



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO.

Accession No.

Call No.....

Acc.No.....



ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی جہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ جہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا موصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیشا یعنی ۸ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔
 منجر "مکار"

جہاں بکلیاں

تصانیف نیاز فختوری

جہاں بکلیاں

شہاب کی سرگزشت	مکتوبات نیاز	جماستان	نگارستان
حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تمہیل اس کی نزاکت بیان اس کی ہندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔	ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان نگینی اور ایسے ہی کے خاص فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پچھلے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ جوڑے کاغذ پر محمد شایع ہوئی ہے۔	ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دورہ مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳۰ کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان نگار تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین نمونہ کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ افسانہ اور سحر حلال اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۱۰ روپیہ (لغوی) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم	حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مصنفین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت ۱۰ روپیہ (لغوی) علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بیسٹا تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہوتا۔ اردو میں آپ کے لئے صرف یہ ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت ۱۰ روپیہ علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ اور اس کی عہد و عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بیسٹا نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات نمایاں ادبی نگار کے نکلے ہوئے ہیں جو ۱۵ صفحات۔ قیمت ۱۰ روپیہ علاوہ محصول

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچویں ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
پر وجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

SV02

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہمیشہ یاد رکھئے کہ ہرچیز پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچویں سے
کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا حصول پانچ گنا قہقہوں
کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ روپے کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
منبر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین ضروری سال ۱۹۴۷ء	شمار (۲)
----------	------------------------------	----------

۲	ملاحظات	اڈیٹر
۹	عہد قدیم کا انسان کیا نہ جانتا تھا	اڈیٹر
۱۴	لہام ہاہر لکھنوی	ع۔ ن۔
۲۳	اپنے ایک اختر کی دوست سے!	گلاب چند
۳۱	دنائے آب کی کہانی	اڈیٹر
۳۸	بڑا گھر	شکر سرور بھٹناگر
۴۳	مخدوم کی شاعری	محبوب حسین (عثمانیہ)
۴۹	قصاص کی گڑھی	اڈیٹر
۵۲	علم کی طیار کی ہوئی دوزخ	اڈیٹر
۵۵	کتوبات نیاز	اڈیٹر
۶۱	جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ	فضل الدین اثر
۶۶	باب الاستفسار	اڈیٹر
۷۲	تنوعات	اڈیٹر
۷۳	منظومات	تمکین - فراق - نجم آندہ - خلیل اللہ قرشی - جگر - انجم - ابد نبی - احمد بہار

دفتر نگار سے اخبار ”جنگ“ کا اجرا اشتہار صفی ایک ہفتہ وار اخبار

جنگ کے آئندہ امکانات (ملاحظات)

جنگ جہاں کہیں بھی ہو، خوفناک چیز ہے، لیکن یہ جنگ جتنی خطرناک ہے، اتنی ہی عجیب بھی ہے، اور ”ہٹلر و اسٹالین“ کے اتحاد نے، امکانات و قیاسات کی دنیا کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ذہن انسانی مشوش ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آئندہ کے متعلق کیا حکم لگائے

اس وقت قدر شاہر شخص کے داغ میں یہ سوال چکر لگا رہا ہے کہ اس جنگ کا حقیقی مقصد کیا ہے اور ہٹلر کے نقطہ نظر سے کیوں یہ چاہتا ہے کہ جرمنی کامیاب ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ گوشتہ اگست میں مابین روس و جرمنی ایک سمجھوتہ یا یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا ہو چکا ہے جس کا نام حسب بیان رابن ٹراپ، آر پلین (R. Plan) ہے اس قیاس کے مطابق، یورپ کے موجودہ جغرافیہ میں جو تبدیلی یہ دونوں چاہتے ہیں اس کو آپ نقشہ میں دیکھئے یعنی فن لینڈ اور ناروے کی سرحدوں کے نقطہ اتصال سے ایک سیدھا خط جنوب کی طرف بحر روم تک کھینچا جائے اور اس خط کے مشرق پر جتنے ممالک ہیں وہ روس کے زیر اثر آجائیں اور مغربی جانب کے ممالک پر جرمنی کا اقتدار ہو جائے۔ یعنی بالٹک ریاستیں، مشرقی پولینڈ، رومانیہ، بلغاریہ اور یونان کا مشرقی حصہ، سوویٹ یونین میں شامل ہو جائے اور سوئیڈن، ناروے، ہنگری اور یوگوسلاویہ اور مغربی یونان پر نازی حکومت کے اثرات قائم ہو جائیں

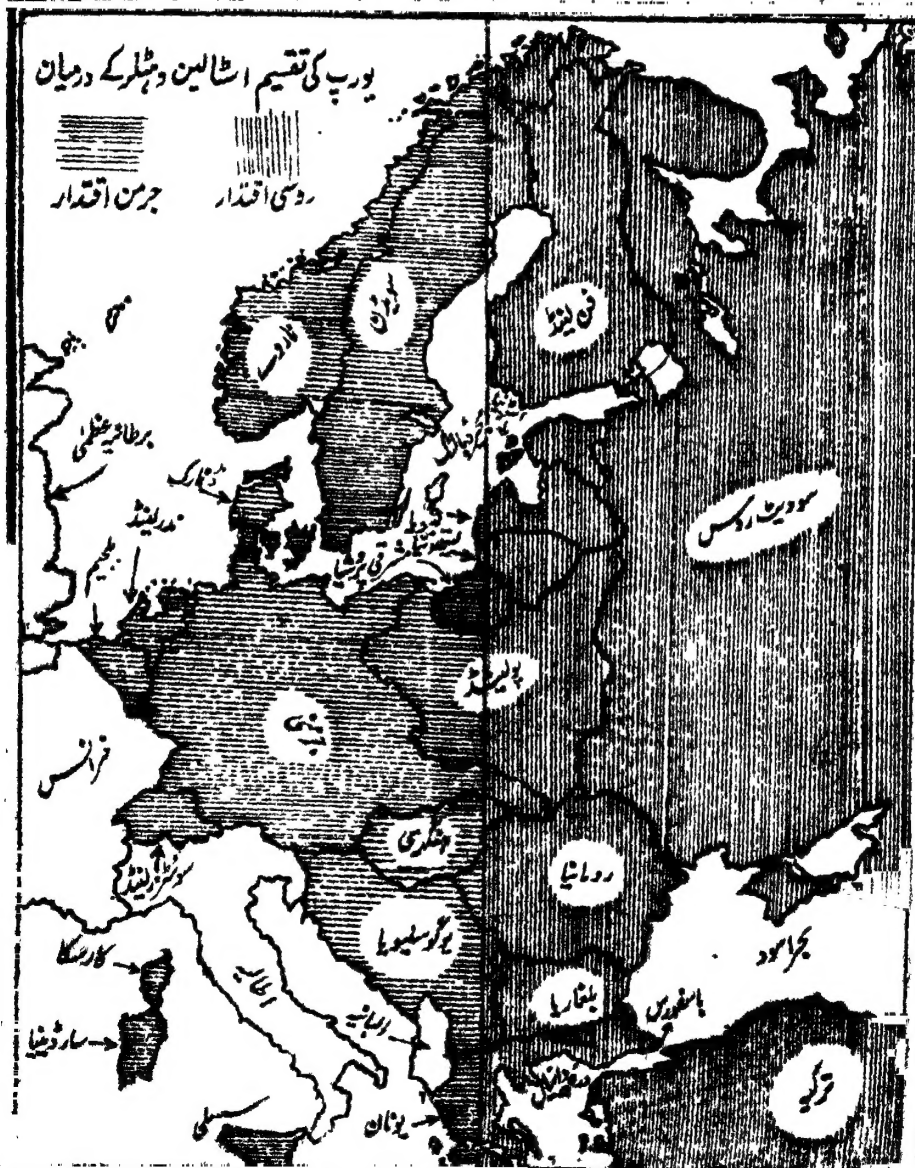
جن لوگوں نے یہ قیاس قائم کیا ہے وہ ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جرمنی کا روس کو اس بات کی اجازت دیدینا کہ وہ بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ پر قبضہ کرے، بغیر اس سمجھوتے کے ممکن ہی نہیں کہ اس کے عوض جرمنی کا بھی کوئی حصہ مقرر ہو گیا ہو گا اور وہ حصہ سوئیڈن و ناروے ہو سکتا ہے یا ریاستہائے بلقان یا دونوں

اگر یہ کہا جائے کہ ہٹلر نے روس کے ان جارحانہ اقدامات کو صرف اس لئے منظور کیا ہے کہ وہ اس کے عوض روس سے خام پیداوار حاصل کر لے، تو یہ اس لئے درست نہیں ہو سکتا کہ اول تو روس کی خام پیداوار اتنی زیادہ نہیں کہ وہ کسی اور ملک کو فراہم کر سکے اور دوسرے یہ کہ جرمنی و روس کے درمیان ذرائع نقل و حرکت اس قدر خراب ہیں کہ چرخی، روسی پیداوار سے کوئی فائدہ اٹھا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جرمنی نے سودا کچھ اور ہی کیا ہو گا اور وہ سوائے ریاستہائے بلقان اور سوئیڈن، ناروے کے کچھ نہیں ہو سکتا

اس لئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنی کا آئندہ قدم کیا ہو گا۔ جب تک فن لینڈ کا مسئلہ طے نہیں ہو جاتا، اس وقت تک تو جرمنی یونانی خاموش بیٹھا رہے گا، لیکن روس جرمنی فلیٹڈ کو عبور کر کے ناروے کی سرحد تک پہنچے گا کہ بحر ہالٹک میں جرمنی کی فوجی نقل و حرکت ہو

دوسو یقین اور دُعاؤں کے ساتھ اس کے خلاف شروع ہو جائے گی ظاہر ہے کہ یہ ممالک جڑ سے اُتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے ان کا بھی دہریہ حشر ہو گا جو بالکل ریاستوں کا ہوا اور اس طرح بہت سی کارآمد معدنیں بھی جڑ سے اُتار کے ساتھ آجائیں گی اور بحرِ شمال میں وہ زیادہ آسانی سے ہلاکت پھیل سکے گا

جب یہ ہو چکے گا تو پھر روس کی باری آئے گی اور وہ ریاستہائے بلقان کا رخ کر لے گا جہتی خاموش رہے گا یہاں تک کہ روس کا پورا دھاتری پر بڑھ جائے اور جب جہتی کے دیکھ لے گا کہ ترکی کے اقدامات کو روس نے روک دیا ہے تو پھر وہ رومانیہ، ہنگری اور یوگوسلاویا کو ہضم کرنے کیلئے دوڑ پڑے گا



اس سلسلہ میں سب سے بڑا سوال آئی کے رجحان کا ہوگا، لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں کہ وہ روس و جرمنی کا ساتھ دے گا، کیونکہ ان کے ساتھ دینے سے اس کو پانے کی اتنی توقع نہیں جتنا اندیشہ کھودینے کا ہے اور اس لئے قومی امکان اس بات کا ہے کہ فرانس و برطانیہ کے ساتھ آئی، اسپین، انگلستان، کا بھی معاہدہ اتحاد ہو جائے گا۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ یہ تمام حکومتیں لڑنے ہی کے لئے تیار ہو جائیں

اسٹالین کے نقطہ نظر سے | دوسری جماعت کا مطالعہ صحیح نظر فکر کی رائے کے مطابق ذرا اس سے مختلف ہے اور وہ اس جنگ کو جرمنی و اتحادین کی جنگ نہیں قرار دیتی بلکہ اشتراکیت و غیر اشتراکیت کی جنگ قرار دیتی ہے چونکہ روس

سب سے بڑی بری حکومت ہے اس لئے وہ برطانیہ کو جو سب سے بڑی بری قوت ہے، ہمیشہ حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتی چلی آ رہی ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ روس، برطانیہ کو سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بھی سمجھتا ہے، اس لئے دوسرا سبب عناد کا یہ بھی ہے برطانیہ کے خلاف روس کی یہ برہمچینی ہی کے وقت سے چلی آ رہی ہے، جس نے کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا تھا کہ "لندن کا راستہ دہلی ہو کر گیا ہے" اور اب اسٹالین اس کی تکمیل جرمنی کے ساتھ شریک ہو کر کرنا چاہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسٹالین نے اتنی گہری پالیسی اختیار کی ہے کہ ساری دنیا اس کے دھوکے میں آ گئی ہے۔ کچھ عرصہ سے برطانوی مہرین یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسٹالین نے انقلابی پالیسی ترک کر دی ہو اور اب وہ قدامت پرست جمہوریت کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہو، حالانکہ بالکل غلط ہے اسٹالین بدستور انقلابی پالیسی کا حامی ہے اور مقصد برآری کے لئے وہ اپنے آپ کو بجائے سیاہ کے سفید دکھانا چاہتا ہے۔ ایک بار سلسلہ میں لندن نے ظاہر کیا تھا کہ اس وقت روس میں تو ہماری پوزیشن مضبوط ہے، لیکن اتنی طاقت ہم میں نہیں کہ بین الاقوامی ملکیت کا مقابلہ کر سکیں، اسلئے ہماری پالیسی یہی ہو سکتی ہے کہ موقعہ کا انتظار کریں۔ چنانچہ اس موقعہ کا انتظار ہوتا رہا یہاں تک کہ اب بدسلطنت جرمنی اس فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے یہ خیال کہ روس اشتراکی اصول کو ترک کرتا جاتا ہے صحیح نہیں اور اکابر روس نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے، چنانچہ ۱۹۳۳ء میں وہاں کے سکرٹری جنرل ڈی ٹروڈ (M. Thorez) نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "ہم پر یہ الزام قائم کیا جاتا ہے کہ ہم اشتراکی اصول سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ اتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم مارکس اور لینن کے صحیح پیرو ہیں یہی نہیں کہ جب تک موقعہ محل کے لحاظ سے اپنی ترکیبوں میں تغیر و تبدل نہ کرتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹے ہوئے نظر آئیں، لیکن یہ بھی ہماری ترکیب ہوگی جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا"

اب اسٹالین کی پالیسی پر غور کیجئے۔ اسٹالین اس خیال کو ظاہر کر چکا ہے کہ تحریقاتی سابقہ سے زیادہ کوئی چیز سرمایہ دار ممالک کو تباہ کرنے والی نہیں، اس لئے ان کو آپس میں لڑاتے ہی رہنا چاہئے۔ اپنے مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے سلسلہ میں انہی ظاہر کیا تھا کہ "گزشتہ جنگ، جرمنی کو تباہ نہ کر سکی، بلکہ بغض و عناد کا بیج اس میں بونگی اور فاتح قوموں کے خلاف ایسا شدید جذبہ انتقام پیدا کر گئی جس کو دور کرنا ناممکن ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ کتنا بڑا فائدہ پہونچا گئی کہ روس کی سرمایہ داری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جو جنگ ہونے والی ہے اس کے نتائج ہمارے لئے اس سے بہتر نہیں ہوں گے؟"

۴۲ اگست ۱۹۳۳ء کو روس کے مشہور اشتراکی اخبار پرادوا (Pravda) نے اسٹالین کی اسی پالیسی کو دوسرے

الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا تھا کہ:۔ ”پہلی جنگ ملکیت نے جب لوگوں کو اقتصادی تباہی میں مبتلا کیا تو اشتراکی انقلاب نے اسکا خاتمہ کیا اور اب اگر جنگ ہوگئی تو یورپ و ایشیا کی بہت سی سرمایہ دار حکومتیں انقلاب کا شکار ہوگئی اور انکے سر سے بھی عذاب دور ہوگا۔“
پراؤڈ کے اس بیان پر ایک انگریز صحافی (Lancelot Lawton) نے لکھا تھا کہ:۔ ”اگر پراؤڈ کی پیشین گوئی صحیح نکلی تو اسکے معنی یہ ہیں کہ سوویت جمہوریتیں، دریائے رھائن کے سواصل پر، بحر روم کے علاقوں اور مشرق بعید میں بھی قائم ہو جائیں گی اور یہ انجام بڑا دردناک ہوگا۔“

اسٹالین کے بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں سرمایہ دار حکومتوں سے کوئی بڑی لڑائی لڑنا نہیں چاہتا، چنانچہ مارچ ۱۹۳۷ء کی تقریر میں اس نے ظاہر کیا تھا کہ:۔ ”ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مبادا دوسروں کے بھرکانے سے ہمارے ہاگ میں پھانسیاں اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں۔“

اسی قسم کا خیال کامریڈ مائیکس (Maks) نے ظاہر کیا تھا کہ ”سرخ افواج کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سوویت جمہوریتوں کی تعداد بڑھائی جائے، اور اس باب میں اسٹالین سے بہتر ناخدا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

اس لئے اسٹالین کا ہٹلر سے مل جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ نازیٹ کو پسند کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولینڈ کے مسئلہ میں یورپین حکومتیں ضرور لڑیں گی اور آخر میں تباہ ہوں گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب روس کو اپنی اشتراکیت پھیلانے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ پولینڈ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہاں کی اشتراکی جماعتوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ”ہمیں لڑائی سے غلجہ رہنا چاہئے، لیکن جب فریقین کمزور ہو جائیں تو ہمیں مداخلت کر کے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔“

ہٹلر خود روس و جرمن اتحاد کا حامی تھا، اس کا یقین تو نہیں ہو سکتا، لیکن جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت کی ضمانت لیلی تو اس کے لئے چارہ کار صرف یہی تھا کہ وہ اسٹالین کو ملائے۔ ہر چند وہ اسٹالین کو اپنا دوست نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ اس کا کیا ارادہ ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روس کی فوجیں، جرمنی فوجوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر آخر میں اسٹالین سے جنگ کو ناپڑی بھی تو فیصلہ جرمنی ہی کے حق میں ہوگا۔

بہر حال اسٹالین و ہٹلر کا اتحاد جو نوعیت بھی رکھتا ہو، اس میں کلام نہیں کہ روس ابھی تک فائدہ ہی فائدہ میں ہے۔ آدھا پولینڈ اس کو مل گیا، بالٹک ریاستوں پر اس کا قبضہ ہو گیا اور اگر فن لینڈ کو بھی اس نے فتح کر لیا تو بحر اٹلانٹک کی طرف وہ برطانیہ کے لئے بڑے خطرہ کی چیز ثابت ہوگا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ فن لینڈ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ قیاس چاہتا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرف اقدام نہ کرے بلکہ لڑائی کا رنگ دیکھے گا۔ اگر اتحادی بین کو کامیابی حاصل ہوئی۔ (اور ظاہر ہے کہ اتحادی بین کی اس کامیابی کا سبب تا کہ جلدی ہوگئی تو جرمنی کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہو جائے گی کہ وہاں انقلاب پیدا کرنا آسان ہو جائے گا اور وہ جرمنی پر اسی آسانی کے ساتھ قابض ہو جائے گا جس آسانی سے پولینڈ اور ریاستہائے بالٹک پر قابض ہوا ہے اور جرمنی ایسے زبردست

ملک کا اشتراکی ہو جائے گا یا سارے یورپ کا اشتراکی ہو جائے گا

اگر کامیابی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو بیشک اسٹالین کی پوزیشن نازک ہو جائے گی، کیونکہ جرمنی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے، علاوہ اس کے ایک بڑا سوال جاپان کا بھی ہے جو اسے جرمنی سے ملحدہ نہیں کر سکتا۔

قرض کیجئے کہ برطانیہ کو شکست ہوئی تو کیا جاپان خاموش بیٹھا رہے گا اور اس کو تنہا فائدہ اٹھانے دیگا، ہرگز نہیں، وہ فوراً جزائر فلپائن، ہانگ کانگ، فرانسسی انڈوچائنا اور جزیرہ مائے لایا پر قبضہ کر کے برما اور ہندوستان کا رخ کرے گا اور پھر اس وقت روس، بغیر جرمنی کی مدد کے جاپان کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

آپ نے بحث کے دو پہلو مطالعہ کر لئے، لیکن ایک تیسرا پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس بلقانی ریاستوں کو سامنے رکھ کر جنگ کا اثر ریاستہائے بلقان پر کیا پڑے گا اور سیاسی و اقتصادی نظر سے فریقین کے وہ کونسے اغراض ان ریاستوں سے وابستہ ہیں جو استخوان جنگ ثابت ہو سکتے ہیں

ریاستہائے بلقان (یعنی ہنگری، رومانیہ، یوگوسلیویہ، بلغاریہ) کا جائے وقوع ایسا ہے کہ جرمنی ان سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ وہ جرمنی سے۔ کیونکہ ان ریاستوں کی خام پیداوار کا نصف حصہ جرمنی ہی کے کام آتا ہے اور جرمنی کی صنعتی ترقیاں رک جائیں اگر یہاں سے لوہا، تانبہ، تانکوں، لکڑی اور پٹرول وغیرہ کی برآمد بند ہو جائے۔ جرمنی بھی پسند نہیں کرتا کہ یہاں سے صنعت و حرفت میں ترقی کر کے بازاروں میں اپنی جگہ علیحدہ پیدا کریں وہ چاہتا ہے کہ یہ ریاستیں صرف خام اشیاء پیدا کر کے جرمنی کی ضروریات کو پورا کرتی رہیں اور وہ ان ٹھوس کارآمد چیزوں کے عوض میں انھیں آئینہ، کنگھا، تیل، غازہ وغیرہ تکلفات کی چیزیں فراہم کر رہا ہے وہ ان کو اپنی مستعمرات یا نوآبادیاں سمجھتا ہے اور یورپ کی کسی اور سلطنت کا درجہ یہاں گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس اقتصادی منہج کے اس کی سیاسی اغراض بھی ان ریاستوں سے وابستہ ہیں

روس کے تعلقات، ریاستہائے بلقان سے اقتصادی نہیں ہیں کیونکہ خام پیداوار کی خود اس کے یہاں بھی کمی نہیں، لیکن بلغاریہ اور یوگوسلیویہ کی سلافی آبادی سے اس کے جذباتی و روایتی تعلقات بیشک دیرینہ ہیں، کیونکہ انیسویں صدی میں بلقان کی سلافی آبادی نے جب ترکی اور جرمنی کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو روس ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ علاوہ اسکے اس کا سیاسی تعلق بھی سرزمین بلقان سے کم نہیں ہے، کیونکہ اوکرائن، کریمیا اور قات پراس کا تسلط اسی وقت قائم ہو سکا تھا جب بحر اسود (Black Sea) خطوں سے پاک رہے اور آبنائے باسفورس کا تعلق سرزمین بلقان ہی سے ہے

ہر چند قیام بالشویت کے بعد، روس کے اثرات بلقان میں کم ہو گئے ہیں، لیکن بلغاریہ اور یوگوسلیویہ کی سلافی آبادیاں اب تک روس کی طرف مایل ہیں اور اگر روس و جرمنی، دونوں بلقان کی طرف بڑھیں تو ہو سکتا ہے کہ کسی وقت یہاں کی سلافی آبادی، روس کی طرف مایل ہو جائے اور روس و جرمنی کے تعلقات اچھے نہ رہیں، لیکن اٹلی کا سوال اس سے زیادہ

اہم ہے اور وہ روس کا اقدام بلقان کی طرف کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ آٹلی بلقان سے دو گونہ تعلقات رکھتا ہے یعنی یہاں کی خام پیداوار بھی حاصل کرتا ہے اور بحر اڈریک کے سواحل اور اپنے مستعمرات افریقہ کی حفاظت کے لئے بھی اس کے اثرات کی یہاں قائم رہنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس نے ۱۸۷۹ء میں البانیہ پر قبضہ کر لیا کیونکہ البانیہ اور جبرائیل ڈوڈو گیز سے وہ ترکی اور یونان دونوں پر دباؤ ڈال سکتا ہے

آٹلی، بلقان میں اپنا قبضہ تو وسیع کرنا نہیں چاہتا، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کا ایک اقتصادی بلاک ایسا بن جائے کہ جرمنی کا اقتصادی دباؤ اور روس کا سیاسی اثر وہاں نہ پڑھنے پائے۔ ہنگر اور سلوینی میں باہم جو سمجھوتا ہوا تھا اس سے آٹلی کو (سوائے قبضہ البانیہ کے) اور کوئی خاص فائدہ اس وقت تک نہیں پہونچا اور اب روس کے ساتھ جرمن تعلقات نے اس کو اور زیادہ مشتبه کر دیا ہے۔ وہ اس سے بھی ڈرتا ہے کہ روس کی مداخلت یہاں اشتراکی تحریک پیدا کر دے گی جسے وہ اقتصادی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے اپنے لئے نقصان رسا سمجھتا ہے

فرانس و برطانیہ کے تعلقات، بلقان میں زیادہ تر سرمایہ دارانہ رہے ہیں۔ انھوں نے زیادہ کوشش اس بات کی کی کہ یہ ریاستیں صنعتی ترقی زیادہ کریں اور جرمنی کو صرف خام پیداوار بھیجے گا ذریعہ بنی رہیں، لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوئی۔ کیونکہ جرمنی یہاں کی خام پیداوار کے عوض اپنے مصنوعات فراہم کیا کرتا ہے اور اسے یہاں بہت اچھا سود اٹھا جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کی خام پیداوار کی کھپت نہایت آسانی سے جرمنی میں ہو جاتی ہے اور دوسرے دور دراز ممالک کو بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی

جرمنی نے بلقان میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے بعض سیاسی حربوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً اس نے یہ بھی کیا کہ ان ریاستوں میں جہاں کہیں جرمن آبادی یا جرمن نسل سے تعلق رکھنے والی آبادی پائی جاتی تھی اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے تسلیم کرائے اور اپنے جداگانہ حقوق حکومت سے حاصل کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازیت کے جراثیم آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئے اور جرمن راکش کا خوف لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت ۳۵ لاکھ جرمن آبادی ہنگری، یوگوسلیویا، رومانیہ اور سوویٹ یونین میں پھیلی ہوئی بتائی جاتی ہے

اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور قوموں کو بھی اپنے افراد کے حقوق کا احساس پیدا ہو گیا، یعنی ہنگری بھی کہنے لگا کہ رومانیہ اور یوگوسلیویا میں ۲۵ لاکھ ہنگرین پھیلے ہوئے ہیں، بلغاریہ بھی رومانیہ میں اپنی بارہ لاکھ کی آبادی کا ذکر کرنے لگا، روس بھی سریا میں اپنی دو لاکھ آبادی کی حمایت پر آمادہ ہو گیا اور اس طرح بلقان کی تمام ریاستوں میں انقلاب و اختلاف کے جذبات پیدا ہو گئے چنانچہ ہنگری اور بلغاریہ دونوں چاہتے ہیں کہ ان کا جتنا علاقہ رومانیہ اور یوگوسلیویا نے لے لیا ہے وہ انھیں واپس مل جائے اور اگر بلقان پر جرمنی یا روس نے حملہ کیا تو ہنگری اور بلغاریہ کو بھی لالچ و دلا کو وہ اپنے ساتھ لائیں گے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فتح پولینڈ کے بعد ہی بلغاریہ نے روس سے معاہدہ تجارت کی گفتگو شروع کر دی

یونان کی حالت البتہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ اسے جرمنی کا اتنا خوف نہیں ہے جتنا اٹلی کا ہے ہر چند دونوں میں ایک نوع کا معاہدہ اتحاد ہو چکا ہے لیکن یونان مطمئن نہیں ہے اور اسی لئے برطانیہ کا دامن نہیں چھوڑتا کہ اگر کسی وقت اٹلی نے حملہ کیا تو برطانیہ ہی اسے بچا سکتا ہے

ترکی، جسے اس وقت ریاستہائے بلقان کے لیڈر کی حیثیت حاصل ہے، بیشک فرانس و برطانیہ سے معاہدہ کر چکا ہے، لیکن اس معاہدہ کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ روس و جرمنی سے جنگ کرنے پر بھی مجبور ہو۔ اگر روس نے بلقان پر حملہ کیا تو اتحادیوں کے جہاز مجبور ہوں گے کہ وہ درہ و دانیال سے گزر کر اپنی فوجیں بلقان میں اتاریں اور یہ وقت میرے خیال میں ترکی کے لئے بہت نازک ہوگا اور نہیں کہا جاسکتا کہ حالات اسے کیا پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے

یہ ہیں وہ سیاسی پیچیدگیاں جن سے بلقانی ریاستیں اس وقت دوچار ہیں اور ان کا نتیجہ بھی ہو، لیکن تین باتیں بظاہر بہت کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فرانس و برطانیہ کا اثر وہاں وہ نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بلقانی آبادی کی حفاظت کی ذمہ داری جو برطانیہ کی طرف سے لی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور ٹھلکنے جو دست درازیاں اسٹریٹا زکو سلو ویکیا اور پولینڈ پر کی ہیں ان کو دیکھ کر بلقانی ریاستیں بھی ڈر رہی ہیں کہ اتحاد میں جب تک مدد دینے کا فیصلہ کریں اس وقت تک کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس کی مداخلت نے جرمنی کے اثرات کو جیسا کہ پائے جاتے تھے بہت کم کر دیا ہے اور اٹلی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر چکا کہ اسے کیا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ روس کے ساتھ ملکر وہ کام نہیں کر سکتا اور جرمنی سے بھی وہ اس لئے خفا ہے کہ اس نے روس کو کیوں بلقان میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ بلقانی ریاستیں اب پوری طرح محسوس کر رہی ہیں کہ دولِ عظمیٰ میں سے کوئی ان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، جب تک وہ خود آپس میں اتحاد پیدا کر کے روس و جرمنی کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم نہ کریں۔ بہر حال دریائے ڈینیوب کی غادیوں پر اس وقت جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت برس پڑیں۔

مازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ رومانیہ کو مجبور کر رہا ہے کہ گھٹے پٹرول فراہم کرے۔ ظاہر ہے کہ رومانیہ پر حملہ کرنے کے لئے یہی اک بہانہ کافی ہے۔ اگر جرمنی نے حملہ شروع کر دیا تو روسی فوجیں یقیناً رومانیہ کے مشرقی علاقہ (سربیہ) کی طرف بڑھیں گی لیکن پولینڈ کی طرح یہاں کامیابی آسان نہیں ہے، کیونکہ بلغاریہ، ہنگری اور ترکی اس کو کبھی گوارا نہ کریں گے اور پھر اٹلی اور یونان کو بھی اس آگ میں کودنا پڑے گا

رہا یہ سوال کہ اتحاد میں اس صورت میں کیا کریں گے، اس کا بڑا انحصار اس امر پر ہے کہ مغربی محاذ کا اس وقت کیا رنگ رہتا ہے۔

عہدِ قدیم کا انسان کیا نہ جانتا تھا

آج دنیا کی علمی ترقیاں اور اصول اخلاق کی بلندیوں بہت حیرت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور عہدِ حاضر کے اکثر اختراعات و ایجادات کا سراغ تاریخِ انسانی کے عہدِ ماضی تک پہنچتا ہے۔ آپ کو شاید یہ منکر تعجب ہو گا کہ بڑے بڑے مہیوں اور دباؤ ڈالنے والے انجنوں کا اسٹیم کے ذریعہ سے حرکت میں لانا، عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا اور طباعت و جلد سازی سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔

ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے، روم کے برتن بنانے والے روز کے استعمالی ظروف پر ٹائپ کے ذریعہ سے اپنے نام نقش کر دیتے تھے، اور نویں صدی عیسوی میں اہل چین ہلاک بنانا کو کتابیں چھاپا کرتے تھے۔

قدیم اسکندریہ میں، اشتہاروں کے لئے ستون نصب کئے گئے تھے اور انھیں پر اعلانات وغیرہ گوند سے چسپاں کئے جاتے تھے۔ روم میں بڑے بڑے تختوں کا بھی رواج تھا جن پر سیاہ و سرخ حروف میں اشتہارات تحریر کئے جاتے تھے۔

آرنے کھنڈروں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق کی سمیری آبادی ڈامر اور اسبستوس (Assur و Damir) کا استعمال جانتے تھے۔ اسی طرح کنکرٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

آگ بجھانے کا انجن مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ہی یونان میں ایجاد ہو چکا تھا اور روم میں تو باقاعدہ آگ بجھانے والا بریگیڈ بھی تھا۔ قدیم دنیا میں خود حرکت کرنے والی (self moving) مشینیں بھی پائی جاتی تھیں، چنانچہ اسکندریہ کے معبد میں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی جس کے اندر سکڑے ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار از خود مل جاتی تھی۔ فراعنہ سے پہلے بطلیموسی خاندان کے زمانہ میں ایک مشین کا بنا ہوا آدمی طیارہ کیا گیا تھا۔ روم میں نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی لوگوں نے بنالیا تھا جو ہتھوڑوں کی ضرب سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا، لیکن وہ طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔

لے ایک شہدار عدلی چیز جو آگ کو قبول نہیں کرتی جیسے ابرک۔

سن کا کپڑا طیار کرنا مصر قدیم کے نہایت ابتدائی عہد کے لوگوں کو معلوم تھا جس کا ثبوت مومیائی شدہ لاشوں کے لباس سے ملتا ہے۔ توریت میں جن لباسوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ معبدوں کے پرستہ اور راہبوں کے لباس نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے۔ تین ہزار سال قبل کی مومیائی شدہ لاشوں کے کپڑوں میں اب بھی وہی نرمی پائی جاتی ہے اور ان کا رنگ تو ایسا نظر آتا ہے گویا ابھی نیا تھا ان سانسے کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

افلاطون نے، پانی سے چلنے والی گھڑی میں ایک ٹیڑھی نلی لگا کر اس کو الارم کلاک بنالیا تھا۔ جس وقت پانی اس نلی کی سطح تک پہنچتا تھا تو وہ دوسرے ٹیوب سے اتنی تیزی کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس سے سیٹی کی آواز پیدا ہوتی تھی افلاطون نے یہ ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس کے شاگردوں کو صبح چار بجے اس کا علم ہو جائے اور وہ اٹھ بیٹھیں۔ ایک پانی سے چلنے والی گھڑی کا بہشت پہل مینار جو آخری صدی قبل مسیح میں طیار کیا گیا تھا، اب بھی پایہ تخت یونان میں قائم ہے۔ خارجی گرمی پہنچا کر انڈوں سے بچہ نکالنے کا طریقہ قدیم مصریوں کو بھی معلوم تھا چنانچہ ان مشینوں سے بیک وقت سات سات ہزار انڈوں سے بچے نکالے جاتے تھے۔ ان مشینوں میں اپنے یا بھوسے کی آگ سے گرمی پہنچائی جاتی تھی۔ (درویس) (Vitruvius) نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، اس زمانہ کے اہل کبر الصوت (loud speaker) کا ذکر کیا ہے جن کو (یعنی آواز بازگشت کو قوی کرنے والا) کہتے تھے۔ یہ کانے کے ظروف تھے جو تھیلر کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں نصب کر دیے جاتے تھے، آواز ان سے ٹکر کر بہت بلند ہو جاتی تھی اور بہت سریلی ہو کر سامعین کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ اسی طرح کے آواز بڑھانے والے آلات اسٹیج کی طرف بھی ستونوں سے نصب کر دیے جاتے تھے تاکہ آواز کا توجہ بڑھ جائے۔ یہ مختلف مایوں کے ہوتے تھے اور اس طرح ٹرس میں ایک دوسرے سے لٹکا کر ملائے جاتے تھے کہ ان سے بالکل انسانی آواز پیدا ہو۔

نولاد کے نہایت عمدہ پھل بنانا بھی انھیں معلوم تھا، جس کا ثبوت تلواروں اور خنجروں کے پھل سے ملتا ہے۔ ان پر وہ کچھ نشانات بھی بنا دیتے تھے جو ٹھنڈے تھے۔ نولاد کو اس قدر سخت ہنا دینے کا راز اب تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ قدیم اہل ہند کے لوگوں کو معلوم تھا کہ رنگ نہ لانے والا لوبو کیونکر طیار کیا جاتا ہے، چنانچہ دہلی میں ساٹھ تین سو سال قبل مسیح چولہے کی لاٹھ نصب کی گئی تھی وہ آج تک موجود ہے اور اس پر رنگ کا نام نہیں۔ یہ فن بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ باقی دانت کو آبال کر نرم کرنا اور اس سے مجسمے طیار کرنا یہ فن بھی عہد قدیم کے انسان کو معلوم تھا جو اب تک ہمیں معلوم نہیں ہوا۔

قدیم یونان میں مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے یہ ترکیب کی جاتی تھی کہ گرم ہوا فرش مکان کے نیچے اور دیواروں کے اندر دوڑا دی جاتی تھی۔ چونکہ فرش اور دیواریں پتھری ہوتی تھیں اس لئے سردی میں ان کی ٹھنڈک بہت بڑھ جاتی تھی

اور اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی جاتی تھی۔

معبودوں میں عجیب و غریب میکا کی ترکیبوں سے کام لیا جاتا تھا، مثلاً قریبا نگاہ کی آگ سے یہ کام بھی لیا جاتا تھا کہ ہوا کو پھیلا کر انہوں کے اندر سے لیجاتے تھے اور مصنوعی چیزوں کے اندر سے یہ ہوا گزر کر مختلف آوازیں پیدا کرتی تھی۔ شگین بتوں میں حرکت بھی میکا کی طریقوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اسکندر یہ کے معبد سرالپس کے گنبد میں ایک مقناطیس اس طرح رکھ دیا گیا تھا کہ بت کے سر کو وہ کھینچتا تھا اور وہ بت اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بہت سے معبدوں میں قربانگاہوں کے پتھر کے نیچے، ہوا کا خزانہ بنارہتا تھا جس کا تعلق زیر زمین نلوں کے ذریعہ سے ایک ایسے ظرف سے تھا جو پانی سے بھر رہتا تھا۔ جب گرمی سے اس کا پانی جوش کھاتا تھا تو ایک دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا جو اس کے پاس ہی معلق رہتا تھا اور جب اس کا وزن بڑھ جاتا تھا تو پوشیدہ پھیپوں کے ذریعہ سے مندر کا دروازہ کھول دیا کرتا تھا اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

مصر کے پوجاری علم مناظر دمرا یا (Ophel) سے بخوبی واقف تھے۔ جب کوئی شخص پوجا کرتا تھا تو مندر کی پشت کی دیوار پر دفعتاً بت کا چہرہ نمودار ہو جاتا تھا، اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کے سامنے ایک مقعر (Concave) آئینہ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے سامنے کی دیوار پر بت کا عکس پڑتا تھا۔

اپالو کے بت کا جلوس جس وقت باہر نکالا جاتا تھا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے تخت سے اٹھتا تھا اور پھر بٹھ جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کھوکھلی لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھ دیا جاتا تھا جو اسے ابھارتا رہتا تھا۔

صنعت و حرفت میں فیکٹری سسٹم اس وقت کی چیز بتائی جاتی ہے لیکن سنٹ آگسٹین پیپو کا بشپ لکھتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہ طریقہ رائج تھا اور ایک ہی چیز مختلف کاریگروں کے ہاتھ سے نکل کر تیار ہوتی تھی۔

پریسڈنٹ روزولٹ صد امریکہ کی یہ اقتصادی تدبیر کہ غلہ کے ذخیرے محفوظ رکھنا چاہئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں، پیئیر پوسٹ کو بھی معلوم تھی، جنہوں نے مصر میں اس پر عمل کیا تھا۔ قدیم مصر میں غلہ کے مستقل کتے رکھے جاتے تھے اور آج کل کی طرح غلہ کا تبادلہ غلہ سے، تعاونی، فصلوں کا بیمہ اور بھاؤ کی نگرانی سب وہاں پائی جاتی تھی اشیاء غور دنی کو محفوظ رکھنے کی ترکیب بھی انہیں معلوم تھی، چنانچہ اس وقت کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں اب تک اچھی حالت میں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کو کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آبدھیس (Jodine) لے ہوئے پانی میں رکھ دیتے تھے۔

میسو ڈوٹش، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، لکھتا ہے کہ امراتصر اپنے ہاتھ میں Quartz (ایک قسم کا پتھر) کی چھوٹے چھوٹے گیند رکھا کرتے تھے تاکہ ہاتھ ٹھنڈے رہیں۔

برتن بنانا یا برتن سے چیزوں کو ٹھنڈا رکھنا بھی پچھلے لوگوں کو معلوم تھا۔ گڑھوں میں مٹی کے پیالے دکھ کر برتن جمانا قدیم اہل ہند کو معلوم تھا اور اسکندر اعظم کے زمانہ میں آسمانی برتن کو دبا دبا کر گڑھوں میں بھر دیتے تھے اور عرصہ تک اس سے کام لیتے تھے۔ نیرو پہلا بادشاہ تھا جس نے شراب کو برتن میں لگا کر ٹھنڈا کرنا رائج کیا۔ سنیکا اور پلوٹارک اب سے بہت پہلے بتاتی اصول کے عادی تھے اور اسیس ثانی (فرعون مصر) نے مسیح قبل ۱۲۵۰ میں ایک مانع شراب نوشی لیگ قائم کی تھی۔

علاج کی غرض سے بچہ کی استعمال بھی عہد قدیم میں رائج تھا، چنانچہ دروس میں ایک ایسی مچھلی کا استعمال ہوتا تھا جس کی برقی رد اعصاب میں سکون پیدا کر دیتی تھی۔ عمل جراحی کے لئے مردم گیاہ (Marm Drake) بوٹی کھلا کر ایک انسان کو تین چار گھنٹے تک کے لئے بیہوش وبے حس بنا دیا جاتا تھا۔ مٹی کی تختیاں جو سواحلِ دجلہ سے دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۴۰۰۰ ق۔ م، اسیریا کے ایک بادشاہ کا علاج مٹھی سے کیا گیا تھا۔ بابل کے کھنڈروں سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں بخاری کھی کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے مراد مچھر ہے۔ گویا یہ حقیقت انسان قدیم کی دریافت کی ہوئی ہے کہ مچھر سے فصلی بچا بھلتا ہے۔

قدیم مصر میں آبپاشی کی نہروں کو گھاس وغیرہ سے صاف رکھنے کے لئے لقلق (ایک چڑیا بگلیا سائیس کے قسم کی) پالے جاتے تھے اور یونان میں طاعون کے جو بے فنا کرنے کی خدمت سانپوں کے سپرد تھی۔ بعض امراض کے ٹیکہ کا رولج قدیم ہندوستان اور چین میں پایا جاتا تھا۔

برتن کی مالش کے ذریعہ سے علاج ۴۰۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا اور یونان کا ایک حکیم ۲۵۰۰ سال قبل مسیح میں علاوہ مالش کے سرد پانی، مینہ کے پانی اور ننگے پاؤں ریت پر چلانے سے بھی کیا کرتا تھا اور شاہ آکسٹس کا علاج ایک طبیب موسیٰ نامے نے اسی طریقہ سے کیا تھا۔

زخمیوں کے لئے مصنوعی اعضا بھی طیار کئے جاتے تھے، چنانچہ ۱۲۱۰ سال قبل مسیح میں کیٹی لائن (Catechism) کے پروردگار کے لئے جنگِ قرطاجہ میں ایک مصنوعی ہاتھ تیار کیا گیا تھا۔ انگلستان کے رایل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں ۳۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا رکھا ہے۔ قدیم ہند کے باشندے پلاسٹر سے مصنوعی ناک، ہونٹ اور کان بناتے تھے۔

رومہ دیونان کی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غددوں کا علاج کوئی نئی چیز نہیں ہے، اور مریضوں کو جوش دیا ہوا پانی پلانا بھی انھیں معلوم تھا۔ ہرودوٹس لکھتا ہے کہ (Herodotus) شاہ فارس اپنے ساتھ ہمیشہ جوش دیا ہوا پانی چاندی کے برتنوں میں رکھا کرتا تھا، اسی طرح رومہ کا مشہور بادشاہ نیرو بھی ہمیشہ اُبلتا ہوا پانی پیتا تھا۔

پھیلائی میں بعض قدیم آلات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے بعض امراض کا علاج آپریشن سے کیا جاتا تھا۔ یہ آلات اب کے ہیں، لیکن اس قدر تیز و صاف ہیں کہ آج بھی ان سے آپریشن کیا جاسکتا ہے۔ جو بیس قیصر اپنی ماں کے پیٹ سے آپریشن کے بعد ہی پیدا ہوا تھا اور اسی لئے یہ آپریشن اب بھی اسی کے نام سے منسوب ہے اور اسے (Caesarian Section) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے بعض کاسہائے سراپے ملے ہیں جن پر جراحی کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔

سکندر اعظم کے زمانہ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا (اگرچہ ارسطو اسے پسند نہ کرتا تھا) مصر قدیم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح، موتیابند کے آپریشن کا وہاں رواج عام تھا۔ بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی بھی ملی ہیں، جن کے دانت مصنوعی ہیں اور بعض کی آنکھیں بھی۔

بال اگانے کے لئے رینڈی کاتیل دوسرے کسی تیل میں ملا کر اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ڈاکٹر جانتے تھے کہ انسانی جلد پر سورج کی مصنوعی روشنی، بلور کے شیشے کے ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہے اور متحدہ پیشوں کے ذریعہ سے بدن جل سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ڈاکٹروں کو فیس بھی دی جاتی تھی، چنانچہ پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ شاہی طبیوں کو علاوہ اُس فیس کے جو عام لوگوں سے ملتی تھی سالانہ ۷۵۰ پونڈ ملا کرتے تھے اور روم کے مشہور طبیب (Caelus) کی فیس ۵۰ پونڈ تھی۔

روحوں کو بلانا اور میز کا گردش میں لانا قدیم مصر میں بھی رائج تھا، مصری سے یہ رسم یونان میں پہنچی اور پھر تمام عیسوی دنیا میں عام ہو گئی۔

حضرت موسیٰ سے بہت پہلے قوتِ مقناطیس سے کام لیکر خود اپنے آپ کو بیہوش کر لیتے تھے اور بعض تیار یوں کا علاج اسی عالمِ بیہوشی میں جاتے تھے۔ سنٹ آگسٹائن کا بیان ہے کہ ایک پادری اپنے آپ کو ایسا بیہوش وجہ جس بنا لیتا تھا کہ اس پر زخموں کا بھی اثر نہ ہوتا تھا اور اسی عالم میں وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ ہرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اسی عہد کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول نیچے گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ہر کے ٹکٹ محصول ہونے پر۔

منیجر نگار

کلامِ آہر لکھنوی

”طاقِ نیاں“ کی جستجو اکثر ایسے جو اہر پاروں سے روشناس کرتی ہے جو ”گردِ تغافل“ کے تہ بہ تہ طبقوں میں پوشیدہ ہو گئے ہیں مگر دستِ طلب کی معمولی سی تحریک جب انھیں نمایاں کر دیتی ہے تو آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی ہے۔
نواب مولوی میر محمد حسین آہر مرحوم انہی ”جفا کشیدہ روزگار“ افراد میں سے ہیں جنہیں دُنیا نے اُن کے بعد بھلایا اور ایسا کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

آج یہ اُن کی نہیں، ادب کی خوش قسمتی ہوگی کہ اُن کے کلام سے اربابِ ذوق کا تعارف ہو جائے اور معلوم ہو کہ خاکِ غفلت میں کیا صورتیں ہیں جو اب تک پنہاں ہیں۔

آہر لکھنؤ کے مشہور ”خانِ ابدانِ اجتہاد“ کے ایک ممتاز فرد تھے، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا ہے اور قدرت نے دنیاوی جاہ و جلال، مال و دولت عطا کیا تھا اس لئے نواب کہے جانے لگے۔

ابتدائی عمر میں عربی صرف و نحو اور ادبیات کی تحصیل کی اور معلوم نہیں کہاں تک پڑھا۔ تاج العلماء مولانا سید علی محمد (متوفی ۱۳۱۵ھ) سے مختصر معانی پڑھنے تک کل بہ کتابوں سے چلتا ہے اس کے بعد شاعری کا ذوق پیدا ہوا انہی منظر علی خاں اتیر کے حلقہ ملازمہ میں داخل ہوئے اور برابر انہی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس طرح آہر کا ادبی سلسلہ صرف ایک واسطے سے مشہور استاد سخن مصحفی تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب لکھنؤ کی شاعری میں زندانِ بے باکیوں کا دور دورہ تھا اور ابتذال کی فراوانی تھی۔ خود منشی اتیر کے ممتاز شاگرد امیر مینائی ایسے ”مقدس“ اور ”نذہبی“ انسان کا کلام ”اچکوں“ وغیرہ کی ایسی رکیک لفظوں سے خالی نہ رہا۔ مگر حیرت ہوتی ہے۔ دیکھ کر کہ آہر کا کلام اس طرح کے ابتذال سے بالکل پاک ہے۔

لکھنؤ کی شاعری کے خصوصیات اُٹلیا چوٹی، کاجل، مٹی وغیرہ کا اُن کے یہاں پتہ بھی نہیں، انھوں نے اپنے لئے ایک دنیا ہی الگ بنائی تھی جہاں تمام کائنات عالم اُن کے سامنے تھی اور ہر ایک سے تشبیہات کے ذریعہ وہ تو قلموں فصاحت و معاطات اور مضامین کا خزانہ فراہم کرتے تھے۔

یہ وہ انفرادی رنگ ہے جس میں آہر اپنی آپ مثال نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر سیر حاصل بحث بعد کو آئے گی

جہاں آپ کو کائنات عالم شاعر کے پیش نگاہ دکھلائی دے رہی ہوگی۔ ابھی دوسرے خصوصیات کو سنئے جو عام طور سے شاعری کے محاسن میں سمجھے جاتے ہیں۔

آہر کے کلام میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں:-

صفائی و سادگی۔ لطیف زبان۔ محاورات۔ شوکتِ الفاظ۔ فارسی ترکیبوں کا اعتدال۔ مشکل پسندی۔ طنز۔ محاکات۔ ندرتِ اسلوب۔ جذبات کی تحلیل۔ منظر کشی۔ طبعانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو شاعری کے اصل جوہر سے متعلق ہیں اور اس کے علاوہ تشبیہ۔ استعارہ۔ مراعاتِ انظیر۔ طباق و تضاد ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ جو شاعری کے خارجی زور ہیں۔ انہوں نے ناسخ کے بعد اسے لکھنو کی شاعری میں اکثر مقصدِ اصلی کی حیثیت اختیار کر لی تھی مگر آہر نے انہیں وہی ضمنی درجہ عطا کیا ہے جس کے مستحق ہیں۔

اب ہر ایک عنوان کے تحت میں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

آہر کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ہیں جن میں تکلف و قصص کا لگاؤ نہیں معلوم ہوتا ہے شعر صفائی و سادگی کہا نہیں گیا بلکہ الفاظ نے مجتمع ہو کر خود شعر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

میں عزیزوں سے بھلا ترک و فاک کیا کرتا خون میں خون ملا تھا تو جدا کیا کرتا
آپ بیٹھا ہوا زخموں پہ چھڑکتا ہوں نکل اور اب مجھ سے محبت کا مزا کیا کرتا
ہم نے تو جان نذر دی، دل کو فدا کیا اب تم بتاؤ چاہنے والوں سے کیا کیا
نہ پونچھو عشق نظر میں کہ کیا گزرتی ہے تو پ رہا ہوں کلیجہ پر تیر کھائے ہوئے
انہی سے پونچھے صدمہ اسیروں کی جدائی کا کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں جو آشیاں میرا
جنازہ لا کے لحد پر پٹک دیا سب نے میں بار دوش تھا، اک دفن بھی بہانہ ہوا
بزاروں آپ کی ہوتیں ادائیں اُس میں بھی بری بھی بات جو منہ سے نکل گئی ہوتی،
وہ دن خدا دکھائے کہ قاصد یہ دے خبر کیجئے وہ آپ آتے ہیں خط کے جواب میں
مضمون پتے کے لکھ کے مجھے خوب بن پڑی غصہ نکالنے وہ خود آئے جواب میں
جگر و دل کو تو کھوئے ہوئے گزری مدت پھر نجانے کہ یہ سینہ میں تو پتا کیا ہے
کچھ ایسا پڑ گیا ہے محبت میں تفرقہ دل کی ہمیں تو دل کو ہماری خبر نہیں
خوشی یہی ہے تو اچھا سونو گلہ دل کا کسی طرح سے سہی ہو تو فیصلہ دل کا
وہ دیکھ لیں تو نہ ہو دل نہ ولولہ دل کا لڑے نگاہ تو ہو جائے فیصلہ دل کا
کسی کے آنے کا احسان اب نہیں مجھ پر لحد پہ جو مری آیا ہے ثواب آیا

لاکھوں ہی حسرتیں ہیں تمنائیں سیکڑوں
 ہستی جو میرے دل میں بسی ہے کہیں نہیں
 آئینہ لیکے جاؤں نہ کیونکر میں سامنے
 اُن کی کسی طرح سے ادھر کو نظر تو ہو
 یہی نشانِ دلِ حزیں ہے
 تھے جہاں ہاتھ دل وہیں ہے
 ایک نے حق میں ہمارے کہا کلمہ خیر
 سب کا منہ دیکھتے ہم مجمعِ محشر میں رہے
 نجانے جنبشِ ابرو میں دل پہ کیا ہوتی
 ہنسی ہنسی ہی میں تموار چل گئی ہوتی
 عدم سے آئے ہیں، جائیں گے پھر عدم اک دن
 اس ابتدا کو ہم انخام کا ر سمجھے ہیں
 دل کو برد باد کیا آرزوؤں کو بے گھر
 تم سا عالم میں کوئی خانہ بر انداز نہیں
 باغ میں آ کے امیرانِ قفس کیا بہلیں
 سب ہوائیں ہیں ہوائے پرداز نہیں
 مہر کو بجا طور سے اپنی زباں دانی پر ناز تھا کیونکہ وہ لکھنؤ کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے
 لطیف زباں تھے جہاں بیرونی عناصر کا اثر بالکل نہیں پڑا تھا۔ پھر اُن کی صحبت بھی اربابِ کمال اور سخنوروں
 کا مجمع تھی۔ مولانا علی میاں کمال۔ بنے صاحبِ مشاق وغیرہ کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے ان کی زبان اور گھر گئی۔
 چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

نظم اشعار میں بھی حسنِ بیاں ہے مہر
 جس کو کہتے ہیں زباں، ہم وہ زباں رکھتے ہیں
 ذیل کے شعروں میں زباں کا لطیف خاص طور پر نمایاں ہے:-

تنگ ہوں زینت سے، اے موت میحائی کر
 جان آجائے اگر روح بدن سے نکلے
 تھا قیام اپنا بہار چنفتاں کی طرح
 وہ وطن ہی نہ رہا ہم جو وطن سے نکلے
 دیکھو خرامِ ناز سے دبتا ہے دل مرا
 پھر کہو گے ہمساکوئی ناز میں نہیں
 رسوائے خلق بھی ہوئے، منہ پر بھی آئی بات
 وصلت میں اور کیجئے مجھ سے نہیں نہیں
 تو بہ! یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہو میری جاں
 یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ ہوا کہیں نہیں
 دل مرا اب نگہِ تند کو برمانے دو
 تیر خالی ہو گیا، دور کرو، جانے دو
 جائے کس طرح طغتنہ اُن کا،
 ابھی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے
 سننے ہو اے کلیم اُن کی صدا
 جن کو دعوائے ن ترانی ہے
 دل و جگر کی تمنائیں قتل ہوتی ہیں
 آجڑ رہے ہیں مرے گھر بے بسائے ہوئے
 نہ دل میں حسرتیں اب ہیں، نہ دل ہی سینہ میں
 بچوں کی راہ میں بیٹھے ہیں گھر لٹائے ہوئے
 مجھ کو پھر درد کی باتوں کا مزاج مل جائے
 منہ میں دم بھر کو زباں بن کے اگر دل ٹھیرے

خطا مجھی سے ہوئی، اب جو کچھ کہوں مجرم
تم ہنسو پھولوں سے لمیل کو میں بڑھکر چھیروں
رنج میں رنج ہی شاید سبب لکیں ہو
رکھو پھولی ہے شفق، وقت نے سرخ ہے یہ
جمع ہے اک خدائی کا ماہر کے دفن میں
دنیا ادھر کی جن سے ہوا کرتی تھی ادھر
ٹھوڑے حصے تڑپ تڑپ کے مریض جہاں ہزار
ثلثت رنگ سے گل دیتے ہیں یہ صدا صدا
وہ عندیہ تھے ہم جن کے دم سے لطف چمن
جہاں میں آئے تھے ماہر تو تھی سبکدوشی
چلو، سدھارو، مبارک تمھیں گلہ دل کا،
باغ میں آ کے کوئی گل تو کھلا میں ہم تم
آؤ روتے ہوئے دل کو تو رلائیں ہم تم
آگ میں آگ چلو اور لگائیں ہم تم
تم بھی چلو شریک ہو کارِ ثواب میں
وہ کروٹیں فقط ترا بیمار لے گیا
جو درد دھتا وہ آپ کا بیمار لے گیا
خزاں نصیب چمن، ہم بہار لیکے چلے
چلے جاؤ گے تو رنگ بہار لیکے چلے
چلے تو سر پہ گستاہوں کا بار لیکے چلے

یہ حقیقتاً زبانِ دانی کا اہم شعبہ ہے۔ جتنا شاعر کو زبان پر اقتدار ہوگا اتنا ہی محاورات اُس کے یہاں زیادہ لطف سے نظم ہوں گے چنانچہ آہر کے یہاں یہ ذخیرہ بہت فراوان ہے۔ ملاحظہ ہو:-

محاورات

گھر اُن کے جا کے سنا یہ عوض میں خاطر کے
پتہ کو چڑھ دلدار کا ہے اسے قاصد
نفسیب اتوں میں کھلتے ہیں دیکھئے کس کے
تقاضا سن کا ہے لڑھپنے سے راہ چلو
منعمو عالم فانی میں خوشی ہے معدوم
سچ تو کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی میند آتی ہے
کرتے ہیں ہم کو ذبح جو وہ آستیں چڑھائے
راز دل کہتے ہو بیمار سے کچھ خیر تو ہے
بھرا ہوا اتنا بجانے یہ کب کا اسے گردوں
کہے نہ دل کی تو کیونکر نہ ہو گلہ دل کا
منہدی پاؤں کی نہ چھٹ جائے گی چلنے دو گام
سر اُٹھی کیا جو چلے آئے منہ اُٹھائے ہوئے
ہزاروں بیٹھے ہیں واں دھونیاں رٹے ہوئے
بڑھے ہیں قتل کو وہ آستیں چڑھائے ہوئے
ادایہ کہتی ہے چال اور بھی بنائے ہوئے
کان بجتے ہیں کہ نوبت کی صدا آتی ہے
شمع پر سو گئے پروانے تو کچھ دل ٹھہیرے
لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہے تاشائے عام ہے
نہ سہی غیر کوئی، حال مرا غیر تو ہے
برس پڑا مری تربت پہ جب سحاب آیا
کبھی تو منہ سے بھی پھوٹے کچھ آبلہ دل کا
آپ بھی پاس ہیں تربت بھی مری دور نہیں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شوکت الفاظ فارسی ترکیبوں ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ خیال شوکت الفاظ کیلئے صحیح نہیں ہے۔ خالص اردو الفاظ کے اجتماعی طور بھی شوکت کا باعث ہو سکتے ہیں،

بہر حال یہ امر ایک حد تک قابل تسلیم ہے کہ غزل میں شوکتِ الفاظ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ چیز قصیدہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ناسخ نے غزل میں اس خصوصیت کا بہت استعمال کیا جس کی وجہ سے اُن کی غزل کے شعر اکثر قصیدوں میں کھپائے جانے کے قابل ہیں۔ غزل میں شوکتِ الفاظ کسی کسی موقع پر اس حد تک مدوح ہے کہ شعر میں ایک تیکھاپن پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے محل کی شناخت شاعر کی سلاستِ طبع اور صحتِ ذوق پر مبنی ہے۔

مہر نے غزل میں اس جس کا استعمال بھی کے ساتھ کیا ہے۔ پھر بھی بعض اشعار میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:-

لگا اتنی تو آگ اے آتشِ فرقت سرا پا کو، سپند آسا اڑا دوں مجر دل سے سویرا کو
آفرین اے زور بازو، مرجا اے جذبِ عشق نے اڑا کنجِ قفس زور پر پرواز سے
تن خاک ہے تو زلیت کا کیا اعتبار ہے جو عضو ہے خبا رک نقش و نگار ہے
کہتا ہے اٹھ کے زور میں یہ دردِ دل مرا یا میں رہوں زمین پہ یا آسماں رہے
اودل جاننا ز رمیو با ادب شمشیر پر یہ وہ جادہ ہے جہاں سر بھی قدم نہ جائے گا
آپ دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں ایک خاص قوتِ مضمر ہے اور وہ ایک ایسے ہی محل پر ہے جہاں کمزور اندازِ معانی کی نوعیت کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے اندر گزشتہ صدی کے آخر تک فارسی زبان کا
فارسی ترکیبوں کا اعتدال اتنا رواج تھا کہ عام طور سے خط و کتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ
یہ ہے کہ اُن کے اُردو کلام میں فارسی ترکیبوں کا کثرت سے استعمال ہوا، اس سے کوئی شاعر مستثنیٰ نہیں ہے۔
میر تقی میر ایسا استاد جس کے یہاں صفائی و سادگی شاعرانہ اعجاز کے درجہ پر پہنچ گئی ہے وہ بھی اس طرح
کے اشعار ضرور کہہ گزرتا ہے:-

بنگامہ گرم کن جو دل نا صبور بھتا پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور بھتا،
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور بھتا،
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے مقدور نہ دیکھا کھو بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کار گہر شیشہ گرمی کا

پھر کسی اور کا کیا ذکر، غالب نے اپنے فطری ذوقِ فارسی کے غلبہ سے اس میں کچھ اضافہ کر دیا اور ایسے اشعار بھی کہہ لئے جن میں اگر روابطِ اُردو کے ہوں تو معلوم ہی نہیں کہ یہ شعر فارسی کا ہے یا اُردو کا۔ بہر حال اس سلسلہ میں اعتدال اس حد تک کہ اُردو زبان جس کی تحمل نہ ہو کسی طرح مدوح نہیں۔ مہر نے فارسی ترکیبوں کا جہاں تک استعمال کیا ہے

اُس میں اعتدال کا پہلو محفوظ رکھا ہے۔ اُن کی فارسی ترکیبیں طبیعت پر بار اور زباں پر گراں نہیں ہیں۔
 ہمراہ پوئے غنچہ کر دم بھی سیرِ باغ سب قفل کھل گئے ہیں طلسم بہار کے
 طلبِ بخشش ہر آشنا کا یار رہا صفائیِ بن کے مرے قلب میں غبارِ ادا
 مثالِ داؤدِ بارودِ روئے آتش ہوں، نہ ہوش اڑیں جو چمک درد کی اُٹھانہ کو
 برقِ آہِ غم سوزاں جو نکل کر چلی، دودِ دل بھی صفتِ ابر بہاراں نکلا
 سبب ہے کیفِ فلک کا مریِ عرقِ ریزی یہی شرابِ تھی مینائے آسماں کے لئے
 بھرا خونِ تال کے دامن میں جب بہارِ ریاض ادا ہو گیا،
 کیا محوطی ارض کوئی رہگزر میں ہے پیچیدگیِ غبارِ طریقِ سفر میں ہے
 ہمتِ مردانگیِ غم کے خشکجوں میں خموش جہتِ ریزی میں تارِ جب کھینچتا تھا بے آواز تھا
 گونہ کیجئے قدر تو ناقدرِ دانی آپ کی ہر ادا ہے ناز پر دردِ جوانی آپ کی

یہ ایک خاص طرزِ کلام ہے جس کے ساتھ معنی ذرا غور کرنے کے بعد واضح ہوں و موجودہ زمانہ
مشکل پسندی کے بہت سے تعلیمیافتہ اور روشن خیال لوگ اس جنسِ شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں:-

پاؤں اُٹھے رہے دامن سے طریقی غم میں ہاتھ ملے کر کے رہ چاک گریباں نکلا
 ضعف جب ساری مرا ہنگامِ بزم ساز تھا چنگ کا نالہ شکستِ رنگ کی آواز بھٹا
 ضعف میں جب طائرِ تصویر سے کچھ ساز تھا، رنگ کا تھمنا بدن پر مانعِ پرواز تھا
 ہجر میں سنتا کوئی کیونکر مریِ فریاد کو دودِ دل ہنگامِ نالہ سہمہ آواز بھٹا
 تصویرِ رنگِ دادہ ہوں دیکھو قدرِ دل روکے ہے دوڑتے ہوئے خوں کو وقارِ دل
 احسان نہ لے تو مثلِ ترا بھی کہیں نہیں اکیر ہے وہ خاک جو دامن نشیں نہیں،
 بقراری سببِ بستگیِ خاطر ہے، جب گرہ کھل گئی کچھ آنسوؤں کی دل ٹھہرے
 و جو ہجر جہاں ہے بقدرِ تاب و توان، بہت ہے یہ، جو کوئی دمِ حبابِ باقی ہے
 آتشِ قدم ہوں قیدِ عجب کا مقام ہے زنجیرِ اشکِ رنجِ مومِ خام ہے
 دشتِ وحشت میں شر اُڑتے تھے جب برق اُلجھی تھی مری زنجیر سے

طنز: اندازِ کلام ایک خاص صنفِ سخن ہے جو اگر صحیح طور پر صرن ہو جائے تو وجدان کو ایک خاص لطیف و
 طنز کیفیت بخشتا ہے۔ آہر کے کلام میں یہ بہت حسن کے ساتھ استعمال ہوا ہے:-

جلجائے دلِ زبان سے عاشقِ نہان کریں ارشادِ ناز کا ہے ادا کا پیام ہے

عشاق کو یہ شرع محبت کا حکم ہے گردن پہ ہو چھری تو تڑپنا حرام ہے
 نہ آتے آپ جو دم کو تو اور کیا ہوتا تڑپ تڑپ کے طبیعت سنبھل گئی ہوتی
 عشاق پاس آ کے یہ اُن کی بلا سنے ہے ہے، ہے، ہے دل کی۔ ہائے جگر کی پکار ہے
 جہر بان چین جبیں کو مری رہنے دیجئے کہیں مٹتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
 خاک جس طرح جلا کر کئے دل لوگوں نے ہم سے تو شمع بھی اس طرح جلائی نہ گئی
 اسی کو اور زیادہ مخفی انداز سے یوں کہا ہے :-

دل وہ تھے جن سے جلائی نہ گئی شمع کبھی اور جو بھولے سے جلائی تو بجھائی نہ گئی،
 نزع میں روتے ہو کیوں یاد کرو ہجر کے دن دل مرا آج بھی گھبرائے تو گھبرانے دو
 مجھ پہ قلعن تھے آیا ہے اب آئینہ کیوں دل جو تنہائی میں گھبرائے تو گھبرانے دو
 ہر روز سرفراز تو کرنا محال ہے اُس کو بھی کہنے عذر جو ہو گاہ گاہ میں
 میں ہی تو تھا سبب استراحت عالم مری ہی منید کے اڑنے سے سب کو خواب آیا
 ستگر دستم ایجا دیاں چلی جائیں نہ اٹھ رہے کوئی بیداد آسماں کے لئے
 رنگ الفت جو کوئی چیز نہیں، جانے دو اک کلی دل بھی ہے، مرجھائے تو مرجھانے دو
 ذکر بھیرن تو ہوتا ہے سنا کر مجھ کو خیر آنکھوں سے بھی دو اشک نکل جانے دو

کسی کیفیت یا حالت کا اس طرح اظہار کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور اُس کا تصور کامل دل میں پیدا ہو جائے ”محاکات“ ہے۔ اس کا مفہوم ”منظر کشی“ سے کسی حد تک وسیع ہے کیونکہ ”منظر کشی“ کا تعلق صرف حیات سے ہوتا ہے۔ آہر کے کلام میں محاکات کا جو ہر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو :-

ناز میں ہاتھ سے شکنوں کو مٹایا جلدی جب نشان وصل کے سمٹے ہوئے بستر میں رہے
 دم نکلتے ہوئے دیکھا تو کہا گھبرا کر ارے مجھ سے بھی تو کہدے کہ یہ کیا ہوتا ہے
 اس کو کیا کہتے ہیں یوں جاگ کے کاٹیں راتیں وصل کی شب جو ہوئی شام سے آرام کیا،
 کچھ بھی ہے اعتبار تمھارے مزاج کا آئے تو بے بلائے، بلایا تو ہٹ گئے
 چاک ہونے کا یہ وحشت نے کیا تھا غور ہاتھ سینہ تلک آیا کہ گریباں نکلا،
 پھر پھر کے آپ سو نگہ رہا ہوں میں اپنی بو بازو پہ سروہ رکھ کے جو لیٹے تھے خواب میں
 برہم تو میری دید سے ہیں اُٹ رہے بچپنا آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہیں حجاب میں
 تڑپوں میں وقت نزع نہ کیوں لیکے بچکیاں گھٹ گھٹ کے رو رہے ہیں مجھ وہ حجاب میں

سیدھی سی بات ایک نئے انداز میں کہی جائے جو خاص کیفیت و اثر پیدا کر دے۔ آہرگے
مذرتِ اسلوب یہاں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) تکمیلِ بربادی کی آرزو:-

نقش و نگار خاک سے صورتِ ناموں پھر آگے ہوا فن کو ترا انتظار ہے،
(۲) ملامتِ گروں کا شکوہ:-

شرر و برق کو روکے، نہ کوئی پارے کو میرے دم بھر کے تڑپ لینے میں کیا ہوتا ہے
کوئی آزرده ہے شمعوں سے شبنم سے تنگ اک مرے رونے میں کیا جانے کیا ہوتا ہے
(۳) دل گمشدہ کی یاد:-

خیالِ دل مجھے یادشِ نجسِ آتا ہے چراغِ جل کے مرے سامنے بجھانے کرے
(۴) ناوکِ قاتل کا استقبال:-

لے وہ پیکاں سرِ ناوکِ قاتل آیا پیشوائی کو بڑھائے آہ، مرا دل آیا،
(۵) منزلِ آخرت کی صعوبت:-

جانے والو سفرِ قبر کی سختی دیکھو بار جاں پھینک کے رہ رو سوئے منزلِ آیا
(۶) ابرو و شمشیر کی مشابہت:-

ابرو کی جنبشوں پہ جو چاہو وہ اب کہو، سیکھے ہوئے ادا مجھے تلواریں مار کے
(۷) حیاتِ بخشی کی آرزو:-

گریا د عادتیں ہوں تو شانِ ہلا دو تم کچھ سو رہے ہیں چین سے ہماں مزار کے
(۸) دفن:-

سب ل کے دفن خاک کے پتلوں کا دیکھ لیں خشکی میں ڈوبتے ہیں سینے غبار کے
(۹) تقاضائے وصل:-

انکار میرے گھر سے فقط سن کا ہے سبب دل میں اگر رہے تو مری جاں کہاں رہے
(۱۰) جوابِ دہی سے معذوری:-

جوابِ دوں تجھے اے عیب پوش بھڑ میں کیا گنہ کی طرح سے گھیرے ہیں اہلِ محشر بھی
(۱۱) خواہشِ دیدار:-

اَلتَوَلَقَابُ مِنْہ سے دکھا بھی چکو جمال ایمان ہو کہ لوگ کہیں تم حسین نہیں

جذبات کی تحلیل شاعری کی ”کارگاہ شیشہ گری“ میں یہ کام بڑا نازک ہے۔ اس کے لئے صحیح فطرت کی نباضی کی ضرورت ہے۔ آہر اکثر اس مرحلہ میں کامیاب ہوئے ہیں۔

سب اسیرانِ قفس دیکھ کے رہ جاتے ہیں ساتھ والوں سے اگر کوئی رہا ہوتا ہے
آئینہ لیکر میں اُن کے ہاتھ سے نادم یہ ہوں ایسی ہی کوئی ادا تھی جس پہ اُن کو ناز تھا
میں سمجھتا ہوں کہ آہر کی کائنات شاعری میں ایک ہی شعر ناز کے لئے کافی ہے۔

میرے آگے تیلیاں توڑیں نہ قیدی قفس زور بازو پر کبھی مجھ کو بھی اپنے ناز تھا
دوستوں نے بھر کے آہ سرد میری جان لی شمع کے پروانے بھی دشمن تھے صرصر کی طرح
صیاد کی تسلیوں کا اعتبار کیا، کھڑکی کھلے قفل کی تو سمجھیں کہ ہاں چلے،
حیات کی اجتماعی صورت اس طرح قلم ہو جائے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر بھرنے لگے۔

منظر کشی پچھلے سے مست بیٹھے ہیں اس انتظار میں بھولے شفق تو جام مے ارغواں چلے
یہ شکل اُن کی دم صبح شام وصلت ہے نگاہ نیچی ہے، بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
دہی ہیں میرے جنازہ پر آج آئے ہوئے ادھر جو دیکھتے ہیں منہ اُدھر پھرائے ہوئے
سب کے ہمراہ جھکے دیکھ رہے ہیں وہ بھی جان کا میری نکلنا بھی تماش کیا ہے
رندان بادہ کش نے کھولے قبا کے بند پنکھے چلے جہاں میں جو ابر بہار کے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں
لڑ بھڑکے کس سے سوئے ہیں کس سے بگاڑ ہے کون اُن کی لے رہا ہے بلائیں خبر نہیں

حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری یہ چیز غزل کے اصل مفہوم سے تو خارج ہے مگر اساتذہ نے اصطلاحی غزل کے ذیل میں اس کی جگہ نکال کر شاعری کو کارآمد

بنادیا ہے۔ آہر کے یہاں تشبیہات و استعارات کے ماتحت اور کائناتِ عالم سے نتیجہ اخذ کرنے کے ذیل میں جسے میں آہر کا مخصوص رنگ سمجھتا ہوں اور جس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ موعظہ و نصیحت اور اخلاق کا ذخیرہ بڑی کثرت کے ساتھ ہے مگر میں اس مقام پر خالص وہ اشعار پیش کروں گا جن میں براہِ راست یہی ہے اور کچھ نہیں، اس سے آپ کو خود آہر کے طبعی رجحان اور اخلاقی میلانات کا پتہ بھی لگے گا۔ فرماتے ہیں:-

کان رکھ کر نہ کبھی میں نے سنی بات اُس کی آدمیت سے جو خارج کوئی انسان دیکھا
منعموں کے گھر بنانے کا تجربہ یہ ہوا آپ سوئے کنج مرقد میں عمارت رہ گئی
انہی باتوں پہ ہے آہر تجھے مطلب کی طلب منہ سے مانگا تو دل آگاہ دعا سے نہ ہوا

جس کو ہنگام دعا شغل نظر بازی رہا چشم بنگر قفل درہائے اجابت رہ گئی
 فاش پایا جبکہ راز عسرت ارباب فقر پردہ رکھ لینے کو دنیا میں قناعت رہ گئی
 اپنا ثبات بحر جہاں میں نہ جان تو ممتا ہے جلد نقش جو آب رواں میں ہے
 دیکھے کچھ اس پیشکش کو کرے او منعم قبول آبروسی چیز کشتی کھٹ سایل میں ہے
 نہ دیکھو گر تو ہوں کم ظرف مثل جام جم بیشک اگر دیکھو تو گنجائش ہے مجھ میں ایک عالم کی
 فقیری قناعت کا باعث ہوئی بری بھی تو اچھی بسر ہو گئی
 ہے آبرو کی طلب گر تو کو ہنر حاصل بقائے بوسہ تو قدر گلاب باقی ہے
 نہ فیض پایگا اس خاک داں سے او غافل سراب پر تجھے امید آب باقی ہے
 نہ تن کے دیکھ ہر اک بار حسن کو غافل یہ آب ذاب بدن تا شباب باقی ہے
 جھک کے چل مآثر ہر اک سے رہ گزار دہریں کھائی ہے ٹھوکر انھوں نے جو اٹھا کر سر چلے

ع۔ن

(باقی)

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ :- اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ
 میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد ۱۰
 مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت
 سے سنبھلی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام
 کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۱۰
 میدان عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب فنی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری
 ہے۔ قیمت مجلد ۱۰
 بیوہ :- فنی پریم چند انجھاتی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمنائے بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو
 کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ۷

مینجر نگار لکھنؤ

اس کے بعد میں نے موجودہ جمہوری ریاستوں کے نظام (Constitution) پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسی سے معترض کو غلط فہمی ہو گئی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ امریکہ انگلستان یا فرانس کی حکومتوں کو میں جمہوریت کا معیار قرار دے رہا ہوں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے جمہوریت کے کھوکھلے پن کو دکھایا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات نفس جمہوریت پر کئے جا رہے ہیں یا ان ریاستوں پر جو اپنے جمہوری ہونے کے مدعی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوری اصول پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جمہوری حکومتوں ہی پر شکستہ چینی کی گئی ہوگی، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی جبکہ میں خود لکھ چکا تھا کہ حقیقتاً امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آتے ہیں اگر امریکہ میں دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات کا بت لوگوں سے اب تک سجدہ عبودیت و مصلحت

کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مادہ تنقید اجتماعیات کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قائم ہو جائے۔ جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے اور گارنٹر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے، معاشرتی اصلاح بھی ہے اور مذہبی تخیل بھی۔

اس کے بعد معترض نے چند تنقیدات قائم کر کے ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تنقیدات اور ان کے جواب اسی قسم کے ہیں جو حامیان اشتراکیت کی لوگ زبان رہا کرتے ہیں اور جو عموماً سطحی ہوتے ہیں کیونکہ ننانوے فی صدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے ہوئے معلمانہ انداز گفتگو اختیار کر لیتے ہیں۔

موجودہ نظام معاشرت کی خامیوں سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کی نا انصافیوں کی کون حمایت کرے گا؟ اسی لئے سرمایہ داروں اور طبقہ امرا کے مظالم پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کے جذبات اس طرح ابھرتے ہیں کہ غور و فکر کی صلاحیت بالکل محضت ہو جاتی ہے اور بغیر سوچے ہوئے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت قابل عمل بھی ہے یا نہیں، یہ حضرات اسی طرف مایل ہو جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر جب کوئی چیز مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے معائب پر نظر کم پڑتی ہے۔ اسی بنا پر اگر میں یہ کہوں کہ اشتراکیت سے اکثر اشتراکی خود نابلدی میں تو اسے مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ مارکس اور انجل کے نام تو اشتراکیوں کے زبان پر ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو مارکس کو سمجھ سکتے ہوں؟ بہت سے تو ایسے ملیں گے جو مارکس کی تصانیف سے بھی ناواقف ہوں گے۔

موجودہ دور کی اشتراکیت تمام و کمال معاشیات کے نظریوں پر قائم ہے (موجودہ دور کی تخصیص سے اشتراکی متعجب نہ ہوں۔ اس شریعت کا پیغمبر مرٹن مارکس ہی نہیں۔ بلکہ اس کے قبل بیسیوں اور بھی گزر چکے ہیں، چنانچہ خود افلاطون بہت بڑا اشتمالی تھا) لیکن ان بزرگم خود ہمہ دال اشتراکیوں کو اس خارزار میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

روس کی کامیابیوں کو اشتراکیت کی کامیابی بتانا بھی ہمارے ایسے ہی مداحان اشتراکیت کا کام ہے۔ شاید ان حضرات کو خبر نہیں کہ جس روزنٹن نے وہاں (New Economic Policy) کا نفاذ کیا، اسی روز اشتراکیت کی بنیادیں ہل گئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ اسٹیلن کی موجودہ پالیسی کو کس قسم کی اشتراکیت کہیں گے۔ میری مراد سیاسی نہیں بلکہ اس کی اقتصادی پالیسی سے ہے جو میں سال کی طویل کوششوں کے بعد اسٹیلن نے اعتراف شکست کے طور پر پیش کی ہے اور جس میں ذاتی جائیداد و اطلاق رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے؟ تجارت کرنے اور کارخانے قائم کرنے کے لئے بھی عوام کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

روس کی ترقیوں کا میں منکر نہیں ہوں اور نہ اس کے کارناموں کو میں جھٹلاتا چاہتا ہوں۔ میری تو عرض تھی

ہے کہ اس کار ازد اشتراکیت میں پنہاں ہے اور نہ بولشوزم میں۔ بلکہ لنین اور اسٹالین کی اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں میں، اور روس کی نیم وحشی آبادی میں۔

اسے روس کی خوش نصیبی کہنے کے لئے لنین اور اسٹالین ایسے رہبر مل گئے اور یہ ان دونوں کی خوش بختی تھی کہ انھیں تختہ مشق بنانے کے لئے ایسا ملک ہاتھ آگیا جو مطلق العنانی کی ہر صدا پر لبیک کہنے کے لئے پستہا پستہ سے عادی تھا۔ روس کی یہ نئی کاپیڈٹ اشتراکیوں کے لئے واحد معجزہ ہو تو ہو۔ لیکن تاریخ اسی روس میں ایسے ہی دو اور معجزوں کا پتہ دیتی ہے۔ ایک ۱۹۱۷ء میں جبکہ (Kademya) نے خود بھی مسیحیت قبول کی اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دوسری مثال تو بہت حال کی ہے یعنی بڑے اعظم کے اصلاحات۔ کیا تاریخ روس کے یہ دونوں واقعات انقلاب سے کم درجہ رکھتے ہیں؟ اور کیا ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی طرح عوام ان پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں کئے گئے تھے؟

بیرونی دنیا کے لئے انقلاب روس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے، خاندان آدم کا وہ طبقہ جو اب تک کچلا جا رہا تھا اس پر تلا ہوا نظراً ہاتھ آکر اپنے حقوق منوا کر رہے گا۔ جنگ عظیم کا نشتر خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچا سکتا۔ پر بھی بالکل رائیگاں نہ لگایا اور بہترے ملکوں سے صدیوں کے منجمد مواد فاسد کو نکال دینے میں کامیاب ہوا۔ اقوام عالم خواب غفلت سے آگھم پتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور حصول مقصد کے لئے بسوں نے الگ الگ لایو عمل مقرر کیا۔ چین۔ جاپان۔ روس۔ ایران۔ ترکی۔ اٹلی وغیرہ وغیرہ بسوں نے اپنے حیات نو کے لئے علیحدہ علیحدہ اور نئی نئی خریعتیں ایجاد و اختیار کیں۔ اس میں کون کا کامیاب رہا اور کون کامیاب اس کا فیصلہ آنے والے مورخین کریں گے۔ میں تو اسے صرف اتفاق ہی کہوں گا کہ روس میں کرنسکی حکومت (Kerensky) کو اپنی اندرونی نا اتفاقیوں کی باعث، لنین کے ہاتھوں شکست ہوئی اور روس کی ساری ترقیوں اور کامیابیوں کا سہرا لنین کے سر رہا، کیونکہ انقلاب روس کے بعد خواہ کوئی بھی حکومت ہوتی اس کی ترقی کی داستان وہی ہوتی جو آج ہے۔ اور اگر نہیں تو ہمارے اشتراکی حضرات ایران۔ ترکی۔ اٹلی۔ جاپان کی کامیابیوں کے لئے کونسی تاویل پیش کرتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اسکا جواب اشتراکی یہی دیں گے کہ ”روس کے دوش بدوش دوسرے ممالک کو کھڑا کرنا عین حماقت اور جہالت ہے کیونکہ روس اور ان ممالک کی حکومتوں میں ”چند اصولی اختلافات ہیں“ ان کے یہاں ریاست ہی سب کچھ ہے۔ روس کے یہاں ریاست کوئی چیز نہیں۔ وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ کے لفظ لایعنی نہیں ہیں، وہاں طبقوں کی بلندی اور پستی متعین چیز ہے، لیکن روس میں نہیں۔ الغرض دونوں میں اصولی اختلافات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک اصول وضع کرنے کا تعلق ہے میں گیا، ہر شخص انھیں بے تامل قبول کر لگا۔ لیکن یہاں بحث اصول سے نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے سے ہے۔ اعتراضات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان

اُصول میں کچھ تو قطعی ناقابلِ عمل ہیں اور بعض ایسے میں جنہیں قابلِ عمل تو کہا جاسکتا ہے، لیکن درحقیقت ان پر عمل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا اُصول کی حقیقت نمبر وار ملاحظہ ہوں:-

نمبر ۱۔ دوسری حکومتیں انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں قبول کرتیں، کہ کبھی انسان اس منزل تک پہنچ سکتا ہے، جب اسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے برعکس کارل مارکس کا خیال تھا کہ ضرورت اور افلاس ہی ام الخبائث ہے خواہ افراد ہوں یا اقوام دونوں کے ارتکابِ جرم کی باعث یہی ضرورت ہوا کرتی ہے اگر ضرورت یعنی افلاس کا خاتمہ کر دیا جائے تو دنیا کو نہ پولیس کی حاجت رہ جائے گی اور نہ فوج کی اور چونکہ اشتیاقیت اسی افلاس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا ذمہ لیتی ہے اس لئے کوئی دوجہ نہیں کہ ریاست کا آلہ جبر و احتساب مضبوط ہو کر نہ بجائے۔ چونکہ روس بھی صحیفہ کارل مارکس کا پیر دیے، اس لئے وہ بھی مدعی ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس معراج تک پہنچ جائے گا۔ بفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مارکس کا یہ ہوائی قلعہ عملی جامہ پہن بھی سکتا ہے تو اس کے لئے سب سے فردوسی شرط یہ ہے کہ ساری دنیا مارکس کی پیروی ہو جائے اور ایک دفعہ روس (Rouss) کی ذہنی (Mental) مصلحت کا تمام روئے زمین پر ساری و طاری ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لیٹن نے ساری دنیا کو اشتیاقی بنادینے کی کوشش کی تھی اور ایک کامیاب انقلابِ عالم کا خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ لیکن بہت جلد اس تجویز کی حماقت اس پر ظاہر ہو گئی اور اُسے کنارہ کش ہو جانا پڑا لیکن بطور ایڈیل یہ اُصول اب بھی روس میں موجود ہے۔ اور اشتیاقی کم از کم اس کا خواب ضرور دیکھ لیا کرتے ہیں۔

نمبر ۲۔ بلند و پست کی تفریق غیر فطری ہے اس کو فنا کر کے سبھوں کو مساوی حقوق دینا چاہئے۔ غیر اشتراکی دنیا اب بھی اس پر مصر ہے کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے بلند و پست کی تفریق نہیں مٹائی جاسکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کل کا اعلیٰ طبقہ آج ادنیٰ ہو گیا۔ اسی طرح آج کا ادنیٰ کل اعلیٰ ہو جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ سب ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دئے جائیں۔ خود روس میں کیا ہوا؟ یہ تو درست ہے کہ ناز کے وقت کی اشتراقییت اب وہاں باقی نہیں ہے۔ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس کی جگہ ایک دوسری ذرا پست درجہ کی اشتراقییت پیدا نہیں ہو گئی۔ آپ لاکھ انسانیت پرست بن جائیں لیکن پست کاموں سے جو ذہنی پستی پیدا ہو جاتی ہے اُسے کیسے دور کر دیں گے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور، انجنوں میں کوئلہ جھونکنے والا انسان، یا صحرائے گوی میں جانوروں کا گلہ بان، اسی قسم کی زندگی بسر کرنے لگ جائے گا جیسا کہ مابعد الطبیعات کا ایک معلم سائنس کا سرچ سکا کر یا کیمسٹ پارتی کا جنرل سکریٹری بسر کرتا ہے۔ عموماً اشتراکیت پسند جماعت اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ یہ کون کتنا ہے۔ ہمارے تشریفِ تصرفِ دولتی کا سوال ہے۔ اشتراکیت کا مقصد تو صرف اکثریت کو افلاس اور فاقوں سے بچانا ہے۔ پھر چھوٹا افلاس نام ہے ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی کا اور امارت نام ہے لوازمِ زندگی کا بے افراط پائے جانے کا، اس لئے اشتراکیت

انہیں دونوں میں توازن پیدا کر دینا چاہتی ہے۔

اگر اشتراکیت صرف اتنے ہی کے لئے کوشاں ہے۔ تو بادب گزارش ہے کہ دوسری ریاستوں کو تو چھوڑیے خود جرمنی اور اٹلی میں بھی کچھ ہو رہا ہے وہاں بھی ذاتی جاہداد اور املاک پر اگر کلیتاً نہیں تو کافی حد تک ریاست کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ساہوکار اور کارخانوں کے مالکوں پر بہت کچھ پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں (Labour

regulation) کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور عیالات کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے حصول کے ذریعے ہیں اور جب زمانہ کی رفتار کا یہ نسخہ ہو اور ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظام سرمایہ داری پر اشتراکیت کی اکثر نکتہ چینیوں قابل قدر ہیں۔ لیکن انقلاب روس اور سوویت نظام حکومت کے بغیر بھی یہ خامیاں ظاہر ہو کر رہیں کیونکہ آزاد سرمایہ داری کی تباہ کاریاں ایسی دیکھیں کہ چپائے چھپ جاتیں۔

نمبر ۳۔ غیر روسی اشتراکی اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جمہوریت روس ہی میں ہے کیونکہ دوسری ریاستوں کی طرح یہاں کی حکومت سرمایہ داروں کی دست نگر نہیں ہے بلکہ حکومت پر سوویت کو اقتدار کئی حاصل ہے نیز غیر مالک کی طرح یہاں حکومت کی مشین ادھر سے نیچے نہیں آتی بلکہ نیچے سے اوپر جاتی ہے۔ یہاں کے *مجلس سہ* (پنجایت۔ یونین بورڈ۔ لوکل بورڈ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ) سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے فرائض بھی انہیں جیسے ہیں۔ رہا توں، قصیوں، کارخانوں، چھوٹے شہروں سے سوویٹس کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کے اوپر ضلع اور صوبہ کے سوویٹس ہوتے ہیں اور صوبوں کے اوپر کونسل آف سوویٹس

(Council of Soviets) قائم ہے۔ یہی یہاں کی مجلس قانون ساز ہے۔ اور ملک کی کینیٹ (The Council of Peoples Commissars) کا بھی یہی انتخاب کرتی ہے سوویٹس کے ممبروں کا انتخاب الکشن کے مروجہ قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ سویت کا صدر عام ٹینگ میں امیدواروں کے نام پیش کرتا ہے۔ ان کی موافقت میں تقریریں ہوتی ہیں۔ حکومت کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں حاضرین سے ہاتھ اٹھا کر ممبروں کے انتخاب ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ عوام الناس کے انبواؤ اور کو بڑھانے کی دوسری قابل ذکر چیز اجتماعیت ہے (Collectivization) ہے جس کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اندرونی انتظامات بالخصوص کارخانوں اور کاشتکاری کا نظم و نسق یہاں اسی کے ذمہ ہے سمجھنے کے لئے اسے (Board of Directors) کہ لیجئے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ یہاں ممبران تمام وکمال کارخانے کے مزدوروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور کارخانہ کے نفع و نقصان سے انہیں بحث نہیں

ہوتی۔ ان کا کام صرف انتظام کی دیکھ بھال ہے اور جہاں تک اپنے مخصوص کارخانے کا تعلق ہے وہ *Trade Union* کی خدمت بھی یہی انجام دیتے ہیں اور اس طرح سودیٹ پر بھی ان کا کافی اثر رہتا ہے۔

یہاں میں نے محض ایک ہلک سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ حقیقت کو بے نقاب کروں پہلے سودیٹ کے طریقہ انتخاب پر بھی ایک بے لاگ نظر ڈال لیجئے۔ پہلی قابل ملاحظہ بات یہ ہے کہ ممبروں کے انتخاب کا حق صرف مزدور کسان اور فوج کو حاصل ہے دوسرے طبقوں سے قطع نظر اس کو بھی ایک حد تک (*Adult Suffrage*) کہہ سکتے ہیں لیکن تا وقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت

کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح ”حکومت اور انتخاب“ کے معنی سمجھ سکے عام رائے دہندگی کا حق لایعنی یہی بات ہے۔ چنانچہ تل نے کہا تھا۔ ”عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے۔“ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت کسی امیدوار کا نام پیش کر کے ایک جادو بیان مقرر حاضرین کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے تو غیر ارادی طور پر بھی اس کی حمایت میں ہاتھ اٹھ ہی جاتے ہیں۔ مزید براں ووٹ برسر عام لئے جاتے ہیں۔ امیدوار حکومت کا منتخب آدمی ہوتا ہے اور انتخاب کرنے والوں میں بھی ایک جماعت حکومت کی حمایتی ہوتی ہے جو ہر ممکن پروپیگنڈے سے کام لیتی ہے۔ نیم خواندہ یا جاہل عوام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ماقبل اور پڑھے لکھے تک اس ماحول اور ایسی فضا میں حق و ناحق میں تمیز نہیں کر سکتے اور (*Mass Psychology*) کے غلبہ میں آ ہی جاتے ہیں لیکن ہے کہ کچھ غیر معمولی فہم و فراست کے لوگ اس طوفان بدتمیزی میں بھی اپنے ہوش و حواس درست رکھ سکیں، پھر بھی حکومت کے خلاف کب آواز بلند کر سکیں گے؟ اور اگر بغرض محال یہ بھی مان لیا جائے تو پھر وہاں ان کی نینا کون؟ یہ اصولی اعتراض تھا لیکن درحقیقت روس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ کہنے کے لئے تو حکومت سودیٹس کے قبضہ

میں ہے اور سودیٹس پر ”کلکٹو“ قابض ہیں۔ لیکن واقعات وہاں (*Communist Party*) مطلق العنانی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ روس میں اسٹالین کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ اسے روسی حکومت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ وہ محض کیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری ہے۔ پھر پارٹی کے مجبوران کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اتنے منظم ہیں کہ کلکٹو اور سودیٹ میں ان کے سوا دوسرے کی رسائی نہیں ہوتی پھر بات بھی نہیں کہ صرف ان کی تنظیم یا بے لوث خدمت قوم انہیں برسر اقتدار رکھے ہوئے ہے، بلکہ اس پارٹی کی قوت کا دار روس کی خفیہ پولیس یعنی (*O.G.P.U.*) میں پوشیدہ ہے۔ جس کے مظالم کی داستان لیول کے ہیٹلرک افسانوں سے کم روح فرسا نہیں، حکومت یعنی پارٹی کے خلاف کسی کی مجال نہیں کہ اشارہ کبھی کچھ کر سکے۔ روسی قتل عام کی داستانوں سے کون واقف نہیں؟ ملک میں اخبارات بھی ہیں۔ جلسے بھی ہوتے ہیں۔ تجزیوں بھی پاس کی جاتی ہیں، لیکن ہر کوئی یہ ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ روس میں عوام

کی زندگی و بال جان ہو گئی ہے ملک اس قید و بند کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ روسی صدیوں سے اسی قسم کی زندگی کے عادی ہیں۔ زار کے زمانہ میں بھی حکومت کے خلاف لب کشائی ناممکن تھی، اسی وقت بھی شاہی پولیس کے مظالم کچھ کم نہ تھے اور دوسری قسم کی پابندیاں بھی آج کی پابندیوں سے کہیں زیادہ تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس کے لئے زار کی حکومت کے مقابلہ میں بولشویک حکومت ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔

اب روس کی اس کمیونسٹ پارٹی کا جرمنی کے نازی اور اٹلی کی فاسسٹ پارٹی اور ان کا حکومت پر جو اقتدار ہے اس سے مقابلہ کیجئے تو یہ تمیز بھی دشوار ہو جائے گی کہ کون کس کا چہرہ ہے۔

یہاں میں نے صرف تین ہی اصول سے بحث کی ہے۔ لیکن انھیں اصول گویا ہے جو اشتراکیوں کے لئے مایہ ناز ہیں۔ بہر حال میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہو سکتی۔

گلاب چند

چند سیاسی کتابیں

جوید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے قیمت ۲ روپیہ خفیس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی۔ سی کمار پالتا صاحب - قیمت ۲

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے قیمت ۴ شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے قیمت ۴ ہندوستان میں برطانوی حکومت :- انڈیا کنٹریں العابدین صاحب یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لٹا جا رہا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے۔ جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اصلاحی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸

مینجر نگار لکھنؤ

سمندروں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ کبھی وہ خشک ہو سکتے ہیں بالکل جہل ہے، بعض کا خیال ہے کہ سمندروں کا جتنا پانی بھرا ہوا ہے، اتنا انھیں واپس نہیں ملتا۔ بعض کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ سمندروں کے پانی کے دباؤ سے کسی وقت زمین کا شق ہو جانا بھی ممکن ہے۔ ایک امریکن ماہر کا بیان ہے کہ ان بلورات کے لئے جو سمندروں کی تہ میں بنتے رہتے ہیں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنا پانی ان میں ہر سال ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سمندر کا پانی ہر سال دس اینچ کم ہو رہا ہے اور اس طرح گویا بارہ ہزار سال میں اسے خشک ہو جانا چاہئے، لیکن آسٹریا کے ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ سمندروں کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، اس لئے یہ خیال کہ کسی وقت سمندر خشک ہو جائیں گے بالکل بے معنی ہے۔

کرہ ارض کے پانی کی تقسیم جغرافیہ دانوں نے مختلف سمندروں کے نام سے کی ہے۔ تین بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں بحرِ ہند، بحرِ اٹلانٹک، بحرِ ہند۔ بعض نے قطبین کے حصہ آب کے بھی علیحدہ نام رکھے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ ہیں انھیں تینوں سمندروں کے حصے۔

ان سمندروں میں بحرِ ہند سب سے بڑا اور بہت زیادہ گہرا سمندر ہے۔ شمالاً جنوباً ۳۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے اور شرقاً غرباً ۱۰۰۰ میل تک۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۰۰۰ فٹ سے کچھ زیادہ ہے۔ سواحل جنوبی امریکہ کی طرف اس کی گہرائی ۱۸ ہزار سے ۲۵ ہزار فٹ تک دریافت ہوئی ہے اور جزائر فلپائن کے پاس ۳۵ ہزار فٹ تک۔ یعنی اگر اوریوسٹ کی چوٹی جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے اس حصہ آب میں ڈال دی جائے اور اس کے اوپر برطانیہ کا سب سے اونچا پہاڑ، بن ٹوس (Ben Nevis) اٹھا کر رکھ دیا جائے، تو بھی دو ہزار فٹ پانی ان کے اوپر نظر آئے گا۔ نیوزیلیئنڈ کے شمال مشرق اور جزیرہ گوام (Guam) کے قریب بھی جو جزائر فلپائن کے پاس ہے ۳۱ ہزار فٹ تک گہرائی دریافت کی گئی ہے۔

بحرِ ہند کا بچا سواحل حصہ ایسا ہے جو ۲۳ ہزار فٹ سے زیادہ گہرا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ ۱۶ اور ۲۰ ہزار فٹ کے درمیان گہرا ہے۔

ایک مسافر جو شمالی افریقہ سے ہندوستان کی طرف سفر کرتا ہے، وہ بحرِ ہند میں اکثر یہ نظارہ دیکھتا ہے کہ رنگین روشنیاں پانی کی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب برشگالی ہوائیں سمندر میں توجہ پیدا کر دیتی ہیں اور بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگتی ہیں تو آفتاب کی روشنی ان میں یہ گل کھلاتی رہتی ہیں۔

بحرِ ہند کی گہرائی کا اوسط ۳۵ ہزار فٹ ہے گویا بحرِ اٹلانٹک کی گہرائی کے اوسط سے ۲۰ فٹ زیادہ۔ چھوٹے سمندروں میں آرکٹک کی گہرائی کا اوسط سب سے کم ہے یعنی ۳ ہزار فٹ بحرِ روم کی گہرائی کا اوسط ۱۵ ہزار فٹ زیادہ ہے۔

سب سے چھپلا پانی خلیج فارس کا ہے یعنی اوسطاً ۴۴ فٹ۔ بالٹک کا پانی اس سے دو چند گہرا ہے اور انگلش چینل (نہر انگلستان) اس سے بھی کچھ زیادہ یعنی اوسطاً ۹۲ فٹ۔ بحیرہ شمالی (North Sea) البتہ نسبتاً گہرا ہے اور اس کی گہرائی کا اوسط ۳۱۲ فٹ ہے۔

جس طرح ہم کو زمین پر پہاڑ اور وادیاں وغیرہ نظر آتی ہیں، اسی طرح سمندر کے اندر بھی موجود ہیں بعض مقامات پر سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اوپر نکل آئی ہیں اور انھیں کا نام جزائر ہے، چنانچہ جزائر گلابرگس (Cape of Good Hope) جو جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی طرف پائے جاتے ہیں، اس سلسلہ کوہ کی چوٹیاں ہیں جو آبائے پناہ سے جنوب مشرق کی طرف پانی کے اندر ہی اندر چلا گیا ہے۔

مغربی بحرِ پسنک میں بکثرت جزائر پائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں شمالی اٹلانٹک میں ایک سلسلہ کوہ ۳۰۰ فٹ کی گہرائی میں اندر ہی اندر چلا گیا ہے جو اسکاٹ لینڈ کو آئس لینڈ سے ملاتا ہے۔ الغرض اسی طرح کے بہت سے سلسلے پہاڑوں کے پانی کے اندر پائے جاتے ہیں، شمالی اٹلانٹک میں سلسلہ کوہستان بہ نسبت وسط اٹلانٹک کے کم پایا جاتا ہے، جہاں بعض پہاڑوں کا سلسلہ ۷۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے۔

بحر ہند میں سمندر کے مغرب اور جاپان کے جنوب میں ایک متوازن سلسلہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نہایت عجیب غریب پایا جاتا ہے۔ پہلے ایک وادی مابین جزائر سماترا و تھائی پائی جاتی ہے جو اورار جاوا بارہ ہزار فٹ گہری ہے اور اسی کے متوازی ایک سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسری وادی بالکل متوازی ۲۱ ہزار فٹ کی لمبی ہے اور پھر ایک سلسلہ کوہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔

سمندر کی سطح کبھی ساکن نہیں ہوتی اور اس کا پانی ہمیشہ مد و جزر میں رہتا ہے، اسی لئے اس کا درجہ حرارت بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک نہیں رہتا۔ دن میں ہوا کے ٹپھر کچر کے مقابلہ میں اس کا ٹپھر کچر ایک ڈگری زیادہ رہتا ہے اور رات کو ڈیڑھ ڈگری گرم۔

سمندر کا پانی اپنی حرارت بالکل سورج سے حاصل کرتا ہے گو تھوڑی مقدار حرارت کی اندرون زمین سے بھی اسے پہنچتی رہتی ہے۔ سورج کی گرمی کس گہرائی تک اپنا کام کرتی ہیں اور وہ کس مقدار کی حرارت پانی میں پیدا کر سکتی ہیں، اس کا صحیح علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا، لیکن ایک بار تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ ایک صاف روشن دن میں جبکہ ہوا نہ تھی، ۶۵ فٹ کی گہرائی میں بحرِ روم کی پانی بہ نسبت سطح کے ۱ ڈگری زیادہ گرم تھا۔

سطح آب سے لیکر بارہ ہزار فٹ کی گہرائی تک سمندروں کا ٹپھر کچر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کے نتائج ایسے نہیں جن کی بنا پر کوئی کلیہ قائم ہو سکے۔ خط استوا پر واقع ہونے والا حصہ آب اور خط استوا سے

ادھر اُدھر ہٹے ہوئے حصہ میں سورج کی گرمی کا اثر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی کیسانیت نہیں ہو اور مختلف موسموں میں اتنی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اس کی بنا پر کوئی اصول نہیں متعین کیا جاسکتا۔

گرمی کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ گرم حصہ آبِ خلیج فارس ہے جس کا ٹمپرچر اس زمانہ میں ۹۶ ڈگری رہتا ہے بحرِ احمر (Red Sea) بھی تقریباً اتنا ہی گرم رہتا ہے، یعنی ۹۴ ڈگری۔ خلیجِ بنگال اور اسی طرح خطِ استوا پر واقع ہونے والے بحرِ ہند کے اور حصوں میں بھی بارش سے پہلے درجہ حرارت ۸۶ تک پہنچ جاتا ہے۔ جاپان کے شمالی مشرقی حصہ آب کا ٹمپرچر بہت بدلتا رہتا ہے یعنی جب کم ہوتا ہے تو ۲ ڈگری تک گر جاتا ہے اور بڑھتا ہے تو ۸۳ تک پہنچ جاتا ہے، اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہاں زمین کے اندر سے کبھی گرم چشے اُبلتے ہیں اور کبھی سرد۔

سمندروں کے ٹمپرچر پر مقدارِ نمک کا اثر ہوتا ہے، یعنی جس حصہ آب میں جتنا زیادہ نمک پایا جائے گا، اتنا ہی زیادہ سرد ہوگا۔

سمندر کا پانی خالص پانی نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سی اور چیزیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ اس وقت تک دنیا میں ۹۰ عناصر دریافت ہوئے ہیں جن میں تیس سمندروں کے پانی میں ملتے ہیں، یہاں تک کہ سونا اور چاندی بھی پانی میں موجود ہے، لیکن اتنی کم مقدار میں کہ اس سے کوئی تجارتی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نمک اور نمک والے عناصر البتہ اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بحرِ اطلانتک سب سے زیادہ نمکین سمندر ہے، اس کے بعد بحرِ ہند کا نمبر ہے۔ خطِ استوا پر واقع ہونے والے حصوں میں نمک زیادہ پایا جاتا ہے اور قطبین کے حصوں میں سب سے کم۔ خلیجِ فن لینڈ اور بوٹھنیا کا پانی نسبتاً بہت صاف ہے۔ سمندروں کے پانی کا نمک نکال کر اس کو پینے کے قابل بنانا آسان ہے۔ اس کا طریقہ قدیم سیاحوں کو بھی معلوم تھا اور اب تو خیر یہ عام بات ہو گئی ہے۔

سمندر کے پانی کو گہرے نیلے رنگ کا کہتے ہیں جو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن شاید حقیقت یہ نہیں ہے، آپ اگر بلندی سے اسکو دیکھیں تو چھپچھلا پانی سبز نظر آئے گا، جس کا سبب یہ ہے کہ اس میں ریت ملی رہتی ہے۔ گہرے حصوں میں بھی بعض جگہ رنگ سبز نظر آتا ہے، جس کا سبب ان بیشمار گیروں کا ہندسہ ہے جو چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی غذا کے لئے قدرت نے سمندروں میں پیدا کئے ہیں۔ شمالی اٹلانٹک اور بحرِ ہند و بحرِ پاسفک کے منطقہ معتدلہ میں پانی کا رنگ عام طور پر واقعی نیلا نظر آتا ہے، لیکن جتنا آپ قطب شمالی کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ سبز ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بحیرہ شمالی کا پانی خالص سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ بحرِ روم کا نیلگوں رنگ بہت مشہور ہے، لیکن صرف مشرقی حصہ کا

مغربی حصہ کا میل بہ بڑی ہے۔ رنگ کا تعلق پانی کی صفائی سے بھی ہے۔ یعنی پانی جتنا زیادہ صاف ہوگا، اتنا ہی زیادہ نیلگوں نظر آئے گا۔ پانی کی صفائی دیکھنے کے لئے سفید رنگے ہوئے گول توں، اندر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ نظر آئیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے سرگاسور (Sargassum) سمندر کا پانی بہت زیادہ شفاف معلوم ہوا ہے، کیونکہ سات فٹ قطر کا تو، ۲۱۶ فٹ کی گہرائی میں بھی وہاں صاف نظر آتا ہے، برخلاف اس کے بحر شمالی میں ۶۰ اور ۱۰۰ فٹ کے درمیان ہی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کے اندر کمروں کے نفوذ کا بھی تجربہ کیا گیا ہے، چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ بحرِ روم میں بارہ ہزار فٹ تک روشنی کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن جب ڈاکٹر بیب (Bebe) نے ایک خاص آلہ کے ذریعہ سے ساحلِ برمودا کے قریب تک پہنچنے کی کوشش کی تھی، تو وہ ہزار فٹ کے بعد انکو سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

لہروں کی پوری ضخامت و قوت کا اندازہ بھی کھلے ہوئے سمندروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی جھیل ایسی نہیں ہے جہاں لہریں اپنی قوت کے ساتھ اٹھ سکیں۔ بحرِ اتلانٹک، بحرِ ہند اور بحرِ ہسپانیہ میں چونکہ مواہبت زور سے چلتی ہے اس لئے وہاں موجوں کو پوری قوت کے ساتھ اٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ سمندر کی لہریں پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہے اور وہ واقعی ایسی ہی معلوم بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب مسلسل اونچی اونچی لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی کے پھیپڑوں سے جو چھینٹے اُڑا کر آتے ہیں ان کے اندر سے سامنے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے اور لہروں کی بلندی پہاڑ کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی پہاڑ کی طرح نظر آتی ہے اور لہروں کی بلندی عموماً چالیس پچاس فٹ ہوتی، گو کبھی کبھی طوفانی حالت میں وہ ستر فٹ تک پہنچ جاتی ہے ورنہ یوں سکون کی حالت میں اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اگر ہوا کا رخ بھی وہی ہو جو سمندر کے ہیجان کا ہے اور اس کی رفتار زیادہ ہو تو لہروں کا تسلسل بہت بڑھ جاتا ہے۔ لہروں کی قوت ڈھلوان ساحلوں پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ بحرِ اتلانٹک اور بحرِ شمالی میں لہروں کا دباؤ فی مربع فٹ ۳۰ ٹن دریافت کیا گیا ہے، حالانکہ سڑک کو ٹپنے والے رولر کا دباؤ فی مربع فٹ ایک ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ سمندر کی تباہ کاریاں تو ظاہر ہی ہیں، لیکن اس کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ ۳۵ سال کے عرصہ میں برطانیہ کی ۶۶۴۰ ایکڑ زمین اگر دریا برد ہوئی تو ۴۴ ہزار ایکڑ زمین دوسری جگہ سمندر نے دے بھی دی۔

سمندر کے اندر جتنی دولتیں ہیں ان کا اندازہ مشکل ہے، لیکن سب سے بڑی دولت اس کا گنیٹیم ہے۔ ایک چمکدار دھات ہے جس کی چادریں، سلاخیں اور ستون وغیرہ بن سکتے ہیں، اور نئی دنیا کے امیڈین

قائم کی ہیں کہ آئندہ تمام مکانوں کی تعمیر اسی دھات سے ہوگی اور کرۂ زمین ان تعمیروں سے جگمگ جگم کرنے لگے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جو اشیاء سمندر میں پائی جاتی ہیں ان کے ۱/۱۰ حصہ سے ۶۰ لاکھ ٹن کنڈیشیم، گیارہ کروڑ تر لاکھ ٹن نمک، ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن چاندی، ۳ لاکھ ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ مونگا بھی سمندر کی بڑی دولت ہے جسکا علم عہدِ قدیم کے انسان کو تھا، اور سوتی کی قدر و قیمت تو خیر سبھی کو معلوم ہے۔

بعض چھوٹے چھوٹے سمندر ایسے ہیں جن کے چاروں طرف خشکی کا حصہ ہوتا ہے اور اصطلاح میں ان کا نام بحرِ مخاط (Inland Sea) ہے۔ اس قسم کے سمندروں میں سب سے بڑا بحرِ اخضر (Caspian Sea) ہے، جس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ ان کو ہم ایک لحاظ سے جھیل بھی کہ سکتے ہیں، یہ جھیلیں پہاڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ یورسٹ کی چوٹی پر بھی ایک جھیل ہوئی جہاز سے دیکھی گئی ہے، لیکن وہاں تک کوئی پہنچ نہیں سکا۔ یہ جھیل بہت چھوٹی ہے، مگر بڑی جھیلوں میں سب سے اونچی جھیل ٹی کا کا ہے جو جنوبی امریکہ کے پہاڑ میں سطحِ آب سے ۱۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے بعض جھیلیں ایسی ہیں جو سطحِ آب سے بہت نیچے واقع ہیں۔ ان میں بحرِ مردہ (Dead Sea) خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے یہ سمندر کی سطح سے ۱۲۹۲ فٹ نیچے واقع ہے۔

گہری جھیلوں میں سب سے زیادہ مشہور سائبریا کی بیکال جھیل ہے جس کی گہرائی کا اوسط ۲۳۰ فٹ ہے لیکن بعض جگہ اس کی گہرائی اس سے دو چند ہے۔ افریقہ کی جھیل ٹنگانیکا دنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے جو ۴۵۰ میل تک چلی گئی ہے اور گہری بھی بہت ہے یعنی بعض مقامات پر اس کی گہرائی ۴۰۰ فٹ ہے۔

یورپ کی سب سے بڑی جھیل لڈوگا ہے جو روس اور فن لینڈ کے درمیان سرحد پر واقع ہے اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل ہے، لیکن گہرائی بہت کم ہے یعنی صرف ۳۰ فٹ۔

سب سے بڑا دریا دنیا کا وہ ہے جو مسوری (Missouri) اور میسیسیپس (Mississippi) سے ملکر بنتا ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے اور اس کی لمبائی چار ہزار دو سو میل ہے۔

اس دریا سے ۱۲۵۰۰۰۰ مربع میل زمین میں آبپاشی ہوتی ہے جو امریکہ کا ایک تہائی حصہ ہے۔ دریائے امینون بھی چار ہزار میل کا لمبا دریا ہے اور اس سے ۲۴۲۲۰۰۰ مربع میل زمین سیراب ہوتی ہے یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ ۲۳۰۰ میل تک اس میں بڑے بڑے جہاز چلے جاتے ہیں اور ۵۰۰ میل تک چھوٹے جہاز۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۲۰ فٹ ہے۔ بارش کے زمانہ میں اس کا پاؤں کہیں کہیں ۵۰۰ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس کا دباؤ ۲۰۰ میل چوڑا ہے۔

دریائے نیل بھی دنیا کا نہایت مشہور دریا ہے۔ یہ ۲۵۰۰ میل لمبا ہے، لیکن رقبہ آبپاشی بہت کم ہے۔ بعض دریا ایسے بھی ہیں جو اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً مسیسیپی، یا شمالی چین کا یلو (Yellow River) بعض ایسے دریا بھی ہیں جو سمندر میں نہیں گرتے۔ ان میں وسط ایشیا کا دریاے ٹارم بہت مشہور ہے۔

دنیا کی سب سے اونچی آبشار امریکہ کی وینی زولاس ہے۔ یہ ایک میل کی بلندی سے گرتی ہے اور اتنا شور پیدا کرتی ہے گویا ہزاروں گھنٹے بجائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آبشار جوگ (Jog Falls) واقع ہے ۸۳۰ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے۔ برٹش گائنا کی ایک آبشار ۸۲۲ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے اور اہم فٹ تک تو بالکل عمودی شکل میں گرتی ہے۔

چوڑی آبشاروں میں امریکہ کی نیا گرا بہت مشہور ہے جس کی چوڑائی چار ہزار فٹ ہے، اس کے بعد افریقہ کی کی آبشار وکٹوریا ہے۔

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف :- اردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے، پورے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات :- اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کا زمامہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل :- ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ طبقہ کی زندہ تصویریں دکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ :- یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے سرت ازدواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منجر نگار۔ لکھنؤ

بڑا گھر

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باپ، چچا، بھائی اور سب رشتہ دار رو رہے تھے، کیونکہ آج بالیش کیخصتی ہو رہی تھی مگر سب کے دلوں میں تسلی سی تھی، کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ اپنے خاوند کے گھر جا کر اس کو ضرور سکھائے گا جو اس کو اپنے باپ کے گھر میں نہ مل سکا تھا۔ ماں نہ ہونے سے کسی کو بہت کم سکھ مل سکتا ہے۔ سب بالیش کو گھر لے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو لیکن دلوں میں خوشی لے کر بالیش سے مل رہے تھے۔ مگر بالیش، ان سبھوں سے آنکھوں میں آنسو ہی لے ہوئے مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں خوشی کو ٹٹولا۔ تو اس کا نام و نشان کہیں نہیں ملا۔ آنے والے زمانہ میں بھی دور تک اُس کی نظر گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی خوشی کا پتہ نہ چلا۔

بہت دنوں سے بالیش اور روپ ایک ہی مقام کی طرف منزلیں طے کرتے چلے آ رہے تھے جہاں وہ دونوں ایک ہو جاویں گے۔ آخر کو دونوں نے پہلی منزل پار بھی کر لی تھی اور اس مقام کا نظارہ بھی وہ کرنے لگے تھے۔ ہماری زندگی میں پہلی منزل ہوتی ہی ایسی ہے کہ جب ہم کسی سے قول قرار کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا ارادہ ہمارے دلوں میں ایسا سما جاتا ہے، جیسے کہ میل کی جڑ زمین میں۔ اور یہی محبت کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل کو پار کر کے دونوں کبھی پیچھے لوٹنے کا خیال نہیں کرتے چاہے آگے کتنی تباہیوں کے منظر ہوں۔ بلکہ تباہیوں کے منظر تو ان کو اور آگے بڑھنے پر آمادہ کر دیتے ہیں تاکہ اگر ان کے ایک ہو جانے کا مقام ان کی پہنچ سے باہر ہو تو وہ بھی ان تباہیوں میں فنا ہو جاویں۔ پہلی منزل ان دونوں نے پار کر لی تھی۔

ان دونوں کی نظروں کے سامنے پہلی منزل کے آگے کوئی مشکل نظر نہ آ رہی تھی؛ ایک دوسرے کا مل جانا دونوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جنت مل گئی۔ روپ دو متمند تھا۔ مگر فقیر بھی نہ تھا۔ اس کے پاس جائیداد بھی تھی اور دوسو روپے کا نوکر بھی تھا۔ مگر وہ اتنا دو متمند نہ تھا جتنا اُس کے چچا اور اُس کے باپ چاہتے تھے۔ مگر بالیش کو تو یہ دیکھنا تھا کہ اس کے ارباب روپ پورے کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ اور دولت با۔ دولت نہ سہی، روپ کے پاس محبت کا تو ذخیرہ تھا۔ بالیش اپنے دل میں محبت چھپائے بیٹھی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد محبت مشکل سے ہی ملتی ہے اور بالیش محبت چاہتی تھی۔ دولت نہیں۔ اس لئے ان دونوں کے ملنے میں مشکلیں کیونکر مائل ہو سکتی تھیں۔ مگر اُس کے والدین

کی خواہش کو کیا کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی شادی کسی بڑے گھر میں ہو اور ان کے ساتھ ساتھ دنیا کی رکاوٹوں کو کیسے پار کیا جاوے!

دنیا ایک دوسرے کو مشکل سے سمجھ سکتی ہے۔ دونوں کو پہلی منزل سے پار ہوتے دیکھ کر دنیا والے آنکھ پھاڑتے ہوئے باتیں کہتا کے پاس آئے اور بولے ”ارے یہ کیا کیا۔ تمہاری سمجھ کہاں چلی گئی۔ اپنی لڑکی کو کہاں جھونکنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“ ان طعنوں کے آگے ایک انسان کہاں تک کھڑا رہ سکتا ہے! باتیں کہتا کہتا ان طعنوں کے سامنے اپنا سر جھکا نا پڑا۔ باتیں کہنے کا ان میں بھی ان باتوں کی بھنگ پڑی اور روپ کے ساتھ اس کی شادی نہ ہو سکی۔

باتیں نے اپنے خاوند کے ساتھ بڑے گھر میں قدم رکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک سنان جنگل میں ڈالا ہے جہاں اس کو کوئی پھول نظر نہیں آتا۔ اپنے دل کے پھول کو۔ ٹوٹے ہوئے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑی کو۔ وہ راستے میں بکھرتی چلی آرہی تھی اور یہاں پہنچی تو اس کے دل میں جھک کا پتہ نہ تھا۔ بادخزاں آئی اور باغ کو اجاڑ کر گئی۔

بڑا گھر۔ ہاں باتیں نے دیکھا کہ گھر تو لمبائی چوڑائی میں بہت بڑا ہے۔ تین منزلہ مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ صحن اتنا بڑا کہ ہزاروں آدمی اُس میں بیٹھ سکتے ہیں! کمرے بھی کافی بڑے تھے اتنے بڑے کہ ان میں باتیں کی نظر بھی کھو جاتی تھی۔ غرض یہ کہ گھر تو واقعی بہت بڑا تھا۔!!

بڑے گھر کی سی کیفیتیں بھی باتیں کو ملیں

اس کے کانوں میں قہقہوں کی آواز بھی آتی تھی اور ان قہقہوں سے بلند ایک سرپی آواز باتیں کے سینے کو چیرتی پھاڑتی نکل جاتی تھی! ایسا تو بڑے گھروں کا قاعدہ ہی ہے نہیں تو بڑا گھر کیسے معلوم ہوا!

”ساری بہت اچھی ہے“ باتیں کہتی

”مگر آج کیسے خریدی جاسکتی ہے؟ دوستوں نے مجھے پارٹی پر مجبور کر لیا ہے اُس میں بھی تو روپیہ خرچ ہوگا پارٹی کے لئے روپیہ نہیں۔ مگر پارٹی نہ کریں تو ناک جوکٹ جاوے گی۔ بڑا گھر پھر کیسے رہے گا۔ دولت کو دونوں ہاتھوں سے صرف کرنا یہی تو بڑے گھر کی نشانی ہے۔ پارٹی کے لئے تو۔ روپیہ کہیں سے لانا ہی پڑے گا۔ ساری کے لئے نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو!

”گھر میں بارہ بجے کیوں آئے“

”ارے راستہ میں دوست روک لیا کریں تو کیا اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ آیا کروں۔۔۔۔۔ اور

”ایسا قاعدہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔ بڑے گھروں کے قاعدوں سے چلنا ہوگا۔ ہمارے گھر کو ڈبو! اسکی سانس کٹی

”ارے آج پیالے کس نے توڑ دئے“ اور بالیش کی طرف نگاہ کر کے کہنے لگی۔ ”یہی ہوگی“ پیار بالیش کے سامنے آکر گرا اور ایک ٹکڑا بالیش کے ماتھے سے لگا!

”پیالے روزانہ ٹوٹیں گے تو کہاں سے آویں گے“

”آج ہی تو پیالہ ٹوٹا ہے“ اس کے بعد دو آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر گئے۔

”بس چپ رہ! میرے اوپر شیر ہو کر چڑھتی ہے! آج تک تیرے سر بھی میرے اوپر شیر ہو کر نہ چڑھے!“

یہ بڑے گھر کی بہودوں کا کام نہیں کہ پلٹ کر جواب دیں۔

”ہاں بڑے گھر میں اتنے نوکر ہوتے ہیں وہ بھی تو جواب اُلٹ کر نہیں دیتے۔“

بالیش کا سینہ چیرتی ہوئی یہ آوازیں نکل جاتیں اور وہ سرد آہیں بھر کر رہ جاتی۔ ان سرد آہوں کا خیال اُس کے پیمانے کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنا بڑا گھر ہے جہاں دولت کی بوچھاڑ ہوگی۔ اتنے آدمی ہیں۔ لڑکی کے لئے ان کو سکھ ہی سکھ نظر آتا تھا۔ مگر بالیش کا دل جانتا تھا کہ کتنا سکھ اُس کے پاس ہے۔

ایک بقیہ ووق میدان جس میں ایک تھکے مسافر کی نگاہ کھو جاتی ہے۔ ایسا ہی وہ بڑا گھر تھا آدمیوں کی بھی اُس میں بھڑکتی تھی۔ گروہ اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرتی جتنا وہ اس بھڑکے محسوس کرتی! دیکھنے کو تو وہ گھر کچا کچ لوکروں، رشتہ داروں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ مگر بالیش کے لئے وہ ایک رنگستان سے بھی زیادہ سناں تھا اس گھر میں خلوص و محبت کا تو گزر تھا ہی نہیں، ہمدردی تو کوئی جانتا ہی نہ تھا! نوکروں کا قافلہ ادھر سے ادھر حکم بجاتا ہوا نکل جاتا تھا۔ بالیش کو بھی اپنی ساس کا حکم بجالاتے سارا دن نکل جاتا تھا۔ حکم بجالانے میں پیار و محبت کہاں بالیش کم رہا کرتی! کچھ تکلیف ہوتی تو شکوہ شکایت کی بجائے دو آنسو آنکھوں سے ٹپکنا دیتی۔ روتا دیکھ کر اس کی ساس اُس سے کہتی ”کیسی مکار ہے آنسوؤں سے کام لینا چاہتی ہے!“ ”تو بالیش کو روتے ہی بتاتا تھا نہ ہنستے ہی! اگر کبھی اکیلی کسی کونہ میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو بیشک وہ دل کھول کر رو لیا کرتی۔

اگر دل ایک ہی طرف جما ہو تو تکلیف، تکلیف محسوس نہیں ہوتی! اگر ایک بہو کو ایک ہی گھر کا خیال ہو تو وہ یہ سوچ لیتی ہے کہ یہی میرا گھر ہے۔ چاہے دوزخ ہو چاہے جنت۔ اس میں کسی نہ کسی طرح سے اپنی زندگی گزارنی ہے ایسی حالت میں تکلیف بھی سہی جاسکتی ہے مگر جب تکلیف دیکھ کر اس کا دل کسی اور کا خیال چھنچھناتا ہو تو تکلیف میں دونا دکھ معلوم ہوتا ہے! رات دن بالیش کو یہ خیال ستا آتا کہ اگر وہ وہاں جاتی تو ایسا کیوں دیکھنا پڑتا۔ بالیش نے کبھی سوچا تھا ”میں روپ سے سب حال کہہ دیا کروں گی۔ ارے۔ وہ تو پہلے ہی میرا سب حال جانتے ہیں“ اُس کے منہ پر شرم کی لال جھلک دوڑ آتی! کبھی اُس نے انگلیوں پر جینے شمار کئے تھے ہفتے شمار کئے تھے۔ دن گئے تھے کبھی وہ یہ خیال کر کے اچھل پڑتی تھی کہ اب تو روپ سے ملنے کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ دن ہی کہاں ہیں۔ آ رہی گئے۔“

کبھی اُس نے یہ نہ جانتا تھا کہ روپ بھی اُسے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا وہ اسے! ”ادھ میری دلی مراد بن مانگے ہی ملی!“ وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑتی تھی! مگر کیا معلوم تھا کہ اس کی خوشی کبھی تکمیل تک نہ پہنچے گی اور دنیا میں ایسے بہت سے آدمی ہیں جو دوسروں کی خوشی سے حسد بھی کرتے ہیں۔ جب ٹیکے کی رسم ہوئی تو اس نے سوچا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب ہمیں کون ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے۔ مگر لڑکیوں کو اپنے اوپر حق تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ خواہش پیدا ہوتی ہے انکے دلوں میں اور پورا کرنے نہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے دوسروں کو۔ ان کو آنکھیں بند کر کے۔ ہونٹ دبا کر۔ بے زبان گائے کی طرح جس کے ساتھ بانڈھ دیا جاوے۔ چلا جانا چاہئے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ اور وہ بالکل تنہا تھی! غمگین انسان اپنے آپ کو تنہائی میں بھول جاتا ہے۔ بالیش نے بھی اپنے آپ کو کہیں کھو دیا تھا۔ اس کا خاوند اندر آیا۔ ٹیڑھی نگاہوں سے اس نے بالیش کی طرف دیکھا اس کے ماتھے پر جھریاں پڑ گئیں۔

”بالیش!“ اس نے پکارا
بالیش نے آواز نہیں سنی۔ اس کے سامنے تو پیار پھینکنے کا منظر تھا۔

”بالیش، یہاں تو آ“
”آخریات کیا ہے، اُس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ بالیش چونک پڑی!
”مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو“

”آخر تو رات بھر کیوں رو دیا کرتی ہے“
بالیش چپ تھی۔

”میں جو ڈرتا تھا۔ وہی ہوا۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ تمہاری سگائی دوسری جگہ ہو گئی تھی!“
تھوڑی دیر ساٹا اور پھر گہری سانس اور پھر۔!
”ہاں“ بالیش کے منہ سے نکل پڑا۔
”میں ناراض ہو رہی ہیں“

”نہیں آؤں گی“
”کہہ میں اندھیرا ہو گیا۔ اُس کے بعد وہی ہوا جو تمام بڑے گھروں میں غریب بھوکے ساتھ ہوا کرتا ہے۔
وہی تاریک رات! چاروں طرف اندھیرا۔ مگر اندھیری گلیوں کو پار کرتی ہوئی بالیش کہاں جا رہی تھی!
دوسرے دن۔ بالیش کے پتا کھانا کھا رہے تھے۔ تعالیٰ چھوڑ کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔
”بالیش، بالیش تو یہاں کہاں!“

بالیش کے منہ میں زبان ہو تو بولے !
 ”نہ سر پر چادر، نہ پاؤں میں جوتا ! یہ کیا ہے ! بول تو سہی“
 بالیش اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو رینے لگی۔
 ”اور یہ تیرے منہ پر لال لال نشان کیسے ہیں۔ یہ تیرا منہ کس نے نوچ ڈالا ہے۔“ بالیش کی آنکھوں سے آنسو
 ٹپکنے لگے۔

”انہیں نے“ اس سے آگے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ رو پڑی اور اپنے کمرہ میں کھاٹ پر جا گری۔ پتا دوڑتے
 ہوئے اس کے پیچھے آئے۔ پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ بالیش چلا اٹھی۔
 ”پیٹھ میں کیا ہوا“

دیکھا تو دہاں نیل پڑے تھے !
 پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے چچا۔ بھائی۔ چتا اور محلہ کے پڑوسی سب بالیش کے چاروں طرف تھے ! کبھی انہوں نے گلے لگا کر
 بالیش کو نصیحت کیا تھا اور اس پر باد دیا تھا کہ سدا خوش رہے ! اُس وقت ان کے دلوں میں تسلی تھی کیونکہ بالیش بڑے گھر
 جارہی تھی۔ لیکن اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بڑے گھر کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔
 بالیش چار پائی پر لپٹی ہوئی تھی اور سب چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔

شکر سرور بھٹناگر

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفاتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو
 ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(۱۹۷۷ء) جنوری ۵ء۔ (۱۹۷۷ء) مئی ۴ء۔ (۱۹۷۷ء) جولائی تا دسمبر ۴ فی پرچہ۔ (۱۹۷۷ء)
 جنوری ۱۱ء۔ فردوسی تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ فی پرچہ۔ (۱۹۷۷ء) فردوسی و جولائی ۴ فی پرچہ۔
 اکتوبر ۵ء۔ (۱۹۷۷ء) جنوری ۵ء۔ فردوسی تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ فی پرچہ۔ (۱۹۷۷ء) جنوری ۵ء۔
 مارچ تا اگست ۶ فی پرچہ۔ (۱۹۷۷ء) پورا فائل ۵ء۔
 منیجر نگار لکھنؤ

مخدوم کی شاعری

جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہنچ جاتی ہے بہتی اور تنزل کے احساسات اسکا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبران سخن اُٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگانا اور ذہنی انقلاب برپا کرنا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یونہی رہے گا۔ ادب جدید کے پیغمبر میکسم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بے چارگی اور زندگی کی فوج خواہیوں سے روک کر یہ کہنے کے لئے مجبور کیا کہ ”زندگی ابدالآباد تک رہے گی ہم اس کے کارساز حقیقی ہیں قیامت یہی ہو گی کہ روح الاجتماع اور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دے۔“ گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت۔ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کر دیا جائے۔ اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہد و عمل کے لئے راہیں بھی تلاش کرے۔ اس کا یہ پیام زمانہ کے معاشرتی حالات سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا اسی لئے، اس کے پیام میں زندگی ہے۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگا رہی ہے اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزل و انحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لئے انقلاب کے ساتھ بیان و قلم باندھا۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذر الاسلام کو بیدار کیا جو برائیوں کے اندھیرے خوف کی آتش اور آشکدہ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے۔ قاضی کی آتشیں کیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستان میں اپنے لئے جگہ کر لی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عبارت بنایا۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدر آباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے ہیں اور جدید ادب کے علم برداروں میں یا ترقی پسند شعرا میں حیدر آباد کی واحد نمائندگی کر رہے ہیں ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا جبکہ بی۔ اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ادیب یا شاعر

جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانہ کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بنی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصہ میں مشق ہوتی رہی۔ ”پیلادو شالہ“ مخدوم کی پہلی شاہکار طنزیہ نظم ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے ملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہیں اور اُسی وقت کہتے ہیں جبکہ زندگی ان سے تقاضا کرتی ہے اور حیات انہیں اکساتی ہے۔ وہ اُسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے۔ یہیں اظہارِ حُریتِ دعا کی جرات کرتے ہیں۔ سرورِ سردی سے معمور زندگی میں مئےِ دو آتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشک طور بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں

بہے جاتے تھے سیٹھے عشق کے زریں سفینے میں تنداؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اُس کو نہ ہا جاتا پسینے میں مئےِ دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینوں میں رنگنے وہ رنگین سحاب جب آتا دیکھتے تو کہہ دیتے کہ:-

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا

وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں سحاب آتا

لبوں کی مئے پلانے جھومتا مسکے شباب آتا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے سرِ قدم پر بغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لڑشیں منتشر ہو جاتیں جس سے شاعر کے ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی کسی کے انتظار میں وہ گداز بھری تائیں لاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن مخدوم چشمِ براہ اور نقوشِ حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہہ دیتے ہیں کہ:-

صبح نے سچ سے اُٹھتے ہوئے انگڑائی لی

اوصبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب مری نیند اڑانے والے

میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے

اب بھی آجا کہ مرے سجدوں کا رماں نکلے

تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں سینے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پہاں ہیں۔
 کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید
 ادب انہیں متاثر کر رہا تھا ان کے تصور حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی انسانیت کا اندرونی اضطراب مسلسل غلامی زمینی
 بربادی بھوک، غم، بے روزگاری، ظلم و استبداد زندگی کی قدامت اور بچھا ہوا پن یہ سب اپنی پیتا سنانے لگے۔
 سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھیک،
 بیماری اور بنجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مسان ہے جو روایتیوں کا غلام ہے اور جس میں صدیوں کا بھڈام
 پرورش پارہا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و گفن ٹھٹھری ہوئی نقش ہے ایک خون میں تھڑا ہوا
 لقمہ ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہاں کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ یہاں
 ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ
 اس زمین موت پر در در کو ڈھایا جائے گا
 اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا
 وہ اس دنیا کو ڈھادینا چاہتے ہیں وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی
 بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے وہی وطن جہاں کبھی
 عشرت و عیش کی جس جا کہ فرادانی تھی
 جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی
 ہاں اسی جگہ مخدوم کے دل زار نے یہ دیکھا کہ :-

خون دہقان میں امارت کے سینے تھے رواں
 ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں
 یہ وہ بد نصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو لگا کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اڑا دے اصلاح مرض کا صحیح علاج
 نہیں بلکہ انقلابی درد کا صحیح درمان ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمت کفر کو ایمان۔ سگ خونخوار کو انسان اور دشمن جاں کو نگہبان نہیں کہا جاسکتا وہ
 کہہ اٹھے کہ
 عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا،
 خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
 حور بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہو سکیں گے چونکہ یہ بہت کھیلے جا چکے وہ انقلابی اپنا مدعا بنا لیتے ہیں کہ:-

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں

قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزاع کے عالم میں ہے جس کے کین جہا جن۔ امیر کاشی کے برہمن اور

کعبہ کے فقیر ہیں۔ جن کے ناخن کی غلش سے اقوام عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر۔ یہی خندہ و تبسم ہیں

ان کی حویلیاں

رہزنیوں کا قصر شوری قاتلوں کی خوابگاہ

کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ،

انھیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نام و بے پوشش گداؤں کا

ایسا گردہ نظر میں آتا ہے:-

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تنہا پائمال

جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کے

کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں لبوں میں

بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے۔ وہ انقلابی ہیں۔ وہ ایمان کے قابل نہیں۔ وہ اس حقیقت سے

واقف ہیں کہ بنی نوع انسان کے ہر مسئلہ کو تاریخ نے استبداد سے طے کرایا ہے اس لئے ان کی حیات کا مدعا یہ

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں

ہے کہ

قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ کاٹھ دھڑ کو معمور کر کے اور قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کے ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں

تباہیوں اور بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثبات قدمی سے دلیرانہ میدان میں آکر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ

دور نما شاد کو اب شاد کیا جائے گا

روح انسان کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لئے اور ان کھنڈروں پر آزادی کے پرچم کھولنے کے لئے علمبردارانِ آنا دی

یعنی ہندی نوجوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چونکہ انہی کی نظر اور ذوق یقین سے زبناں کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔

ان کا نوجوان آنرہیوں میں پلا اور طوفانوں میں پروان چڑھا۔ وہ مرد مجاہد ہے اس کی ٹھوکرے گیتی لڑزہ بر اندام ہوتی ہے ان کا نوجوان اس سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اڑا دے گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔
مخدوم نشاۃ ثانیہ کے لئے سرمایہ داری کو ام الجبائٹ اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں وہ خدا را ان وطن اور ان کی نعشوں کے جہنم کو سر د کرنے کے لئے قیامت کا جوش لئے ہوئے آتے ہیں :-
خدا نے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ

جس کھیت سے دھقان کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

دور محشر اس کھیت کے خوشہ گندم ہی کو جلانے کا حکم کیوں دیتا ہے کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کر دیا جائے جس نے دھقان کو روزی میسر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سختی سے ایک دور دراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دنیا کی عمر کافی دراز ہو چکی۔ ہمارے تجربہ بچتے ہو چکے اور سچ پوچھنے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہو چکی۔ اب یہ وعدہ اور سارے فرمان طاق نسیاں ہو جائیں گے۔ اب یہ جہاں قصر شہداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لئے

وہیں — اسی دنیا میں احساسات کی بیداریاں جہد و عمل کے لئے آئیں گی اور کہیں گی کہ

پھونک دو قصر کو گر کن کا تاشا ہے یہی

زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا کہ بنسیا بجے گی — استبداد کا وہ دیوتا خوشہ گندم کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بر مادی اور فٹائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آنرہیوں، گرجدار گھٹاؤں اور جہنم کی ہواؤں کے شور محشر سے مدد لیکر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ یہ پھر کبھی نہ ابھر سکے ان کا انقلاب ایک قیامت صفر کا نمونہ ہو گا جس کا نتیجہ کائنات کے لئے ایک متوازن نظام ہو گا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرہ بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے Theme (مرکزی تخیل) کے جوش اور اثر کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ایسے شعر مجرم ہیں، جس میں اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گونگڑا ہٹ ہے۔ وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں، وہ ساحل پر ٹھہر کر دریائی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے۔ بلکہ یہی ساری ترکیبوں سے بطور خود واقعہ ہیں اس لئے ان کے کلام میں بلا کا جوش ہے

مخدوم کے راسخ عقیدے اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبہ عمل کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے چونکہ وہ زندگی کے عمیق مسائل بیان کرتے ہیں، تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لئے راہ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ ابھی نوخیز ہیں ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لئے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کا راز نہ ضبط ہے جو ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لئے اثر پذیر بھی ہے وہ انقلاب کے بہت بڑے لقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنا دے گی۔ وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس ہم میں رہبری کے لئے سب سے ممتاز رہیں گے۔

محبوبین (عثمانیہ)

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں :-

نگارستان جمالستان ترغیبات جنسی شہاب کی سرگزشت استفسار و جواب ہر حصہ جلد

نور روپیہ

ایک روپیہ

تین روپیہ

چار روپیہ

دو روپیہ

معرکہ سخن مکتوبات نیاز اردو شاعری ہندی شاعری میزان کل

ستائیس روپیہ آٹھ آنے

ڈیڑھ روپیہ

دو روپیہ

دھائی روپیہ

دھائی روپیہ

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر "نگار" لکھنؤ

قصص کی کرسی

امریکی قاتل کا قصص یوں ہوتا ہے کہ، اُسے ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر برقی رود و ڈاکرا سے ہلاک کر دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال قائم کیا گیا ہے کہ ہلاکت کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے اور انسان کو بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس باب میں ایک افسانہ نویس، چارلس فرانسس پاٹر کا بیان پڑھئے، جس نے ریکارڈ اس منظر کو دیکھا تھا۔

مجھ سے ایک اخبار کے نمائندہ نے کہا کہ ”آج گیارہ بجے کراؤلی کا قصص ہونے والا ہے، چلو، تمہیں نفسیات انسانی کے ایک خاص پہلو کے مطالعہ کا موقع ملے گا اور ممکن ہے کسی افسانہ میں تم اس سے کام لے سکو۔ لیکن ہمیں قید خانہ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جانا چاہئے۔“

ہم لوگ ٹھیک نو بجے قید خانہ کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ وہاں بچا اس تماشائی اور موجود تھے، لیکن ان میں سے اکثر اخباروں کے نمائندے تھے چونکہ دو گھنٹے باقی تھے، اس لئے یہ وقت باجمد گرا سی گشتگو میں بسر ہوا کہ قصص کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی پھانسی کو بہتر سمجھتا تھا، کوئی زہر ملی گیس کی رائے دیتا تھا اور کوئی بندوق کی۔ میرے لئے چونکہ بالکل پہلا اتفاق ایسی صحبت میں شریک ہونے کا تھا، اس لئے خاموشی سے سن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ ایسے دردناک موضوع پر یہ لوگ کیسے ٹھنڈے دل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وقت قریب آیا تو نمائندہ اخبار نے جو میرے ساتھ آیا تھا کہا کہ ”آؤ قریب کے کمرہ میں چلیں“ چنانچہ میں بھی سب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہاں پہنچ کر سب نے اپنی اپنی جیب سے دھسکی کی بوتل نکالی اور مجھ سے بھی کہا کہ اس صحبت میں ان کا شریک بھل۔ میں نے کہا کہ ”میں شراب نہیں پیتا۔“ ان میں سے ایک نے کہا کہ ”اگر تم پیو گے تو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکو گے۔ ہم سب لوگ کیا احمق ہیں جو شراب پی کر قصص دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہاں کا منظر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب تک احساس کو کندہ بنا دیا جائے، برداشت مشکل ہے۔“

میں نے کہا کہ ”میں پوسے حواس کے ساتھ اس کو دیکھنا چاہتا ہوں، میں نہ پیوں گا۔“

تھوڑی دیر میں سپاہیوں کا ایک دستہ آیا اور ہم کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تاکہ ہماری جامہ تلاشی لی جائے۔ اس سے قبل کسی قصاص کے وقت کوئی نمائندہ اخبار جھوٹا سا کیمرا چھپا کر لے گیا تھا اور اس نے تصویر لیتی تھی اس لئے اب یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اندر جانے سے پہلے ہر شخص کے کپڑے دیکھ لئے جاتے ہیں۔

ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قصاص کا پورا حال اخبارات میں لکھ کر شائع کیا جاتا ہے تو اس کی تصویر کی اشاعت میں کیا حرج ہے۔ تصویر دیکھ کر قد رٹا لوگوں کو اور عبرت حاصل ہونا چاہئے۔ بہر حال یہ موقع اس بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ میں بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہو گیا اور جب سب کی جامہ تلاشی ہو چکی تو ہم لوگ یکے بعد دیگرے قصاص کے کمرے میں پہنچے۔ لیکن ایک رپورٹر کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ یہ کہہ کر واپس آیا کہ پچھلے قصاص میں میری حالت خراب ہو گئی تھی، میں باہر جاتا ہوں، تم جو کچھ دیکھنا، مجھ سے زبانی کہہ دینا۔

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا، نہ اسے حقیقتاً اپنے تاثرات کے لحاظ سے بیان کر سکتا ہوں اور نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ اندر صرف ایک کرسی ہوگی جس پر قاتل کو بٹھا دیا جائے گا اور آٹا فانا برقی رو سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ لیکن اندر پہنچ کر دیکھا کہ چاروں طرف پچاس کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور سامنے درمیان میں ایک بڑی کرسی مضبوط لکڑی کی رکھی ہوئی ہے اور کئی ایک کمرے چمڑے کے اس میں لٹک رہے ہیں۔

جب ہلوگ بیٹھ گئے تو ایسا گہرا سکوت دفعتاً چھا گیا کہ اپنے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند سکنڈز کے بعد پہلو کے کمرہ سے گارڈ کی حفاظت میں مجرم نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھا۔ میں اس وقت ایسا محسوس کر رہا تھا، گویا خود موت آہستہ آہستہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔ ایک یاد رہی بھی ساتھ تھا۔

مجرم کرسی کی طرف بڑھا اور از خود بغیر کسی حکم یا ہدایت کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر بہت سے لوگوں کو حد درجہ مضطرب دیکھا ہے، لیکن اس شخص کے سکون کا عالم نہایت حیرتناک تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی فریضہ زندگی کو ادا کر رہا ہے۔

اس نے کرسی پر بیٹھے ہی ہاتھ اٹھا کر گارڈ کے سپاہیوں سے کہا کہ ”خدا حافظ“ اور اس کے بعد ہی نہایت تیزی سے اس کے ہاتھ پاؤں تسموں سے باندھے جانے لگے۔ اس کا جسم کسا جا رہا تھا اور وہ خاموش مٹکا میں نیچے کے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس نے جیلر سے کہا کہ ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میری ماں کو میرا آخری سلام پہنچا دیا جائے“

اس کے بعد قصاص ہونے ہی والا تھا کہ اس نے جیلر سے کہا کہ اپنے پاؤں کا تسمہ ذرا ڈھیلے ہے، اسے کس دیا جائے چنانچہ تسمہ کس دیا گیا اور اس کے بعد ہی فوراً سگنل دیا گیا۔

میں یہ تو دیکھا کہ کرسی کو غیر معمولی جھٹکا لگا، لیکن اس کے بعد جو کچھ نظر آیا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجلی کی رو اس کے

ایک ایک ریشہ میں دوڑ گئی اور جسم کی انگوٹھیں کا یہ عالم ہوا گویا کوئی بڑا قومی جانور بھی چرچر کے تسموں سے کس دیا گیا ہے اور وہ انگوٹھیں تو ڈگر ٹکل جانا چاہتا ہے۔ تسمے چرچر رہے تھے، کرسی جھٹکے کھا رہی تھی اور ہم لوگ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ تسمے ٹوٹ کر یہ ہم پر چھپنے ہی والا ہے۔

برقی روئیکے بعد دیگرے برابر دوڑائی جا رہی تھی اور ہم لوگ ہر دفعہ اپنی کرسیوں پر پیچھے کی طرف ہٹ ہٹ جاتے تھے کہ کہیں یہ ہم پر نہ آگے۔

ہم نے سنا تھا کہ اس طرح انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی اور غوراً ہلاک ہو جاتا ہے، لیکن اس قصاص کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سب غلط تھا۔ اس کی تکلیف کا یہ عالم تھا گویا اس کا ایک ایک ریشہ موت کا مقابلہ کر رہا ہے اور موت ہر مرتبہ اپنی گرفت میں لا کر جھٹکے پر جھٹکے دے رہی ہے جھنجھوڑ رہی ہے اس کے ساتھ ہی سینے اس کے جسم سے پسینہ ٹپکتے دیکھا۔ گویا بھلی کے چوٹے پر کسی انسان کو بھونا جا رہا تھا اور اس کے جسم کا عرق ٹکل ٹکل کر لباس میں جذب ہو رہا تھا اس کے بعد وہ ناقابل برداشت منظر سامنے آیا جس کے ڈر کی وجہ سے لوگ شرابیں پی بی کر یہاں آتے ہیں۔ یعنی ایسی بو محسوس ہونے لگی جو گوشت جلنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ چراہندہ ایسی تیز ایسی منگوٹھن اور اس قدر امتلا پیدا کرنے والی تھی کہ معاذ اللہ!

ہر چند یہ منظر صرف پانچ منٹ سامنے رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں گزر گئے۔ جب قصاص کے بعد اس کے جسم کو لاشیں کی گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا جانے لگا، تو میں نے اسے پھر دیکھا۔ وہ بالکل پھول گیا تھا اور ایسا سرخ تھا گویا جسم کی کھال نکال لی گئی ہے۔

نگار کے خاص نمبر

- جنوری ۳۲ء (غالب نمبر)۔ غالب شوق نگار دفتر نظم کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت ۷۰/- علاوہ محصول
- جنوری ۳۵ء (اردو شاعری نمبر)۔ اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ صفحات ۲۳۶ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے جس میں جناب نیاز صاحب کی قلمی تصویر بھی شامل ہے قیمت ۷۰/- علاوہ محصول
- جنوری ۳۶ء (ہندی شاعری نمبر)۔ ہندی شاعری کی تاریخ اور سندھ شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ۷۰/- علاوہ محصول
- جنوری ۳۷ء۔ ڈرامہ اصحاب کہف۔ خطوط سکروالڈ بنام سارہ برہنارت اور سلاطین خلافت و امامت پر پانچوں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے
- صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۷۰/- علاوہ محصول
- جنوری ۳۸ء۔ تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس وقت نظر انداز تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہو اسکا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ قیمت ۷۰/-
- جنوری ۳۹ء (مصحفی نمبر)۔ اسکے بعض عنوان حیات مصحفی۔ تمدن و تمدنی میں مصحفی کا ترجمہ مصحفی کی غیر مطبوعہ فتویوں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۶۴ قیمت ۷۰/-
- جنوری ۴۰ء۔ (تذکرہ نمبر)۔ بعض عنوانات۔ تذکرہ لکھنؤ۔ تذکرہ لکھنؤ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ۷۰/- علاوہ محصول
- منبر نگار گھنٹو

علم کی طیار کی ہوئی دوزخ

حال کی جنگ ہسپانیہ میں جب بارسلونا فتح ہوا اور جنرل فرانکو وہاں پہنچا تو اسے بعض تہ خانے ایسے نظر آئے جن سے تعزیر گاہ یا تعذیب گاہ کا کام لیا جاتا تھا اور جنرل فرانکو کے وہ سپاہی جو گرفتار ہو جاتے تھے ان میں سے بعض کو ان تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔

ان تہ خانوں میں نہ کوئی شکنجہ ہے، نہ زنجیر، نہ کوئی درہ ہے اور نہ کوئی آواز تعزیر، لیکن پھر بھی وہ اتنی سخت تعذیب گاہیں ہیں کہ شاید ہی ذہن انسانی نے ان سے زیادہ ظالمانہ طریقے انسان کو تکلیف پہنچانے کے کوئی اور وضع کئے ہوں۔

نفسیات کا مسلم مسئلہ ہے اور اس سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک خاص حد تک پہنچ کر جسمانی تکلیف کا بڑھنا رک جاتا ہے بلکہ شاید اس میں کمی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکیں تو اول یقیناً اسے بہت اذیت ہوگی بلکہ وہ اذیت ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد رک جائے گی اور شاید اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ درد کا خوگر ہوا انسان تو صٹ جاتا ہے رنج۔ بہر حال جسمانی اذیت کی ایک انتہا ہے، لیکن انسان کے حواس اور نفس کے ذریعہ سے جو تکلیف اس کو پہنچتی ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں اور یہ تہ خانے اسی علمی اصول پر طیار کئے گئے تھے۔

یہاں زندقیوں کو شکنجہ میں کسا جاتا تھا، نہ گرم لوہے سے دانا جاتا تھا، نہ ان کی آنکھیں ٹکالی جاتی تھیں، نہ ٹکلی میں بانوہ کر دروں سے جسم کی کھال اڑائی جاتی تھی۔ لیکن جس عذاب میں وہ مبتلا کئے جاتے تھے وہ ان سب سے زیادہ سخت تھا۔

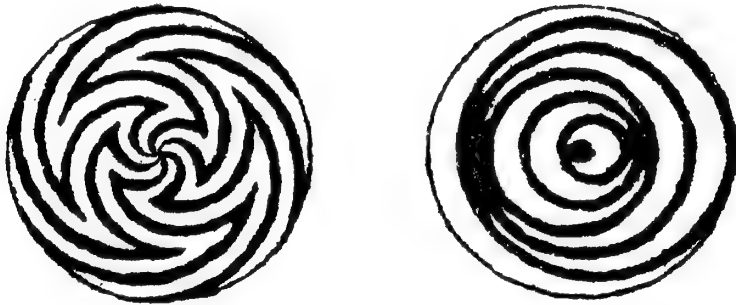
تہ خانوں کی دیواروں پر مختلف قسم کے رنگین دائرے اور دوسری ہندسی شکلیں بنائی گئی تھیں، مختلف رنگ کی تیز روشنیاں ڈالنے کا انتظام تھا، ایک ہی قسم کی آوازیں مسلسل پیدا کی جاتی تھیں اور یہی وہ عذاب تھا جس میں قیدی مبتلا کئے جاتے تھے، اور جس کا برداشت کرنا انسانی قوت سے باہر ہے۔

بارسلونا کے تہ خانوں کی تعمیر اور اس کی نقاشی ایک شخص الفانسو لارنٹ سک (Alfonso Laurenti Cirk)

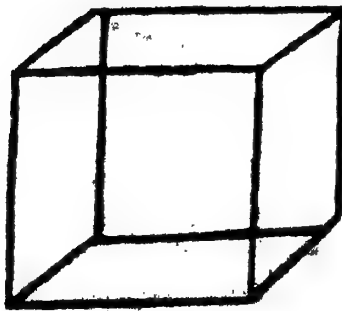
نے کی تھی جو یوگو سلوویا کا ایک نہایت ذہین انجینئر نقاش تھا اور اس کا بیان ہے کہ حکومت اسپین کی خفیہ پولیس نے ہجر اس سے یہ سب کچھ طیار کرایا تھا۔

دیواروں پر جو نقوش، دایروں، سیدھے ٹیڑھے خطوط اور دوسری ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں یہ سب حال ہی کے طیار شدہ ہیں اور تعذیب و تعزیر کی دنیا میں بالکل نئی چیز ہیں۔

ان نقوش کے ذریعہ سے تکلیف پہنچانے کا خیال اس اصول پر قائم ہے کہ اگر خاص قسم کے دایرہ یا نقوش مختلف روشنیوں میں نگاہ کے سامنے ہر وقت رہیں تو رفتہ رفتہ تکلیف برابر بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت لغو و مہمل معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس صفحہ پر جو دایرہ بنائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو آنکھ کے پاس لیجائیے اور جلدی جلدی نصف انچ کے دایرہ میں ان کو برابر گردش دیتے رہئے شاید چند سکند بھی آپ اسے برداشت نہ کر سکیں گے اور اسی پر قیاس کیجئے کہ اگر اس قسم کی تکلیف مسلسل پہنچتی رہو تو آپ کا کیا حال ہوگا۔



ان بصارت آزار دہ خانوں میں علاوہ دایروں کے کچھ نقوش کعبہ قسم کے بھی بنے ہوئے تھے جن کو غور سے دیکھنے کے بعد کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خالی صندوقوں کے نقشے ہیں اور کبھی ٹھوس کعبہ نظر آتے تھے۔ مثلاً:-



اصول کا اثر بھی بصارت پر نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔

یہ تو آپ کو یہ کھیل نظر آئے گا، کیونکہ آپ کے اختیار میں ہے جب تک آپ چاہیں دیکھتے رہیں اور پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن ان تہ خانوں کے قیدیوں کو یہ اختیار حاصل نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے پوٹے کاٹ دئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں پوٹے کے اوپر آہنی چھلے بڑھادئے جاتے تھے تاکہ وہ بند نہ ہو سکیں اور چونکہ ہاتھ پاؤں قیدیوں کے بازو دئے جاتے تھے اس لئے وہ ان کمانیوں کو ہٹا بھی نہ سکتے تھے جس طرف دیکھتے تھے یہی دایرے اور نقشے انھیں نظر آتے تھے اور اگر اس طرف سے نگاہ ہٹتی تھی تو پھر نہایت تیز روشنیوں پر پڑتی تھی جو اور زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی تھیں۔ رنگوں کے ذریعہ سے بھی عذاب پہنچانے کا یہاں انتظام تھا۔ صرف سیاہ و سفید دایروں سے بھی نگاہ کو تکلیف پہنچتی ہے، لیکن اگر ان کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جائے اور بہت سی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں بھی مختلف رنگ کی نگاہ کے سامنے دیں تو یہ تکلیف دوچند ہو جاتی ہے، چنانچہ ان تہ خانوں میں یہ بھی انتظام تھا کہ نہایت تیز روشنیاں مختلف رنگوں کی بدلتی رہتی تھیں اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دیواروں کے دایرے اور نقشے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر کے سامنے آتے تھے اور قیدیوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھوتوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔

اگر آپ سورج کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھتے رہیں اور پھر اُدھر سے نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو نگاہوں کے سامنے روشن دھبے ملتے ہوئے نظر آئیں گے کیونکہ قرص آفتاب کی تصویر پر وہ چشم پر مرسم ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی حال رنگ کا بھی ہے آپ غور سے دیر تک کسی ایسی تصویر کو دیکھئے جو نہایت سُرخ رنگ میں بنائی گئی ہو اور پھر نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو دیوار پر ہی تصویر سُرخ رنگ کی نظر آئے گی کیونکہ سُرخ رنگ کا معادن ہے۔ اب آپ خیال کیجئے کہ ان تہ خانوں کے قیدیوں کا جو تیز روشنی میں ان تیز رنگوں کے نقوش کو مسلسل دیکھنے پر مجبور تھے، کیا حال ہوتا ہو گا اور ان کی چکاچوند کتنی تکلیف کا باعث ہوتی ہوگی۔ رنگوں کا انسانی دماغ کو متاثر کرنا یقینی ہے لیکن مختلف لوگوں کی دماغی حالت پر مختلف رنگوں کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا پورا حال ماہر نفسیات کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا، لیکن سُرخ اور بنفشی رنگ کا بیجان انگیز ہونا ثابت ہو چکا ہے اور شاید سُرخ رنگ کو خطرہ اور جنگ کا رنگ قرار دینا اسی لئے ہے۔ جس طرح رنگ اور روشنی کے ذریعہ سے انسانی دماغ کو تکلیف پہنچ سکتی ہے، اسی طرح آواز سے بھی پہنچائی جاسکتی ہے اور ان تہ خانوں میں ایک خاص حصہ ایسا بھی تھا جہاں سامعہ کے ذریعہ سے قیدیوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ کئی ایک پٹولم لٹکائے گئے تھے جن سے ٹپ ٹپ کی آواز ہر وقت پیدا ہوتی رہتی تھی، لیکن یہ قیدیوں کے کان میں اتنی اونچی ہو کر پہنچتی تھی کہ نہایت بڑا ڈھول کان کے پاس بجایا جا رہا ہے۔ اور وہ رات دن ہر لمحہ ان آوازوں کو سننے پر مجبور تھے۔

ایک حصہ اس قید خانہ کا ایسا بھی تھا جہاں قیدیوں کو براہِ ٹنگین غرض پر چلنا پڑتا تھا اور ان کے قدموں سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ بعض آلات کے ذریعہ سے اتنی بلند و گرجت ہو کر ان کے کانوں میں پہنچتی تھی کہ وہ دیوانے ہو ہو جاتے تھے ان قیدیوں کو ایک جگہ ٹھہرنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے کوٹھے مار مار کر آگے بڑھایا جاتا تھا۔

مکتوبات نیاز

خط پہنچا، اب کیا پوچھتے ہو کہ کس ادھیر بن میں لگا ہوا ہوں۔
 ”تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا۔“ — صرف شاعری ہے، حقیقت نہیں — حقیقت یہ ہے۔
 ہم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
 سو، اب یہ دیکھو کہ ”ہم“ کیا ہیں؟ کچھ نہیں! — میر علیہ الرحمۃ نے شاید اسی منزل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ
 القصد، نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم،

سو، بھئی اب تو معاملہ اسی ”نہیں ہم“ کا ہے۔
 وہ گلیاں، جن میں ہم تم خاک چھانا کرتے تھے اب بھی وہی ہیں۔ لیکن جن دروں کی طرف پہلے دل کھینچتا تھا،
 آج وہی آنکھیں دکھا رہے ہیں، آفتاب کا طلوع و غروب وہی ہے، لیکن پہلے غروب کی خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ اسکے
 بعد طلوع ہوگا، اب طلوع سے بھی رنج پہنچتا ہے کہ اس کے بعد غروب ہے۔ پہلے کائنات کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے
 چڑھتی ہوئی ”ہوائی“ کو دیکھتے ہیں، آج اس کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ”ہوائی“ زمین کی طرف آرہی
 ہو۔ بے نور، بے رنگ!

لوگ کہتے ہیں، سمجھ چالیس کے بعد آتی ہے۔ لیکن اگر سمجھ اسی کا نام ہے تو شاید موت دنیا کی سب سے بڑی
 ”سمجھ“ ہے۔ جو ان جینا اور جو ان مرجانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ پھول وہی ہے جو کھلتے ہی پھنی سے چُن لیا
 جائے خشک ہونے پر زمین سے اس کی پنکھڑیاں کوئی چنتا بھی ہے تو پھول سمجھ کر نہیں بلکہ کیا ری صاف کرنے کے لئے!
 ابھی نہیں، کچھ دن اور گزر جانے دو، اس وقت تم اس کو بہتر سمجھ سکو گے۔ میں پاؤں توڑ کر پیٹھ جانے کا قابل
 نہیں، لیکن ہرزہ گردی کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارا ساتھ کیونکر دے سکتا ہوں۔

حضرت، آپ کے شکوہ محبت کی قدر کرتا ہوں اور محذرت خواہ ہوں کہ واقعی مجھ سے سخت کوتاہی ہوئی۔ لیکن
 ڈرتا ہوں کہ میری یہ سادگی بیان آپ کو اور زیادہ برہم نہ کر دے۔

میں نہیں تھا، لیکن سچ پوچھئے تو نہیں تھا۔ ایک عزیز دوست کی علالت نے اس قدر سراپیمہ رکھا کہ دنیا کا کوئی کام سوائے ان کی تیار داری کے کمر ہی نہ سکا۔ گو، اب خطرہ باقی نہیں، لیکن میری فکر اب بھی وہی ہے، بیماری کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کی ضد کی وجہ سے!

بہر حال اگر اب بھی وقت ہو تو لکھئے، تعمیل ارشاد کے لئے آمادہ ہوں۔ وہ خود یہیں آتے رہتے ہیں، میرے جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر انھیں ماننا ہے تو یوں بھی مان لیں گے، میری نقل و حرکت سے کیا ہوتا ہے۔

یہ آپ نے خوب کہا کہ جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا۔ آپ کو کیا خبر کہ ابھی دل میں کیا کیا ہے!

نالہ بسیار و آہ بسیار ست

در در دستگاہ بسیار ست!

یہ قسمت کا قابل ہوں نہ اس بات کا کہ ”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے“۔ آپ نے دیکھا ہو لیکن مینے تو بار بار تدبیروں سے قسمت کو اکٹ جاتے دیکھا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ اب میں کیا کرنے والا ہوں۔ لیکن ابھی تک مجھے خود نہیں معلوم۔ ہاں مایوس نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آج نہیں تو کل نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ ارادہ ہے کہ اخیر جنوری میں یہاں سے روانہ ہوں اور اس وقت تک واپس نہ ہوں، جب تک ادھر یا ادھر آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ کو البتہ تھوڑی سی مدد کرنا پڑے گی۔ لیکن ابھی نہیں، عین وقت پر بتاؤں گا، تاکہ آپ کو بہانہ تلاش کرنے کی فرصت کم مل سکے۔

زندگی کے کھیل میں دلچسپی پیدا کرنا ہو، تو پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھئے، ٹھوکریں کھائے اور قدم آگے بڑھائے، منزل تک پہنچ جانا، شاید اس قدر دلچسپ نہیں، جتنا منزل تک پہنچنے کا خیال۔ بہر حال دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔ ابھی آپ کی قیاس آرائیاں قبل از وقت ہیں۔

نیاز نوازیوں کا شکریہ، لیکن یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ سے دور ہو کر میں نے آپ کو بھلا دیا ہے۔ شاید آپ کو

معلوم نہیں کہ

آپ سامنے ہوں یا نہ ہوں — ”عالم ہے وہی جلوہ گری کا!“

قدرت کی طرف سے جن کے لئے رخم کھانا اور تڑپنا مقصود ہو چکا ہے۔ ان کے لئے آپ کو کیوں اتنی فکر رہتی ہے

نگاہوں کے نشتر وہی، جنگل کے کاٹے سہی۔ آپ نہیں آپ کی یاد تو ہے،

دل و صد آرزوئے خام، بدل

یار و چندیں فریب، دوشمن تنہا!

یقیناً پچھلی بار آپ سے بہت روروی میں ملنا ہوا۔ مجھے خدا جانے کیا کیا کہنا تھا، لیکن نہ کہ سکا، اور آپ نے بہت سی وہ باتیں بھی کہ ڈالیں جو نہ کہنا چاہئے تھیں۔ چنانچہ آپ نے نئے پیدا ہونے والے تعلق کا بھی ذکر مجھ سے کیا تھا؛ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تکمیل کو پہنچا یا نہیں؟ تحریر کے سرورق پر جو پتہ درج ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھی تک نہیں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ ”اُدھر“ ہو۔ اور اُدھر اس کا اظہار نہ ہو۔ دودھاری تلوار کا کیا کہنا!

آپ میرے اس استفسار سے بدگمان نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی نہ پوچھیں کہ میں یہ کیوں پوچھتا ہوں۔ بس پوچھتا ہوں، یونہی پوچھتا ہوں۔
”چہ تو ال کرد، مرا باتو سرے اُفتادست“
اگر فرصت ہو تو کبھی کبھی یاد کر لیا کیجئے۔ اور میری اس حسرت کو کبھی نہ بھولنے کہ
نہ باتو رنتم دئے میتو در غمت مُردم
یکے زد دست نیامد ازیں دو کار مرا

آپ کا خط، جسے ”شہر آشوب“ کہنا زیادہ موزوں ہے، پہنچا۔ یوں کہئے آپ کی جو اتردی کی تعریف کر دوں، لیکن ”جوانمرگی“ کی بات ہی اور ہے۔ آپ لطف و مسرت کی جستجو کرتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ
باز می جویم دلِ اسردہ را
آں دل و آں خاطر آزرده را
آپ کو کیا خبر کہ ”تنہا ملول بودن و تنہا گریستن“ بھی ایک عالم ہے۔

انسان پر بعض اوقات دو حالتیں نہایت عجیب گزرتی ہیں، ایک، بغیر سوچے کام کرنے کی اور دوسری، بغیر کھلے ہوئے سوچتے رہنے کی۔ آپ اُس عالم سے گزر رہے ہیں اور میں اس عالم سے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی نہ آپ کو اپنی سرگردانی سے کچھ ملنا ہے اور نہ مجھے اپنی حیرانی سے!

زخمہا دارد تفاوت درمیاں
ورنہ خار و شتر و مژگان یکے ست

مجھے وعدہ یاد ہے اور اس کے ایفاء کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن آپ کے تقاضہ سے نہیں، اپنی خوشی سے۔ پھر ایسی جلدی کیا ہے۔ وقت آنے دیجئے، میں اور میری تمام ”نارمائیاں“ آپ کے لئے وقف ہیں۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں اور اس قدر خفا ہوں کہ بات کرنا پسند نہیں کرتا، پھر کس امید پر مجھ سے خط و کتابت کی جرأت کرتے ہو۔ تم نے جو وعدہ مجھ کو پہنچایا ہے وہ ایسا نہیں جسے میں آسانی سے بھول

جاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ”عذر ہائے لنگ“ کی کمی نہیں اور شاید اسی اعتماد پر تم نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں بھی اتنا احمق نہیں کہ آنکھ بند کر کے تمہاری ہر بات کو مان لوں !

”درتوبہ“ کبھی بند نہیں ہوتا یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے طیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمہارے ”اعترا“ کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ ”بت شکنی“ کا کفارہ ”تعبیر کعبہ“ سے بھی نہیں ہو سکتا، تمہاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے !

قبلہ محترم

آپ کا ادنیٰ اشارہ میرے لئے ”فرمان خداوندی“ ہے، چہ جائیکہ آپ کسی بات پر اتنا اصرار فرمائیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کیوں۔ مجھے کس قدر مسرت ہوئی اگر بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے، آپ میری طرف سے انھیں مطمئن کر دیتے۔

انھیں بھیجئے، میری ہر امکانی کوشش ان کے لئے وقف ہے، لیکن کامیابی کے لئے غالباً آپ کے معافی تصرف کی بھی ضرورت ہوگی۔

کعبہ مستمنداں، ایک زمانہ ہو گیا کہ آپ مجھ سے بغیر ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ اس کا سبب ناخوشی تو نہیں — درگاہ گرامی کے ساتھ مجھے لاکھ عقیدتمندیاں سہی۔ لیکن ”رد و قبول“ کا اختیار تو حضرت ہی کو حاصل ہے۔ اور میں شاید اس منزل سے ابھی دور ہوں جب ”سجدہ“ بے نیاز ”مسجود“ ہو جاتا ہے۔

میری آشفٹ خیالیاں بدستور اپنی جگہ قائم ہیں اور اگر ان میں کوئی تغیر ہوا بھی تو یہ کہ اب نہ ”نالہ نیم شبی“ میں کوئی لطف باقی رہا نہ ”دعائے صبح گاہی“ میں — حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اس کی تکمیل میرے اختیار میں نہیں۔ ہاں، اگر لطف شما پیش نہ ہد گائے چند !

سید صاحب قبلہ آج کل کہاں ہیں ؟ اگر وہاں ہوں تو میرا سلام قبول فرمائیں۔

شادی مبارک ! عدم شرکت کا مجھے واقعی سخت افسوس ہے، لیکن تمہارا اصرار بھی کچھ یونہی سا تھا، نہایت کمزور قسم کا۔ ورنہ میرا نہ پہنچنا کیا معنی ؟

”ابنی مون“ کا زمانہ کہاں بسر کیا جائیگا بربنگلور میں ؟ یہ میں تم سے نہیں پوچھ رہا، بلکہ کسی اور سے پوچھ رہا ہوں — جو آپ تھیں دو گے لیکن وہ تمہارا نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہو کہ آئندہ ماہ کی کسی تاریخ میں بمبئی جانا پڑے۔ اسلئے میری جوائے ہو سکتی ہو وہاں آکر

صحیح کہتا ہوں میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ تم کو خط لکھوں گا۔

پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچارجی سے ہم

تمہاری علالت کا حال سن کر دل بچپن ہو گیا۔ خدا کے لئے لکھو کہ معالج و مداوا کی کیا صورت اختیار کی ہے، وہ حرارت جگر ہو یا التهاب خون، ان میں سے کسی کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو تمہیں جگہ بدلنا چاہئے اور گوشت یک لخت ترک۔

قدرت الگو بیمار ڈالتی ہے تو علاج بھی کرتی ہے۔ کھلی ہوئی صاف و خشک ہوا، پھیلوں کا استعمال، مقررہ اوقات پر مقررہ ہلکی غذا اور دماغی سکون۔ سب سے زیادہ ضرورت ان چیزوں کی ہے اور یہ تمہیں وہاں میں نہیں آسکتیں۔ بہاڑوں پر جانے کا موسم نہیں ہے اس لئے کم مرقع مقامات کا انتخاب مناسب ہوگا۔ اس صوبہ میں دیرہ دون، اور پنجاب میں کیمبل پور بہترین مقامات ہیں۔

اگر واقعی تم اس کے لئے طیار ہو (اور طیار نہ ہونا کیا معنی، ہونا پڑے گا) تو مجھے لکھو، میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا، ابتدا ہی میں اس کی روک تھام ہونی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس باب میں ضد سے کام نہ لو گے اور بوایسی ڈاک مجھے اطلاع دو گے کہ کس تاریخ تک جانے کا ارادہ ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے سے انتظام کیا جائے۔ میں تو تمہارے ساتھ ہوں، سب ہو جائے گا۔

یہ بالکل صحیح ہے موت کا ایک وقت مقرر ہے، لیکن وقت قدرت کا مقرر کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود انسان اُسے مقرر کرتا ہے اور مثال بھی سکتا ہے اگر وہ چاہے۔ صحت کی حالت میں وہ طفلانہ اور ذرا سی بیماری میں یہ کم ہمتی! کس قدر شیوہ مراد کے خلاف ہے۔ عزم انسانی کے معجزے تم نے ابھی دیکھے ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں آتا ہوں۔ تمہیں کافر بنا کے نہ چھوڑا ہوتا بات نہیں!

تم نے بالکل صحیح سنا ہے۔ واقعی ایک زمانہ سے میرے ان کے درمیان سلسلہ مراسلت بند ہے، لیکن اسکا سبب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آخری بار ان سے دہلی میں ملنا ہوا تھا اور ایک ہفتہ تک برابر ساتھ رہا۔ شاید تین چار سال کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ ایران چلے گئے اور وہاں سے عراق وغیرہ ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد واپس آئے۔ ان کے خطوط برابر آتے رہے۔ واپسی پر انہوں نے ایک خاص معاملہ میں مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور وہ میں ان کی خواہش کے مطابق نہ دے سکا۔ اس کے بعد پھر انہوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور مجھے بھی کوئی موقع نہ سوچے گا نہ ملا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔

بعد کو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور کافی نقصان اٹھایا۔ ہو سکتا ہے

کہ یہ حجاب اسی لئے ہو۔ بہر حال، میں انھیں لکھتا ہوں۔ اگر مان گئے تو خیر، ورنہ اس میں نقصان ہی کیا ہے۔

ابھی ابھی تمہارا کارڈ ملا، میں تمہاری محبتوں کا معترف ہوں اور اسی اعتماد کی بنا پر تم کو کبھی خط بھی نہیں لکھتا۔ تم نے خواب بالکل غلط دیکھا۔ میں بالکل اچھا ہوں اور فی الحال پندرہ بیس سال تک بیمار پڑنے کا ارادہ بھی نہیں۔ تقدیروں کو پلٹ دینے والا انسان ہوں، تمہیں معلوم نہیں؟ یہ مدرسہ عالیہ کے پرنسپل کی خبر مرگ مجھے کیوں سنائی۔ کیا کوئی بڑے مرد معقول تھے؟ میں تو ان سے واقف نہ تھا۔ امسال عرس میں ضرور شریک ہوں گا۔ مولانا مرحوم کی خصوصیات جسوت یاد آ جاتی ہیں تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ سرزمین رامپور کا سب سے پہلا اور آخری انسان تھا۔

عرشی صاحب سے میرا سلام کہدو۔ مجھے اُن سے باوجود اُن کے مولوی ہونے کے بڑی محبت ہے۔ چند دن ہوئے اتفاق سے اسماعیل (ذبیح) ملے آگئے۔ بڑی مشکل سے بیٹے انھیں پہچانا، اب تو بھٹی، وہ کہہ میں رہتے ہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔ دُہائی ہے کعبہ والوں کی!

کرمی۔ آپ نے جو تجویزیں نگار کی ترتیب کے متعلق سوچی ہیں وہ یقیناً ملک کے لئے بہت مفید ہیں، لیکن کوئی ایسی تجویز بھی تو سوچئے کہ ملک، نگار کے لئے مفید ثابت ہو۔ خشک داد سے کب تک کام چلے گا۔ اٹھارہ سال کی جانکاہی کا صحن یہ تھی کہ آپ ”سبحان اللہ“ بلکہ خاموش ہو رہیں، اور میں خون کا سا گھونٹ پیکر بچاؤں کم از کم میری سمجھ میں تو آنا نہیں۔

بزم جم آخر شد وقت صبح ماہ سید

طرح دیگر می تو اس انداخت دور جام را

لیکن یہ ”طرح دیگر“ کیا ہو سکتی ہے؟ سوائے اس کے کہ جام دینا کو چور کر دیا جائے اور بساط کو ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا جائے۔ اب تو یہی سوچ رہا ہوں۔

ایک غلطی کی تصحیح

جناب حمید سکرٹری بزم نظیر آگرہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ نظیر کی قلمی تحریر حسب عکس نگار کی گزشتہ اشاعت میں شائع ہو اسے، انھوں نے بھیجی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا اور ایک دوسرے صاحب کا نام صحت ہو گیا۔ جناب حمید امید ہے معاف فرمائیں گے۔

نیاز

جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ

”اور سب سے بڑی بات جس میں سمجھنے کو جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی جتنے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری، ہمارے دلوں کی کیفیت ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے۔ کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے جتنے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور جستی شلاب ہوتی ہے۔“

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسف)

جامعہ ملک کا وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں تعلیم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت دی جاتی ہے۔ چنانچہ دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ جامعہ کا سلوک بالکل مختلف ہے۔ عموماً ہمارے تعلیمی ادارے یہی اپنے فرض کی انتہا سمجھتے ہیں کہ سال بعد سال اپنے طلبہ کو کتابیں پڑھا کر ان میں بعض مہارتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور آخری درجہ میں اپنے طلبہ کو کسی پبلک امتحان میں شریک کر کے ان کے اہل یا نا اہل ہونے کا فیصلہ کر دیں۔ گویا ان اداروں کا سلوک اپنے طلبہ کے ساتھ اس سوتیلی ماں کا سا ہے جو اگر بچوں سے پیار بھی کرتی ہے تو اس نیت کے ساتھ کہ وہ جلد سے بڑھ کر اور ناکارہ سے ناکارہ تر بن جائیں۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے یعنی جس وقت ہمارا طالب علم فارغ التحصیل ہو کر دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو ایک اجنبی کی حیثیت میں پاتا ہے اور اپنے آپ کو اجنبی کیوں نہ سمجھے، مدرسہ اور سماج کے درمیان اسے ایک ایسی خلیج نظر آتی ہے جس کا کبھی اسے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی باعث ہمارے طالب علم کے دماغ میں ایک نہایت تکلیف دہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر یا تو وہ اپنی تعلیم کو کیر فریب اور استادوں کو فریب کا سمجھنے لگتا ہے یا پھر دنیا کے ہر مطالبہ کو ہیج اور جہل سمجھ کر اسے ٹھکرانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ دنیا کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ہمارا طالب علم ہی خود کشی میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ تعلیم جو ان نتائج کی حامل ہو دنیا کے کسی ملک کے لئے سازگار ثابت نہیں ہو سکتی اور بالخصوص اس ہندوستان کے حق میں جس کی آزادی ہنوز ایک خواب بے تعبیر کی حیثیت رکھتی ہو، جس کی معاشرت تباہ اور جس کا تمدن برباد کیا جا چکا ہو یہ تعلیم پر ہی اکتفت ہے۔ مروجہ تعلیم کے باقی نے چاہا تھا کہ اس تعلیم کے ذریعے غلام پیدا ہوں۔ چنانچہ غلام پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں۔ آج میکائے کی روح اور سیاست کی روٹی کھانے والے انگریز کا دل اپنی کامیابی پر بے حد نازاں ہے۔

لیکن اس قلیل عرصے میں جامعہ اپنے نصب العین سے عملاً کس قدر معروف ہو چکی ہے۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ قردول باغ میں گردوارہ روڈ پر شام کے وقت اکثر آپ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کچھ بچے دیکھتے ہیں۔ بچے صاف تھرے پن اور بھولے بھالے پن میں اس ماحول کے تمام بچوں سے مختلف ہوں گے۔ انہیں ذرا قریب سے دیکھتے ان میں سے ہر بچے کے دانت موتی کی طرح صاف ہوں گے، اس کے ناخن ترشے ہوئے ہوں گے اور گرد و غبار سے بچنے کے لئے اسکی جیب میں رومال ہوگا۔ آپ ان میں کسی بچے کو روکے۔ بچہ بے خون ہو کر لپکا اور آپ سے کہیگا ”فرمائیے“ آپ اس سے کسی کا پتہ پوچھئے۔ وہ بہت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ آپ کو پتہ بتا دیگا اور اگر آپ نے ذرا پریشانی ظاہر کی تو یہ بچہ خود آپ کا راہبر بن جائیگا۔ آپ کو منزل تک پہنچائے گا، ترگشنگی کے ساتھ ”آداب عرض“ کرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ یہ جامعہ کا بچہ ہے۔

جامعہ کے بچے سے اس سطحی تعارف کے بعد آئیے میں آپ کو اس کی زندگی سے اور زیادہ قریب لے چلتا ہوں۔ شہر کی زہریلی ہوا سے دور، شہری زندگی کی خامکاریوں سے الگ اور مصنوعی تہذیب کی حدود سے باہر۔ اوکھلا میں جس جگہ ہماری موٹر رکتی ہے وہاں بائیں جانب ایک عالی شان دو منزلہ جرمن طرز کی سرخ عمارت نظر آئے گی۔ دور سے یہ عمارت قرب جوار کی ناہموار زمین پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے الالہین کے چراغ والے جن نے کہیں سے اٹھا کر اسے یہاں لا رکھا ہے۔ لیکن یہ کسی ہندوستانی ”چراغ الہ الدین“ کا محل نہیں ہے۔ یہ جامعہ کے بچوں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں ہندوستان کے سواد و سو بچے ہندوستان کی زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں وہ گھر، جہاں کے بچے پروان چڑھ کر استبداد کی گردن پر پاؤں رکھیں گے وہ گھر جہاں کے رہنے والے دولت کی لعنت اور دراشتی کبر و خصوصیت کے گلے پر چھری چلا دیں گے۔ کیونکہ ان کا مشرب ہے ”جاگو اور جگاؤ“

جو ہر منزل، حالی منزل، اقبال منزل، انصاری منزل، محمود منزل اور اجمل منزل۔ اس عمارت میں چھ اقامت گاہیں ہیں۔ آپ ان ناموں سے سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ ابتداء ہی سے بچہ میں کس حد تک اپنے قومی ورثے کو صحیح زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی عادت ڈالتی ہے۔ آئیے اب ذرا ایک اقامت گاہ میں چلیں۔ دیکھئے ان بچوں کے بستر کس سلیقے سے لگے ہوئے ہیں۔ بستروں کے درمیان ہر جگہ ایک سا فاصلہ ہے۔ گویا کل کمرے کی پیمائش کر کے بستروں کی جگہ قائم کی ہے۔ یہ کمرے کے پیچھے دیکھئے انکے استعمال کے کپڑے تنگے ہوئے ہیں اور یہیں ایک قطار میں سب کے جوتے رکھے ہوئے ہیں کوئی ان میں دیکھنے پینے کا پانی ایک گھڑ میں رکھا ہے۔ صفائی کے لئے گھڑے میں صابن کا ٹکڑا لگا ہوا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوئی ہیں وہ اسی کمرے کے رہنے والوں کی تحنیل کی ترجمان ہیں۔ یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بچے کے فطری رجحانات اور ذوق و شوق کی پزیرائی کے کیا مواقع ہیں۔ یہ بچے منہ انوہیر اُٹھتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر بون گھنٹہ کھلی ہوا میں وندش کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک بڑے خانہ دان کی طرح ایک ساتھ بیٹھ کر ڈانٹنگ ہال میں ناشتہ کرتے ہیں۔ جس فحاست کے ساتھ یہ بچے ناشتہ کرتے ہیں وہ آپ کو

دوسری جگہ کے بڑے طلبہ میں بھی کم نظر آئے گی۔ ڈائننگ ہال میں انتظام کرنے کے لئے ہمراہ ہر جماعت اپنے دو نمائندے منتخب کر کے بھیجتی ہے جو ڈائننگ ہال میں کھانے کے وقت اپنی اپنی جماعت کی ضروریات پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ناشتے کے بعد سب بچے ترانے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اُس وقت جب اس عمارت کے ایک گوشے سے دوسو معصوم آوازیں

باتھ اٹھائے، سر کو جھکائے

رحم پہ تیرے آس لگائے

گاتی ہوئی اُٹھتی ہیں تو دل کی رگ رگ میں ایک گونج پیدا ہو جاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے تو یقیناً انسان اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ ”ترانے“ کے بعد دن کے ضروری اعلانات ہوتے ہیں پھر کل کی کھوئی ہوئی چیزیں جن میں جوئے، ٹوپیاں، تولیاں، چاقو، ربر، پنسلیں سب ہی کچھ ہوتا ہے بچوں کو واپس کر دی جاتی ہیں اور پھر مدرسہ شروع ہوتا ہے۔

درجے میں بھی بچے اپنے بچپن سے دور اور زندگی سے الگ نہیں ہونے پاتے بلکہ یوں کہنے کے زندگی ہی ان کے لئے ذریعہ تعلیم ہے۔ چنانچہ جامعہ کا بچہ زبان سیکھتا ہے، اس لئے نہیں کہ اسے زبان کا امتحان دینا ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حساب لیکھتا ہے اس لئے نہیں کہ حساب اسکے نصاب میں شامل ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے چڑیاخانہ، بچوں کی دوکان اور بینک کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ وہ سائنس پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ سائنس کے کچھ اصول رٹ کر اچھے نمبر حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر اس سے کبھی (woman in science) کی شیشی نہ کھلے تو وہ ایک دیاسلائی سے اس کا ڈھکن گرم کر کے اسے کھول سکے۔ وہ سماجی علم پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ریل کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر دوسرے مسافروں کو دھکا دے بلکہ اس لئے کہ خود بھی آرام سے سفر کرے اور دوسروں کو بھی آرام سے سفر کرنے دے۔ وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ افیونی بن کو جنت و جہنم کے خواب دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کرے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسروں کی مصیبت میں خدا کا ہاتھ بن کر کام آئے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کا بچہ زندگی اور دنیا سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ سماج میں اپنی جگہ پہچانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا سماج بڑا اور سماج کا اس پر کیا حق ہے۔

دوپہر کو کھانے بعد بچے کچھ آرام کرتے ہیں۔ شام کو ان کے لئے ہر قسم کے کھیل کا انتظام ہے۔ زیادہ چھوٹے بچوں کے لئے جھولے اور سلاٹ موجود ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ریڈیو پر کچھ دیر گانا اور خبریں سنتے ہیں۔ پھر وقت پر سو جاتے ہیں۔

ان کھیلوں اور دلچسپیوں کے علاوہ جن کا مدرسے کی طرف سے انتظام ہے بچوں کی اپنی نجی دلچسپیاں بھی ہیں بینک پھلوں کی دوکان، کتابوں کی دوکان اور چڑیا گھر کے انتظامات کے علاوہ ایک پندرہ روزہ ”بچوں کا اخبار“ بھی ان کا نجی معاملہ ہے۔ اس اخبار کے ”عید نمبر“ اور ”دیوالی نمبر“ بہت دلچسپ تھے اور اشتہاروں کے ذریعے باضابطہ طور پر ان نمبروں کا پروپاگنڈا کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف بچے اپنے لئے ایک موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ تصاویر اور معلومات الجھکی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ایک بچے نے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے، بچوں ہی کی تصاویر کا ایک ایسا مجموعہ

مجھے یہ اہم سب سے زیادہ پسند ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے کہ اس بچے کو اپنا بچپن کس قدر عزیز ہے اپنی باتوں، کپڑے، کوٹے، ٹکٹ اور سب جمع کرنے کا شوق تو عام ہے۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ ہر جماعت کی ایک یونین ہے جس میں باقاعدہ مختلف کاموں کے لئے فزیروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر مہینے یونین کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں بعض مفید باتوں پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔

آئیے، اب میں اپنے چند دوستوں سے آپ کی ملاقات کراؤں۔ دیکھئے یہ ایک چھوٹا سا بچہ جوبنی ادنی ٹوپی اور گرم کوٹ میں اسکیمو معلوم ہو رہا ہے درجہ دوم کا طالب علم ہے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال کی ہوگی اور اس کا نام قاضی اسرار ہے۔ جامعہ میں میری دوستی سب سے پہلے اسی بچے سے ہوئی تھی۔ اسے کہانیوں کا بیحد شوق ہے۔ ایک دن سحرگشت کے سلسلہ میں اس نے مجھے یہاں سے نہر تک چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ اس کا ہیئت تقاضا ہوتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں۔ میری انگلی پکڑ لیتا ہے اور ساتھ رہنے کے شوق میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھاگتا جو حتیٰ کہ اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ پھر میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں ایک اور بچہ دیکھئے۔ اس کا نام رضوان ہے۔ چہرہ کیسا گول گول ہے، آنکھیں کس قدر روشن۔ ہر بات سے بھولا پن پرستار ہو گیا معصومیت کا دیوتا ہے۔ ورڈسورٹھ نے ایسے ہی کسی بچے کے قدموں میں آسمان دیکھا ہوگا۔ اسے بھی میری گود میں جڑھکر مجھ سے باتیں کرنے کا اور میری انگلی پکڑ کر چلنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہاں وہ ایک بچہ بھی جس نے ہمیں دور سے سلام کیا، عجیب بچہ ہے۔ ذہانت اس کے چہرہ سے برسی ہے، گو لکھنے پڑھنے میں زیادہ تیز نہیں ہے۔ جب میں سب سے پہلی مرتبہ ڈاننگ ہال آیا تو انھوں نے ”السلام علیکم“ کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ”آپ کس سیاسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں؟“ تو میں ک سیاست کو سیاست کی طرح سمجھنے کا عادی ہی نہیں، ذرا گھبرا سا گیا۔ اپنی ذمات چھپانی تھی اس لئے خاموش رہا لیکن انھوں نے پھر نئے شوق کے ساتھ مجھ سے کہا ”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں کسی سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا۔“ میرا جواب تھا۔ اس پر اس بچے نے تیار بگاڑ کر مجھ سے کہا ”واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا، ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں مختلف چیزیں انتخاب کرنی ہوتی ہیں۔ اسلئے کوئی سیاسی ادارہ بھی آپ کا پسندیدہ ضرور ہونا چاہئے۔“ جامعہ میں یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک بچے سے مجھے ملا۔ یہ ملاقات تو یہیں ختم ہوگئی لیکن اپنی اولین فرصت میں ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی، چائے پی پھل کھائے اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ان کا نام مصطفیٰ راشد صدیقی ہے۔ درجہ ششم میں تعلیم پاتے ہیں اور چڑیا گھر کے ناظم ہیں۔ وہ ایک صاحب جو ابھی ابھی نظر بجا کر ادھر سے نکل گئے منیر الدین قادری ہیں خدا نے ذوق اور ذہن دونوں دے دیں مدرسے کے بہترین مصور ہیں۔ ہم دونوں کو ایک تعلیمی سفر کے سلسلہ میں قریب دو مہینے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ کس حد تک جامعہ اپنی تربیت کے اثرات بچوں کے ذہن میں مستقل طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ میں روز اس بات کی تلاش میں رہتا تھا کہ دیکھوں منیر جامعہ کے اصولوں سے کس جگہ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن میری جستجو فضول تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ جامعہ کا بچہ ہر جگہ اپنی جامعہ بنا لیتا ہے۔ منیر کو اس کسبی میں زبان پر تحیر کن قبا اور قدت حاصل ہے۔

میرے سامنے بیٹھ کر اپنی ڈائری کے صفحے کے صفحے بیکر کاغذ لکھے چلے جاتے تھے اور مضمون کے تسلسل میں سرسوفرق نہیں آتا تھا۔ ”بچوں کا اخبار“ انھیں کی یادداشت ملتا ہے۔ عبداللہ نعیم اور محمود سے آپ کی ملاقات اور کرنا لیکن وہ اس وقت کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ جامعی بھائیوں میں یہ بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔ یہ توجند وہ ستارے تھے جن سے مجھے اپنا آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ آپ پھر لکھنؤ کی جامعہ سے جامعہ کے بچوں کو دیکھنے اور غور کیجئے کہ دوسرے مدرسوں میں تعلیم پائے ہوئے بچوں سے کس قدر مختلف ہیں۔ بڑے بڑی بات جامعہ کے بچے ہیں۔ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُستاد موجود ہو یا نہ ہو لیکن اسے اپنے کام میں لگے رہتا۔ اسکے علاوہ جامعہ کا بچہ اگر ادھندوستان کی حیثیت سے رہنا پسند کرتا ہے۔ اسلئے اسکے نزدیک سماجی امتیازات اور پابندیاں لایینی سی چیزیں ہیں اور وہ ان بان جسے کرے کی آن بان کہنے اسکے یہاں تھرا ہے۔ یہ بچہ غریب گھر کا ہو یا امیر لیکن صاف رہنے کے لئے خود ہی پٹے جوتے پر بالمش کر لیتا ہے اور خود ہی کپڑے بھی دھو لیتا ہے۔ جامعہ کا بچہ وقت کی پوری قدر کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وہ دوسروں کے پاس جا کر ان کا وقت برساتا نہیں کرتا لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جامعہ کا بچہ عمر سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں جب موقع ہوتا ہے تو شور مچاتا ہے اور خوب شور مچاتا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے لڑ بھی لیتا ہے اور پھر جواب میں پٹ پٹینے پر دوتا بھی ہے۔ ملک اور قوم کے بچوں کی اس خدمت کے باوجود کچھ لوگ جامعہ سے غما ہیں اور وہ اس لئے کہ جامعہ انکے بچوں کی تربیت کا ذمہ دے سکی۔ ہمارے ان بزرگوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے کے شوق کے ساتھ ساتھ جامعہ کی مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھیں۔ جامعہ ایک اتھارٹی ورگاہ ہے اور اسے اپنا طریقہ تعلیم کامیاب بنانے کے لئے دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر ضرورت سے زیادہ کمزور کسی بچے کو یا کسی ایسے بچے کو جو یہ لحاظ نہ کرے صحیح ذہنی استعداد حاصل نہیں کر سکا ہے۔ داخل نہ کرے۔ جامعہ کا یہ رویہ والدین کے لئے ناگوار ہو تو ہو لیکن جامعہ والدین کو خوش کرنے کے لئے بچہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ کچھ قسمی قسم کی غلط فہمیوں سے متاثر ہو کر بعض احباب نے جامعہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنا ”شفلی فرصت“ بنا رکھا ہے میری حیرت کی انتہا رہی جب ۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو میں نے بمبئی میں مکتبہ جامعہ کی شلخ کے قریب دیر اور پرے اشتہار لگا دیکھا ”جامعہ کی کتب، بایکٹ کرو۔ جامعہ بچوں کو دین کی بجائے کاشی کا راستہ دکھاتی ہے۔ نیا قاعدہ ص ۲۲۔ یہ اشتہار دیکھ چکے کے بعد میں نے اپنی سب سے پہلی فرصت میں نیا قاعدہ دیکھا۔ صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے جیسے تھے یادداشت سے نقل کرتا ہوں۔ ”ریل میں بیٹھ۔ سفر کرتے ہوئے چلے لا۔“ آپ خود سوچئے اگر کیا یہی کاشی کی راہ دکھانا ہے؟ پھر ان معتز ضعیف کو اگر تعلیم دے دیا بھی لگاؤ ہوتا تو جانتے کہ ہندوستانی بچے کے لئے متحرک اور متحرک پڑھنے زیادہ قریب کی چیز ہیں نہ کہ لکڑے کا مظہر اور مدیہ منورہ۔“ یہ اصول کہ بچے کے لئے تعلیمی مواد بچے ہی کے ماحول سے لینا چاہئے اب اتنا نیا بھی نہیں ہے کہ کہیں کے مسلمان اسے نہ جانتے ہوں۔ لیکن جس قوم کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہو کہ اسے مٹانا ہے اس کے لئے کوئی انسان کہہ بھی لیا سکتا ہے۔ جامعہ کا اگر کوئی قصور اور کفر ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک بیدار قوم بنا کر ہندوستان میں امن و سکون کے ساتھ رہنا سکھاتی ہے لیکن ہندوستان کے مسلمان کو ہندوستان میں رہنا ہی کب ہے۔ اسے تو افغانستان، ایران، عرب، فلسطین، ترکستان اور مصر میں جا کر ان آزاد مسلمانوں کی حمایت میں کٹ مڑنا ہے جنہیں اس غلام مسلمان کی ضرورت نہیں یا ہندوستان میں سرسے کے ایک مسافر کی طرح زندگی کے دن پسے کر کے آسمان کا رخ کرنا ہے۔ جامعہ آپ کو بچہ ہو گا روپے سے نہیں بنی ہے۔ اسکی بنیادیں ایشیاد اور خلوص پر رکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ان بے شمار دشواریوں کے جس قسم کے اداروں کے سامنے آتی ہیں جامعہ دوزخ و زانیہ نصیب اللہین سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ جامعہ کی مسلسل ترقی کا ایک ثبوت ”اُستادوں کا مدرسہ“ بھی ہے۔ ”اُستادوں کا مدرسہ“ اس سال اپنی زندگی کا دوسرا سال پورا کر رہا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جس اُستادوں کے مدرسے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر حسین صاحب، پروفیسر محمد رحیم صاحب اور پروفیسر عبدالغفار صاحب جیسے اُستادوں کی سعی و کوشش وابستہ ہوں اسے جدید تعلیمی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کس معیار کے اُستاد تیار کرنے چاہئیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس ادارے کو بھی اپنی نوعیت کے باء بعض سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جامعہ کا یہ ادارہ بھی اپنے پیشرو اداروں کی طرح ہندوستان کے بچوں کے مابین تعلیم سے خراج فہمی حاصل کر چکا ہے۔ اور یہ سب خلوص کا گہرا اور ایشیاد کا سحر ہے۔ اسی سحر پر جامعہ کا کام چلا ہے اور چلیگا۔

فضل الدین اختر ایم۔ اے

باب الاستفسار

موجودہ جنگ کا نتیجہ

(جناب سید اسماعیل حسن صاحب - ناگپور)

آپ کے جو مقالے جنگ کے متعلق نگار میں شائع ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سیاسیات عالم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن ہمیں تو آپ صاف صاف الفاظ میں یہ بتائیے کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا، آئندہ یہ کیا صورت اختیار کرنے والی ہے اور ہم لوگ کب تک اس مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔

(نگار) آپ ایسے مسئلہ میں مجھ سے پیشین گوئی کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آج کوئی نہی ہوتا، تو شاید وہ بھی اسکی حرمت نہ کر سکتا۔ بڑے بڑے انبیاء نے متعدد دلائل و اسباب لڑی ہیں، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ ہمیشہ ان کے موافق ہوا ہے، اگر انھیں نتیجہ کا علم ہوتا تو وہ کیوں لڑتے اور کیوں انھیں شکست ہوتی۔

تاہم حالات کی بنا پر یہ ضرور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ حکومتوں کے نظام پر اس کا بڑا زبردست اثر پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ یا تو عالم میں ایک مستقل امن و سکون کی صورت پیدا ہو جائے، یا اس سے بھی زیادہ ہولناک جنگ کے اسباب رونما ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فرانس و برطانیہ کا علی اتحاد اور امریکہ وغیرہ دو سری جمہوری حکومتوں کی اخلاقی ہمدردی ہے۔ اتنا زبردست محاذ ہے کہ جتنی دیر ورس کا باہمی تعاون اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آگے چل کر جمہوری حکومتوں کے مقابلہ میں لڑائی کا سارا بوجھ انھیں دو کے سر پر پڑ جائے گا اور یورپ و ایشیا کی کوئی اور حکومت ان کا ساتھ نہ دے گی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے تین سال تک لڑنے کا ارادہ تو کر ہی لیا ہے۔ لیکن پرنسٹون کے خیال کے مطابق اس میں ایک حشر اور بڑھانا چاہئے۔ جرمنی کی طیاروں کا صحیح علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن اگر

اس کے بیانات سے بالذکر کا حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو بھی وہ کم از کم ایک سال تو آسانی سے مقابلہ کر ہی سکتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس دوران میں بعض گتھیاں ایسی نہ پڑیں کہ ان سے وہ جائز یا ناجائز فائدہ اٹھا کر اور کئی سال تک اس آگ کو مشتعل نہ رکھ سکے۔ میں نے اس اشاعت کے ملاحظات میں زیادہ تفصیل کے ساتھ جنگ کے مستقبل پر بحث کی ہے، آپ اسے پڑھئے اور پھر بھی اگر کوئی بات آپ کو تشنہ نظر آئے تو مجھ سے دریافت فرمائیے۔ بہر حال آپ اور ہم سب کو نہایت سخت مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے طیارہ رہنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس موقع کو محض توکل بخدا ایک بیکساز خاموشی کے ساتھ گزر جانے دیا تو پھر اس کے بعد جو دور ہندوستان پر آئے گا وہ ایک لازوال غلامی کا ہو گا اور اس سے صدیوں تک نجات ملنا مشکل ہے۔

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب فضل حسین صاحب۔ رانچی)

معلوم نہیں اس سے پہلے جن محفرت نے استفسار کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، وہ آئندہ اس کو جاری رکھیں گے یا نہیں، لیکن اس خیال سے کہ مبادا وہ خاموش ہو گئے ہوں اور یہ سلسلہ منقطع ہو جائے، میں ذیل کے اشعار کا مفہوم دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

- ۱۔ غیر کو سینہ بکھ سے سیمبر دکھلا دیا تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا
پہلا مصوبہ بہت اُبھا ہوا ہے۔ کیا سیمبر اس جگر منادی ہے۔ دکھلا دیا کا فاعل کیا ہے
- ۲۔ دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا اس بہت پردہ نشین نے جلوہ گر دکھلا دیا
ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے؟
- ۳۔ دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا قییب، مکتب ساز گار طالعِ ناساز دیکھنا
طالعِ ناساز اگر خود مومن کا تھا تو وہ اس کے حق میں سازگار کیونکر ہو گیا۔

- ۴۔ مت رکھو گردِ نازک عشاق پر قدم پامال ہوئے جائے سراسر افرار دیکھنا
- ۵۔ گور میں بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا جائے آپ ہی میں ہم نہیں جب کنج تنہائی ملا
- ۶۔ ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یا سن طلب کس لئے خضر، موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا
- ۷۔ جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کس لئے کیا دلِ گم گشتہ اسے ہنگامِ آرائی ملا
- ۸۔ واعظ بتوں کو غلہ میں لیجائیں گے کہیں ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

- ۹ - ہے ظلم کرم جتنا سخت فرق پڑا کتنا
شکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا
- ۱۰ - کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا
- ۱۱ - مطلب ہے کہ وصلت میں ہو ہوا ہوس آفت میں
اس گرمی صحبت میں اسے دل نہ گھیل جانا
- ۱۲ - محو جفا ستم کش الطاف کب ہوا
رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا
- ۱۳ - کس دن تھی اسکے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدد سے خفا ہے سبب ہوا
- ۱۴ - جی طعن و سئل حور سے کیسا جلادیا
روڑ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا
- ۱۵ - از بس کہ تھی وصال میں غیروں سے ہمہری
عیش و سرور باعث رنج و تعب ہوا
- ۱۶ - تاثیر بقیہ سراری ناکام آفریں
ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھا مانا
- ۱۷ - دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے
اسے چرخ اپنے تومہ کامل کو تھامنا
- ۱۸ - مضطرب ہوں کس کا طرز سخن سے سمجھ گیا
اب ذکر کیا ہے سامع عاقل کو تھا مانا
- ۱۹ - سیکھے ہیں مجھ سے نالہ نہ آسماں شکن
صیا داب نفس میں عمتا دل کو تھا مانا
- ۲۰ - یہ زلف غم بخم نہ ہو، کیا تاب غیر ہے
تیرے جنوں زدہ کی سلاسل کو تھا مانا
- ۲۱ - مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام
مومن، زبان بیہدہ سائل کو تھا مانا
- ۲۲ - تھی کہیں میں غارت بوس دہن ہنگام خواب
شب کی بیداری سحر کا خواب رہن ہو گیا
- ۲۳ - زخم تو بھی مرا ہم زخم کہن ہے چارہ گھر
بند تیر یار سے سینہ کار و زن ہو گیا
- ۲۴ - راز تو نہاں زبان اغیار تک نہ پہونچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یا رتک نہ پہونچا

(نگار) مومن کے اشعار سمجھنے کے لئے سب سے پہلے آپ ان کی نشتر کر لیا کیجئے، بہت سے اشعار تو اسی طرح حل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو، تو پھر یہ غور کیا کیجئے کہ شعر میں محذوفات کیا کیا ہیں اور اگر کوئی خاص فارسی ترکیب ہو تو اس کے مفہوم اور محل استعمال کو بھی دیکھئے۔ آپ نے جتنے اشعار درج کئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو نشتر کرنے کے بعد سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بعض البتہ زیادہ دقیق ہیں۔ بہر حال اب سلسلہ وار انکا مطلب سنئے۔

۱ - پہلے مصرعہ کی نشریں ہوئی :- سیمبر کہے سے غیر کو سینہ دکھلا دیا۔ یعنی غیر نے جو تھیں سیمبر کہا تو فوراً غم و غور سے سینہ دکھا دیا۔ دوسرا مصرعہ صاف ہے۔ سیمبر یہاں منادی نہیں ہے، دونوں مصرعوں میں دکھلا دیا کا فاعل تھے۔

۲ - ایمان بالغیب سے مراد خدا پر بے دیکھے ایمان لانا ہے، جو مومن کی صفت ہے۔ دعا یہ کہنا ہے کہ اسے مومن

یہ تمھارا ایمان بالغیب اسی وقت تک ہے جب تک اس بت پر دشمنی نے جلوہ نہیں دکھایا۔ یعنی اس کا جلوہ دیکھتے ہی خدا کو نہ بھول جاؤ تو سہی !

۳۔ دوسرے مصرعہ کی تشریحات پر کرنے کے بعد یوں ہوگی :-

منجم کے لئے میرا طالع ناساز دیکھنا، اس کے لئے سازگار تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب منجم نے میرے حال زاد کو دیکھا تو اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس پر یہ جان دیتا ہے وہ واقعی بہت جمیل ہے اور اس طرح وہ میرا قریب بن گیا۔ گویا میرا طالع ناساز دیکھنا ہی اسے سازگار ہو گیا۔

۴۔ عاشقوں کی سروں کی خاک پر قدم نہ رکھنا ورنہ ان کے لئے یہ بات سرفرازی کا باعث ہو جائے گی اور یہ تم چاہتے نہیں کہ جو تمھارا پاپا مال ہو وہ سرفراز ہو جائے۔

۵۔ جب تک زندہ رہے دنیا کے ہنگامہ کی وجہ سے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ گور میں بیشک تنہائی ملی تھی اور موقع تھا کہ خوب دل بھر کر رو لیتے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں خود ہمیں اپنا ہوش نہیں۔

۶۔ اس شعر میں تلمیح ہے موسیٰ و خضر کے ملاقات کی۔ مشہور روایت ہے کہ موسیٰ کو بعض باتیں معلوم نہ تھیں اور ان کو ہدایت ہوئی تھی کہ وہ خضر سے ملکر دریافت کریں۔ اسی پر قیاس کیے کے شاعر کہتا ہے کہ میں بھی تو موسیٰ کی طرح نادان ہوں اس لئے مطلب کی طرف سے یا موسیٰ کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ہے مجھے بھی میرا خضر (محبوب) مل جائے۔

۷۔ اے ہنگامہ آرائی، کیا دل گم گشتہ تجھے مل گیا تھا جواب ہنگامہ جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کرتی ہے؟ یعنی جس طرح ہنگامہ آرائی سے دل گم گشتہ نہیں مل سکا، اسی طرح وصلِ دلبر بھی میرے نہیں آسکتا، مدعا یہ کہ سب مقدر پر منحصر ہے، کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

۸۔ یہ شعر نازک ہے۔ داغظ پطعن کرتا ہے کہ اگر تیرے کہنے کے مطابق کافروں کو عذابِ جہنم میں مبتلا کیا جائے گا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بتوں کو جہنم سے نکال کر خلد میں لیجائیں گے۔ ورنہ اگر بت بھی جہنم میں رہے تو کافروں کیلئے جہنم بھی بہشت ہو جائے گا۔

۹۔ کتنا فرق پڑ گیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اتنا ہی ظلم ہے۔ دفعتاً کسی کا مزاج اتنا بدل جانا بہت مشکل ہے۔

۱۰۔ ۱۱۔ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں اُس سے سوالِ وصل کرتا ہوں تو وہ پانی پر کافور جلا کر دکھاتا ہے یعنی دیکھو بواہوس یا غیر کا حال وصل میں اسی کافور کی طرح ہوتا ہے، سو اسے دل تو ان باتوں میں اگر سوالِ وصل سے ہٹ نہ جانا، وہ تو یونہی باتیں بنایا کرتا ہے۔

۱۲۔ محو جفا (یعنی میں) کب اس کے الطاف کا شکر ہو اتھا یعنی میں اس سے واقف ہی نہیں کر سکی غنائیں کتنا بڑا ظلم ہیں، اس لئے اس کا لب میرے حال پر رحم کرنا قیامت ہے۔ کیونکہ اس نوع کی ستمانیوں سے تحمل ہونیکا

واقعہ مجھے کبھی ملا ہی نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ میں انہیں برداشت نہ کر سکوں۔

۱۳۔ یہ شعر خاص مومن کے رنگ کا ہے۔ محبوب، عدو سے اس لئے خفا ہے کہ اس کی محبت کا یقین نہیں رہا۔ مومن یہ رنگ دیکھ کر محبوب سے کہتا ہے کہ عدو کو تم سے پہلے ہی کب محبت تھی جواب نہیں رہی۔ اس لئے تمہارا اُس سے ناخوش ہونا بے سبب ہے۔

۱۴۔ روزِ جزائے ذکر پر محبوب نے طعن کیا کہ تمہیں تو دہاں حوریں ملیں گی، پھر کیا فکر ہے۔ اس طعن کو سن کر مومن کہتا ہے کہ میرا جی کیا کیا جلا ہے۔

۱۵۔ مجھے وصل تو نصیب ہوا لیکن اس خیال سے کہ یہ تو صرف غیروں کی برابری ہوئی، سارا عیش خاک میں مل گیا۔
۱۶۔ اس شعر میں آخر میں کالِفظ دھوکا دیتا ہے اور لوگ اسے ناکام کے ساتھ متعلق سمجھ کر کوئی فارسی ترکیب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آخر میں یہاں بالکل علیحدہ ہے اور شائباش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اپنی بے قراری ناکام سے طنز یہ ہے کہ میں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شائباش، تو نے خوب اپنا اثر دکھایا یعنی بجا ہے اس کے کہ تو اس کو بے قرار کر دیتی، تو نے اس میں اور سکون پیدا کر دیا، سچ ہے ایسے شوخ شمایل کو تھا مناجا بھی آسان نہ تھا۔

۱۷۔ وہ (محبوب) چاندنی کی طرف دیکھ رہا ہے، اس لئے اے آسمان اپنے مہر کا بل کو سنبھالنا کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر آگے۔
۱۸۔ سامع عاقل میری باتوں سے سمجھ گیا کہ میں کس کے لئے بیتاب ہوں، اسلئے اب اس کو سنبھالنا مشکل ہے۔

۱۹۔ "نالہ بے آسماں شکن"۔ یعنی وہ نالہ جو لو آسمانوں کو توڑ کر نکل جائے۔

۲۰۔ یہ محبوب کی زلفِ خم بہ خم نہیں کہ غیر سنبھال لے، بلکہ تیرے دیوانوں کی زنجیر ہے۔

۲۱۔ "زبان بیدہ ساکن" یعنی وہ زبان جو بے معنی سوال کرے۔ اے مومن اپنی بے معنی سوال کرنے والی زبان کو مقام۔ بتوں سے پناہ مانگنا حرام ہے۔

۲۲۔ یہ شعر مومن کا بہت اُلجھا ہوا ہے اور وہ معنی جو اس کے بیان کے جاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر پہلے مصرعہ میں خواب کو وصل کے معنی میں لیا جائے اور دوسرے مصرعہ میں شب کی بیداری کے آگے لگے بعد محذوف مانا جائے تو یہ معنی پیدا ہو سکتے ہیں کہ وصل کی شب بوسہ دین لینے کی خواہش لگھات میں تھی لیکن یہ رہزنی اس وقت پوری ہوئی جب رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے وقت معشوق سو گیا۔

۲۳۔ پہلے یار نے تیر چلایا تو زخم ہو گیا لیکن جب دوبارہ چلایا تو تیر اس زخم میں رگ گیا اور اس کا روزن بند ہو گیا اسکو وہ مرہم زخم سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۴۔ محبوب کی عادت ہے کہ وہ ہر بات غیروں سے کہہ دیتا ہے۔ اس لئے اگر میرا راز نہاں آشکارا نہیں ہوا تو ایسا اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا کوئی خط محبوب تک نہیں پہنچا، ورنہ وہ یقیناً غیروں سے ذکر کرتا۔

تنوعات

کرسیوں وغیرہ پر جس چیز سے وارنش کی جاتی ہے اسے لاکھ کہتے ہیں لاکھ میں ایک کیرا ہے جو درختوں کی شاخوں میں لگ جاتا ہے اور اسی کو ہلاک کر کے وارنش طیار کی جاتی ہے، لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو گا کہ جب ۵۰۰۰۰ کیروں کا خون ہوتا ہے جب کہیں جا کر ایک پونڈ لاکھ ہاتھ آتی ہے۔ چوڑی کی ایک قسم ہے جو بارش کے وقت پنکھڑوں کا پتیوں کی چھتری اپنے سر پر لیکر چلتی ہے۔ سمندر میں آپ ایک جہاز سے زاید از زاید دس میل دور کی چیز دیکھ سکتے ہیں۔ ہر درجہ حرارت کے اضافے کے ساتھ آواز کی رفتار فی سکنڈ ایک فٹ بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ جاپانی موٹے آدمیوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہاں دوسرے ملکوں کے جتنے سفیر بھیجے جاتے ہیں وہ سب دبے پتلے ہوتے ہیں۔ روم کے پاپائے اعظم کی ڈاک کا جواب دینے کے لئے ۳۵ سکرٹری مقرر ہیں۔ کلیفورنیا کی ایک سببی میں جہاں زیادہ تر معدنوں میں کام کرنے والے رہتے ہیں ایک ہوٹل کے دروازہ پر یہ نوٹس لگا ہوا ہے کہ ”اگر تمہیں ہمارے یہاں کا بھنا ہوا گوشت سخت معلوم ہوتا ہے تو ہوٹل سے نکل جاؤ، یہ کمزور آدمیوں کی جگہ نہیں ہے۔“ یوگوسلیو یا میل یک مقام ہے جس کا نام ورولکا ہے، یہاں کی مقامی حکومت نے قسم کھانا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے اسے تینہ بکری دی جاتی ہے، لیکن دوسری بار اس جرم کے ارتکاب میں اسکو جھاڑو لیکر سڑکیں صاف کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی دو تیریاں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ انسان کے اعصاب بالائی حصہ جسم پر ہوتے ہیں اور کیروں کے اعصاب اندر ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان میں ۵ لاکھ لفظ پائے جاتے ہیں جن میں سے کسیکسیر نے ۲۴ ہزار استعمال کئے اور ۵ ہزار ایسے جنہیں کمر استعمال نہیں کیا۔ ملٹن نے ۱۷ ہزار الفاظ استعمال کئے اور انجیل میں صرف ۲۰۰۰ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ستر سال کی عمر میں ساڑھے چار سال انتظار میں ختم ہوتے ہیں اور تین سال نہانے دھونے میں۔ اسوقت دنیا میں ۵ لاکھ ۵۰ ہزار کیرے دریافت ہوئے ہیں جو انسان کی غذائی پیداوار کا دسواں حصہ منقسم کر جاتے ہیں۔ جرمنی میں اب ایک دائرہ بجائے ۲۶۰ ڈگری کے ۴۰۰ ڈگریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس لئے وہاں کا زاویہ قائمہ بجائے ۹۰ ڈگری کے ۱۰۰ ڈگری کا ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے کم عمر چرے کی ہے یعنی دو یا تین سال۔ یورپ میں سب سے زیادہ اوسا پیدایش روم کا ہے یعنی ۴۲۵ فی ہزار۔ جلی فش (ایک قسم کی مچھلی) کی ساخت میں ۹۰ فی صدی حصہ پانی کا ہے۔ بارش کے قطروں کو کبھی کبھی ایک ٹھنڈی زمین تک پہنچنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ سیام کے امراء کی نہایت مرغوب غذا سانپ کا اچار ہے جو سرکہ سے بنایا جاتا ہے۔ انسانی زبان میں ذائقہ کے ۳۰۰۰ ہزار خلا پائے جاتے ہیں، گائے کی زبان میں پندرہ ہزار اور ہرن کی زبان میں ۵۰ ہزار۔

معراجِ محبت

(سرست تملین حیدر آبادی)

تمناؤں سے حسن و عشق کی گودوں میں پڑتے تھے
 رہتی کی ہر منزل میں جادو بن کے چلتے تھے
 نگاہوں کی طلب ل کا تقاضا بنے رہتے تھے
 نہ جانے اور ہم آپس میں کیا کیا بنے رہتے تھے
 ہمیں امکان کی حد سے گزر جانا بھی آتا تھا
 سما کر آنکھوں میں دل میں اتر جانا بھی آتا تھا
 تمناؤں کا ہو جانا تھا سودا آنکھوں آنکھوں میں
 اکیلے ہی ہو کرتے تھے ہم رکھ بھی لاکھوں میں
 نظر بیکمرے اراں انھیں جب گدگداتے تھے
 تو حیریں جھنپ جاتی تھیں ملائک مسکراتے تھے
 حیاتِ شوق کی ہر سانس بس جاتی تھی خوشبوئیں
 خوشی سے جب طرکاتا تھا مادل اُنکے سپاہ میں
 وہ میرا مست ہو جانا وہ اُن کا جھینسا پہا جانا
 وہ کھوجانا مرا وہ بس کے اُن کا مجھ کو پا جانا
 شگوفے سے چلکے تھے جوانی کی ترنگوں میں
 رچا کرتی تھی ہولی رات دن دل کی اُمنگوں میں
 متاعِ زندگانی بیخودی کی جان ہوتی تھی
 گناہوں میں بھی اک معصومیت کی شان ہوتی تھی
 اگر فلکِ غم فردا اڑا دیتی تھی دونوں کو
 محبت لوریاں دیکر سلا دیتی تھی دونوں کو
 نشہ میں چور تھے اپنے سے باہر ہو کے جیتے تھے
 محبت کے سوا ہم اپنا سب کچھ کھو کے جیتے تھے
 خدائی سہی کیا کرتے تھے جانِ بندگی بنکر
 سما جاتے تھے ہم اک دوسرے میں زندگی بنکر
 وغیرہ بیخودی میں ایک ہو جاتے تھے ہم دونوں
 محبت لوریاں دیتی تھی کھوجاتے تھے ہم دونوں

شباب و شعر کا مفہوم جب ہم سے عبارت تھا
 اسے کیا ہو گیا وہ دور معراجِ محبت کا

غزل:

فراق گو رکھپوری

راز کو راز ہی رکھا ہوتا
 لیکن کب تک پردہ کرتے
 آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
 کم کم اٹھتیں تیری ٹکائیں
 کھٹے کھٹے کٹتیں راتیں
 رات کی رات دیا ر محبت
 میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
 عشق نے مجھے کمی کی درد
 پردہ دارئی غم بھی ہے شاکی
 آہ یہ درد یہ بکیس حالت
 ہم جو تجھے کچھ بھول سا جاتے
 جان گنوا کر آنکھ اٹھا کر
 یہ مایوسی یہ بیزاری
 کچھ دل غمگیں کر کے دکھاتا
 منزل منزل دل بھٹکیگا
 دنیا دنیا عالم عالم،
 ہوتا عشق اور تنہا ہوتا

ہم بھی فراق انساں تھے آخر
 ترک محبت سے کیا ہوتا

فکر و نظر

(نجم آفندی اکبر آبادی)

پھر سانس کو آس اے دل ناکام ہوئی
انگ شمع جلا کہ جھٹ پٹا وقت ہوا
پھر فطرت غم تشنہ پیغام ہوئی
نغمہ کو ذرا بلند کر شام ہوئی

کس سمت چلے در و طلب کے مارے
بس ہیں فکر و نظر کی تسکین کے لئے
قدرت بے انتہا بہت شہ پارے
مٹھی بھر پھیل آسماں بھرتارے

دونوں جانب سے شمع جلتی ہے مری
تشویش بجا کہ مختصر ہے صحبت
اک رات سے کم بھی زندگی اچھی ہے
تسکین یہ ہے کہ روشنی اچھی ہے

دل کو ہمہ تن مشمع فروزاں کر دے
یہ بھی کوئی روشنی ہے اے برق جلال
آئینہ نگاہ احساں کر دے
ظلمت کو جو کچھ اور نمایاں کر دے

ابد سرہندی

غزل :-

ترے حریم تجسلی میں بار بار نہ سکا
میں کس طرح اے کہندوں خداے عالم عشق؟
مٹی نہ شورشش تیز، کفر و ایمان کی
تو بھول کر بھی مجھے یاد کر سکا نہ کبھی
سیاہ تر تھیں مرے عہد ہجر کی راتیں
نہ دی خود ہی محبت نے رخصت سجدہ
میں اپنے آپ کو خود بھی سمجھ سکا نہ کبھی
میں چشم شوق کو جلوں سے جگمگا نہ سکا
اُجاڑ کر مرے دل کو جو پھر بے نہ سکا
چراغ دید و حرم کے کوئی بجھانہ سکا
میں بھول کر بھی تری یاد کو بھلا نہ سکا
کہ چاند کیا کوئی تا را بھی مسکرا نہ سکا
میں آستان پتھارے جس جگہ نہ سکا
عجب نہیں جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

جگر بریلوی

غزل :

ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہو
 نہ جانے زخمِ دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی
 سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ میں دلِ شکر
 شبتِ تاریک ہو ویرانہ ہو محویتِ غم ہے
 ازل سے موت نے اب تک کئی قالب لولے
 جہاں وہ بیٹھ جائے گھر کے منزل ہو وہی اسکی
 کسی کی یاد کو ہر دم بھلائے جاتا ہوں پھر بھی
 بیاباں کی گشتِ شب اب لے اڑیگی دل کے دڑوں کو
 جہاں دل ضبطِ غم سے خون ہو جاتا ہر سینے میں
 اگر سینے میں دل رکھتے ہو تم تو آج بتلا دو
 ہجومِ نامرادی سے یہ عقدہ کھل گیا آخر
 کوئی جینے کو سمجھے مایہ عشرت بڑا کیا ہے
 ابھی لے شدتِ غم زندگی محسوس ہوتی ہو
 پھٹا جاتا ہو سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہو
 یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہو
 عجب عالم میں قربتِ آپ کی محسوس ہوتی ہو
 مگر جو چوٹ تھی دل میں وہی محسوس ہوتی ہو
 جسے ہر گام پر داماندگی محسوس ہوتی ہو
 کھٹکتی دل میں نوکِ خاری محسوس ہوتی ہو
 کہ ہر برسائش پر وارفتگی محسوس ہوتی ہو
 وہیں کچھ روح کو بالیدگی محسوس ہوتی ہو
 تمہیں بھی میری بیتابی کبھی محسوس ہوتی ہو
 جو ہوتی ہو تو غم میں زندگی محسوس ہوتی ہو
 مجھے تو اک عبادتِ زندگی محسوس ہوتی ہو

غزل سے لے جگر اندازہ کر میری حقیقت کا

غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہو

طلوعِ ماہتاب

(انجمِ رضوانی)

کے سامنے نگاہ کے ہے طور کا مجسم
وہ ہولناک شست میں
وہی وہ میرے روبرو

طلوعِ ماہتاب کا
سماں بھی کیا عجیب جو
نظر فریب کس قدر ہے اُت گڑھ پہ نور کا
نظارہ سامنے کھینچا ہوا ہے کتنی دور کا
ہے خود پراور کوہ پرگماں کلیم و طور کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
طلوعِ ماہتاب کا

وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہ سامنے پہاڑ پر
تجلیاتِ حسن ہیں کہ بارشیں ہیں نور کی
کہ اطلاع ہیں کسی حسین کے ملبور کی
کہ ہو رہی ہیں جلوہ پاشیاں چراغِ طور کی
وہ سامنے پہاڑ پر
وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہی وہ میرے روبرو
وہ ہولناک شست میں
پہاڑ ہے کھڑا ہوا کہ نور کا مجسم
دلِ حزیں کے واسطے سرور کا مجسم

صلاح کار

(خلیل اللہ ترقی)

یہ رند ان بلا کش کس لئے خاموش ہیں ساقی!؟
کہاں تک انتظار گردشِ مینا کریں ساقی!؟
اور ایسے میں اتیرے میخوار!؟ جو رے سہیں ساقی!؟
نہ دیوانے کے ”ضبطِ شوق“ کا دعویٰ کریں ساقی!
یہ دور اذکار اندیشے تیرے دشمن کریں ساقی!
”اُٹھ کر بیٹیں“ بنی کر کریں۔ اگر کر بیٹیں ساقی!
میری جانب مڑی ہوئی نظر اُٹھیں ساقی!
زمانہ بھر میں نامے دلوش کی دھو میں محیں ساقی!

کیسی بے بسی چھائی ہوئی ہو آج محفل پر!؟
سکوں کا دور ہے بیکیفیوں کی حکمرانی ہے
فضائیں مست۔ کہساروں پنتہ سا۔ جہاں بخود
نہ ہم بزدل کے بڑھتے حوصلوں کو پست ہونے دیں
”سوزا!؟“ ”حققی!؟“ یہ سب ادھام باطل ہیں میرا ذمہ
کہاں کی آبرو؟ کیسی خرد؟ سب غرقِ مے کر دیں
”شوری کیفیت“ تک جسے سیکھی خود فراموشی
زمانہ بھر میں لہرائیں علمِ جوش و مسرت کے

اسرار

(نبی احمد بریلوی)

اعتبار محض یہ سارا جہاں پاتا ہوں میں
 دہر کی ہر چیز کو وہم و گماں پاتا ہوں میں
 جو ودیعت کی گئی ہے سینہ احساس میں
 کچھ خموشیہائے اُلفت کی نہ پوچھو لذتیں
 رہنے دو غرق مئے و مینا نہ چھیڑو دوستو
 سائے میں تاروں کے جب ہوتا ہوں پیانہ بکعت
 ہے خدا جانے کہاں تک اس تسلسل کا عمل
 علم و دانش سے کہیں کھلتے ہیں اسرار حیات
 سے پلا ساقی کو ہیں عقل و خرد کی یورشیں
 یہ تصور ہے کسی کا یا وہ خود ہے، کیا خبر

اک فریبِ مستقل کون و مکان پاتا ہوں میں
 ذہن انسانی کو خلاق جہاں پاتا ہوں میں
 وہ امانت اپنے سینے میں نہاں پاتا ہوں میں
 دل ہی دل میں دل کو سرگرم فغاں پاتا ہوں میں
 اپنے کو کچھ برتر از سود و زریاں پاتا ہوں میں
 اس جہاں کے ذرے ذرے کو جواں پاتا ہوں میں
 سارا عالم کارواں درکارواں پاتا ہوں میں
 ایک ذرے کی حقیقت بھی کہاں پاتا ہوں میں
 اپنے کو پھر مبتلائے این و آن پاتا ہوں میں
 قلب کی گہرائیوں میں کچھ نہاں پاتا ہوں میں

نُرشِ روئی سے کسی سے جب کوئی کرتا ہے بات
 اپنے دل پر اک عجب بارگراں پاتا ہوں میں

غزل: بہار کوئی

بن گئی کا فر نظر جزوِ رگ جاں دیکھئے
 ہر کلی شیشہ بکعت ہر گل خمستاں درکنار
 اک نگاہِ فتنہ پرور اک ادائے برقِ پاش
 جاگ اٹھا پھر درد پھر انگڑائیاں میں شوق نے
 دیکھنا ہی ہے اگر اندازِ استغنائے حسن

ٹوٹ ہی کر رہ گیا دل میں یہ پیکاں دیکھئے
 پچھلی راتوں میں جمالِ شبنمستاں دیکھئے
 مٹ نہ جائے کاش زخمِ رگ جاں دیکھئے
 پھر ٹپی دل پر نگاہِ فتنہ سماں دیکھئے
 اپنا دامن دیکھئے مسیر اگر بیاں دیکھئے

چن رہے ہیں دجیاں وہ میرے دامن کی بہار
 رنگ لایا ہے جنونِ فتنہ سماں دیکھئے

حادثہ

(انجم رضوانی)

بندی نہ تھی پیشانی پر نورِ حسین پر تارا مر می قسمت کا چمکتا تھا جبیں پر
 بکھرا ہوا ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسم، نکھرا ہوا سلجھا ہوا اندازِ تکلم،
 اٹھتی ہوئی چڑھتی ہوئی بھرپور جوانی نشے میں جوانی کے وہ کچھ چور جوانی
 رنگینی گلزار وہ گالوں میں سیٹے تار کی شب زلف کے بالوں میں پلیٹے
 آنچل کو سنبھالے ہوئے شرماتی بقاتی ہر گام پہ سوتے ہوئے قتنوں کو بگاتی

دنیا کی تمنائیں کچلتی ہوئی گزری

تقدیر زمانے کی بدلتی ہوئی گزری

آنکھیں تھیں کہ تابندہ سرعش کے تارے تارے تھے کہ دو برق کے بیتاب شرارے
 آنکھیں تھیں کہ دو جام مئے تند سے لبریز پلکوں سے ٹپکتا ہوا اک کیف جنوں خیز
 اللہ کے نگاہوں کا تصادم سرِ اسے ناگاہ ہوئے ہوش و خرد گم سرِ اسے
 وہ شوخ وہ گستاخ وہ بیباک نگاہیں لبریز شرارت سے وہ چالاک نگاہیں
 بجلی سی لڑتی ہوئی بیتاب نگاہیں سرسبز جوانی کی وہ شاداب نگاہیں
 اٹھیں بعد اندازِ تبسم سرِ اسے اور مفت میں مارا گیا انجم سرِ اسے

اس مرگِ حسین کی کوئی فریاد نہیں ہے

فریاد کہ بیدار بھی بیدار نہیں ہے

میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی سوچئے

کہ کیا اس وقت ایک ایسے اخبار کی ضرورت نہیں ہے، جو صرف مسائل جنگ سے بحث کرے اور اعداد و شمار، نقشوں، کارٹونوں، تصویروں اور تحقیقی مقالوں کے ذریعہ سے ہر ہفتے لوگوں کو بتاتا رہے کہ جنگ کی موجودہ رفتار کیا ہے، آئندہ کیا کیا امکانات اس میں پوشیدہ ہیں اور ہم کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہئے

اگر آپ واقعی اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور کم از کم ایک روپیہ ماہوار اس پر صرف کر سکتے ہیں، تو فی الحال آپ اس تجویز کے معادنوں میں ایک کارڈ بھیج کر اپنا نام درج کرا لیجئے —
(روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں) جس وقت دو سوناموں کی فہرست پوری ہو جائے گی اسی وقت یہ اخبار جس کا نام ”جنگ“ ہو گا جاری کر دیا جائیگا اور آپ کو اپنا ماہوار چسندہ بھیجنے کی زحمت دی جائے گی

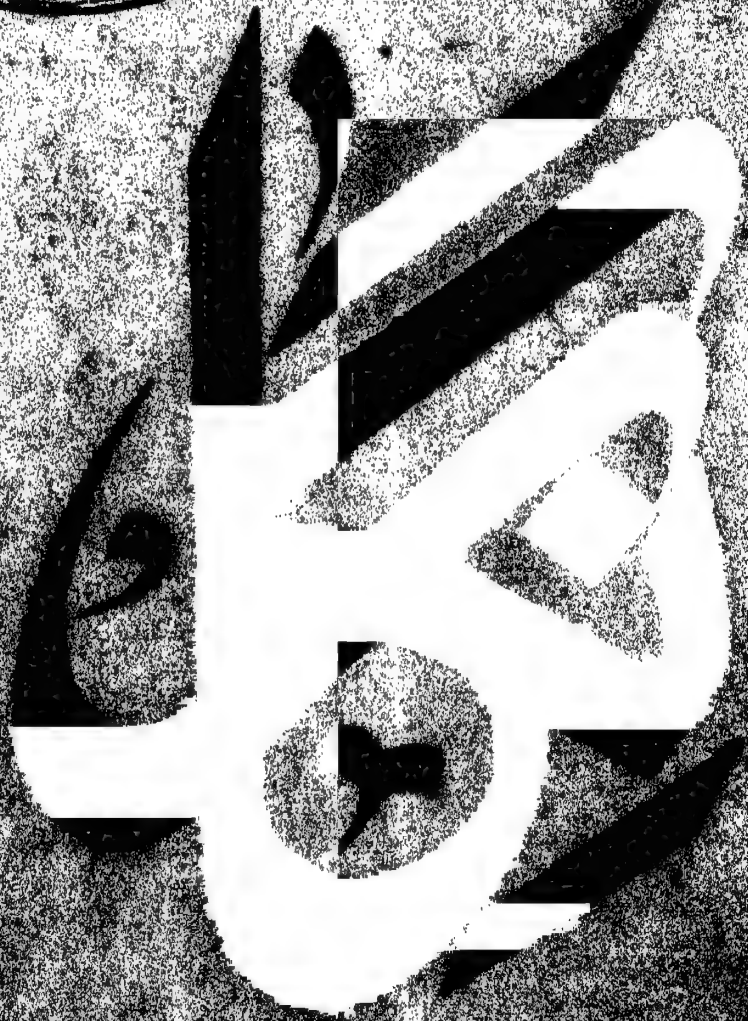
آپ خود بھی غور کیجئے، اپنے حلقہ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے اور مجھے بتائیے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا

یہ اخبار میری ادارت میں شائع ہو گا اور زیادہ تر میرے ہی مقالات اس میں شائع ہوں گے۔ اس کا حجم ۱۶ صفحے اور سائز بڑا ہو گا

نیاز فختوری

۱۰۰

مستطابق



۱۰۰

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی جہیز کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ جہیز کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آسٹے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خاتمہ اپ پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور آس کے جہیز قیسا یعنی ۸ کے ٹکٹ محصول ہونے پر۔

تصانیف نیازمندی

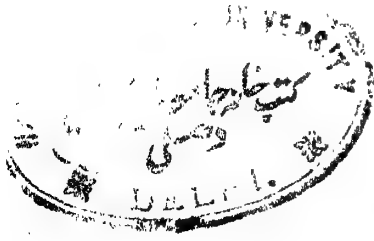
نگارستان	جماعتان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
<p>حضرت شہباز کے پیرترین ادبی مقالات اور انسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو جذبہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مصنفین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔</p> <p>قیمت دو روپیہ (عمر)</p> <p>علاقہ محصول</p>	<p>ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دورہ مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ زبانِ قدرت بیان کی تخیل و دیکھ بھال کے پیرترین شاہکار کے علاوہ بہت سے سماجی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ افسانہ اور نثر اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عمر)</p> <p>علاقہ محصول</p> <p>غریبان نگار سے ایک روپیہ کم</p>	<p>ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز دو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلطنت بیان کی اور ادبی پس منظر کا مطالعہ فنِ انشاء میں بالکل پہلی پہچ ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی چھپکے معلوم ہوتے ہیں۔ مختصر حضرت نیاز ۲۲ چٹکے کا ذخیرہ محبت شائع ہوئی ہے۔</p> <p>قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عمر)</p> <p>علاقہ محصول</p>	<p>حضرت نیاز کا وہ عظیم انفسانہ افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ بحرِ طلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ (عمر)</p> <p>علاقہ محصول</p>

اردو شاعری

یعنی ہندی شہزادہ کاظم جس میں آدھ دوش افغانی کی تاریخ ۱۱۱۱
 عہدہ حیدرتی اور ہرنانہ کے شعر اور بید نقد و بحر کا کیا ہے جس
 انتخاب کلام ۱۱۱۱ کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ کو کچھ کی ضرورت
 باقی نہیں رہتی اور میں سات مصلحتیں اذیتر لکھ کر لکھ دے گا
 تجرید مصلحت۔ قیمت ۵۰ روپے

ہندی شاعری

فیجی جزیرہ ملک کے کانگریس میں ہندی سٹادی کی ترقی کا
 اس کے تمام اہلکار کا یہ انداز کہ مسجد ہے اس کی تمام شہریتوں کے شعراء
 کے کام کا نقاب مستحق ہے کہ وہ ہے ہندی شاعری کی اصل کیفیت
 کا بیان ہے۔ ہندی شاعری کی اصل کیفیت کے لئے ہندی شاعری کی اصل
 کیفیت ہے۔ حیرت منانہ کمال ہے



نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
ہر دو اضافی مضامین و قیمت شامل نہ ہوگا

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تیس روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا پانچ شلنگ

ہمیشہ یاد رکھئے کہ ہر چندہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پہونچے
کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پہونچنے کا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیثا یعنی ۸ روکے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
"منبر" نگار

جلد ۳	فہرست مضامین اپریل ۱۹۴۰ء	شمار
ملاحظات	ادیٹر	۲
ازمات	ادیٹر	۹
خلیفہ گلزار علی اسیر	تکین کاظمی	۱۹
داستان ابرو باد	ادیٹر	۲۸
انقلاب پسندی اور اصلاح عالم	گلاب چاند	۳۳
راجہ منشی	حیات اشد انصاری	۴۲
اخبار کبھی کے عہد حکومت میں	سید محمد عبدالعلیم ہاشمی	۵۳
مکتوبات نیاز	ادیٹر	۶۶
باب الاستفسار	ادیٹر	۶۰
کلام مآثر لکھنوی	دع. ن	۶۳
تنوعات	ادیٹر	۶۹

نگار



اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳ | اپریل ۱۹۷۷ء | شمارہ ۴

ملاحظات

ہمارے سیاسی اجتماعات !

رام گڈھ میں کانگریس کا جلسہ بھی ختم ہو گیا، لاہور میں مسلم لیگ کا اجتماع بھی منتشر ہو گیا، فارورڈ بلاک کانفرنس بھی اپنی تجویزیں پیش کر چکی — لیکن دنیا جہاں پہلے تھی اب بھی وہیں ہے اور ہندوستان، دوہہ تذبذب و بے اعتمادی کی جس منزل سے گزر رہا تھا، ہنوز اسی جگہ ہے —

ایک دفتر تدبیر و مصلحت پیش کیا گیا لیکن ایک ایسا دفتر جو اقدام عمل کی راہوں سے خالی تھا — جرأت و مردانگی کے بڑے بڑے دعوے کئے گئے لیکن اس حال میں کہ دل گرمی سے اور دماغ عقل سے معرّا تھا — آوازیں بلند ہوئیں لیکن ایسے صحرائیں جہاں ان کا سننے والا کوئی نہ تھا !

یہ تھا طے الترتیب ان تینوں سیاسی اجتماعات کا ذکر ابھی کیا گیا، لیکن آئیے اس اجمال کی تفصیل پر بھی اک سرسری نگاہ ڈال لیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جو خطبہ دیا ہے وہ اپنے سنجیدہ دل و لہجہ اپنے مضبوط دلائل اور اپنے تجربہ تاریخی کے لحاظ سے یقیناً ایک ایسا پر خلوص لٹریچر ہے

دفتر تدبیر و مصلحت

جسے ہم ایک ”دفتر تدریس و مصلحت“ تو ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن جسوقت ہم اس کے ادراک میں لائے عمل کی جستجو کرتے ہیں تو ہمیں سخت ناکامی ہوتی ہے

مولانا آزاد نے جس اختصار و خوبی کے ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی اور برطانوی سامراج پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی سامراج کو چیلنج دیا ہے اس کے مرحل ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن عملی نقطہ نظر سے مولانا آزاد کا یہ خطبہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ یہ بہت دل دکھا دینے والی بات ہے

مولانا، خطبہ کے اختتام پر ملک کو تین ہدایتیں کرتے ہیں۔ ایک اتحاد، دوسرے تنظیم، تیسرے گاندھی جی کی رہبری پر اعتماد کامل! اور چوتھے تینوں باتیں ایک ہی سانس، ایک ہی فقرہ اور ایک ہی سلسلہ میں کہی گئی ہیں، اس لئے یہ تینوں ہدایتیں ملکر ایک ہی ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور مولانا اس پر راضی نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ہر ایک ہدایت پر علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ ملک کا اتحاد اور قوم کی تنظیم بھی بیکار ہے اگر اس مخصوص قیادت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ گویا یہ الفاظ دیگر یوں سمجھے کہ جب تک گاندھی جی کے ”عصائے موسوی“ کے پیچھے پیچھے قدم نہ اٹھایا جائے ہم ”بنی اسرائیل“ کی نجات ممکن نہیں!

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا میں صرف اصول و ضوابط نے کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ شخصیتوں ہی نے انقلاب پیدا کیا ہے، لیکن شخص پرستی کی یہ ارتجاعی شدت کہ کسی مخصوص فرد کی قیادت پر ایمان لانا ہی اصول کار میں شامل کر لیا جائے، ایسی عجیب و غریب ذہنیت ہے جس کی تائید مولانا ابوالکلام ایسے آزاد انسان کی طرف سے بالکل گوسالہ سامری کا معجزہ نظر آتا ہے اور جس پر جتنی حیرت بھی کی جائے کم ہے!

گاندھی جی کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کے خلوص و صداقت پر ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کیا جاسکتا لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ عظمتوں کا اور نیتوں کے ساتھ صداقتوں کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ کل کا بڑا انسان آج چھوٹا ہے اگر اس نے وقت کا ساتھ نہ دیا اور آج کا چھوٹا انسان کل بڑا ہو سکتا ہے اگر وہ زمانہ کی نباضی کر سکتا ہے۔ پھر مجھے اس میں کلام ہے کہ گزشتہ بیس سال کے اندر دنیا اتنی آگے نہیں بڑھ گئی ہے کہ گاندھی جی کی ایک ربع صدی قبل کی ذہنیت بدستور رہبری کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو، اور وقت کے تقاضہ کو شخصی اعتماد یا ذاتی اعتقاد کے سامنے یک لخت نظر انداز کر دیا جائے

اول تو گاندھی جی کا، کانگریس سے علیحدہ رہنے کے باوجود کانگریس پر حکمرانی بجائے خود ایسی غیر آئینی بات ہے جس کا جواب نہ گاندھی جی دے سکتے ہیں نہ ارباب کانگریس، لیکن اگر اس بیسویں صدی میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی اجتماع سے علیحدہ رہنے کے بعد بھی اسی اجتماع کا ایک فرد مانا جاسکتا ہے، یا اگر گاندھی جی کی ہستی کو تمام دنیاوی مصالح و تدابیر اور انسانی اصول کار کی سطح سے بلند و برتر سمجھ لیا گیا ہے، تو بھی یہ بات مشکل سے یقین کی جاسکتی ہے کہ اگر آج تک

ساکنان ملار اعلیٰ نوع انسانی کے مصائب کو دور نہیں کر سکے، تو اب گاندھی جی کی ”فرشتہ خونی“ کیونکر ہمارے دیکھ درد کا علاج ہو سکتی ہے۔ اگر الہام کا دروازہ بدستور کھلا ہوا ہے تو ہم کو تاریخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ الہام محض سے بھی دنیا کا انتظام نہیں ہو سکا !

گاندھی جی کا حقیقی مفہوم ہندوستان کی آزادی و جنگ آزادی سے کیا ہے۔ اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ شخص جو مکمل آزادی سے گھٹ کر مستعمراتی آزادی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، جو مستعمراتی آزادی کی طرف سے بھی مایوس ہو کر پھر آزادی کامل کا مطالبہ کرنے لگے، جو باوجود علمبردار حریت ہونے کے برطانوی دامن کا ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہ کرتا ہو، جو باوصف تمام ہندوستان کی نمایندگی کا دعوے کرنے کے ذہبیت کی لعنت میں گرفتار ہو، جسے بالآخر اذعانے رواداری دوسری قوموں کے جذبات کو صدمہ پہنچانے سے دریغ نہ آتا ہو اور جسکے مہمات غیبی کا مولد و منشاء صرف چرخہ اور کھنڈر ہو۔ اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کو غلامی کی لعنت سے آزاد کر سکتا ہے، بھجر زمین میں تخم ریزی کرنا ہے اور ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس سال کانگریس نے صرف یہی کیا

کانگریس نے تو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر دیا کہ گاندھی جی کے ارشاد پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا ہی تنہا ذریعہ نجات ہے، لیکن گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لئے پہلے چرخہ اور کھنڈی کی غلامی لازم ہے اس لئے سوال اب آزادی کا ہے نہ جنگ آزادی کا بلکہ صرف ”نتھاکا تنے“ کا اور ایک ”کچے دھاگے“ سے ملک کی قسمت وابستہ کر دینے کا ! اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک کی تمام آبادی کسی ایک بات پر متفق ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ بڑی بات نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی۔ چھوٹی جماعتیں ہی بڑھکر بڑی ہوئی ہیں اور جن آگروں نے قیصر و کسریٰ کے محلوں کو پھونک کر خاک کر دیا تھا وہ پہلے جنگاریاں ہی تھیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ سال جو حقیقتاً سب سے زیادہ سازگار سال تھا، کانگریس نے بالکل ضائع کر دیا اور

نتیجہ کے لحاظ سے اس نے کوئی بات ایسی پیش نہیں کی جسے علیٰ اہمیت حاصل ہو

ہمیں یقین ہے کہ گاندھی جی پھر برطانوی حکومت سے مصالحت کی کوشش کریں گے اور اگر انھیں کسی غیر یقینی وعدہ کی بناء پر کوئی ملٹی سی توقع قائم کرنے کا موقع مل گیا تو وہ یہی مشورہ دیں گے کہ صوبوں میں کانگریسی جماعت پھر عنوان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر وہی لوگ برسر اقتدار آجائیں جن کی آستینوں میں مہا بھائی خنجر چھپے ہوئے ہیں اور جن کے نزدیک آزادی ہند کا مفہوم، برطانوی اقتدار کے سایہ میں ہندو راج سے زیادہ کچھ نہیں

لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی اپنے اجتماع کے لحاظ سے بہت شاندار رہا اور

سفید ہانہ مطالبات

اس میں بھی کانگریس کی طرح ایک ہی رزولوشن پیش کیا گیا، لیکن فرق یہ ہے کہ کانگریس کے رزولوشن میں عمل کا فقدان تھا اور مسلم لیگ کے رزولوشن میں عمل و عقل دونوں کا مطالبہ دونوں جگہ

آزادی کا تھا، لیکن وہاں شخصیت پرستی میں تبدیل ہو گیا اور یہاں واہم پرستی میں۔ دیاں چرخہ اُسے کھا گیا اور یہاں اقلیت کا خوف !

مسلم لیگ کے اس یادگار روز ولوشن میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ وفاقی حکومت کے خیال کو بالکل ترک کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ جس وقت آئین جاریہ پر نظر ثانی کی جائے تو یہ سمجھ کر کی جائے کہ مسلمان کبھی اسے قبول نہ کریں گے اگر ان کے مشورہ و منظوری کے بغیر اسے نافذ کیا گیا اور تیسرے یہ کہ صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کو (جہاں مسلم اکثریت ہے) علیحدہ علیحدہ آزاد و خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے اور دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کی قومی، مذہبی و اقتصادی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لی جائے

اس روز ولوشن کا اہمال اتنا کھلا ہوا ہے کہ معمولی دماغ کا انسان بھی اس کو کسی صحیح دماغ انسان کا نتیجہ فکر قرار نہیں دے سکتا۔ اگر بنگال و پنجاب، علیحدہ علیحدہ خود مختار مسلم حکومت تسلیم کر لیا گیا تو جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے انھیں بھی خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح نصف سے زیادہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیگا۔ تو کیا مسلم لیگ اس منہاجت پر راضی ہے کہ اگر نصف سے کم مسلمان اپنی جان بچا سکتے ہیں تو باقی نصف سے زیادہ مسلمانوں کو وہ جہنم میں ڈالنے پر راضی ہو جائے گی اور کیا اس مطالبہ کی بناء پر وہ تمام اسلامی ہند کی نمایندہ ہونے کا دعوے کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کی شرط ہی اس لئے لگائی ہے کہ ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر جبر و ظلم نہ ہو سکے تو پھر اس صورت میں خود مختار مسلم حکومتوں کا سوال بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اس طرح برطانوی اثر و اقتدار بدستور قائم رہے گا اور صورت بدستور وہی رہیگی جو اس وقت پائی جاتی ہے

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اس روز ولوشن کی تائید کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ روز ولوشن سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اقلیت کہنا صحیح نہیں۔ وہ ایک قوم ہے اور ایسی قوم جو تلوار سے فیصلہ کرنے سے کبھی نہیں ڈرتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ معاملہ کا انحصار رايوں پر ہے، اس لئے اگر کانگریس نے کانگریسی مسلمانوں کی رائے پر عمل کیا تو ”سول وار“ ہو جانا یقینی ہے۔ یہ ہے تقریر اُس شخص کی جو حکومت یو۔ پی کے صدر مقام میں میونسپلٹی کا بڑا قانون داں چیرمین ہے، لیکن وہ یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ اس کے اس ایک جملہ میں کتنی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں

ایک طرف تو وہ تلوار کے ذریعہ سے فیصلہ کرنے پر طیار نظر آتا ہے اور دوسری طرف سول وار سے بھی ڈرتا ہے تو کیا ”سول وار“ کا تعلق کسی ایسی تلوار سے ہے جس کا بوجھ چودھری صاحب کی نازک کلائی برداشت نہیں کر سکتی۔ یا ”سول وار“ سے مراد صرف گالی گلوچ ہے۔ پھر اگر صورت، وہ ہے تو تلوار کا نام بھی ان کو زبان پر نہ لانا چاہئے اور

اگر صورت دوسری ہے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ اس باب میں کانگریسوں سے زیادہ مشتاق ہیں اور مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سب و قسم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے !

اس میں شک نہیں کہ کانگریس نے متعدد غلطیاں کی ہیں، سب سے پہلی اور بڑی غلطی تو یہ تھی کہ اس نے وزارتوں کے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری اتنی ہی نامعقول غلطی یہ تھی کہ وزارتوں پر جہاں بھائی ذہنیت رکھنے والوں کو قابض ہو جانے دیا۔ پہلی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی بلوکیٹ پھر ایک ربع صدی کے لئے اپنی جگہ مطمئن ہو گئی اور دوسری غلطی نے مسلمانوں کو کانگریس سے بالکل متنفر کر کے مسلم لیگ کے مُردہ جسم میں پھر جان ڈال دی

یقیناً مسلمانوں کو اپنے قومی تحفظ کے لئے منظم ہو جانا چاہئے، لیکن اگر یہ تنظیم غیر وطنی جذبات پر قائم ہوتی ہے تو اس سے انتشار ہی بدرجہا بہتر ہے اور میں مسلم لیگ کا صرف اسی لئے مخالف ہوں کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان اور ہندوستانی آبادی سے علیحدہ رکھنا چاہتی ہے اور ہندوؤں کی اکثریت سے ڈر کر وہ ایسے بزدلانہ طریقوں سے کام لینا چاہتی ہے جو مسلمانوں کی روایات تاریخی کے بالکل منافی ہیں

مسلم لیگ کا یہ رزولوشن، بالفاظ دیگر گویا قیام ”پاکستان“ کی تحریک ہے، جس میں قومی آزادی کی جدوجہد برطانوی سامراج کے سامنے دست سوال پھیلانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غالباً یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ اس نے بھیک مانگنے کا نام آزادی قرار دیا ہو

فارورڈ بلاک کانفرنس میں بھی حقیقتاً ایک ہی رزولوشن پیش کیا گیا جس میں آئندہ معرکہ سے بکشت صدا بے صحرا کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اب انتظار کا وقت ختم ہو گیا ہے اور جنگ آزادی کو ۶ اپریل سے شروع ہو جانا چاہئے

اس قرارداد میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ جنگ شروع کرنے کے بعد ہمیں راستہ بم دم لینا چاہئے اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں ہر محن تحریک شروع کر کے اختیار کیا گیا تھا

میں اس کو صدا بے صحرا کہتا ہوں کیونکہ ”گاندھی گردی“ میں اس پامردی کو کون پوچھتا ہے جیسا کہ خیال تھا، بہار کے شروع ہوتے ہی قلعینڈ کا قصہ ختم ہو گیا اور روسر جنگ کے آئندہ امکانات

ہندوستان کے شمالی، مشرقی و جنوبی علاقہ پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ فن لینڈ شکست ایک تسلیم شدہ ملک تھا، لیکن اتنی دیر صرف شدت سہرا کی وجہ سے ہوئی جس نے یہاں کے علاقہ کو روس افواج کے لئے ناقابل گزربند دیا تھا۔ بہر حال وہ توجہ کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب سوال یہ ہے کہ آئندہ نقشہ جنگ کیا ہوگا

اس سے قبل جنگ کے تین محاذ خیال میں آتے تھے، ایک سرزمین بلقان، دوسرے سویڈن و ناروے، تیسرے بالٹک و لٹویا اور گمان تھا کہ جس وقت روس، فلیٹینڈ کی طرف سے فارغ ہو جائے گا تو ان محاذوں میں سے کوئی ایک محاذ ضرور متعین ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا اور جو صبر آزما انتظار پہلے تھا وہی اب بھی باقی ہے اور دنیا کی دماغی الجھن و اعصابی کشمکش برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

اس دوران میں ہٹلر اور مسولینی کی ملاقات نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جرمنی کے مقابلہ میں اتحادائیں کی یہ دوسری سیاسی شکست ہے۔ اس سے پہلے دنیا نے سمجھ لیا تھا کہ شاید مسولینی دہلکے کا اتحاد ختم ہو گیا ہے، لیکن ان دونوں کی آخری ملاقات نے اس کی پوری طرح تردید کر دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ سرزمین بلقان میں جنگ چھڑنے کا بہت کم امکان رہ گیا ہے۔

جرمنی اور روس کی طرف سے رومانیہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے معنی یہی ہیں کہ جرمنی یہاں لڑائی چھیڑ کر اپنے اس سرمایہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا جو کروڑوں پونڈ کی مقدار میں ریاستہائے بلقان کے اندر پھیلا ہوا ہے اور نہ اپنے ان تجارتی و صنعتی فوائد کو نقصان پہنچانا مناسب سمجھتا ہے جو بلقان سے صرف امن ہی کی صورت میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

سویڈن و ناروے کی طرف کسی جنگ کا امکان تو نہیں ہے، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ جرمنی سویڈن کے بعض ساحلی مقامات کا مطالبہ کرے اور سویڈن بغیر جنگ کئے اسے دیدے، کیونکہ وہ پولستان و فنستان کا مشترکہ دیکھ چکا ہے، علاوہ اس کے یوں بھی ہمیشہ سے اس کا رجحان جرمنی کی طرف رہا ہے اور وہاں کی حکومت جرمنی سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی۔

بالٹک و لٹویا البتہ ابھی تک خطرہ میں ہیں اور ہٹلر کی باران بر حملہ کرتے کرتے رہ گیا ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان پر حملہ کرے گا یا نہیں اور کرے گا تو کب تک۔ لیکن روس کی شرکت نے چونکہ اس جنگ کو مشرق کے لئے بھی ایک حد تک خطرہ سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اگر ان خبروں پر اعتماد کیا جائے جو سرحد ایران پر روسی افواج کے اجتماع کے متعلق آئی تھیں، تو ایران کے ساتھ ہی ہندوستان تک اس آگ کی لپٹ کا پہنچ جانا ناممکن نہیں ہے۔ اول تو روس و ایران سے حال ہی میں ایک تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے، اس لئے اگر روس نے مشرق کا رخ کیا تو ایران اس کا مزاحم نہ ہوگا اور اگر ہوا تو وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگا، کیونکہ ایران کی فوجی حالت خراب ہے۔ اور میثاق سعد آباد کی رو سے افغانستان، ترکی و عراق کا اس کی مدد کرنا امید ہو سکتا ہے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ترکی اور عراق و ایران کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں اور ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ ترکی کا عربیہ ایران میں چل سکتا ہے، نہ ایران کا ترکی و عراق میں اودان کے درمیان آپس میں کوئی تعاون نہیں پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کا ایک مقصود تو اس جنگ سے یہ ہے کہ آرٹلک سے لیکر باسفورس تک اور
رہائش سے لیکر ولاڈی واسک تک پھیلے ہوئے اقتصادی و تجارتی اثرات برطانیہ کے ختم کر دے، دوسرا مقصود
اسی کے ساتھ یہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں تمام برطانوی فوجی مستقروں کو تباہ کر دے اور تیسرا مدعا یہ ہے کہ فرانس
کو برطانیہ سے علیحدہ کر کے غیر جانبدار رہنے پر مجبور کر دے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ نے بھی اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا
ہے کہ پولستان اور ڈیکو سلو وکیا کو دوبارہ زندہ کر کے نازی حکومت کے زور کو توڑنا ہے
اس لئے اس جنگ کے جلد ختم ہونے کے آثار نہیں ہیں، کیونکہ باوجود اس عزم بلند کے فریقین میں سے کسی
نے اقدام کی جرات نہیں کی ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ گھات میں لگے ہوئے ہیں

برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی کو صرف اپنی ناکہ بندی سے بیدست و پا کر دینا چاہتا ہے اور فوجی
کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ فرانس کی پالیسی اس باب میں زیادہ تیز ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اگر جرمنی حملہ نہیں کرتا
تو فوجی حملہ کر دینا چاہئے، لیکن برطانیہ اس کے لئے آمادہ نہیں۔ دوسری طرف جرمنی کی اقتصادی حالت بھی
ایسی خراب نہیں کہ برطانوی ناکہ بندی اس کو جلد سر جھکا دینے پر مجبور کر سکے۔ اول تو اس کے یہاں خود خام اشیاء
کا ذخیرہ بہت کافی موجود ہے، علاوہ اس کے روس و بلقان کی طرف سے تمام اشیاء کی درآمد بدستور جاری ہے اور
ناکہ بندی کی دسترس سے باہر ہے۔ اب فغانستان پر روس کے اقتدار نے جرمنی کے ذرائع کو زیادہ وسیع کر دیا ہے
الغرض اس وقت تک جنگ نے جرمنی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ فائدہ ہی میں ہے، برطانیہ کو
اس وقت تک فائدہ کوئی نہیں ہوا اور نہ اس کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا موقف ہی مدافعتی ہے۔ البتہ
اگر مشرقی افریقہ میں جنگ شروع ہوگئی یا ہندوستان پر حملہ کا خطرہ پیدا ہوا، تو برطانیہ کو اپنی موجودہ جنگی تدابیر
میں تغیر کرنا پڑے گا اور اس کی تمام وہ بحری، بری و فضائی قوت جو جبرالٹر، بحرہم، اسکندریہ، عدن، خلیج فارس
عراق، فلسطین اور بحر ہند میں پھیلی ہوئی ہے حرکت میں آجائے گی کیونکہ سن ۱۹۱۷ء میں لارڈ لینسٹون دارالامراء
میں مشرق کے متعلق برطانوی پالیسی متعین کر چکے ہیں کہ خلیج فارس یا اس کے آس پاس برطانیہ کسی اور حکومت کا
اقتدار دیکھ ہی نہیں سکتا جس کی تائید سن ۱۹۱۷ء میں سر ایڈورڈ گریس کی طرف سے بھی ہو چکی ہے

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ہٹلر نے مسکو سے ملنے کے بعد صلح کی چند شرطیں پیش کی ہیں جن میں پولینڈ اور ڈیکو سلو وکیا
کو بیس کمپیس سال کے اندر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن جرمنی کی طرف سے اسکی تردید ہو چکی ہے اور اگر یہ تردید صحیح ہو تو اس کے
معنی یہ ہیں کہ اتحادیوں غالباً ان شرائط پر صلح کرنے کے لئے طیار ہیں اور انھیں جرمنی سے منسوب کر کے نازی حکومت کا منشاء
معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے اور واقعی جرمنی نے کسی وقت ان اصول پر صلح کا ارادہ ظاہر کیا تو اتحادیوں اسے منظور
کر لیں گے۔ لیکن ابھی تک یہ تمام باتیں ظن و قیاس کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگ تین فتنات اور
تبعیہات کی حدود میں کب تک آئے گی۔

ازمیات Isms

(چند سیاسی اصطلاحیں)

پچھلے جہنے ایک صاحب کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے ایک فہرست ان سیاسی اصطلاحات کی پیش کی تھی جو انگریزی میں ازم (ism) پر ختم ہوتی ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ نگار میں ان سب پر روشنی ڈالی جائے گی چونکہ جنگ کی وجہ سے اس وقت بہت سے لوگوں کو سیاسیات کی طرف توجہ ہو گئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مزید تعویق کے اس سلسلہ کو شروع کر دینا مناسب ہے

ہو سکتا ہے کہ ازمیات کے ختم ہونے کے بعد اور سیاسی اصطلاحات بھی پیش کئے جائیں جن سے ہمیں روز مطالعہ اخبار میں واسطہ پڑتا ہے

فہرست چونکہ پچھلے جہنے دی جا چکی ہے اس لئے اس کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان اصطلاحوں کو ردیف وار پیش کروں گا، لیکن انگریزی حروف تہجی کے لحاظ سے اور ہر ممکن اختصار کے ساتھ تاکہ فرہنگ سے بڑھکے علمی تالیف کی صورت نہ اختیار کرے۔ ان اصطلاحوں کا مفہوم زیادہ تر والٹر تھمر کے تصریحات کو سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہے

1- Absolutism (استبدادیت) :-

وہ طریق حکومت ہے جس کے لئے کوئی آئینی یا قانونی حد نہ مقرر ہو۔ اس نظام حکومت میں جمہور کی نمایندگی بالکل نہیں ہوتی، یعنی نہ اُن کی رائے کو دخل ہوتا ہے، نہ وہ نظم و نسق میں کوئی حصہ لے سکتے ہیں

سولہویں اور سترھویں صدی کی استبدادی حکومتیں، اگر مطلق العنان حکومتیں تھیں، لیکن ان کی قوت کا راز امراء و شرفاء کی مدد میں پنہاں تھا۔ اور اگر عوام پر کسی طبقہ یا فرد کی طرف سے کوئی ظلم ہوتا تھا تو ان کی فریاد بھی سنی جاتی تھی اور انصاف بھی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جب جمہور کے جذبات آزادی اور حقوق شاہی کے درمیان تصادم ہوا تو پھر رفتہ رفتہ استبدادیت کا وہ مفہوم قرار پایا جو آج کل آمرانہ حکومتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے جرمنی اور اٹلی۔

۲- Activism (عملیت) :-

سیاسی جماعتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو صرف پروگرام بنایا کرتی ہیں اور عمل کی جرات نہیں کرتیں، دوسری وہ جن کا مقصد صرف عملی اقدام ہے۔ انھیں لوگوں کا نظریہ عملیت کہلاتا ہے۔

۳- Anarchism (فوضویت)

اس سے مراد کسی حکومت کا نہ ہونا ہے بلکہ صرف ایک ایسی سوسائٹی کا قیام جو قوانین حکومت سے بے نیاز ہو۔ اس نظریہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ حکومت کی ہر قسم (ملوکیت، جمہوریت، جمہوری اشتراکیت) بُری ہے اور ظلم و استبداد کا سبب۔ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے قانون، فرج، پولیس، قید خانے وغیرہ سب مٹ جائیں اور سوسائٹی کا نظام صرف آپس کے معاہدوں پر قائم ہو۔ اس نظریہ کے بڑے بڑے علمبردار یہ تھے :-

(۱) ولیم گاڈون (William Godwin) ۱۷۵۶ء - ۱۸۳۶ء۔

یہ اگر نریت تھا اور حکومت و سرمایہ داری کا سخت مخالف تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی حکومت کے صرف سوسائٹیاں قائم ہو جائیں اور سوائے ضروری ملکیت کے کوئی اور سرمایہ کسی کے پاس نہ رہے۔ یہ کہتا تھا کہ صرف انصاف و اخلاق کی تبلیغ سے ہمیں امن پسند سوسائٹیاں پیدا کرنا چاہئے تاکہ کسی حکومت کی ضرورت دنیا میں باقی نہ رہے۔

(۲) میکس اسٹرنر (Max Stirner) ۱۸۰۶ء - ۱۸۵۶ء۔

یہ جرمنی تھا اور معلمی کا پیشہ کرتا تھا۔ یہ فلسفہ خودی کا بڑا بڑا دست علمبردار تھا، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں خودی و انفرادیت کو سوسائٹی سے زیادہ اہم ثابت کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اخلاق و اخلاقیات پہل چیزیں ہیں اور کسی مقصد کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اچھا ہے یا بُرا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں خود اپنا مقصد پھول اور میں نہ اچھا ہوں نہ بُرا۔

(۳) پیری جوزف پروڈھن (Pierre Joseph Proudhon) ۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء۔

یہ فرانس کا باشندہ تھا اور مزدوروں کا لیڈر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ہے "ملکیت کیا ہے" اور آخر میں ثابت کیا کہ "ملکیت چوری ہے"۔

اس کے بعد اس کی مخالفت صرف بڑے بڑے صاحبان ملکیت تک محدود ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی ملکیتوں کی طرف دای کر نے لگا۔ دسک کے رواج اور سود کا سخت مخالفت تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ضروریات انسانی صرف اشیاء کے باہمی تبادلہ سے پوری ہونا چاہئے، جو نیکوں کے ذریعہ سے ممکن العمل ہے۔ آخر عمر میں وہ فوضویت ترک کر کے وفاقی (Federalism) طرز کی حکومت کا قائل ہو گیا۔

(۴) میکائیل باکونن (Michael Bakunin) ۱۸۱۴ء - ۱۸۷۶ء

یہ روس کا نہایت مشہور انقلاب پسند فوضوی (انارکسٹ) تھا اس نے ایک آزاد غیر مرکزی اشتراکیت کو رواج دیا جو کارل مارکس کے نظریے ”حکومت اشتراکی“ کے خلاف تھی یعنی کارل مارکس تو یہ کہتا تھا کہ تمام ملکیت حکومت کے سپرد کر دینا چاہئے، لیکن باکونن کہتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں کے سپرد ہونا چاہئے جو باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے توازن کو قائم رکھیں، یہ پارلمانی (Parliamentary) طریق حکومت کو غیر مفید بتاتا تھا اور اس کا نعرہ عمل تھا:-

فوضویت۔ اجتماعیت اور لاد مذہبیت (Anarchism, Collectivism, Atheism) اس نے اپنے اطالوی، ہسپانوی اور روسی مقلدین کی ایک بین الاقوامی انجمن ۱۸۶۹ء میں قائم کی لیکن متبعین مارکس نے اس کی سخت مخالفت کی اور ۱۸۷۲ء میں یہ انجمن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد بیس سال تک فوضویوں نے بڑا ہنگامہ برپا کیا اور باکونن کے نائب نشانیٹ (Netchayeff) نے قتل و خون کے ذریعہ سے فوضویت کو پھیلا نا چاہا، چنانچہ روس کا زار اسکندر۔ اٹلی کا بادشاہ ہمبرٹ (Hamburgt)۔ فرانس کا صدر کار فر (Carnot)۔ آسٹریا کی ملکہ اترتجہ، اور امریکہ کا پریسیڈنٹ میک کنلی (Mackinley) سب انھیں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے

امریکہ میں فوضویت کے علمبردار بنجیامن ٹکر (Benjamin Tucker) اور جان موسٹ (Johann Most) آخر الذکر جرمنی کا اشتراکی تھا۔ امریکہ کے فوضویوں نے ۱۸۸۳ء میں اپنی کانگریس منعقد کی لیکن ۱۸۸۶ء میں اس تحریک کو دبا دیا گیا اور ۱۸۹۱ء سے قانوناً ممنوع قرار دی گئی یہاں تک کہ اب کوئی شخص سرزمین امریکہ میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ یہ اقرار نامہ داخل نہ کرے کہ وہ فوضوی خیال کا نہیں ہے۔

(۵) پٹر کروپٹکن (Peter Kropotkin) ۱۸۴۲ء - ۱۹۰۱ء

روس کا نامہ جغرافیہ تھا اس نے ”اشتمالی فوضویت“ (Communist Anarchism) کو رواج دیا۔ چونکہ بڑے بڑے صنعتی ادارے فوضویت کے رواج میں حایل تھے اس لئے اس نے سب سے پہلے انھیں کی مخالفت کی اور کہا کہ صنعتی پیداوار چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں کے ذریعہ سے ہونا چاہئے اور ملکیت کو چھوٹے چھوٹے اداروں میں تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے ممبروں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے ذمہ دار رہیں وہ تقسیم محنت و عمل کا بھی مخالف تھا اور اجرت کی تعین کا بھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اجرت ملنا چاہئے اور چار بانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کسی سے کام نہ لینا چاہئے۔

آخر میں یہ بہت اعتدال پسند ہو گیا تھا، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں وہ اتحاد میں کاموافق تھا اور جب ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب ہوا تو یہاں آگیا اور کرسکی (Kerensky) کا طرفدار ہو گیا۔ اس کے بعد جب روس میں اشتمالیت پسندوں (Communists) کا غلبہ ہوا تو اس نے پروتاری (مزدور پیشہ) لوگوں کے اقتدار کی مخالفت شروع کی اور یہیں ۱۹۱۷ء تک رہا

(۶) ٹالستانی (Count Leo Tolstoy) ۱۸۲۸ء - ۱۹۱۰ء

یہ مشہور روسی مصنف تھا اور اس کی فوضویت کا رجحان زیادہ تر مذہب کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت و قانون کا جو مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اور بجائے قانون کے وہ محبت کی حکومت کا قائل تھا۔ وہ امن پسندانہ عدم تعاون کا قائل تھا (جسے بعد کو گاندھی جی نے اختیار کیا)۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ فوجی ملازمت ترک کر دیں، ٹیکس نہ ادا کریں، عدالتوں کو تسلیم نہ کریں تاکہ نظام حکومت از خود ٹوٹ جائے۔

۴۔ Anti-Semitism (معد سامیت) :- یہودیوں کے خلاف جو تحریک قائم ہو اسے اس نام سے پکارتے ہیں۔ پہلے یہ مخالفت یہودی مذہب سے تھی لیکن اب یہودی قوم سے ہے۔ نازی جرمنی اب اس تحریک کا مرکز ہے۔ اس سے پہلے روس میں بھی یہ تحریک پائی جاتی تھی لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے ختم ہو گئی ہے۔

اس تحریک کا آغاز اٹھارہویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے جب آریں یا نارڈک (Aryans) قوموں کی برتری کا نظریہ پیش کیا گیا (جس پر آئندہ دیگر سیاسی اصطلاحات کے سلسلہ میں روشنی ڈالی جائے گی) یہودیوں کے خلاف اس تحریک کا سبب زیادہ تر اقتصادی ہے۔ چونکہ یہودی قوم نے صنعت و حرفت اور تجارت میں غیر معمولی ترقی کر کے ایک بہت بڑی سرمایہ دار جماعت کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور سیاسیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے یورپ کی بعض یہودی قومیں ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جرمنی میں ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

۵۔ Bolshevism (بالشویزم) :- کیونکہ کم کا دوسرا نام ہے۔ ۱۹۱۳ء میں روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی تو انتہا پسند جماعت نے جس کا لیڈر لینن تھا اکثریت رائے سے اقتدار حاصل کر لیا اور چونکہ اکثریت کو روسی زبان میں بالشنو (Bolsheviks) کہتے ہیں اس لئے اس جماعت کے لوگوں کو بالشیوکی (Bolsheviks) یعنی افراد اکثریت اور دوسری اعتدال پسند جماعت منشیوکی (Mensheviks) یعنی افراد اقلیت کہنے لگے۔

۶۔ Caesarism (قیصریت) :- اصطلاح، جولیس قیصر

(Julius Caesar) کے وقت کی یادگار ہے۔ یہ روم کا مشہور ڈکٹیٹر تھا۔ اس سے مراد فوج یا اہل سیاست میں سے بڑے بڑے لوگوں کی حکومت ہے اور جمہوریت کی ضد۔ اس زمانہ کی ڈکٹیٹری حکومتیں، قیصریت ہی کہلاتی ہیں۔

۷۔ Capitalism (راس المالیت) - اس کو سرمایہ داری بھی کہتے ہیں اور متاعیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد وہ اقتصادی نظام ہے جس کے تحت دولت کی پیداوار اور تقسیم پر انویسٹ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے لوگوں کو سرمایہ دار کہتے ہیں اور ان کی کاروبار میں لگی ہوئی دولت جس سے بڑا نفع حاصل کرتے ہیں سرمایہ کہلاتی ہے اس کی ضد اشتراکیت (Socialism) ہے جو سرمایہ داری کے نظام کو متاثر دولت کو جمہور میں برابر تقسیم کر دینا چاہتی ہے، تاکہ انفرادی فائدہ کے بجائے وہ پبلک مفاد کی صورت اختیار کرے۔

۸۔ Centralism (مرکزیت) - ایک سیاسی نظام ہے جس کی رو سے تمام سلطنت کا انتظام ایک خاص مرکز سے متعلق ہوتا ہے یہ اس وفاقی حکومت کی ضد ہے، جس میں ملک کے صوبوں کو اختیارات کلی دیدئے جاتے ہیں۔

۹۔ Chauvinism (شاوینیت) پھولین اول کے ایک نہایت جوشیلے سردار کا نام ساؤن (Chauvin) تھا یہ اصطلاح اسی کے نام سے نکلی ہے جس سے مراد کسی خاص مقصد یا قومیت پرستی کی انتہائی طرفداری کرنا ہے۔

۱۰۔ Clericalism (کلیسائیٹ) کیتھولک مذہب والوں کی سیاسی تحریک کو اس نام سے منسوب کرتے ہیں۔

۱۱۔ Collectivism (اجتماعیت) - ان تمام اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا نام ہے جو آپس میں اتحاد عمل اور مرکزیت کے ساتھ کام کریں۔

۱۲۔ Communism (اشتمالیت) - اس کی صراحت پچھلے جینے ہو چکی ہے۔

۱۳۔ Fascism (فسطائیت) - اٹلی کی قومی تحریک ہے جس کو سولہویں صدی میں مسولینی نے جاری کیا۔ اس کا اخذ اطالوی لفظ (Fascio) ہے جس کے معنی ہیں لکڑیوں کے گٹھے، قدیم روم میں حاکم اعلیٰ کے آگے آگے لکڑیوں کا گٹھا اور کلہاڑی اظہار شان کے لئے لیکر چلتے تھے۔

فسطائی نظام حکومت، اشتمالیت اور پارلیمانی حکومت کا ضد ہے۔ یہ نہ سرمایہ دارانہ حکومت ہے نہ اشتراکی۔ یہ ذاتی ملکیت کو تسلیم کرتی ہے، لیکن اسے حکومت کے اقتدار میں رکھنا چاہتی ہے۔ تجارتی اور صنعتی ادارے سب فسطائی حکومت کے زیر اثر ہیں۔

اٹلی میں اس وقت صرف ہی ایک سیاسی پارٹی ہے جس کے ممبر مسولینی کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ سیاہ فام بننے

ہیں اور قدیم اہل روم کی طرح اوپر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔ فسطائی تنظیم بالکل فوجی تنظیم ہے اور اس کا مقصد قدیم روم کی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنا ہے۔ یہ جمہوریت کے بھی غلات ہیں اور لیبرل حکومت کے بھی۔ ان کے یہاں ابتداء ہی سے فوجی تعلیم لازم ہے اور ۱۸ سال کی عمر میں ہر نوجوان فسطائی جماعت کا ممبر ہو جاتا ہے۔ یہاں شاہنشاہیت و تسلیم رکھی گئی ہے، لیکن برائے نام۔ تمام انتظامات فسطائی کونسل عظمیٰ کے سپرد ہیں جسے مسکینی نے مقرر کیا ہے۔ اس کونسل کو مسکینی کا جانشین نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ کیتھولک مذہب کے اقتدار کو یہاں دوبارہ قائم کیا گیا ہے اور ۱۹۳۷ء سے یہودیوں کے غلات بھی تحریک شروع ہو گئی۔

۱۴۔ *Feudalism* (اقطاعیت)۔ اس سے مراد یورپ کا وہ نظام حکومت ہے جو انقلاب فرانس تک پایا جاتا تھا۔ اس سے مراد جاگیر داروں اور امراء کی حکومت ہے۔ یعنی بادشاہ کے یہاں انھیں لوگوں کا اثر ہوتا تھا اور یہی سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کے پاس فوج بھی ہوتی تھی اور حکومت کے مختلف عہدے بھی انھیں کے قبضہ میں ہوتے تھے۔

۱۵۔ *Guild Socialism* (گلد اشتراکیت)۔ گلد قرون وسطیٰ میں اس ٹاؤن ہال کو کہتے تھے جہاں جلسے ہوا کرتے تھے۔ گلد اشتراکیت سے مراد وہ تحریک ہے جو ۱۹۰۶ء میں عہد وسطیٰ کے گلدی نظام حکومت کو موجودہ ترقی یافتہ اصول حکومت کے ساتھ ملانے کے لئے جاری ہوئی تھی، اس سے مقصد یہ تھا کہ حکومت کو مختلف تجارتی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت اپنی جدا کونسل مقرر کرے۔ یہ تحریک اس اشتراکیت کے غلات تھی جس میں صنعت و حرفت حکومت کے زیر اثر مانی جاتی تھی۔

۱۶۔ *Imperialism* (ملوکیت)۔ جس حد تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے، ملوکیت سے مراد برطانیہ کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے مقبوضات برطانیہ کے درمیان تعلقات استوار کر کے ان کو سیاسی حیثیت سے انگلستان کا تابع قرار دیا گیا تھا اور جدید مقبوضات حاصل کر کے سلطنت کو اور وسیع کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۴ء تک اسی پر عملدرآمد ہوا، لیکن اس کے بعد اس تحریک کو نظر انداز کر دیا گیا۔

زیادہ وسیع معنی میں ملوکیت سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک فتح کر کے سلطنتوں کو وسیع کیا جائے۔ موجودہ ملوکیت کی ابتداء اسی صدی میں ہوئی ہے اور انھیں مختلف ملوکیت پسند حکومتوں کا تصادم جنگ عظیم کا باعث ہوا، اس ملوکیت میں خصوصیت کے ساتھ انھوں نے زیادہ حصہ لیا، جن کی تجارتی و صنعتی ترقیاں حال ہی میں ہوئی تھیں

(مثلاً جرمنی، اٹلی اور جاپان) اور دوسری بڑی سلطنتوں سے اس لئے خفا تھیں کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے اندر تقسیم کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے زیر اثر جاپان نے سلسلہ میں چین پر حملہ کیا، اٹلی نے سلسلہ میں حبشہ پر حملہ کیا اور جرمنی نے آسٹریا، زیکو سلوواکیا اور پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔

ملوکیت فی الحقیقت وہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے جو تجارت و صنعت کی ترقی کے سلسلہ میں مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے اور دولت کو ایک محدود جماعت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ عوام اور مزدوری پیشہ لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ تمدنی حیثیت سے نیچے درجے کے لوگ ترقی کر سکتے ہیں۔ موجودہ آمرانہ حکومتیں بھی، ملوکیت ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو جدا جدا ترکیبوں سے سرمایہ دارانہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

۱۷۔ *Isolationism* (اجتنابیت) امریکہ کی ایک مخصوص سیاسی جماعت کا یہ نظریہ کہ یورپ کے معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے۔ موجودہ لڑائی سے پہلے برطانیہ میں بھی کچھ لوگ اس خیال کے پائے جاتے تھے۔

۱۸۔ *Marxism* (مارکسیت)۔ اس سے مراد کارل مارکس کے نظریے ہیں۔ کارل مارکس سلسلہ میں جرمن میں بمقام ٹربین (*Trotsky*) پیدا ہوا اور سلسلہ میں لندن میں مرا۔ یہ یہودی تھا اور تعلیم پانے کے بعد اخبار نویس کا پیشہ کرنے لگا تھا۔ اس کی رائیں چونکہ حکومت کو پسند نہ تھیں اس لئے جرمنی سے خارج ہو کر دیار گیا۔ یہ فرانس پہنچا اور یہاں بھی نہ رہنے دیا گیا۔ یہ سلسلہ میں پھر جرمنی آیا، لیکن پھر ناکام رہا اور آخر کار لندن چلا گیا۔ موجودہ اشتراکی و اشتعالی تحریکوں پر مارکس کی تعلیم کا بڑا زبردست اثر ہے۔ اس کے اصول مختصر یہ ہیں کہ دولت کی پیداوار کا فائدہ صرف مزدوروں کی محنت ہے اور انھیں کو ملنی چاہئے۔ سرمایہ دار کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اسے بالکل محروم کر دینا چاہئے۔

مارکس کے نظریہ نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر سیاسیات و اقتصادیات کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑا ہے۔

لیکن روس کا مشہور انقلابی اسی کے فلسفہ کا پیرو تھا اور روس کی اشتعالیت، مارکسیت ہی کی عملی صورت ہے۔

۱۹۔ *Nazism* (نازیت) دوسرا نام بلکہ مخفف ہے *National Socialism*

(قومی اشتراکیت) کا۔ سب سے پہلے سلسلہ میں جرمنی کی لبر پارٹی نے آسٹریا میں اس تحریک کو شروع کیا تھا۔

لیکن ہٹلر کا براہ راست اس پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہٹلر کی پارٹی کی بنیاد ایک جرمن مزدور ڈاکٹر (*Drexler*)

نے ۱۹۱۹ء میں قائم کی تھی۔ جب ہٹلر اس میں شریک ہوا تو اس کا نام (*National Socialist*

Party) رکھا اور اس کے ۲۵ اصول مقرر کئے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں :-

تمام جرمن اقوام کا اتحاد - معاہدہ ورسائی کی تسخ - حقوق و فرائض میں مساوات - رومن قانون کی جگہ جرمن قانون کا قیام - صحت جسمانی کی ترقی - جبریہ فوجی تعلیم - غیر جرمن اقوام اور یہودیوں کا اخراج - بڑے بڑے تجارتی و صنعتی اداروں پر حکومت کا اثر - کاشت کی اصلاح - عام قومی تعلیم -

لیکن جب سلسلہ میں ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا تو اس تحریک کا اشتراکی حصہ تو نظر انداز کر دیا گیا اور اسکی حیثیت صرف قومی تحریک کی سی رہ گئی۔ یہاں سرمایہ داروں کی حکومت تو نہیں ہے، لیکن سرمایہ داری کی ضرور ہے، یعنی ہر چند امراء اور صاحبانِ دولت کا اقتدار حکومت پر نہیں ہے لیکن دولت کی تقسیم بھی رسی نہیں کہ واقعی اہل احتیاج کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

نازی پارٹی کا نظریہ ہے کہ صرف آریں قوم ہی دنیا میں حکومت کے لئے آئی ہے اور خالص آریں نسل کے لوگ وہی ہیں۔ یہودیوں سے نفرت کا سبب یہ ہے کہ وہ سامی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جرمنی کا اقتصادی نظام بالکل نئے ہاتھ میں تھا۔ ۲۰۔ *Nihilism* (عدمیت) لاطینی لفظ *کنہ کنہ* (کنہ کنہ) سے ماخوذ ہے، جسکے معنی ”کچھ نہیں“ کے ہیں۔ سترھویں صدی میں روس کے اندر بعض لوگوں نے ایک ذہنی نظریہ یہ قائم کیا تھا کہ حکومت یا اقتدار کسی قسم کا بھی ہونا قائل تسلیم ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے اور اپنے افعال کا مالک - اس تحریک کو ٹرگینیو (*Turgeneff*) کے ناول (*Father & Son*) کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ہر چند اس تحریک نے انقلابی خیالات پیدا کرنے میں کافی مدد پہنچائی، لیکن یہ بجائے خود کوئی سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ صرف فلسفہ اور نظریوں تک محدود تھی۔

۲۱۔ *Pacifism* (امنیت) - دنیا سے جنگ کو ختم کر دینے کی تحریک اس نام سے موسوم کی جاتی ہے جو اس قسم کی سوسائٹیاں برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ ہر جگہ قائم کی گئیں اور ہر چند اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی لیکن اس کا اثر بینک دنیا پر بہت بڑا، چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے ایک بین الاقوامی صلح پسند کانفرنس کا انعقاد اس کا نتیجہ تھا اور جنگ کے بعد مجلسِ اقوام کا وجود، بین الاقوامی عدالت کا قیام اور معاہدہ کلاگ (*Kellogg*) اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف معاہدوں اور تحریکوں تک محدود رہیں اور عملاً بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔

۲۲۔ *Pan Islamism* (جمہ اسلامیت) - اس سے مراد تمام مسلم اقوام و مسلم حکومتوں کا اتحاد عمل ہے۔ یہ تحریک سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور سلسلہ ۱۹۰۶ء میں ایک پان اسلامی کانگریس

۱۹۰۶ء امریکہ کے وزیرِ خارجہ کا نام (*Kellogg*) اعلان اس کی تحریک اور فرانسیسی وزیرِ خارجہ بریاں (*Briand*) کی تائید سے تقریباً دنیا کی تمام قوموں نے سلسلہ ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا تھا کہ آئندہ بین الاقوامی نزاعات لڑائی سے نہیں بلکہ آپس کے مجھوت سے ہونا چاہئے۔ لیکن اس پر عمل کسی نے نہ کیا۔ اس معاہدہ کا نام معاہدہ کلاگ ہے۔

کے انعقاد کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ سلطان عبدالحمید بہت کمزور انسان تھا اس لئے یہ تحریک کامیاب نہ ہوئی اور جنگ عظیم میں ترکوں کا ساتھ مسلمانوں نے نہیں دیا۔ اس کے بعد جب کمال اتاترک نے خلافت کا وجود ختم کر دیا تو اس تحریک کا مرکز سرزمین عرب قرار پائی اور خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے قاہرہ اور مکہ میں مسلمان جمع ہوئے، لیکن چونکہ ایک سے زائد دعویٰ اور خلافت پیدا ہو گئے اس لئے کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

یشاق سعد آباد کی روس سے ایران، افغانستان، ترکی اور عراق میں بیشک معاہدہ اتحاد ہو چکا ہے اسی طرح مصر، عراق اور سعودی عرب میں بھی معاہدہ اتحاد ہوا ہے، لیکن ان کو پان اسلامزم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان کا تعلق بجائے مذہب کے سیاسیات سے زیادہ ہے۔

۲۲۔ Socialism (اشتراکیت)۔ اس تحریک کا مقصود یہ ہے کہ دنیا کی ملکیت تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہونا چاہئے۔ عہد حاضر میں اس کی ابتداء اٹنیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے، جب سٹارٹس مور (Sir Thomas More) کے خیالی ہیئت اجتماعیہ (Utopia) کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی فوریر (Fouquier) (۱۷۹۷ء - ۱۸۳۷ء) نے سوسائٹی کا ایسا نظام تجویز کیا جس سے طبقات انسانی کفیل بالذات ہو جائیں اور پھر رابرٹ اوڈن (Robert Owen) (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۷ء) نے اپنی ساری دولت صرف کر کے نمونہ کے طور پر ایک ایسی فیکٹری اشتراکیت کے اصول پر قائم کی لیکن سوائے اس کے کہ تجارتی اداروں میں اتحاد عمل کا جذبہ تو ضرور اس سے پیدا ہو گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس تحریک کی سیاسی اہمیت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب پراؤڈھن (Proudhon) نے فرانس میں سکھ کا چلن موقوف کرنے کے لئے تبادلۂ اشیاء کے بنک اور اتحاد باہمی کی کمیٹیاں مقرر کرنے اور لوئی بلانش (Louis Blanc) نے ایک قومی دارالصنعت قائم کر کے صنعت و حرفت کو قومی اصول پر رواج دینے کی تجویزیں پیش کیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک انجلس (Frederick Engels) ان خیالی باتوں کے مخالف تھے اور اشتراکیت کو عملی حیثیت سے چلانا چاہتے تھے۔

اس وقت جرمنی اشتراکیت کا مرکز بن گیا تھا اور فرٹونڈ لاسیل (Ferdinand Lassalle) ایک اور اشتراکی جرمن نے سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ مارکس اس کا مخالف تھا اور اشتراکی حکومت کا قیام چاہتا تھا جب ۱۸۶۷ء میں لاسیل (ایک واقعہ محبت میں) قتل ہو گیا تو پھر اس کی پارٹی بھی مارکس کی پارٹی سے مل گئی اور اشتراکیت ۱۹۱۷ء میں روس کی کتاب کا نام ہے جس میں اس نے اپنی خیالی حکومت کو سامنے رکھ کر ایک فرضی جزیرہ کا حال بیان کیا تھا کہ وہاں کی ملکیت کس طرح سب لوگوں میں برابر تقسیم تھی اور وہ کیسی امن و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کتاب پہلے لاطینی میں شائع ہوئی (۱۹۱۷ء) اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا۔

کا اتنا زور ہوا کہ برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور روس ہر جگہ یہ تحریک پھیل گئی۔

۱۸۶۵ء میں مارکس نے ایک بین الاقوامی انجمن مزدوروں کی قائم کی جسے اصطلاح میں پہلی انٹرنیشنل (First International) کہتے ہیں۔ اس کے بعد اشتراکیت اور فوضویت میں تصادم ہوتا رہا اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت کرتی رہیں، تاہم اشتراکیت کی تحریک برابر جاری رہی اور مارکس کے انتقال (۱۸۸۳ء) کے بعد بھی لوگ اسے چلاتے رہے۔

۱۸۸۹ء میں انٹرنیشنل کی پھر تجدید ہوئی اور تمام دنیا کی اشتراکی جماعتیں اس میں شریک ہو گئیں۔ اس کو دوسری انٹرنیشنل کہتے ہیں۔ اسی دوران میں ایک اصلاحی جماعت اور پیدا ہو گئی جو اصول اشتراکیت کی تو قائل تھی لیکن تدریج کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچنا چاہتی تھی اور مارکس کی تعلیم تھی کہ ہنگامہ کر کے فوراً انقلاب پیدا کرنا چاہئے۔

۱۹۱۲ء میں انٹرنیشنل نے جنگ کے خلاف تجویز پاس کر کے سرمایہ داروں کو ڈرایا کہ اگر انھوں نے جنگ میں حصہ لیا تو وہ بغاوت کر دیں گے، لیکن جب سلسلہ میں لڑائی شروع ہوئی تو اکثر اشتراکی اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گئے۔ تاہم انتہا پسند اشتراکیوں کی ایک جماعت ایسی موجود تھی جو اپنے خیال پر قائم تھی اور آخر کار اسی نے لینن کی قیادت میں سلسلہ میں روس کے اندر انقلاب پیدا کیا اور خود جرمنی میں بھی اسی تحریک نے لڑائی کو ختم کر دینے میں بڑا حصہ لیا، کیونکہ جرمنی کی قیصریت و ملوکیت کو اشتراکی تحریک ختم کر چکی تھی اور ملک جنگ کے لئے تیار تھا۔ اس انقلاب کے بعد جرمنی میں قواعد بدل پنداشتراکیوں کا غلبہ ہوا، لیکن روس میں انتہا پسندی کا وہ زور ہوا کہ اشتراکیت کیونکر بن گئی۔

برطانیہ میں اشتراکیت کی نمائندگی ایک حد تک لیبر پارٹی کر رہی ہے، لیکن کیونکر کمزور کا دباؤ پڑتا نہیں۔ جرمنی میں البتہ اشتراکی ووٹوں کی تعداد ہٹلر کے سامنے ۳۸ فی صدی تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت صرف روس ہی ایک ایسی سلطنت ہوا جہاں انتہا پسند اشتراکیت کی حکومت ہے اور اب میکسیکو (Mexico) میں بھی قائم ہو گئی ہے، اور دوسری سلطنتوں میں اس وقت تک اس کا رواج نہیں ہوا ہے۔

۲۴۔ Syndicalism (صنعتی اشتراکیت)۔ یہ مزدور طبقہ کی انقلابی تحریک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تجارتی و صنعتی اداروں کی تنظیم مزدوروں اور کام کرنے والوں کے مطالبات و اغراض کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ان کا خاص حربہ ہڑتال (Strike) ہے۔ جنگ کے بعد یہ تحریک اشتراکیت کا جزو بن گئی ہے۔

۲۵۔ Zionism (صیہونیت)۔ یہ یہودیوں کی تحریک ہے جس کا مقصد فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کی ابتداء ۱۸۹۵ء میں ہوئی اور سب سے پہلی اسکی کانگریس کا جلسہ ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ ڈاکٹر ہرنل (Dr. Herzl) اس کا بانی ہے اور اس وقت ۲۰ لاکھ یہودی اسکے ممبر ہیں۔

خلیفہ گلزار علی اسیر

خلیفہ گلزار علی اسیر میاں نظیر کے فرزند اکبر تھے مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ سلسلہ میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں نظیر جی کے مکتب میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور باپ سے شاعری بھی ورثہ میں ملی تھی، میاں نظیر کی زندگی تک کچھ بڑے اڑاتے رہے سلسلہ میں نظیر نے انتقال کیا تو اسیر (تیس سال کی عمر میں) مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی والا اور مائی تھان والوں کو پڑھانے لگے، دوجہ کی آمدنی ستر روپیہ ماہوار تھی، گوالیار میں ان کے دو گھوڑے بھی تھے وہاں سے فی گھوڑا بائیس روپے آتے تھے جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے اور تیس روپے خلیفہ جی کو ملتے تھے۔ اس طرح سو روپیہ ماہوار سے زیادہ آمدنی تھی، میاں نظیر کی سی غربت اور بھلمنسائٹان کی طبیعت میں نہ تھی مولف زندگانی بے نظیر کسی نوازش علی بیگ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ سلسلہ میں مہاراجہ بلونت سنگھ نے آگرے میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی اور بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہونے لگا چونکہ خلیفہ جی مہاراجہ کے نوکر تھے اس لئے مہاراجہ نے ان سے خواہش کی کہ مشاعرہ کے لئے سوزل کہدیا کریں۔ انھوں نے کہا میں اس لئے نوکر نہیں کہ اپنی عزت تمھیں بختا کروں تم خود کچھ کہو جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا، درست کر دوں گا، مہاراجہ نے مجبور ہو کر حاتم علی قہر کو بلوایا اور وہی عزت کہدینے لگے، مگر ان کے اس سیکھے پن کے باوجود مہاراجہ انھیں بھی مشاعرہ میں بلواتے اور اپنا استاد سمجھتے، مشاعرہ میں خلیفہ جی کو اپنی دینی طرف بٹھاتے اور قہر کو بائیں طرف، دونوں کے آگے چاندی کا حقہ لگایا جاتا، مرزا حاتم علی قہر تو حقہ براکتفا کرتے مگر خلیفہ انیون کے رسیا اور بھنگ کے دلدادہ تھے حقہ سے بھلا کیا سیر ہوتے، ساقن جو دوسروں کو حقہ پلانے مقرر ہوتی اس کو بلاتے اور گرام گرم حقہ سے محفل مشاعرہ کو دھواں دھار بناتے تھے، قہر ذرا جھنڈ آدمی تھے پہلی دفعہ انھوں نے خلیفہ جی کی یہ حرکت دیکھی تو کچھ حیرت کا اظہار کیا خلیفہ جی کب چونکنے والے تھے فوراً یہ مطلع سنایا:-

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی گو مسلمان ہوں پہ بول اٹھتا ہوں بے کالی کی

خلیفہ کی تعلیم بھی نہایت معمولی ہوئی تھی میاں نظیر کی ولایت کے ثبوت میں مولف زندگانی بے نظیر نے ایک روایت نوازش علی کے حوالے سے بیان کی ہے کہ جب کبھی میاں نظیر خلیفہ جی کو ساتھ لے کر مکتب کی طرف روانہ ہوتے خلیفہ جی پیٹ کے درد کھانا نہ کر کے مکان کو واپس ہو جاتے، میاں نظیر نہ فالج کا حملہ ہوا اور تین روز کی بیہوشی کے بعد چوتھے روز ہوش آیا

تو انھوں نے دریافت کیا کہ مکتب کون پڑھا رہا ہے اس کے جواب میں خلیفہ جی نے کہا آپ کے سوا بھلا کون پڑھا سکتا ہے میں نے تو ابھی تک گلستاں بھی ستم نہیں کی ہے مکتب کے طلباء، اطراف اور ابراہیم افضل پڑھتے ہیں بھلا میں انھیں کیا پڑھا سکتا تھا اس لئے کوئی انتظام نہ ہو سکا، میاں نظیر نے کہا تم جاؤ بھی تو، چنانچہ خلیفہ کا بیان ہے کہ ”ارشاد سے ان کے گیا اور ان کی دعا سے کچھ ایسا بہرہ کہلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی حقیقتاً یہی اُن کا ایک تصرف تھا“ اس سے بہتر چلتا ہے کہ خلیفہ بس یوں ہی خلیفہ بن گئے تھے پڑھے لکھے اسی قدر تھے کہ گلستاں تک نہیں ختم کی تھی۔

مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ خلیفہ کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور شاگردوں کا جم غفیر ہمیشہ لگے ساتھ رہتا تھا، شہباز نے خلیفہ جی کے دو دوا دین کا ذکر کیا ہے ایک مطبوعہ اور دوسرا قلمی لالہ سرپرست نے مخمناۃ جاوید میں ان کی ایک ٹمنوی کا ذکر کیا ہے جو سوز عشق کے نام سے مشہور تھی۔

خلیفہ جی نے ۱۲۹۹ء میں انتقال کیا ان کے ایک شاگرد غلام محمد خاں رہائے تاج دہلی جو لوح مزار پر کندہ ہے

گفت اسیر رام ہستی شد رہا

اس میں چھ عدد کا تحریر ہے۔

یہ حالات تھے خلیفہ جی کے جو پروفیسر شہباز کی کتاب زندگانی بے نظیر سے ملے، آئیے اب ہم آسیر کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کریں۔ ہمارے پیش نظر آسیر کا دیوان مطبوعہ مطبع حیدری واقع دار الخلافہ اکبر آباد کٹرہ حاجی محمد حسن باد شعبان المعظم ۱۲۹۶ھ مطابق فروری ۱۸۷۳ء ہے جو رائل سائز اور (۱۳) سطری سطر پر طبع ہوا ہے متن میں ۱۳ اور حاشیہ پر ۱۴ اس طرح فی صفحہ ۲۷ شعر ہیں ۱۶۷ صفحات ہیں بظاہر اس دیوان میں (۴۷۲) شعر ہیں، آخر میں دو ایک نمبر ایک آدھ سہ سہ چند رباعیاں ہیں مگر سب معمولی شروع سے ۱۶۹ صفحات تک غزلیات ہیں عموماً غزلیں بڑی بڑی ہیں اور دو غزلہ سہ غزلہ کہتے گئے ہیں جس سے ان کی ہر کوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیوان پیش نظر خلیفہ جی کی زندگی ہی میں طبع ہوا ہے اس دیوان کی طباعت کے انیس سال کے بعد خلیفہ جی نے انتقال کیا ہے انیس سالہ شاعری جس دیوان میں تھی وہ پروفیسر شہباز کی نظر سے گزر چکا ہے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے کوئی اچھا انتخاب اس دیوان سے نہیں کیا صرف چند شعر آسیر کے نقل کئے ہیں جن میں سے اکثر اس مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ بقیہ چار چھ شعر ایسے ہیں جو اس دیوان میں نہیں مگر وہ شعر بھی کوئی خاص بات نہیں رکھتے، ٹمنوی جس کا ذکر سرپرست صاحب نے کیا ہے ہمیں نہ مل سکی اور نہ پروفیسر شہباز زہی کو اس کا پتہ چلا وہ ضرور ٹمنوی کا ذکر کرتے اس دیوان کے مطالعہ سے ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں ان کی مفلسی پر روشنی پڑتی ہے اور ناقدری کا پتہ چلتا ہے، حب اہل بیت اور مذہبی توغل بھی ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ ذوق نگاہی بھی نظر آتی ہے جو جو اس کے کہ سوز و پیدہ اور خلیفہ جی کی آمدنی تھی اور اس زمانہ میں سوز و پیدہ خاصی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ بڑے بڑے

شاعر میں روپیہ ماہوار پر زندگی بسر کر رہے تھے ملک الشعراء استاد ذوق پانچ روپیہ ماہوار پاتے تھے ان کے مقابل میں تو اسیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی مگر متعلقین کی زیادتی کے علاوہ ایون نوشی اور اس کے لوازمات کی کثرت کی وجہ سے شاید آمدنی ان کو کفایت نہیں کرتی تھی اسی وجہ سے مفلسی کا رونا روتے رہے اس سبک وضعی کا احساس انکو بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں :-

یہ سب سے نسب میں ہوں گراں قدر اسیر آہ لیکن میں سبک وضعی سے مطعون جہاں ہوں
اس کے ساتھ ہی ساتھ جادو پردہ سے انحراف کا بھی انھیں افسوس تھا۔

افتادگی کی چال چلو تم بھی اب اسیر ا وضع پر جو چھوڑے وہ فرزند کچھ نہیں
انھیں وجہ سے فراغت نصیب نہ تھی اور روتے تھے کہ

سر میں بھی اٹھاؤں جو ترے دور میں اب چرخ ہوگی کبھی کاہے کو فراغت مجھے اتنی
مفلسانیم و ہوائے سنی و مطرب داریم کیونکر اس شہر میں اوقات گزاری ہوگی
افلاس میں ہو سیر تو دل سیر ہو کیا خاک دولت ہی کا سب میلہ ہے دولت کا تاشا،
اے لذت دنیا تجھے کیا یاد کریں گے دو دن کے لئے ہم نے جو کی آن کے جاگرم
تس پر بھی نہ بھیجا کبھی افلاس نے چھوڑا پانی جو ملا سرد تو کھانا نہ ملا گرم
افلاس کا غلبہ ہوتا تو یہ کہہ کر تسکین دلیا کرتے تھے کہ
مولیٰ کی اک نظر ہے فقط کیسا اسیر کچھ غم نہیں جو آیا ہے افلاس اب کے بھر
مگر باد جو اس مفلسی کے گلچھرے اڑاتے تھے

مفلسی میں تو یہ گلچھرے اڑاتا ہے اسیر جانے کیا کرتا ترے پاس اگر زر ہوتا،
مفلسی میں انسان متمولوں سے متنفر ہو جاتا ہے اور یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ کسی متمول کی صورت
بھی دیکھنا نہیں چاہتا،

ہو جو مقدور تو دنیا میں منادی کر دوں سامنے ہو کے نہ مفلس کے تو نگر نکلے
باوجود اس مفلسی کے خود داری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ خود دولتوں کی خوشامریا مصاحبت کو ناپسند کرتے تھے۔
سوداغ مفلسی تجھے دل پر قبول ہیں لیکن نہیں ہے صحبت نودوتاں پسند
اسی مفلسی نے انھیں اپنی بنجستی کا احساس بھی پیدا کر دیا تھا اور اپنے تئیں بڑا بلیکس و بے بس تصور کرتے تھے۔
ہم کو ان کانوں نے جو جو کہ سنایا وہ سنا ہم کو ان آنکھوں نے جو جو کہ دکھایا دیکھا
چکا جو فلک نے تو زمیں نے دیا سر کا میں اک گل بازی ہوں ادھر گانہ ادھر کا

اسی سلسلہ میں یارانِ وطن سے بھی شکایت پیدا ہو گئی تھی،
 بیڑیاں کاٹ جو صحران کو نہ بھاگے گا اسیر
 یاں شمع کہاں ہے مرے ویرانے میں مجنوں
 اس کے باوجود اپنی پاک باطنی اور صاف دلی پر ناز تھا۔
 باطن آباد ہے ظاہر میں خرابی ہے اگر
 گنج لیجاتی ہے دنیا مرے ویرانے سے
 شاعری سے متعلق نہ صرف خلیفہ جی کے فنی معلومات ہی اچھے تھے بلکہ ذوقِ نگاہی بھی ان میں پیدا ہو گئی تھی،
 دوستوں کی تعریف کو وہ حقیقی تعریف نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ لوگ منہ دیکھے کی کہتے ہیں۔
 نازاں نہ ہوا اسیر اب کچھ اپنے شعر پر تو
 کہتے ہیں یہ جو تیرے سب دوستدار اچھا
 پریم تو اس کو اچھا کہتے ہیں جس کو سُنکر
 دشمن کے منہ سے نکلے بے اختیار اچھا
 شاعری میں بعید مضامین اور گتھیاں سلجھانے کے بھی وہ قابل نہ تھے صاف اور سیدھے شعر چاہتے تھے۔
 معنی شعر جبکہ بدقت سمجھ میں آئے
 تو شعر کا ہے کو وہ ہوا چیتاں ہوا،
 لوگوں کے مضامین لے کر اپنے رنگ میں باندھنے کے بھی وہ قابل نہ تھے بلکہ اُسے بُرا سمجھتے تھے
 ہے اپنے قاعدے میں یہ شعر و سخن کی بات
 نکلی ہوئی کہیں نہ کسی کے دہن کی بات
 انھیں اس کا احساس تھا کہ بڑے سے بڑے استاد کی بھی پوری غزل مرصع نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی دو شعر ہر غزل
 میں اچھے نکلتے ہیں

کیوں اہل معنی داد و سخن دیں نہ اسے اسیر
 اچھے ہیں اس غزل میں بھی اشعار ایک دو
 معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ دمشق میں ان پر اعتراض بہت ہوتے تھے کبھی تو وارد ہو جاتا تو لوگ مرقہ بتاتے تھے اور اگر
 غزل اچھی ہوتی تو کہتے کہ استاد سے کہلو الیہ غالباً یہ باتیں نظیر کے انتقال سے پہلے کی ہیں اور یہ شعر بھی جب ہی
 کہے گئے ہیں۔

سخت مشکل ہے اگر ہر دے تو ارد واقع
 اس کو بس غیر کا مضمون بتاتا ہے کوئی
 اور لکھتے ہیں جو ہم شستہ و رفتہ سی غزل
 تہمت استاد کے شعروں کی لگاتا ہے کوئی
 اس کے بعد چیلنج کرتے ہیں

شک ہو کر دل میں تو کو مصروفِ رنگیں موزوں
 کیوں نہیں طبع سے پھر طبع لڑاتا ہے کوئی
 آج مرزا بھی ہیں منصف ابھی کھلجائے گا،
 ہم چراتے ہیں غزل یا کہ چراتا ہے کوئی
 غالباً مرزا سے مراد مرزا حاتم علی قہر ہے، کیوں کہ ایک اور شعر میں انھوں نے اپنے چند معاصرین کو گناہ

نجلہ قہر بھی ہیں۔

شاعری چکے جو چندے یہی صحبت رہ جائے

تہر و مہ اعظم و آغا ہیں سخن سنج اسیر
لڑائیں عیب جوئی اور غور و گہری کی عادت نہ تھی۔

جو ہنرمند ہیں وہ داد ہنر دیتے ہیں،

عیب جوئے سخن ڈھونڈتے ہیں عیب اسیر

عدو کی چشم جو سوئے ہنر نہیں تو نہ ہو

دلا تو عیب چھپا اور ہنر کو دیکھا کر

علوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آگرہ میں شاعری کا زور شور تھا اور ہر شاعر طوطی ہند بنا ہوا تھا، دیکھئے طنز کرتے ہیں
یہ کتنا گہرا طنز ہے

طوطیوں سے کشور ہندوستان خالی نہیں

جس کو سنئے وہ جواب بلبل شیراز ہے

راہنے کلام کی حقیقی قدر بھی آپ جانتے تھے اور آگرہ والوں کی نادری کے شاک بھی تھے۔

موت سے ہے دکان ہماری کھلی ہوئی

گاہک ہی آگرہ میں سخن کا نہیں اسیر

اس طرح سے گل مضمون کھلاتا ہے کوئی

آج شاخ قلم خشک سے جزیرے اسیر

اور ریختہ کہنے کو سراپا میں زباں ہوں

چپ رہنے کو تصویر ہوں برسوں بھی نہ بولوں

جو کھا کے موتی اُگلتا ہے عاشق

اسیر سخن سنج کی کچھ نہ پوچھو

پاکو یہ زعم بھی تھا کہ مرنے کے بعد آپ کی رنگینی طبع سے گل احمر کھلیں گے، یہ مضمون تعلیٰ میں بالکل نیا ہے :-

رنگینی پہ آئے گی اگر زیر زمیں طبع،

کیا کیا گل احمر مری مٹی سے کھلیں گے

رنگ رخ شمع سحر چھا نہیں ہوتا

پیری میں کہاں رونق ایام جوانی،

ہم اپنی سرگزشت قلمبند کرتے ہیں

برجستہ شعر، بندش مضمون کہاں اسیر

یہ دل کے نکلتے ہیں بخارات زباں سے

وہ گرمی مضمون تو ہوئی سرد اسیراب

الہ کے دیوان کی فکر بھی رہی ہے ممکن ہے کہ نو کشور کا پہلا ڈیشن جو بہت ضخیم تھا جس میں ہزلیات کا بھی
خاص حصہ تھا خلیفہ صاحب ہی کا مرتبہ ہو

شیرازہ دیوان پر کھینچ کے بازو

گر چاہو کہ ہوں صاحب دیوان اسیر آپ

علوم ہوتا ہے کہ آخر میں بالکل میاں نظیر کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور بادوستاں تلمط بادستناں دارا پر عمل کرتے تھے۔

کچھ بجز لطف و مدارات مجھے یاد نہیں

میں وہ ہوں دوست کہ دشمن کو بھی ناخوش کر لیا

نئی طرح خلیفہ اسیر نے "مقامیات" پر کوئی مستقل نظم یا غزل نہیں کہی ہے مگر بعض شعر مقامی رنگ کے ضرور کہے ہیں

دیکھو تو آگرہ میں دیوالی کی روشنی
اے جنوں چل کسی ویرانے میں سر پھوٹیں گے
ہر کوچہ ماہتاب ہے ہر خانہ آفتاب
اب آگرہ میں بھی ہوتی ہے زعفران پیدا
کسی نے کہا ہے:- ”دیوانہ باش تاغم تو دیگران خورند“ مگر اس سے اچھی چیز نیم پاگل بن ہے جسے اردو میں اُتو،
گرہا وغیرہ کہتے ہیں اس کو ذرا پھلکڑ قسم کے لوگ ”چوتیا پن“ کہتے ہیں اس قسم کی مخلوق دنیا میں بڑے مزے میں
رہتی ہے خلیفہ جی نے اسی کو بے شعوری سے تعبیر کیا ہے:-
جوبے شعور ہیں دنیا میں چین سے ہیں اسیر
عاشقانہ شعر خلیفہ جی نے خوب کہے ہیں بعض شعر نزاکت تخیل کی بڑی اچھی مثال ہیں:
آیا جو چلتے چلتے تری زلف کا خیال
دیکھئے کس قدر لطیف شعر ہے:
یاد آتی ہیں کسی کی غضب مہربانیاں
اس شعر میں ایک سوز ہے جس کی جھلکیاں کہیں کہیں ملتی ہیں:
جب سے پڑا دل عشق میں تب سے قصہ خوانی بھول گیا
اپنی کہانی یاد رہی اور سب کی کہانی بھول گیا
اسی غزل کے دو شعر اور سن لیجئے:-
جان پھنسی ہو آفت میں تے جیتے ہیں نے مرتے ہیں
ہائے رے اس نیاں کا برا ہو رہ کر چچا تاہوں
شعر لائحہ ہو بعض لوگ اس کو تصوف کے رنگ میں سمجھیں گے، مگر یہ عاشقانہ شعر ہے، خوب کہا ہے:-
میری دو آنکھیں اس کے لاکھ جلوے
کس قدر صحیح کہا ہے:-
جس کی گردن میں لپٹی ہے سکھا دیتی ہے
چند شعر مختلف مضامین کے سنئے:-
سیتے میں مرے آہ تو مدت سے ہوئی سرد
اک نالہ محضوں ہے سو محتاج اثر کا
لے شاید انیس کی راجی اسی سے ماخوذ ہے:-
یا سعدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں،
گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں،
حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
ہر جاتری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے

جلے جو دل تو ہو آہ شررِ فشاں پیدا
 لگے ذرا آگ تو کس طرح ہو دھواں پیدا
 شاید کہ ساتھ نالہ کے جاں ہو گئی رواں
 مرغِ چین جو کھول کے منقار گر پڑا
 پھر کسی کا ہاتھ سے کھینچا ہے دامنِ غیر نے
 پھر کسی کا چاک تا دامن گریباں ہو چلا
 پھر کسی سودا زودہ کا دل پریشاں ہو چلا
 حیف میں دیکھوں اور دل باسے
 میری آنکھوں کے سامنے مارا
 ظلم بتاں ہوا ستمِ آسماں ہوا
 یک مشت استخوان پہ کیا کیا یہاں ہوا
 مافسانہ ہوا گوشش زدِ خلائی کے
 ہزار حیف تمھارے دکان تک پہنچا
 دل ترا سینہ ترا سر ترا سماں تیرا
 کب کے لے اُڑتی زمیں سے مجھے ساتی یہ شراب
 کوئی معشوق بغل میں جو بہہ کا ہوتا
 میری وحشت نے رفوگر کو بھی حیراں کر دیا
 جب تلک دامن سیا لکڑے گریباں کر دیا
 سنئے اسے کان لگا کر ذرا
 قصہ دل ہے یہ کہانی نہیں
 اپنے میں پاؤں کی زنجیر ہلا دیتا ہوں
 جبکہ حلقہ در زنداں کا ہلاتا ہے کوئی
 بزمِ اغیار میں بیٹھا ہوا تو یاد آیا
 گرد گل کے نظر آئے جو چین میں کانٹے
 مجھے خبر نہیں دامن بھایا گریباں تھا
 کئے ہیں رات کو کچھ تار تار سے میں نے
 دل پہ اللہ اختیار نہیں
 بوندِ مجبور اس قدر کوئی
 عجب کچھ تفرقے سے شہر آب و گل میں پھرتا ہوں
 مجھے ڈھونڈھے ہے دل میں جستجوے دلیں پھرتا ہوں
 بے دل کے جلے سوزِ جگر میں نہیں ہوتا
 خوشبو کے لئے آگ پہ رکھتے ہیں اگر کو
 میخواری سے تو بہے پر اس وقت ہوں معذور
 جب شمع پہ گل صورت پیدا نہ بنے گا
 بخت جاگا کیا جب تک کہ رہے ہم سوتے
 ہم جو بیدار ہوئے بخت کو سوتے دیکھا
 کچھ جامہ زیبیاں تو گل انداموں پر ہیں ختم
 جس رنگ کی پہناؤ بدن میں قبا کھلے
 اگر ہر ہمیشہ دلی کا اثر رہا ہے مگر خلیفہ جی کے کلام میں لکھنؤ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے:-
 ستمِ سچ دھج بنا تھا بلا چوٹی گندھانا تھا
 غضبِ مسی لگانا تھا قیامت پان کھانا تھا
 تیری آنکھیں پھرتے ہی عالم کی آنکھیں پھریں
 برہ آہو زیادہ شیر نرسے ہو گیا
 چہرہ غورِ شید و فشاں سے ہے تاباں تیرا
 مشرقِ نور ہے کرتی کا گریباں تیرا
 رہتا ہے نراں میں بھی ہر از غم بدن کا
 پانی تھا تری تیغ میں کیا نہرِ چین کا

تیری مجلس کی طبعی سے ہے غورِ شید
آفتاب سے ہے پانی مر کا ل ہوتا،
کاسہ سر کو بنایا جو مرے خاک انداز
اسے فلک کرنا تھا سر پوش کسی سینی کا
کام بندوق دونالی کا کب کرتا ہے
اسے بت صید فلک خال تری بینی کا
حجام خط یا رکوا صلاح دیتے ہیں
چھلتے ہیں تیرے ہاتھ کے پروردگارِ حرم
چار دم حق کے جب غیر ملاتا ہے انھیں،
میرے اٹھتا ہے کلیجے سے دھواں دود و دن
چو کھٹ پہ رہی اپنی جبیں شام سے تا صبح
کنڈی و گمر اُس ستم ایجا دے کھولی
نظیر کے مذہب کے متعلق میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر کے اجداد اہل تسنن تھے نہ جانے کس وجہ سے نظیر کے والد نے یا
نظیر نے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا مگر نظیر کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں حب اہل بیت کے علاوہ کوئی
دوسری شیعہ نشانی نہ تھی خلیفہ جی البتہ ذرا "اشد" معلوم ہوتے ہیں مقلدوں یعنی سنیوں پر ایک جگہ چوٹ کی ہے۔
خدا ہمیشہ مجھے اس مقلدی سے بچائے کہ دل میں بغضِ علیؑ نام ہے غلامِ علیؑ
خلیفہ جی نے نعت اور منقبت میں بہت شعر کہے ہیں مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے، البتہ جریدتین کا مضمون اس
کثرت سے باندھا ہے کہ کسی شاعر نے اس قدر شعر اس مضمون کے نہیں کہے ہیں اس موضوع کی حد تک خلیفہ جی
جریدہ ہیں۔

بعدِ دن بھی میرے دل کے چٹلک پھوٹتے ہیں
چھتے جاتے ہیں جریدوں کے بدن میں کانٹے
شاخِ سد رہ کا نہ جبریل کا رستہ دیکھو
دو جریدوں کی جگہ رکھ دو کفن میں کانٹے
تر رکھا جو اشکوں نے عصائے بغلی کو
شاخوں میں جریدوں کے لگے پیر لحد میں
خلیفہ جی کے دیوان کے مطالعہ سے ایک عجیب و غریب توار و کا پتہ چلا، ایک شعر بہت مشہور ہے:-
کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش
یہ شعر اس قدر مشہور ہے کہ بچے بچے کی زبان پر ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کس کا شعر ہے، یہ شعر حکیمِ مومن خاں
کا ہے جو اُن کی تیسری قنوی میں ہے، خلیفہ جی کے دیوان میں ایک غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-
کون سنتا ہے فغانِ درویش
کون ہے مرتبہ دانِ درویش
چاہئے بند زبانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش
خلیفہ جی کے پہلے مطلع کا پہلا مصرع اور دوسرے مطلع کا دوسرا مصرع مومن کا شعر بنتا ہے خلیفہ جی اور مومن
معاشرہ ضرور ہیں مگر سر قند تو مومن نے کیا ہے نہ خلیفہ جی نے یہ بھی بڑے مزہ کا توار دے۔
چونکہ خلیفہ جی پر لکھنؤ کا اثر بہت تھا اس لئے محاوروں کے استعمال کی کوشش بھی کی ہے اور یہ بہت

محاورے استعمال کئے ہیں :

صاحب زکوٰۃ حسن کے ہم بھی ہیں مستحق خیرات اپنی ہم کو بھی دو دار پھر کر
تقد لب خوبی قیمت سے تو رہتا ہے اسیر در نہ اسے یار تر یار تو ہے دل دریا
محاوروں کے شوق میں دل دریا جیسا بازاری محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔
چونکہ کالی سگم (افیون) کے شیرائی تھے اس لئے مٹھاس پر جان دیتے تھے یہی وجہ ہے جو بعض میٹھے
شعر کہے ہیں :

خون میٹھا عشق شیریں کے اثر سے ہو گیا بند بند اپنا زیادہ نے شکر سے ہو گیا
پینک میں بھی خلیفہ جی نے شاعری کی ہے شعر ملاحظہ ہو۔

دنیا خیال و خواب ہے اور میں بھی خواب ہوں یہ دیکھتا ہوں خواب میں میں خواب دوسرا
دیکھا کوئی مکاں نہ مکیں آسمان پر صاحب ہمیں زمین پہ ہمیں آسمان پر
خلیفہ جی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن پر تصوف کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی کوئی بات نہیں۔

خلیفہ اسیر ایک پرگو صاحب مذاق اور واقعہ فن شاعر تھے زبان پر بھی خاصا عبور تھا درجہ دوم کے شعرا
میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے گو ان کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کلام اس قابل بھی نہیں کہ بالکل نظر انداز
کر دیا جائے، نظیر کی ہمہ گیری اور روانی ان میں نہیں ہے مگر پھر بھی ایک اُپچ ضرور ہے، چونکہ تریاکئی قدیم تھے اسلئے
پینک میں بڑھی دور کی کوڑی لاتے تھے، سوزن اور رشتہ سوزن ایک پامال مضمون ہے دیکھئے اس کو کس عمدگی سے
باندھا ہے :

دامن دشت پہ ہر گام میں کم ہوتی گئی، زندگی اپنی مگر رشتہ سوزن نکلی
فلسفہ رنج و راحت کو کس مزے سے بیان کیا ہے :

راحت بغیر رنج کے ملنا محال ہے جنت میں جائے گا جو جہنم میں گھر ہوا

اس قسم کے بیسیوں شعر ان کے دیوان میں موجود ہیں مبتذل اشعار بھی ہیں اور ثقہ بھی، عمدہ بھی خراب بھی ہر حال
اسیر کا دیوان ایک گلدستہ ہے جس میں ”پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی“ مگر ”جو گل کے جویا ہیں انھیں کیا خار کا کھٹکا“

تمکین کاظمی

دستان ابرو باد



لاکھوں برس پہلے کی بات ہے کہ جب کرۂ زمین کے مشتعل معدنی اجزاء آہستہ آہستہ سرد ہونے لگے، تو وزنی عناصر (جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا) مرکز زمین کی طرف مائل ہوئے اور ہلکے عناصر (جیسے ہیلیم، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن) سطح پر رہ گئے جن کے امتزاج کا دوسرا نام فضا (Atmosphere) ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہوا کی موٹی چم زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کا وزن ۶ ہزار بلین ٹن ہے (یعنی ۱۰ کھرب ٹن)۔

ہوایں پھیل جانے کی صلاحیت، سو سال قبل مسیح ہی میں معلوم ہو چکی تھی اور اس کے دباؤ کا حال بھی گلیلو کے ایک اطالوی شاگرد کو معلوم ہو چکا تھا جس نے پارہ کا تھرمامیٹر ایجاد کیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۱۴ پونڈ ذریعہ یافت ہوا ہے، لیکن انسان اس دباؤ کو اس لئے برداشت کر سکتا ہے کہ خود اس کے جسم کا اندرونی دباؤ بھی اتنا ہی ہے اور وہ ہوا کے دباؤ کو سنبھالے رکھتا ہے۔

صاف ہوا انسان کی صحت و زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ اس میں تھوڑا سا نم بھی ہونا چاہئے، کیونکہ خشک ہوا میں گرمی بالکل نہیں ہوتی اور تر ہوا میں گرمی پائی جاتی ہے۔ زمین سے متصل حصہ ہوا کا نسبتاً زیادہ گندہ اور بھاری ہوتا ہے، اس لئے خالص ہوا زمین سے ۶۶ فٹ بلندی پر سمیرا سکتی ہے اور صحت گاہیں بلند مقامات پر قائم کی جاتی ہیں۔

شہروں کی ہوا خراب ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس میں مختلف چیزوں کے ذرات مل جاتے ہیں۔ جس چیز کا نام گہر ہے وہ یہی ذرات ہیں جن میں آفتاب کی روشنی نفوذ نہیں کر سکتی۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ برطانیہ کے جزیرہ میں ہر سال ۵ لاکھ ٹن خاک کے خراب ذرات ہوا میں مل جاتے ہیں اور لندن کی فضا میں سالانہ ۵ لاکھ ٹن ذرات گندہک کے پائے جاتے ہیں۔

خشک ہوا میں ۱۰ فی صدی مسدود ورجن پائی جاتی ہے، ۲۱ فی صدی آکسیجن، ۹۳ و۔ فی صدی آرگن (موجودہ) اور ۰.۳ و۔ فی صدی کاربن۔ چمک میں اور بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار گھٹ کر ۱۸ فی صدی رہ جائے تو شمع کُل ہو جائے اور اگر ۱۰ فی صدی رہ جائے تو انسان دم گھٹ کر مر جائے۔ زمین کے دو پھیپھڑے ہیں، بایاں پھیپھڑا کٹا ڈا ہے اور داہنا شمالی سا بئیر یا جاڑوں میں پھپھیپھڑے گرم ہوا کی بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سرد ہوا فراہم کرتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کا یہ عمل اُلٹ جاتا ہے۔

زمین کے چاروں طرف فضا کی اتنی شفافیت ہے کہ آفتاب کی روشنی برابر آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی گرمی، ہم فی صدی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم زمین کی گہرائی کی طرف چلیں تو ہر سو فٹ پر ایک درجہ حرارت بڑھا ہوا نظر آئے گا اور اگر ہم اوپر چڑھیں تو ہر ۳۰۰ فٹ پر نصف درجہ حرارت گرا ہوا معلوم ہوگا

کرۂ زمین کے چاروں طرف جو گیسیں پائی جاتی ہیں وہ بہت ہلکی ہیں لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے وہ بہت اوپر جا کر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پھر بھی بعض گیسیں ایسی ہیں (مثلاً ہائڈروجن اور ہیلیم) کہ وہ بھاگ ہی نکلتی ہیں اور زمین اُن پر پورا قابو نہیں رکھ سکتی۔

چاند کے چاروں طرف بھی کسی وقت گیسوں کی فضا پائی جاتی تھی لیکن اب وہ خلا میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی ہے۔ عطارد جو ہماری زمین کے بیسیویں حصہ کے برابر ہے، کرۂ ارض کی طرح کوئی فضا نہیں رکھتا۔ زہرہ کے گرد البتہ ویسی ہی فضا پائی جاتی ہے جیسی زمین کے گرد، اس لئے اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہوا جتنی گرم ہوگی، بادل اتنے ہی اونچے ہوں گے۔ یعنی اگر خط استوا پر جہاں کی ہوا زیادہ گرم ہوتی ہے بادل چھ میل کی بلندی پر ہوں گے تو منطقہ بارودہ میں (مثلاً گرین لینڈ) ان کی بلندی نصف میل سے زائد نہ ہوگی۔ شمالی یورپ میں جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے دوسرے موسموں میں بادلوں کی بلندی نصف میل سے ڈھائی میل تک ہوتی ہے اور بارش کے زمانہ میں آدھ میل سے سوا میل تک۔

انسان اس وقت تک زیادہ سے زیادہ چودھ میل کی بلندی تک پہنچ سکا ہے، لیکن غبارہ بیس میل کی بلندی تک گیا ہے۔ ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت صفر سے بھی ۶۳ درجہ کم ہوتا ہے، ۱۲ میل کے بعد ۲۰ میل تک البتہ ہوا کی چمک

پھر گرمی شروع ہو جاتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پیرس پر بمباری کی تو پول سے گولہ باری کی ہے تو گولہ ۲۲ میل اونچا خم ہوتا تھا لیکن کراکاتوا (Karadtoa) کے آتش فشاں پہاڑ کا مادہ ۳۰ میل کی بلندی تک اڑ کر پہنچتا تھا۔
بڑی بڑی آندھیاں جو زمین پر آتی ہیں، ان کا سبب ہوا کے وہ موجات ہیں جو ۲۵۰ میل اونچے پیدا ہوتے ہیں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۳۰۰ میل کی بلندی پر بھی ہائڈروجن اور نائٹروجن کے منتشر اجزاء فضا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کی قیمتی چیزوں میں گیسوں کا بھی شمار ہوتا ہے بعض گیسوں تو سونے اور پلاٹینم سے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ ان میں موسم کا مقابلہ کرنے کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ قیمتی گیسوں ہوا میں بھی پائی جاتی ہیں اور سمندروں کے پانی میں بھی بلکہ پانی میں ہوا سے زیادہ۔

ان گیسوں میں اس وقت ہیلیم (Helium) گیس کی بڑی قدر ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور آگ کو قبول نہیں کرتی۔ غباروں میں اب اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کا ذخیرہ سب سے زیادہ امریکہ کے پاس ہے۔

قطبین کے پاس، ہوا کے ذرات زمین کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت دو چندان رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ آندھیوں کا تعلق ۵۲۰ میل بلند فضا کے موجات سے ہے، اس لئے اکثر و بیشتر آندھیوں کا رخ اوپر ہی کی طرف ہوتا ہے ورنہ تباہ ہو جائے۔

امریکہ میں بہت زیادہ آندھیاں آتی ہیں یعنی وہاں سالانہ ۱۴ آندھیوں کا اوسط ہے اور سیکڑوں جانیں ان سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۱۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ سلسلہ میں آندھیوں کے سلسلہ نے لوئی سیانا (Louisiana) سے لیکر ورجینا (Virginia) تک سیکڑوں آدمیوں کو ہلاک کیا ۱۸۹۶ء میں سنٹ لوئی (St. Louis) کو آندھیوں نے ۲۰ لاکھ پونڈ کا نقصان پہنچایا اور سلسلہ میں یہاں کی ۵۵۰ عاتقین مسمار کر دیں۔ سلسلہ میں ایک آندھی نے فلوریڈا کے بارہ سوا اور گواڈلوپ کے ۱۲۰۰ آدمیوں کی جانیں لیں۔
یورپ میں آندھیاں کم آتی ہیں لیکن سلسلہ کی آندھی نے فرانس کے جنگلوں میں ۵۰ ہزار درخت جڑ سے اکھاڑ پھینک دیئے۔

یورپ میں ہوا چکیوں کا رواج صلیبی جنگوں کے وقت سے ہوا ہے، جو ایران سے وہاں پہنچا تھا۔ عجم میں ایک ہوا چکی بارہویں صدی کی اب تک پائی جاتی ہے۔ بالٹک میں ۱۵۰ چکیاں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں۔ چین میں بھی ایسے ذریعے سے آبپاشی ہوتی ہے۔

بارش کے قطرے گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں، یعنی گرمیوں میں ان کا قطر پچھرا انچ سے پچھرا انچ تک ہوتا ہے۔ بارش کے قطرہ کا وزن اوسطاً ۰.۰۲ گرام ہوتا ہے۔ یہ ۲.۵ فٹ فی سکند فی رفتار سے زمین پر آتا ہے بارش کا اوسط مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش، آسام کے پہاڑی مقام چراپونچی میں ہوتی ہے جہاں کا سالانہ اوسط چار پانچ سوا انچ ہے۔

گہر بھی ایک قسم کا بادل ہی ہے لیکن زمین سے متصل۔ جب زمین کے بخارات میں دھوئیں کے اجزا الجھاتے ہیں اور وہ بخارات اوپر نہیں اٹھ سکتے تو گہر بن جاتے ہیں۔ گہر سے بھی دنیا کو بہت نقصان پہنچتا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۵۷ء کے گہر نے انگلستان کو ایک کروڑ پونڈ کا نقصان پہنچایا۔ فروری ۱۹۵۷ء میں ایک دن ایسا آیا تھا جب سارے یورپ کو گہر کی چادر نے لپیٹ لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے تمام کام معطل ہو گئے۔

گرج کا طوفان بھی بادلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دو ہوائیں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں تو ٹھنڈی ہوا اوپر سے اگر گرم ہوا میں داخل ہوتی ہے اور اس سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہوا پانی کے قطروں میں انجماد پیدا کر دیتی ہے اور انھیں کا نام آدلا ہے۔

انوارہ کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین پر سالانہ ایک کروڑ ۶۰ لاکھ گرج کے طوفان آتے ہیں اور ۶ لاکھ بار بجلی کی چمک روزانہ پیدا ہوتی ہے۔ طوفان کے دوران میں بجلی ۲۰۰ مرتبہ فی گھنٹہ چمکتی ہے۔ بجلی فی الحقیقت ایک شعلہ یا چنگاری ہے جو زمین و بادل یا دو بادلوں کے درمیان تناؤ یا کشش کے دباؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ۵۰ کروڑ گھوڑوں کی قوت یہاں ہوتی ہے اور اس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکند ہے۔

گرم ممالک میں گرج کے طوفان زیادہ آتے ہیں۔ جاوا سب سے بڑا مرکز ان طوفانوں کا ہے جہاں ہر سال اوسط ۲۲۳ طوفان آتے ہیں۔

بجلی سے فائدہ بھی دنیا کو پہنچتے ہیں اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے سالانہ دس کروڑ ٹن نائٹروجن پیدا ہوتا ہے جو زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اور نقصان یہ کہ بہت سے درختوں میں اس سے آگ لگ جاتی ہے، فصلوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں۔

گرج کی رفتار تقریباً ۱۸ سکند میں ایک میل ہے، اس لئے اگر گرج چار میل دور ہو تو ٹیلی فون سے آپ تقریباً ۱۸ سکند پہلے اس کی آواز کو سن لیں گے۔ گرج کی آمدانیں بازگشت پیدا ہوتی ہے ہوا کی اُن تہوں سے جو مختلف دبازت و تپیر پر رکھتی ہیں۔

موسم سے مراد فضا کی وہ کیفیت ہے جو کسی مخصوص حصہ زمین میں کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہے، خط استوا کے نیچے جتنے مقامات ہیں وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں، کیونکہ آفتاب کی کرنیں یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ زمین کے ٹپریج کا اوسط ۱۶ درجہ نشی گریڈ ہے لیکن ترکستان میں وہ ۵۰ تک بڑھ جاتا ہے اور گرین لینڈ میں سفر سے بھی نیچے ۹۰ درجہ تک گر جاتا ہے مخلوقات میں صرف انسان اور کتا وہی جاندار ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف موسموں کا عادی بنا سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ سفید اقوام میں یہ اہلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر حصہ زمین کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے، یعنی جو حصہ پہلے گرم تھے وہ سرد ہوتے جا رہے ہیں اور جو سرد تھے وہاں گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب آفتاب کے تغیرات کو قرار دیا جاتا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے زیادہ خشک مقام خرطوم ہے جہاں کی ہوا میں نمی کی مقدار صرف ۸ فیصد ہے اور سب سے زیادہ مرطوب جگہ کیرون پیٹا کا دامن ہے جہاں کی ہوا میں ۹۲ فی صدی رطوبت پائی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ ابرا کو مقام روس کا جزیرہ نمائے کو لاس ہے جہاں تقریباً ہمیشہ بادل گھرے رہتے ہیں اور سب سے زیادہ صاف فضا پٹلی کے ایک شہر کلانا کی ہے جہاں اب کبھی نظر نہیں آتا۔

جزائر جلوٹ (Jalut Islands) میں سال کے ۳۶۶ دنوں میں برابر بارش ہوتی رہتی ہے اور دریائے نیل کی وادی حلقہ میں دس دس برس تک پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوائی کا ایک مقام وائیلی (Waialeale) میں ہوتی ہے، جہاں کا اوسط ۵۸۰ انچ ہے سب سے زیادہ تیز بارش جزائر فلپائن کے ایک مقام باگوڈ (Baguio) میں ہوتی ہے جہاں ایک بار چوبیس گھنٹے میں ۲۶ انچ بارش ہو گئی۔

زمین کو آفتاب سے جتنی گرمی پہنچتی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے یعنی آفتاب کی گرمی کو ہم ۴۰ سال فرض کر لیں تو اس میں سے صرف ایک سکند ہکومتی ہے۔ دوسرے سیارے زمین سے دس گنا زیادہ حرارت حاصل کرتے ہیں اور باقی حرارت ضایع ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین تک ۴۰ فی صدی چالیس کے اوسط سے پہنچتی ہیں ۲۰ فی صدی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ۴۰ فی صدی واپس پلٹ جاتی ہیں۔

اگر آفتاب کی کرنیں جن کا درجہ حرارت دس ہزار یقین کیا گیا ہے، دس فی صدی گرمی کو دیں تو دنیا کے گرم تر مقامات بھی منجمد ہو جائیں۔

انقلاب پسندی اور اصلاح عالم

عہدِ حاضر کو اگر انقلاب کی پرستش کا دور کہا جائے تو حقیقت سے چنداں بعید نہ ہوگا۔ یوں تو اس کی حمایت و تحریک میں صفحے ہی نہیں متعدد صحیفے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ خصوصاً انقلاب پسند جماعت نے اس خواب کو ”رویہ صادقہ“ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک سنجیدہ غور و فکر کا تعلق ہے بہت کم حضرات اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ میری لب کشائی اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور میری غلطیاں مجھ پر روشن ہو جائیں۔

لفظ انقلاب کی عالمگیری نے اس کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا لفظ اپنے اندر اتنے مختلف و متضاد پہلو رکھتا ہو۔ لفظی معنی تو محض اُلٹ جانے یا گردش کھا جانے کے ہیں۔ دقت اس کی اصطلاحات سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً نظام معاشرت یا نظام حکومت کے دفعتاً بالکل بدل جانے پر لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جبر و جہد کو بھی انقلاب کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ذہنی انقلاب تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے۔ جب دو طبقے یعنی اعلیٰ اور ادنیٰ باہم متصادم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا غالب ہو جاتے ہیں تو اسے بھی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں تو ترقی کی ہر کوشش اور اس کے لئے باہم جنگ آزمائیاں بھی انقلاب کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر انقلاب کو اس کے وسیع ترین تخیل میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انقلاب ایک فطری تقاضہ ہے۔ انقلاب و ارتقاء ظاہر و متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ایک ہی واقعہ اگر آج اپنے جزئیات کی وجہ سے انقلاب معلوم ہوتا ہے تو کل یہی ارتقاء کے نام سے یاد کیا جانے لگے گا۔ مثال کے لئے اپنے ہی دور کو لیجئے۔ کیا یہ دور انقلاب نہیں ہے؟ لیکن کچھ مدت کے بعد اگر ہماری یہی رفتار رہی تو آنے والی نسلیں یہی سمجھیں گی کہ ہم برابر ارتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے زمانہ ماضی کی رفتار ہم کو سوائے ارتقاء کے دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن آج کی فرصت میں میرا دئے سخن اس قسم کے انقلاب کی طرف نہیں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں عوام بھی انقلاب سے یہ معنی نہیں لیتے۔ انقلاب کا نام لیتے ہی ذہن فوراً اس بغاوت و بد امنی، قتل و غارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو انقلاب فرانس یا روس کا طرہ امتیاز رہا ہے اور جس کی لازمی شرط ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ پر غلبہ حاصل کر لینا ہے، اس کے انقلاب کہے جانے پر تو چنداں اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مابہ النزاع مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہماری رفتار ترقی کا معاون ہو یا

مخالفت - یہ ہماری ارتقائی منزلوں کا زینہ ہے یا راہ کا ایک سنگ گراں -

ماضی عموماً حال مستقبل دونوں کی آئینہ داری کیا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس باب میں بھی ہماری رہنمائی کرے اور تاریخ کی ورق گردانی سے ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ لیکن پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ انقلاب کیوں ہوتا ہے اور اسکی رفتار کا کیا رخ رہتا ہے۔ سوال کا پہلا جزو آسان ہے۔ وقت اس کے دوسرے حصہ سے شروع ہوتی ہے اور یہی ہمارا موضوع بحث ہے۔

عوام میں اضطراب و بے چینی جب حد کو پہنچ جاتی ہے۔ جب مصائب کے برداشت کرنے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، خصوصاً اس وقت جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ طبقہ جو نسبتاً خوشحال اور برسر اقتدار ہے ان سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتا اور اپنی رنگ رلیوں میں مست اور بے خود ہے تو بے چینی اور بد حالی کا احساس اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ یہ انتقام پر اتر آتے ہیں اور شر و فساد اور قتل و غارت کا طوفان موجیں مارنے لگ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام الناس کی مصیبت اور افلاس تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انقلاب شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوئے؟ اس کے دو اسباب ہیں، ایک سیاسی اور دوسرا ذہنی۔ سیاسی یہ کہ اگر حکومت مضبوط رہی تو محکوم لاکھ بد حال، بظن اور مضطرب ہو کر بھی کامیاب بغاوت نہیں کر سکے، ایک قومی اور چوکس حکومت انھیں اُبھرنے کے قبل ہی دبا دے گی۔ عوام تو درکنار، خواص تک یہاں پر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انقلاب حکومت کو کمزور نہیں کرتا بلکہ یہ خود حکومت کی کمزوری کی علامت ہے۔ بد امنی اور بغاوت زوال پذیر حکومتوں کے لوازم میں داخل ہیں چنانچہ واقعات تاریخ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک مضبوط حکومت کتنا ہی ظلم کر جائے اور عوام کے حقوق کی کتنی ہی پامالی کرتی رہے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اس کے برخلاف حکومت میں جہاں کمزوری آئی اور معمولی معمولی باتیں فساد برپا کرنے لگیں — دوسری طرف جسے انقلاب کا داخلی یا ذہنی سبب بھی کہہ سکتے ہیں انقلاب اگرچہ عوام الناس کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن درحقیقت چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی کامیابی کے لئے ایک یا چند تباہ فطرت انقلابیوں کا وجود بھی از بس ضروری ہے، محض عوام کی نمکیت و سستی انھیں نہیں اُبھارا کرتی، بلکہ اس وقت اُبھرتے ہیں جب انھیں اپنی پستیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ احساس پیدا کرنے والے ہی چند انقلابی ہیں اور اسکی ہولناکیوں کے ذمہ دار بھی چند اشخاص قرار دئے جاسکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی حسی قوت بہت تیز ہوتی ہے اور اپنے ماحول سے یہ بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں وہی مصائب جو عوام پر کچھ اثر نہیں کرتے انھیں مضطرب کر دیتے ہیں ان کا اضطراب دوسروں کو اُبھارتا ہے پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پہلے کے خوشحال اور برسر اقتدار طبقہ کی دنیا دفعتاً بدل جاتی ہے۔ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عثمانی اقتدار انقلابیوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ درحقیقت انقلاب کا مقصد پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی غرض محض تخریب ہے تو اس کے کامیاب ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ متداول انقلاب پسند جماعت کہا بھی کرتی ہے کہ تعمیری اقدام کے لئے موجودہ فرسودہ نظام کا انہدام ضروری ہے۔ بنا بریں ایک کامیاب انقلاب کے لئے کشت و خون، قتل و غارت لازمی شرط ہے۔

مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہے اور اس پر ذرا وضاحت سے بحث نامناسب نہیں معلوم ہوتی، ممکن ہے کہ میرے اس قول پر کہ انقلاب اپنے تعمیری مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنوں میں اسے رجعت پسندانہ اقدام سمجھنا چاہئے، قارئین کو تعجب ہو۔ لیکن گزشتہ انقلابات کا مطالعہ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر کم از کم پانچ ناکام انقلابوں کی رودادیں ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طبقوں کی نزاع باہمی کے نعرے محض عوام کو فریب دینے کے طریقے ہیں، جس سے ملک بجائے فائدہ کے سخت نقصان اٹھاتا ہے۔ کیونکہ عوام جو کچھ کر گزرتے ہیں وہ محض فوری جوش و خروش کا اثر ہوتا ہے۔ تخریب کے لئے تو یہ حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ لیکن تعمیری اقدام تا وقتیکہ بہت غور و فکر اور نہایت سنجیدگی سے کام نہ لیا جائے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انتہائی جذبہ کے تحت عوام نظام حکومت، نظام تمدن، نظام معاشرت وغیرہ کو کامیابی کے ساتھ تاخت و تاراج تو ضرور کر دیتے ہیں لیکن جب تعمیری نویت آتی ہے تو ان کے بنائے کچھ نہیں بنتا اور ایک سربراہ اور وہ منظم جماعت کے ہاتھ پر انھیں بیعت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ چند نفوس محض اپنے نفوق کے لئے (Class of Parasites) کے نعرے لگا کر عوام کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خود غرض جماعت ملک و قوم کا کتنا درد اپنے سینہ میں رکھتی ہوگی؟ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو کچھ یہ کرتی ہے غلو ص دل اور قوم کی محبت کے سبب سے کرتی ہے، پھر بھی اس کی نااہلی منزل مقصود تک اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ اور نادانوں کی دوستی عقلمندوں کی دشمنی سے زیادہ مضرت آتی ہے۔ میں انقلاب کو رجعت پسندانہ تحریک کہہ گیا ہوں۔ پہلے اسی پر ایک نظر غائر ڈال لینی چاہئے۔

عوام میں اضطراب، ضروریات زندگی کی عدم فراہمی، حقوق کی پامالی اور حکمران طبقہ کا ان کے ساتھ ہیمنہ سلوک کی بنا پر تقویت حاصل کرنا ہے اور انھیں شکایات کو دور کرنے میں وہ کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی تو حکومت ان کے کچھ مطالبات قبول کر کے ان کی اشک ثنوی کر دیتی ہے اور کبھی انھیں خاموش رکھنے کے لئے ان کا رویہ اور بھی جارحانہ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حاکم و محکوم میں ایک طرح کا مول تول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ ہزار کچھ نہ ہونے پر بھی عوام کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے ہی جاتے ہیں اور حکومت آہستہ آہستہ ان کے مطالبات قبول کرتی جاتی ہے جو کیونکہ ایک بار عوام میں بستی کا احساس ہو جانے کے بعد کوئی قوت بھی اسے نہیں دبا سکتی اور ذہنی انقلاب بڑی بڑی سلطنتوں تک کے پایہ عزم و ثبات کو متزلزل کر دیتا ہے لیکن اسی دوران میں قوم میں ایک ایسی جماعت بھی پیدا

ہو جاتی ہے جسے عام طور سے ”گرم دل“ کہتے ہیں اس کے افراد فطرتاً جو شیلے اور رجعت پسند ہوتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ جتنا بھی بلد ہو سکے ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاکر حکومت کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جس کا طریقہ سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے انھیں دوسرا نہیں نظر آتا۔ عوام میں اتنی صلاحیت کہاں کہ تدریج و میاند روی کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ ذرا شہ پاتے ہی یہ اُبل پڑتے ہیں، اگر حکومت میں کچھ دم ختم ہوا تو بغاوت و بادی گئی اور اس سختی سے انتقام لیا گیا کہ ایک زمانہ کے لئے ترقی کی ساری امیدیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں اور اگر حکومت کمزور ہوئی تو پورے ملک میں شروفساد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور عوام الناس کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی گھن کی طرح پس جاتی ہے۔ نئی حکومت چونکہ خون کا دریا بہا کر اقتدار حاصل کرتی ہے۔ قیام حکومت اور انتظام سلطنت کے لئے بھی اسے کشت و خون ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے، شروع میں تو عوام کی دوسرے عوام کے نام پر اور عوام کا ایک جزو بن کر اُٹھتی ہے۔ لیکن قوت حاصل کرتے ہی اسکے او جہور کے درمیان پھر پہلا جیسا بعدا المشترقین حایل ہوتا ہے ابتدا میں تو عوام اس تبدیلی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تازہ کاریابی سے ان کی آنکھیں چوڑھیاں رہتی ہیں۔ اور وہ اس امید موموم پر بھولے رہتے ہیں کہ جب حکومت ہی ہماری ہو گئی تو کچھ مطالبات کا کیا ذکر؟ جو چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے کر لیں گے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ من مانی کر بھی لیتے ہیں لیکن بہت جلد ان پر روشن ہو جاتا ہے کہ کوئی سے نکل کر یہ کھائی میں جا کرے ہیں۔ انقلابی حکومت استحکام پاتے ہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پہلی حکومت میں تو خیر تہا پشت کے اشرافیت کی بعض خوبیاں بھی تھیں اُن نواداروں میں تو اس کا شمع بھی نہیں ہوتا۔ ولولہ و جوش، عزم و ثبات کی تو فراوانی ہوتی ہے لیکن وہ محاسن جو شرفاء کے طرہ امتیاز اور انسانیت کے جزو لاینفک ہیں ان کے پاس مطلق نہیں ہوتے۔ دولت و حکومت کا نشہ انھیں کچھ اس طرح مخمور کر دیتا ہے کہ دوسروں کو یہ بالکل بھول جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن جبر و تعدی کو بروئے کار لانے میں نہیں چوکتے۔ عوام اس وقت چوکتے ہیں جب حکومت کی زنجیریں انھیں اچھی طرح جکڑ چکتی ہیں۔ مزید براں عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے عموماً حکومت کوئی ایسا کھلونا بھی پیش کر دیتی ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یہ اس میں محو ہو جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد چونکہ فوراً ہی ملک پر بربر و فنی حملے شروع ہو گئے تھے پورے ملک کو فحاشی و فجور کا ماحول ہو جاتا تھا۔ انقلاب روس کے بعد کچھ دنوں تک تو خاندان جنگی جہور کو ہلائے رہی اور اس کے بعد جو لوگ ذرا چوٹے تو اصلاحات کے بعض کھلونے ان کو دیدیے گئے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اتنی سخت پابندیاں بھی عاید کر دی گئیں کہ یہ چوڑی جہانگداز نہ کر سکے۔ پھر یہ تو ممکن ہے کہ اس طرح ان کی معاشی حالت کچھ درست ہو جائے۔ لیکن ذہنی موت تو یقیناً ہو جاتی ہے، شہری زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانیت کی منزل سے اُتر کر یہ حیوانیت کے قریب تر آ جاتے ہیں۔ اور اس طرح انقلاب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ملک کی رفتار اگر پیچھے کی طرف مراجعت نہیں کر جاتی تو رک تھینا جاتی ہے۔

انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے افسانے آج گھر گھر دہرائے جا رہے ہیں اور بنی آدم کے لئے انھیں ایک غیر مشروط چیز سمجھا جا رہا ہے۔ اپنے دعوئے کے ثبوت میں انھیں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں ؛ تفصیلی بحث کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، انقلاب کے بعد واقعات کی طرف محض اشاروں پر اکتفا کر دینگا لیکن اس کے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انقلاب فرانس اور اس کے واقعات انقلاب پسند جماعت کے طفیل کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ حقیقت سے زیادہ ان میں جذبات کا اثر حلول کر گیا ہے۔ چند ناموں اور چند مقولوں کو اس طرح اچھا لایا گیا ہے کہ ان میں ایک خاص کیفیت اور عظمت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ میرے خیالات جو عام انداز گفتگو کے بالکل برعکس ہیں، بعض حضرات کو مضحکہ خیز معلوم ہوں اور بعض طیش میں بھی آجائیں لیکن گزارش احوال واقعی ضروری ہے۔

اہل نظر سے انقلاب فرانس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں گے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی طبقہ امرا کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ شاید ہی کسی ملک میں عوام کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہو اس میں مطلق مبالغہ کو دخل نہیں ہے کہ سچ مچ انھیں جانور سمجھا جاتا اور یہی سلوک کیا بھی جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ فرانس کے لئے یہ بد حالی کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ کوئی شانزدہم کے زمانہ میں (جس کے عہد حکومت میں انقلاب ہوا) عوام کے مصائب میں کوئی خاص اضافہ ہی ہوا بلکہ اس دور میں تو حکومت اٹکے مصائب و افلاس کو دور کرنے کی تدابیر و ذرائع بھی تلاش کرنے لگ گئی تھی۔ پھر بھی انقلاب ہوا تو اس دور میں۔ جس کی وجہ یہی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں عرض کر آیا ہوں، یعنی ایک تو حکومت میں کمزوری آگئی تھی۔ دوسرے روشواور والٹائر کا جاوہ اس وقت تک عوام پر کافی اثر کر چکا تھا۔ ملک کو اپنی بستی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور عوام اپنی نکت و بد حالی کے احساس سے مضطرب ہو رہے تھے اس میں جو کمی تھی وہ ۱۷۸۹ء کے سالہ قحط نے پوری کر دی (ٹروٹ (جہ جہ دست) کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تباہ کن قحط سالی بھی تھی۔ ورنہ اس کے اصلاحات سے طبقہ امرا کی رعونت بہت کم ہو جاتی اور عوام انناس کے حقوق کافی حد تک محفوظ ہو جاتے لیکن ایک طرف پادریوں اور فوابوں کی مخالفت اور دوسری طرف قحط کے بنا پر حکومت کی مشکلات نے ٹروٹ کا ناطقہ بند کر دیا اس کے بعد نیکر (۱۷۹۱ء) بھی انھیں مشکلات کی بنا پر اپنے اصلاحات کو بروئے کار لانے میں ناکام رہا۔ کوئی شانزدہم کو بھی اتنا مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس غریب کی غامی محض اس کی کمزوری تھی۔ ورنہ اگر امرا پر اس کا بس چلتا تو بات اتنی نہ بگڑتی۔ حکومت کے مالیات میں کمی اور محکوم کی بے چینی کے سبب سے یکے بعد دیگرے وزراء تبدیل ہو رہے تھے۔ اور کوئی بھی حکومت کی کشتی کو پار لگانا نظر نہیں آتا تھا اگر ۱۷۸۹ء میں قلمدان وزارت پھر نیکر (۱۷۹۱ء) کے سپرد کرنا پڑا۔ نیکر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے کیا کرنے سے یہ ڈوبتی ہوئی کشتی اُبھر سکتی ہے۔ ۱۷۹۰ء میں اس نے باوجود شدید مخالفت کے ممکنہ تاک

(General) کا انتخاب کرا ہی لیا۔ پورے ملک میں اس کی مخالفت سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جبکہ انجمنیں قائم
 لیں اور حکومت کو کھلی ہوئی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ پھر بھی امراد ہی میں ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو حکومت کی
 ورنڈیشی کی قایل اور ہر طرح اس کی امراد پر کمر بستہ تھی۔ ڈیوک آف اورلینس (Duke of Orleans)
 اس جماعت میں بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ (States General) نے آئین و قوانین ہی میں نہیں ملک کے
 (Constitution) تک میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اگر یہ قائم رہ جاتیں تو صدیوں کی چند سری حکومت
 (Oligarchy) فوراً جمہوریت میں تبدیل ہو جاتی لیکن امراد کی مخالفت کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔
 اور لوئی نے ان اصلاحات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر بھی اس سے انکار ناممکن ہے کہ سب کچھ ہونے پر بھی حکومت
 جمہور کے مطالبات کے سامنے بہت جھک گئی تھی اور انھیں کچھ نہ ملنے پر بھی بہت کچھ حقوق مل گئے تھے۔ اس عہد کو اگر
 نصف صدی پہلے کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو حقیقت کھلے۔ لوئی چہارم کے قول C'est moi، C'est
 (ریاست سے مراد میں ہوں) کا مقابلہ اس عہد کے نعرہ C'est nous، C'est nous (ریاست سے مراد
 ہم ہیں) سے کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوام کی آواز کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ امراد اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ
 اب ان کے اقتدار کے چند گئے ہوئے دن رہ گئے ہیں اور بہت جلد جمہور کے مطالبات کے سامنے انھیں سر تسلیم
 خم کر دینا پڑے گا۔

جب اہالیان شہر کو معلوم ہوا کہ (States General) کے مطالبات ٹھکرا دئے گئے ہیں اور نیکر
 (Necker) بھی برطرف کر دیا جانے والا ہے۔ تو ان میں آگ سی لگ گئی۔ جابجا مظاہرے شروع ہو گئے اور محل شاہی
 کے سامنے ان کی ایک بہت بڑی جماعت اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ لوئی کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اگر اس کا دل عوام
 کی طرف تھا تو دماغ پر غواص قبضہ کئے ہوئے تھے۔ غرض عجیب کشمکش میں غریب کی جان تھی۔ بہر حال موقع کی نزاکت
 کو سمجھ کر (States General) کے مطالبات اسے قبول کرنے ہی پڑے۔ لیکن اس کے سوا اب اور کیا کہا جائے
 کہ ناما قبت اندیش امراد اور عوام کے چشیلے اور عجبت پسند لیڈروں کا براہمو کہ بات بنکر بگڑ گئی۔ ایک طرف امراد کی سازشیں
 نھوت و بددماغی اور دوسری طرف خود غرض لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ کھلی ہوئی بغاوت کی تبلیغ۔ نفرت و ہیزاری کی آگ
 پرتیل چھڑک رہی تھی۔ اگر ایک طرف غیر ملکی ریجنٹوں کی آمد کا انتظار تھا۔ تو دوسری طرف انقلابی رہنما بھی کسی بہانے کے
 منتظر تھے۔ آخر قوم فروش امراد نے لوئی پر اتنا دباؤ ڈالا اور اس پر سختی کو اس طرح پہنکایا کہ وہ نیکر کو برطرف کرنے پر رضامند
 ہو گیا۔ انقلابی تو موقع کی تاک میں تھے ہی۔ جولائی ۱۷۹۰ء کی بارہ تاریخ کو نیکر برطرف کیا گیا اور وقتاً بغاوت کی
 آگ بھڑک اٹھی۔ پورے ملک میں بھونچال سا آگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی دنیا الٹ گئی ہے۔ انسان درندوں میں
 تبدیل ہو گئے۔ کشتوں کے پتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بن گئیں۔ جب عوام کا جوش غضب فوراً سرد ہوا اور قتل و غارت کا

طوفان تھا تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہ کہیں عوام کے حقوق کا پتہ ہے اور نہ ان کے مطالبات کا ذکر۔ اگر ہیں تو چند فتنہ انگیز خطیب ولیڈر، حکومت سے تو ان کی اور حقوق ہیں تو ان کے غرض چند الفاس کی مکاریاں اور سفایاں مسلسل چھ سال تک پورے ملک پر چھائی رہتی ہیں حکومت کے لئے آئین بھی بننا ہے، نظم و نسق کے لئے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن جمہور کو تو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ فاقوں کا مارا جیسے کھانے پر گرتا ہے۔ یہ بھی آزادی پر ٹوٹ پڑے اور تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور ایک دفعہ فرانس میں (State of Nature) کا دور دورہ ہو گیا۔ لیکن یہ روش (Rousseau) نہیں (Hobbes) کا (State of Nature) تھا۔ ۱۷۹۵ء تک فرانس پر کیا گزری۔ ہم لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ اسے انقلاب نہیں قتل و غارت کا گرداب سمجھنا چاہئے۔ چھ سال کی یہ جو چمکاں داستان مشعل ہے صرف سازشوں اور باہم ریشہ دوانیوں پر یا اسے قدرت کا انتقام کہئے کہ انقلابیوں کی ہر جماعت دوسری جماعت کی دشمن بن کر سامنے آئی اور سب کے سب آپس ہی میں کٹ مر کے رہ گئے جو پارٹی بھی غالب آتی اپنے پیش رو کو موت کے گھاٹ اتارتی آتی۔ غرض یہ کہ مسلسل چھ سال تک فرانس میں پے در پے انقلاب ہوتے رہے (معمولاً ۱۷۹۳ء کی عبرت ناک موت کے بعد نصیب ملک کو طوفان انقلاب سے ایک گونہ نجات ملی اور فرانسیسی حیوانیت سے انسانیت کی طرف آہستہ آہستہ رجوع کرنے لگے۔ جون ۱۷۹۵ء میں گیارہ لوگوں کے کمیشن (The Commission of the eleven) نے جو دستور العمل پیش کیا اور جس کی رو سے حکومت پانچ افراد کی ڈائریکٹری کے تحت میں آگئی۔ اس پر لفظ قانون کا اطلاق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہی کہنا بڑا تباہ کن ہے کہ یہاں بھی ذاتیات اور خود پرستی، مال اندیشی اور وطن پرستی بر غالب رہیں ۱۷۹۶ء میں ڈائریکٹری کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ پھر پہلا جیسا نرج (Anarchy) کا دور بہت قریب نظر آنے لگا۔ لیکن عین اسی وقت پولین بوناپارٹ میدان کارزار سے فرانس کی سیاسی بساط پر آ موجود ہوا اور جس طرح اس نے ملک کو تلخ داران یورپ کے شعلہ انتقام سے بچایا تھا، یہاں بھی خانہ جنگیوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فرانس کے لئے پولین کی اٹھارہ سال کی حکومت رحمتِ ایزدی سے کم نہایت نہیں ہوئی، فرانس اس دور پر بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ لیکن کیا انقلاب فرانس کا مقصد یہی تھا کہ ایک پولین پیدا کر کے خاموش بیٹھ جائے؟ کیا ۱۷۹۹ء میں انقلابیوں کا یہی مطمح نظر تھا کہ کوئی شانزدہم کی جگہ کسی پولین کے قالب میں کوئی چہار دہم کی روح اپنی پوری شانِ رعوت کے ساتھ فرمانروائی کرنے لگے؟

تعمیر کو تو بالائے طاق رکھئے۔ اپنی تخریب تک میں انقلاب افسوسناک طریقہ سے ناکام رہا۔ اشرافیت جسے اس نے حیرت غلط کی طرح مٹا دینا چاہا تھا۔ پولین کے دور میں پھر عود کر آئی۔ اگرچہ اس کے زمانہ تک اسے صلاحیت کی اشرافیت (Aristocracy of merit) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے بعد بوربون خاندان کے

دوبارہ تخت نشین ہوتے ہی پرانی اشرافیت اپنی تمام قدیم روایات کے ساتھ پھر ملک پر مسلط ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں پھر انقلاب ہوا۔ لیکن ۱۹۴۹ء کے انقلاب کے مقابلہ میں اسے صرف حکومت میں تبدیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور حقیقی معنوں میں اسے فرانس کے جمہوری نظام کی پہلی ارتقائی سیڑھی سمجھنا چاہئے۔ لوئی فلپ چونکہ ہزار کچھ ہونے پر بھی بد بون خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ زمانہ کے بدلے ہوئے تیور نہ پہچان سکا۔ آخر ۱۸۴۸ء پھر ریپبلک حکومت قائم ہوئی، جو تاریخ میں دوسری ریپبلک کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اسے ریپبلک کہنا، ریپبلک پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا صدر ایک ایسا شخص تھا جو اس وقت جمہوریت نہیں، شہنشاہیت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ بہر کیف اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عوام کی آوار اب بہت با اثر ہو گئی تھی اور یہ ریپبلک ان کی شاندار فتح کہی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۲ء میں یہ ریپبلک شہنشاہیت میں پھر بدل گئی لیکن ضرور تھا کہ یہ ایسی شہنشاہیت تھی جسے جمہور خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ فرانس میں شہنشاہیت کا سنبھالا اس کی آخری ہچکی تھی جو ۱۸۷۰ء میں شاید ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

مندرجہ بالا سطور سے مقصد صرف یہ دکھلانا تھا کہ ۱۸۸۹ء کا انقلاب نہ محض ناکامیاب ثابت ہوا بلکہ ملک کی رفتار ترقی اس کی وجہ سے اگر سو سال نہیں تو پچاس سال پیچھے ضرور پڑ گئی۔ اگر فرانس ۱۹۴۹ء میں انقلاب کی نعمت میں گرفتار نہ ہوتا اور اسکے رہنما انگلستان والوں کی طرح تدریجی ترقی کے قابل ہوتے، جیسا کہ ۱۸۳۰ء سے ان کا رویہ ہو گیا۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ۱۸۷۰ء کے بہت پہلے جمہوریت یا Constitutional Monarchy قائم ہو جاتی۔

Prevost نے خوب کہا ہے ”اگر جرمنی میں اصلاحات کی ابتدا ہوئی تو انتہا میں یہ انگلستان تک پہنچی۔ لیکن فرانس نے انقلاب کے دعوے دنیا کے سامنے پیش کئے اور خود اس کی بے راہ روی کا شکار بننا رہا۔“

سطر بالا میں عرض کر آیا ہوں کہ ہر چند انقلاب، عوام کے ذریعہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے لیکن چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں، انھیں کی تحریر و تقریر عوام میں احساسِ ہستی پیدا کر کے انھیں انتقام پر آمادہ کر دیتی ہے اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ایسے لوگ عموماً دو قسم کے جذبہ سے متاثر رہتے ہیں۔ ایک تو محض انسانیت کی خدمت کا خیال یعنی عوام کی ہستی کو دور کرنے کی کوشش اور دوسرا خود غرضانہ یعنی اپنے مفاد کے لئے عوام میں جوش پیدا کرنا اور اقتدار حاصل کر لینا، لیکن سنجیدہ نگاہی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ دونوں اپنے مقصد سے منزلوں دور رہ جاتے ہیں۔ انقلابی دعوے عوام کے در و کا در مل کر پاتے ہیں اور نہ خود اپنے اقتدار کی محافظت کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کی ناکامی کا سبب تو یہی ہے کہ تحریک سے تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا اور وقتی جوش و ولولہ سنجیدہ و مفکرانہ اقدام کے مترادف

نہیں قرار دے جاسکتے۔ انقلاب فرانس کے واقعات اس پر شہادت دے رہے ہیں کہ عوام کس بری طرح ناکام رہے اور ملک کو ان کی بے راہ روی کی بدولت کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن سب سے بڑی ناکامی اُسی جماعت کو ہوتی ہے جو اپنے اقتدار کے لئے عوام سے آلہ کار کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں تو یہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن دہی حربہ جو یہ اپنے پیش رو کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ بہت جلد اس کے خلاف بھی اُٹھایا جاتا ہے اور جس طرح عوام کو درغلا کر یہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتی ہے۔ اس کے مخالفین بھی اُسی طرح (Class struggle) کے نعرے لگا کر اور اسے رجعت پسندی کا خطاب دیکر خود ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک دفعہ عوام کا شر و فساد اور بغاوت و بد امنی کی طون مایل ہو جانے کے بعد احترام قانون اور امن و آشتی کی طون مغا رب ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ عوام کے مطالبات خصوصاً اس وقت جبکہ ایک غیر مطمئن جماعت انھیں ابھارتی رہے لامتناہی حد تک طویل ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لینا کہ جس جماعت نے انھیں ابھارا تھا۔ ان کے دبا دینے پر بھی قادر ہوگی۔ سخت غلطی ہے۔ انقلاب کی چنگاری جب ایک دفعہ بھراک اُٹھتی ہے تو دم بہ دم اس کی آگ بڑھتی ہی جاتی ہے اور اس وقت تک سر نہیں پڑتی جب تک کہ ملک کے سامنے اس سے بھی جہیب تر کوئی دوسری آفت نہ آکھڑی ہو، یا خود عوام میں انتہائی قتل و غارت کے بعد اس کا فطری رد عمل شروع نہ ہو جائے۔ غرض یہ کہ انقلاب کی لیڈر شپ بڑی تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ہر انتہا پسند جماعت کے بعد ایک انتہا پسند تر جماعت برسرِ اقتدار ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس انتہا پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کوئی حد حاصل متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار محض اُسی جماعت پر ہوتا ہے جو غیر مطمئن رہا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ مطمئن اور غیر مطمئن طبقہ کی تفریق تمام و کمال اضافی ہے، جس کی انتہا کبھی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے مقصد میں بھی انقلاب ناکامیاب رہتا ہے اور انقلابی اپنے اقتدار تک کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ روس میں تو اب تک انقلابی برسرِ اقتدار ہیں، لیکن اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ یقیناً اور اس کے حواریں نے زار اور اس کی حکومت کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو اس جماعت کو تیغ کیا جس نے سرزمین روس سے زاریت کا خاتمہ کیا تھا۔

گلاب چاند

(تنگار) میں گلاب چاند صاحب کے اس مقالہ کے جواب میں کوئی بیسٹ انگلو کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا ”انقلاب“ کی تحریک کی انفرادی حیثیت رکھتی ہے یا اجتماعی۔ اگر انفرادی نہیں ہے تو یقیناً اس کی بنیاد صرف جذبہ اصلاح یا طلبِ مدد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اب رہا یہ امر کہ اس تحریک کی قیادت کرنے والے غلطی یا خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں، سو اس سے اصل تحریک کا نقص ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اسکے ایک بات اور دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ انقلاب کا سبب زیادہ تر اقتصادی عدم توازن ہوا کرتا ہے اور اس کو دور کرنا آسان کام نہیں۔ ہزار ہا سال کے بعد بہ ملوکیت و سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے بھی کم از کم سیکڑوں برس درکار ہیں اور ظاہر ہو کہ اس کو کشش میں غلطیاں بھی ہونگی، خود غرض لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کریں گے۔ خدا جانے کتنی مرتبہ صورتیں بن چکی ہیں، لیکن اس پر ہرگز کوئی حکم لگانا کہ ”انقلاب“ کی تحریک ہی بجائے خود غلط ہے، صحیح نہیں۔

راجہ جی

اس اقتصادی کشمکش، اس سیاسی الجھن اور اس علمی و انتہادی کشمکش کے دور میں بعض وقت کتابچی چاہتا ہے کہ کاش کہ کبھی کبھی چند گھنٹوں اس زمانہ کی بھی میسر آجایا کریں جب انسان ”زورٹھا“ نہ ہوا تھا اور ہر چیز کا مطالعہ طفلانہ سادگی سے کیا کرتا تھا۔ وہ بانی کو صرف باقی سمجھ کر اس سے کھیلتا تھا اور اس فکر میں مبتلا تھا کہ اس میں اس کیجی کی مقدار کتنی ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی۔ وہ پھول کو محض پھول جان کر اس سے سرور حاصل کرتا تھا اور اسے طلقی خبر نہ تھی کہ رات کے وقت اس کی خوبصورت پنکھڑوں سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔ وہ چاند کی صرف ٹھنڈک سے لطف اٹھاتا تھا اور یہ منحوس بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ یہ ایک مُردہ کرہ ہے۔

آج ہمارے فسانوں میں انتقاد و علمیت ہے، نفسیات و سیاست ہے، طبیعیات و ریاضی ہے اور خدا جانے کیا کیا اسی طرح کی بہت سی ثقیل چیزیں موجود ہیں، لیکن اس ”معصومیت“ کو نہ نہیں ہماری کہانیوں میں پائی جاتی تھی۔ آپ بھی میری طرح شاید گھبراٹھے ہوں گے اس لئے آئیے ہم آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے اس ”مثین و عقل“ کی دنیا کو چھوڑ کر پھر اس عالم کی سیر کریں، جہاں فقیہ کی دُعا سے بادشاہوں کے اولاد ہو جایا کرتی تھی اور جہاں شاہزادے ہمیشہ چوتھا ممنوع راستہ اختیار کر کے بیوی کی بستی میں پہنچے جایا کرتے تھے۔

ہمارے عزیز دوست حیات اللہ انصاری کو خدا خوش رکھے کہ ان کی وساطت سے کبھی کبھی یہ بھولی ہوئی دنیا پھر یاد آجاتی ہے۔

گئے طفلہ شود مستانہ می رقص !

نیاز

سات دریا پار ایک ناگ دیں تھا جہاں کے بنے والے رات کو کام کاج کرتے اور دن کو سوتے تھے۔ یہاں ناگ راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا حکم سمند کے گھریالوں، جنگل کے خیلوں اور آسمان کی چڑیوں پر بھی چلتا تھا۔ اس کے پاس دیوتاؤں کا دریا سب کچھ تھا۔ ایک نہیں تھا تو لوہا کا ہی نہیں تھا جو اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھتا اور اس کے راج کا مالک بنتا۔ راجہ اس کے کالین سر وقت اُداس رہتا اور سادھوؤں اور سیرانگیوں کی سیوا میں لگا رہتا۔ ایک بار اس کی سیوا سے خوش ہو کر ایک سادھو نے دعا دی کہ ”جا، تو جینے کے بعد حیرانی رانی کے ایسا سند پھر ہوگا جسے دیکھے چند زمانہ شرما جائے اور پریاں بل بل جائیں“

سادھو کا کہنا پڑا ہوا اور نوں جہینے رانی ایسا لڑکا جنی جو خوبصورتی میں چاند کا کھڑا اور میرے کی صورت معلوم ہوتا تھا خبر سنتے ہی راجہ نے خزانوں کا منہ کھول دیا اور اتنا سونا چاندی لٹایا کہ رعایا میں کوئی غریب نہیں رہا۔

راجہ نے اس کا نام راجکمار بنی رکھا اور اس کے رہنے کو ایک گنگا جمنی محل بنوایا جہاں روشنی کو میرے اور لال کے چاند سورج چڑوائے اس میں ایک باغ لگوایا جس میں ساری دنیا کے سدا پھل اور سدا بہار درخت تھے۔ پھر ہر دس کے سندرے سندرے بوٹے غلام منگوائے وہاں رکھے اور ان کو حکم دیا کہ خبر داور میرے راجکمار کی کسی بات پر نہیں نہ ہو۔ راجکمار اس محل میں اس طرح پروان چڑھا جیسے کلی کی گود میں پھول یا سیسی کے سینے میں موتی پروان چڑھتا ہے۔ راجکمار جب دس برس کا ہوا تو وہ ایسا سندر نکلا کہ جہاں جاتا وہاں اُجالا ہو جاتا اس کی سندر آنکھوں سے میرے کی ایسی جوت ٹھکتی اور چہرے سے سورج کی ایسی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

راجکمار بنی کی کسی بات پر نہیں نہ ہوتی۔ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر آسمان سے تارے اور سمندر کی تہ سے ہوتی آسکتے تھے مگر اس پر بھی راجکمار اُداس اُداس رہتا تھا اور باغ میں ایک ہرنگھار کے درخت کے نیچے دن دن بھر چپ بیٹھا رہتا تھا۔ راجہ کو اس کی بڑی فکر تھی مگر وہ کسی طرح راجکمار کو خوش نہ کر سکا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ راجکمار بنی شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور ایک گاؤں کے پاس ٹھہر کر انکے آنے کی راہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں گھٹا گھڑائی اور پیٹ پیٹ کر پانی برسنے لگا۔ راجکمار گھوڑے کو درخت کے نیچے باندھ کر آپ ایک جھونپڑے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس جھونپڑی میں رہتا تھا ایک چڑیا۔ جس وقت راجکمار اس کی جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا اُس نے اندر اپنی بیوی سے کوئی کام کو کہلایا بیوی نے کہا میں نہیں کر دوں گی۔ اس پر چڑیا نے اُس کو برا بھلا کہا بیوی نے بھی غصہ میں آکر برابر کا جواب دیا اور دیر تک دونوں میں جھگڑا ہوتا رہا۔ تھوڑی سی دیر میں چڑیا کی بیوی اپنا قصور سمجھ گئی اور اُس نے اپنے شوہر سے معافی مانگ لی دونوں گلے مل گئے اور خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ راجکمار بھی ان کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس وقت راجکمار کے ساتھی اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ پہنچے تھے اور یہ دیکھ کر کہ راجکمار کچھ باتیں سن رہا ہے ہاتھ باندھ کر الگ الگ کھڑے ہو گئے۔ راجکمار نے ان میں سے ایک کو پاس بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھی نے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا:

”ہمارا راجہ یہ لوگ چڑیا نہیں اور آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں“

راجکمار نے آج تک ”جھگڑنے“ کا لفظ ہی نہیں سنا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ میں اتنا بڑا ہو گیا اور آج تک کسی سے جھگڑا کیا اور نہ لاپ کر کے چڑیا کی طرح خوش ہوا۔ اب اس کے دل میں یہ سودا سایا کہ ہم بھی کسی سے کوئی بات کہتے اور چڑیاؤں کی طرح وہ بھی اس کے کرنے سے انکار کر دیتا۔ پھر تم گڑبے اور وہ بھی گڑبے اور دو گوں خوب جھگڑتے۔ پھر

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ملاپ کر لیتے اور چڑیا اور چڑیا رن کی طرح خوش ہوتے۔ راجکمار کو اس کی لگن ایسی لگی کہ اسے محل پہنچتے ہی اپنے سب سے زیادہ سیدو کرنے والے نوکر کو بلایا جب وہ آیا تو اس سے کہا:

”جو میں کہوں وہ تو کرے گا۔“

اُس نے پاؤں چھو کر جواب دیا:

”اگر آپ کی آگیا ہو کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ ڈالوں تو میں اپنا سر کاٹ ڈالوں گا۔“ راجہ جی باتیں روز سنتا رہتا تھا۔ اس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہا: ”اچھا، تم ہم سے جھگڑا کرو۔“

یہ سنتے ہی وہ کانپ گیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑا کر کہنے لگا۔ ”ہمارا راج آپ کے غلاموں کی کیا مجال کہ وہ اس کا خیال بھی جی میں لائیں۔“

راج کمار نے اس کی بہت خوشامدی کردہ ہاتھ باندھے گردن جھکائے بلامنہ سے ایک لفظ نکالے چپ کھڑا رہا۔ پھر راجکمار نے اس کو بہت ڈانٹا تب اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے مگر اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ راجکمار نے بگڑ کر اس کو اپنے کمرے سے نکال دیا اور پھر ایک دوسرے نوکر کو بلایا جو راجکمار کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح چلتا تھا جب وہ آیا تو اُس سے کہا:

”جو میں کہوں وہ تو کرے گا۔“

اُس نے ادب سے پاؤں چھو کر جواب دیا:

”اگر ہمارا راج کی آگیا ہو کہ میں آگ میں کود پڑوں تو میں کود پڑوں گا۔“

راجکمار ایسی باتیں ہر وقت سنا کرتا تھا اُس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہنے لگا: ”ہم سے کسی بات پر جھگڑا کرو۔“

یہ حکم سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا اور رونے لگا۔ پھر گڑا کر بولا:

”ہمارا راج آپ کے اس غلام سے کیا قصور ہوا ہے جو اس کو ایسی آگیاں ملی ہے۔“

راجکمار نے منت کی اور جب نہ مانا تو اُس کو ڈانٹا ڈپٹا وغا دار نوکر ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑا رہا راجکمار نے غصے میں آکر اُس کو اپنے سامنے سے دور کیا اور ایک اور نوکر کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا جہاں ہمارا راج کا پسینہ گرے وہاں میں اپنا خون بہا دوں راجکمار نے کہا:

”اچھا آؤ ہم تم جھگڑیں۔“

یہ سنتے ہی وہ پرانی دیوار کی طرح زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا:

”میری ایسی مجال کہاں۔“ راجکمار نے ایک ایک کر کے اپنی سب داس واسیاں بلائیں لیکن ایک نے بھی اسکی آگیاں پوری نہ کی۔ اب راجکمار اتنا اُداس رہتا کہ نہ باغ جاتا اور نہ کھانا کھاتا، دن بھر سر جھکائے بیٹھا رہتا راجہ نے اس کا

دل بہلانے کے لئے مسخرے بھیجے کوئی مور کی طرح ناچتا تو کوئی کوسے کی طرح پھدکتا کوئی شیر کی طرح گرجتا تو کوئی مرغ کی طرح گلڑوں کوں کرتا یہ سب آئے اور اپنے کرتب دکھاتے رہے مگر راجکمار اسی طرح اُداس اپنے خیالوں میں گھویا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا زندگی ہے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ملتا ہے اور جو میں نہیں چاہتا ہوں وہ ملتا ہے، ایک دن راجکمار کو کچھ خیال آیا اور اس نے دو جوہدار بھیج کر چڑیا مار اور چڑیا مار کو بلا بھیجا۔ جب وہ دونوں آئے اور راجکمار کے سامنے کھڑے ہوئے تو ان کی گھلھی بندھی ہوئی تھی اور چہرے دھلے کپڑوں کی طرح سفید تھے۔ کیونکہ انھوں نے زندگی بھر نہ راج محل کو دیکھا تھا نہ کبھی راجکمار کو۔

راجکمار نے ان کی ڈھارس بندھائی اور کہا اگر تم میرا ایک حکم مانو تو میں تمہیں اتنا سونا چاندی دوں گا جو تمہاری سات پشتوں تک چلے۔ چڑیا مار نے خوش ہو کر پوچھا ہمارا راج کی کیا آگیاں ہے۔ راجکمار نے کہا جیسے تم آپس میں جھگڑتے ہو ویسے ہی تم مجھ سے بھی جھگڑو۔

چڑیا مار نے کہا کہیں پر جا رہا جاؤں سے جھگڑ سکتی ہے۔

یہ سنکر راجہ جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سمجھ گیا کہ راجکمار بن کر میں اپنی خواہش نہیں پوری کر سکتا۔ اب راجکمار کا یہ شوق اتنا تیز ہو گیا کہ اُس نے طے کر لیا کہ چاہے جو میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے اس کے کارن اپنا دیں اور راج پاٹ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

اسی دن آدھی رات رہے جب سارے محل میں سوتا پڑا تھا راجکمار ایک سپاہی کا بھیس بدل کر باہر نکلا۔ اور اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین کس راتی رات کسی دور دراز کے دیس کو چل کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچا جہاں کے بازاروں میں ایسی چیل پیل تھی اور لوگ ایسے لمنسار تھے کہ اسکا جی چاہا کہ یہیں رہ جاؤں اُس نے ایک اچھا سا مکان خریدا۔ اور وہاں ایک سوداگر بن کر رہنے لگا۔

پڑوس میں ایک کسان رہتا تھا جس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام کنول تھا جو مور کی طرح ایلی اور ناگن کی ایسی چیل تھی۔ ایک دن وہ اپنے کوسٹے پر آئی تو دیکھتی کیا ہے اس کے پڑوس والا مکان جہاں پہلے دن کو چمکا دڑا اور رات کو بھوت رہتے تھے اب آدمیوں سے بسا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اُچک کر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کمرے میں پر دے پڑے ہوئے ہیں۔

اُس نے کہا اہا اہا یہاں تو ریشمی پرے پڑے ہوئے ہیں اور یہ لہکر اس طرف کو دگنی اور چپکے چپکے جا کر پردہ اٹھا کر اندر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کوئی چادر تانے بے خبر سو رہا ہے اور اس کے پاس چوکی پر ایک کٹورے میں پانی بھرا رکھا ہے اور ایک تھالی میں پان پھول اور عطر رکھے ہیں۔ یہ دیکھ پاؤں اندر گئی اس نے کٹورے کا آدھا پانی پی لیا تھالی کے آدھے پان کھائے، شیشی کا آدھا عطر لگا لیا اور آدھے پھول ہاتھ میں لے کر اپنے گھر چلی آئی۔

سورج ڈوبنے پر راجہ جی کی آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ کوئی کٹورے کا آدھا پانی پی گیا ہے تھالی کے آدھے پان کھا گیا ہے۔ شیشی کا آدھا عطر لگا گیا ہے اور آدھے پھول لے گیا۔ راجہ جی کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس طرح چوری چھپے آیا ہو اور اس کی چیزوں کو بگاڑ گیا ہو۔ اُس نے بچا ہوا پانی پیا اور بچے ہوئے پان کھائے بچا ہوا عطر لگا یا اور بچے ہوئے پھول سوکھے تو اس کو ان میں ایسا مزہ ملا جیسا آج تک ان چیزوں میں نہیں ملا تھا۔

دوسرے دن پھر وہی ہوا کہ کنول آئی اور آدھا پانی پی گئی آدھے پان کھائے آدھا عطر لگا یا اور آدھے پھول ساتھ لے اور لوٹنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ سونے والے کا ہاتھ بٹی سے ٹک رہا ہے اور اُس کی انگلی پر ایک انگوٹھی چمک رہی ہے کنول نے اپنی انگلی کی انگوٹھی اُتار کر اُس کو پہنا دی اور اُس کی انگوٹھی خود دہن کر چلتی بنی۔ جب سورج ڈوبا اور رات چلی کی آنکھ کھلی تو دیکھا آدھا پانی آدھے پان آدھا عطر اور آدھے پھول تو غائب ہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آج ہاتھ کی انگوٹھی بھی بدلی ہوئی ہے۔

راجہ جی نے سوچا کہ کچھ ہو اس چور کو ضرور پکڑنا چاہئے دوسرے دن جب سورج نکلا اور راجہ جی کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تو اُس نے تلوار سے اپنی چھٹنگیا کاٹ کر اس میں نمک مرچ بھر لیا کہ اس تکلیف سے نیند نہ آئے اور چادر تلک سوتا بن گیا۔ جب دوبارہ ہوئی تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک لڑکی پری کی ایسی پھرتی مور کی ایسی الیسی اور ناگن کی ایسی خنچل چلی آرہی ہے۔

اس کے ہونٹ ایسے لال تھے جیسے طوطے کی چوہنچ اور آنکھیں ایسی بڑی بڑی تھیں جیسے کنول کے کٹورے وہ بٹی کی طرح دبے پاؤں اندر آئی۔ اس نے چپکے سے آدھا پانی پیا، آدھے پان کھائے، آدھا عطر لگا یا اور پھر اس کے سر پر سے آدھے پھول اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ راجہ جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کنول نے ایک جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور کوہدرالگ کھڑی ہو گئی۔

راجہ جی کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ آج تک اس کے ساتھ کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ راجہ جی نے ذرا سختی سے کہا ”میں تم کو آگیاں دیتا ہوں کہ ادھر آؤ“
کنول، یہ سن کر بڑبڑائی اور کہنے لگی:
”مجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا“

اس کا بڑبڑانا تھا کہ راجہ جی پر چھائی ہوئی گھٹا چھٹ گئی اور اندر خوشی کی ہر س اٹھنے لگیں۔ اس نے منتیاں کوبہ کنول کو روکا اور اسی دن سے کنول اس کی بیوی ہو گئی۔

راجہ جی کے ماں باپ راجہ جی کے کھوجانے سے بہت پریشان تھے ان کی بھوک پیاس جاتی رہی تھی اور وہ ان کا یہی کام تھا کہ اپنے لڑکے کو یاد دکر کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے پنڈت اور جوتشی بلائے

اور ان کو راجکمار کی کنڈلی دکھائی گئی اور بہت بوجھا پاٹ کیا گیا۔

راجکمار کی ماں نے کچھ اور سوچا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ ہونہو راجکمار کسی خوبصورت لڑکی کے پھر میں غائب ہوا ہے اور اس نے اپنے چکر میں اس کو ایسا پھنسا رکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے راج پاٹ کو بھلائے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر مہارانی نے بڑی بڑی گٹنیاں بلائیں اور اُن سے پوچھا تم کیا کیا کام کر سکتی ہو؟

• ایک بولی ”میں آسمان میں چلتی لگا سکتی ہوں“

دوسری نے کہا ”میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں“

تیسری نے کہا ”میں سیپی کے پیٹ سے موتی چرا کر لاسکتی ہوں“

چوتھ سے بڑھی تھی چلا کر بولی ”میں پرانی بہو بیٹیوں کو بھلا پھسلا کر لاسکتی ہوں“

رانی نے جو تھی کشنی کو بہت پسند کیا اور اس کو اپنے راجکمار کی بیجان بتائی اور وہ پیسیدہ دیکر راجکمار کی کھوج میں بھج دیا۔ بڑھیا شہر شہر گاؤں گاؤں، محلوں محلوں، جھونپڑوں جھونپڑوں، راجکمار کی کھوج میں گھومی گھومی پھری۔ چوہے کی طرح بڑے سے بڑے محل میں گھس جاتی۔ چرنروں کی طرح اونچے سے اونچے قلعہ میں پہنچ جاتی اور شہد کی کھیلوں کی طرح باغوں میں گھومتی آخر گھومتے گھومتے وہ اس دیس میں آئی جہاں راجکمار رہتا تھا اس نے ایک ایک کر کے سب گھر دیکھ ڈالے لیکن راجکمار کا گھر بچ رہا کیونکہ وہ صرف رات کو کھلتا تھا۔ بڑھیا نے جب بھی اس کو دیکھا اندر سے بند پایا۔ اس نے سوچا کہ کیسے لوگ ہیں جو گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی جیل خانے میں۔ اس نے پاس پڑوس والوں سے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے لوگوں نے کہا یہاں ایک سوداگر بچہ رہتا ہے جو صرف رات کو باہر نکلتا ہے۔ یہ سنکر بڑھیا کھٹکی اور سوچنے لگی کہ ہونہو یہی راجکمار ہے۔

جب رات ہونے لگی تو بڑھیا ایک بھکار بن کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہی، رات گئے جب راجکمار باہر نکلا اور بڑھیا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو پوری وہی صورت پائی جیسی مہارانی نے بتائی تھی۔ بڑھیا دیکھ کر خوش ہو گئی۔ دوسرے دن اس نے چوڑی والی کا بھیس بنایا اور رنگ برنگی چوڑیاں ایک ٹوکری میں رکھ کر راجکمار کے گھر کی طرف آئی۔ جب رات ہوئی اور راجکمار باہر چلا گیا تب اُس نے دروازے کے سامنے آکر آواز لگائی۔

”لے چوڑی۔ لے رنگ برنگی چوڑی۔ لے سنہری روپہلی چوڑی“

کنول کو راجکمار کے گھر میں رہتے ہیں بیت گئے تھے۔ لیکن اس کے دروازے پر کبھی کوئی سودا بیچنے نہیں آیا تھا کیونکہ رات کو جب یہ لوگ جاتے تھے تو سودے والے اپنے اپنے گھر جا کر سو رہتے تھے۔ اس وقت کنول نے جیسے ہی چوڑی والی کی آواز سنی وہ دوڑی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور چوڑی والی کو بلا کر اندر لے گئی اور جھٹ سے چوڑی پہننے کے لئے اپنے ہاتھ کو بڑھیا کے سامنے بڑھا دیا۔ بڑھیا نے دیکھا کنول کا ہاتھ سونے کی طرح ہلکا چوڑی

کے بے تب تو وہ ہاتھوں کو دیکھ کر ہنکاری اور کہنے لگی کہ تمہارے میاں تم کو بالکل نہیں جانتے۔

کنول نے کہا: ”واہ واہ وہ تو ہم سے بہت پریم کرتے ہیں“

بڑھیا نے کہا میں نہیں مانتی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے میاں تمہارا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں اور جھوٹا پانی پیتے ہیں؟
کنول نے کہا ”نہیں، ان کی تھالی اور کٹورا الگ رہتا ہے اور میرا الگ رہتا ہے“

بڑھیا بولی: ”واہ کچی کہاں پریم کرتے ہیں؟ تب جانوں کہ تم سے پریم کرتے ہیں کہ آج تم اُن کا جھوٹا کھاؤ اور جوہ

تمہارا جھوٹا کھائیں۔ کنول نے کہا ”یہ بھی کوئی بڑی بات ہے؟ آج ہی اپنے میاں سے کہوں گی۔“

اس دن جب راجکمار اور کنول کھانا کھانے بیٹھے تو کنول نے کہا کہ آؤ آج ہم تمہارا جھوٹا پانی پیئیں اور تم ہمارا جھوٹا

پانی پیو، یہ سنتے ہی راجکمار کے کان کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے کہا: ”کنول آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہاں کوئی

آیا تھا اور اُس نے تم کو کچھ سکھایا پڑھایا ہے؟“ کنول نے سمجھا کہ راجکمار اس طرح بات ٹالنا چاہتا ہے۔ اُس نے

جھٹ پٹ کہا نہیں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میں خود سے چاہتی ہوں۔“ راجکمار نے اُسے سمجھایا کہ یہ نہ کرو لیکن اس سے

جھگڑا نہیں ختم ہوا تب راجکمار نے اپنا کٹورا اٹھا کر اپنے منہ سے لگایا اور اس طرح جھوٹ موٹ کے گھونٹ پئے جیسے

پانی پی رہا ہو لیکن اس نے پانی نہیں پیا۔ پھر وہ کٹورا کنول کو دیدیا اور اس کے کٹورے کا پانی خود پی لیا۔ کنول خوش ہو گئی۔

بڑھیا اپنے جی میں خوش تھی کہ کنول نے راجکمار کے منہ کا جھوٹا پانی پی کر جان دیدی ہوگی۔ لیکن جب وہ دوسری رات

کو سر مہستی لے راجکمار کے گھر آئی تو دیکھتی کیا ہے کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہے اور اُسے دیکھتے ہی تالی بجا کر کہنے لگی کہ دیکھو میں

کہتی تھی کہ میرے میاں مجھے جانتے ہیں۔ کل میں نے ان کا جھوٹا پانی پیا اور اس نے میرا جھوٹا پانی پیا۔

بڑھیا نے کہا: ”واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی۔ تب جانوں کہ تمہارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ تم ان کے منہ کا

اگال کھاؤ اور وہ تمہارا اگال کھائیں“

کنول نے کہا: ”اچھا۔ آج یہی ہوگا“

بڑھیا چلی گئی اور اس دن جب راجکمار آیا اور کھانا پینا ہو چکا تب دونوں پان کھا کر باتیں کرنے لگے ویسے ہی کنول

نے کہا ”تب جانوں کہ تم مجھ کو چاہتے ہو کہ تم میرا اگال کھاؤ اور میں تمہارا اگال کھاؤں“

اب تو راجکمار یہ سنگرباچکر میں پڑا کہ یہ بات کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی کنول کو سکھاتا پڑھاتا ضرور ہے۔ اس نے کنول سے

پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کہ یہ باتیں کون بتاتا ہے۔

کنول نے اپنے دل میں کہا کہ میرا میاں مجھے ٹالنا چاہتا ہے اُس نے کہا: ”یہاں رات کو مجھے کون سکھانے پڑھانے

آئے گا۔ یہاں رات کو صرف چوہے جی آتے ہیں۔ ان کے سکھانے سے کوئی سیکھ لے تو سیکھ لے۔ راجکمار نے بہت سمجھا

لیکن کسی طرح وہ نہ مانی۔

آخر راجکمار نے اپنا اگال اپنے ہاتھ میں لیا اور کنول سے کہا کہ لاؤ اپنا اگال دو جب کنول نے اپنا اگال دیا تو کہنے وہ بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اپنا اگال آپ کھالیا اور اس کا اگال اُس کو دیدیا گیا۔ کنول سمجھی کہ اس نے ہماری بات مان لی اور خوش ہو گئی۔

دوسرے دن جب بڑھیا آئی اور اُس نے دیکھا کہ کنول صحتی جاگتی بیٹھی ہوئی ہے تو بہت گھبرائی کہ یہ کیا بات ہے کنول اس کو دیکھتے ہی ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ میں کہتی نہ تھی کہ میرے میاں مجھ کو چاہتے ہیں۔ کل ہم نے ان کا اگال کھالیا تو انھوں نے میرا اگال کھالیا۔

بڑھیا نے کہا ”واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ وہ تم کو اپنی ذات بتا دیں بڑھیا چلی گئی۔ رات کو جب کھانا دانا کھا کر راجکمار اور کنول بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو کنول نے پوچھا کہ تمھاری ذات کیا ہے۔

یہ سنتے ہی راجکمار اچھل پڑا اور بگڑ کر کہنے لگا دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ نہیں تو ہم تم بچھڑ جائیں گے۔ کنول نے کہا: ”میں یہ کچھ نہیں سنتی۔ تم مجھے اپنی ذات بتاؤ۔“

راجکمار نے اس کی منتی کی گڑ گڑایا۔ مگر کنول نے ایک نہ سنی۔ نہ ماننا تھا نہ مانی اور وہی رٹ لگاتی رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

ایک دن سے دوسرا دن ہوا، کنول اٹوار کھٹوار بیکر بھوکی پیاسی ایک کونے میں پڑی رہی راجکمار نے اس کے سمجھانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی بار بار کہا کہ یہ بات تم کو کسی دشمن نے سمجھائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم تم بچھڑ جائیں مگر کنول کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

راجکمار نے اس کے لئے زنگ برنگی کپڑے اور طرح طرح کے زیور خریدے۔ موتیوں کے ہار جس کے موتی لال کے انڈے کے برابر تھے اور یاقوت کے بندے جو طوطے کی زبان کی طرح لال تھے لاکر کندن کے سامنے رکھ دئے۔ مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور برابر ہی رٹ لگائے رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ اپنی ذات بتاؤ۔

آخر راجکمار نے کہا میں اپنی ذات اس وقت بتاؤں گا جب میں کمر کمر پانی میں کھڑا ہوں۔ کنول نے کہا چاہے ندی میں کھڑے ہو کر بتاؤ چاہے سمندر میں لیکن مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ میں بلا یہ جانے زندہ نہیں رہ سکتی۔“

دوسرے دن ڈولا منگوایا گیا۔ اس میں کنول بیٹھی اور گھوڑے پر ساتھ ہوئے راجکمار بنی اور دونوں گھاٹ پر پہنچے۔ یہاں راجکمار نے کہا دیکھ کنول اب بھی مان جا۔ نہیں تو پھپھٹائے گی کندن بولی میں کچھ نہیں سنتی۔ راجکمار نے یہ سن کر غصے سے کپڑے اتارے اور کمر کمر پانی میں اتر گیا۔ پھر کہا اب بھی مان جا۔ نہیں تو میرے تیرے بیچ میں سات سمندر ہوں گے۔ نہ تو وہاں جا سکے گی اور نہ پھر میں آسکوں گا۔ کنول بولی میں یہ کچھ نہیں سنتی، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ راجکمار

کی یہ سنتے ہی تھلا گیا۔ اُس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور پھر کالا چمکتا ہوا چہرا اور شعلے کی طرح لپ لپ کرتی زبان دریا سے نکال کر بولا۔

”یہ دیکھ میری ذات۔ یہ دیکھ میری ذات۔“

پھر بچپن اندر کر لیا جہاں راجہ مار نے غوطہ لگایا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے گھیرے پانی پر بنے اور دھیر دھیر کر کے مٹ گئے۔ راجہ مار غائب ہو کر پھر باہر نہ آیا۔

جب راجہ مار واپس نہ آیا۔ تب کنول کو معلوم ہوا کہ اُس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ جیسے سادہ بھادوں میں کالی گٹھائیں جھڑی لگا دیتی ہیں ویسے ہی کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب روتے روتے اُسے کئی دن بیت گئے تو اُس کے جی میں آیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ اُٹھ کر دریا کی طرف دوڑی اور کود پڑی۔ دو چار ڈبکیاں کھا کر بے ہوش ہو گئی ایک مچھلی یہ سب لیلہ دیکھ رہی تھی اُسے کنول کی پتا پر ترس آ گیا۔ اُس نے کندن کو اپنی پیٹھ پر لا کر ساتھ سمندر پار ناگ دیس پہنچا دیا۔

کنول کی جب آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہے کہ میں ایک بہت بڑے جنگل میں پڑی ہوں۔ جنگل کے پیڑوں پر پھل پھول تھام ہیں مگر جی ایک بھی نہیں اور ڈالیاں سانپ کی طرح بل کھاتی آپس میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کنول اُٹھ کر ایک طرف چلی۔ چلتے چلتے ایک آبادی کے باہر ایک کنوئیں کے پاس پہنچی۔ جہاں چار پانچ سندھو لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ کنول چلتے چلتے تھک کر چور ہو گئی تھی اور اس کا گلاب پیاس سے سوکھ کر کاٹا ہو گیا تھا۔ اُس نے جگت کے پاس جا کر ایک لڑکی سے کہا ”بہن مجھے پانی پلا دے۔“ اُس نے کہا ”ہٹ تجھے اپنی پڑی ہو آج میرا راجہ مار نہا رہا ہے جو برسوں کے بعد گھر آیا ہے پنڈت جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ ایک سو ایک گھڑوں سے نہ نہائے گا ہم لوگوں سے مل جل نہیں سکتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ جلدی سے وہ نہائے تو ہم اس سے ملیں ملیں۔“

کنول کے کان کھڑے ہوئے اُس نے پوچھا تمہارا راجہ مار اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے جواب دیا:-

”اُسے ایک چالاک عورت نے اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اب ایک بڑھیا اُسے چھڑا کر لائی ہے۔“

کنول نے منتی کی کر مجھے پانی پلا دو پیاس سے مری جا رہی ہوں۔ آخر ایک پانی والی کو ترس آیا اور اُس نے کہا

”ادھر آ۔ میں پانی پلا دوں۔“

کنول نے پانی پینے میں اپنی آنکھوٹھی گھڑے میں ڈال دی پانی بھر کر سب لڑکیاں ایک ایک لگڑی سر پر اور ایک ایک کر کے رکھ کے محل کی طرف چلیں۔ محل میں راجہ جی ایک سوئے کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ پانی بھرنے والیوں نے اپنے اپنے گھڑے لاکر رکھ دیے اور ایک ایک کر کے راجہ مار کے سر پر ڈالنے لگیں۔ ایک گھڑے سے آنکھوٹھی نکل کر راجہ مار کی گود میں گری راجہ مار نے اُسے دیکھتے ہی چھپا لیا اور کہا:- ”آخر کینخت آپہنچی۔“

نہا دھو کر بنی ٹہلنے کے بہانے محل کے باہر نکلا اور ادھر ادھر کنول کو دیکھنے لگا۔ دیکھا تو وہ ایک درخت سے لگی کھڑی رو رہی ہے اس کے کپڑے میلے ہیں بال اُلجھے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہیں، اس بُری حالت میں دیکھ کر راجا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انھوں نے پاس جا کر اپنی ہتیلیوں سے کنول کے آنسو پونچھے۔ آنسو پونچھنے میں کنول کی آنکھوں کا کاجل ہتیلیوں میں بھر گیا اور اسے اس کی خبر نہ ہوئی۔

راجا بھار نے کہا دیکھ کنول، آج میں اپنی ماں سے کہوں گا کہ گھر میں جھاڑو دینے کو ایک عورت کو رکھ لو وہ پوچھے گی کون عورت ہے تو میں کہوں گا کہ مصیبت کی ماری نہیں باہر سے آگئی اور یہاں ماری ماری گھوم رہی ہے تب وہ تم کو رکھ لیں گی۔ یہ سن کر کنول کو تھوڑی سی ڈھارس ہوئی اور وہ راجا کے ساتھ ساتھ محل کے پھاٹک تک آئی اندر جا کر راجا بھار نے جو کچھ کنول سے کہا تھا اپنی ماں سے کہا: ماں نے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ کر کنول کو نوکر رکھ لیا۔ لیکن راجا بھار کی بہنوں نے راجا بھار کی ہتیلیوں میں کاجل بھرا دیکھ لیا اور کھٹک گئیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہنوں نے ایک ڈلیا میں دھان نکالے اور ایک ایک گن کر کنول کو دے دیں اور کہا اس کو کوٹ لا کر خبردار ایک چانول نہ ٹوٹے۔

کنول بچاری ڈلیا لے کر باہر آئی اور ایک پیر کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آنکلی راجہ بنی۔ انھوں نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ کنول نے سب حال کہا، یہ سن کر راجا بھار نے جنگل کی چڑیوں کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سب دھان کھٹک کر چانول باہر نکال دو چڑیوں نے بات کی بات میں کام پورا کر دیا اور کنول خوش خوش چانول کی ٹوکری لے کر ہوئے اندر آئی۔

راجا بھار کی بہنیں یہ دیکھ کر کنول سے کہنے لگیں:-

”یہ تیرا کام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے۔“

دوسرے دن راجا بھار کی بہنوں نے کنول سے کہا دیکھ ہمارے بھیا کا بیاہ ہو رہا ہے ان کے رہنے کے لئے وہ سامنے والا کرا جھاڑ بھار کر صاف کر دے۔

کنول جھاڑو لئے کمرے کی طرف گئی، وہاں دیکھتی کیا ہے کہ چھت میں بڑے بڑے سانپ لٹک رہے ہیں اور بھینکاریں مار مار کر آپس میں لڑ رہی ہیں۔

نیچے بڑے بڑے اجگر بڑے ہوئے ہیں اور کونوں میں بچھو اور کھٹکھجورے رینگ رہے ہیں یہ دیکھ کر کنول ڈر کر بھاگ آئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آنکلی راجہ بنی انھوں نے جو اسے روتے دیکھا تو پاس آ کر پوچھا کیا بات ہے اُس نے سب قصہ کہہ سنایا۔ انھوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر کنول کو دی اور کہا بے جا کر کمرے میں ڈال دو۔

کنول نے ایسا ہی کیا انگوٹھی دیکھتے ہی سب اجگر سانپ بچھو اور کھٹکھجورے بلوں میں گھس گئے۔ کنول نے سب جھاڑ بھار کر صاف کیا اور راجا بھار کی بہنوں سے آکر کہا کہ کمرہ صاف ہو گیا ہے۔

راجکار کی بہنوں نے جا کر کرہ دیکھا اسے سات دیکھ کر حیرت میں آگئیں پھر کنول سے کہنے لگیں :

”یہ حیراکام نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے“

ہوتے ہوئے راجکار کی برات کا دن آگیا۔ بیاہ میں ہاتھی گھوڑے شیر اور بچھ سب ساتھ ساتھ تھے۔ خوب باجے کا بجے تھے اور طرح طرح کی آتشبازیاں تھیں۔ راجکار کی بہنوں نے کنول کو بلا کر پوچھا کہ تم راجکار کو کتنا چاہتی ہو اس نے جواب دیا کہ ان کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں، بہنوں نے کہا ہمارے یہاں رواج ہے کہ جو دو لہا کو بہت چاہتا ہے اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں میں کپڑا بیٹ کر تیل چھڑک دیتے ہیں پھر اس میں آگ لگا کر مشعلیوں کے ساتھ ساتھ دو لہا کے گھوڑے کے آگے آگے رکھتے ہیں۔

بھولی کنول اس پر راضی ہو گئی اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں پر کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر ان پر گھی چھڑکا گیا اور ان میں آگ لگا دی گئی اور اُسے راجکار کے گھوڑے کے آگے کر دیا گیا جب برات چلی تو یہ بھی چلی۔ اتفاق سے اس کی انگلیوں سے اس کی ساڑھی میں آگ لگ گئی۔ اُسے دیکھ کر کسی نے کہا :

”مشعلیچن۔ دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں“

کنول اپنے دکھ میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اُس نے سنا بھی نہیں پھر کسی نے کہا :

”مشعلیچن دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں“

اب کنول چونکی اور چونک کر بولی :

”کپڑے کیا یہاں تن سب جل رہا ہے“ اس کی آواز سن کر راجکار چونک پڑا اور گھوم کر اس کی طرف دیکھا

تو دیکھتا کیا ہے کہ کنول کی دسوں انگلیاں مشعل بنی ہوئی ہیں اور اس کے بدن میں بھی آگ لگ چکی ہے۔

راجکار نے جب کنول کو اس بری حالت میں دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک بھنگا رماری جس سے برات کے سارے چراغ مشعلیں اور بتیاں بجھ گئیں اور اندھیرا گھپ ہو گیا اُس نے کنول کی ہانہ پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھالیا اور گھوڑے کو بھگاتا ہوا اپنے دیس سے نکل گیا۔ دیس کے باہر پہونچ کر اُس نے اپنے بال کاٹ ڈالے جس سے اس میں ناگ بننے کی طاقت نہیں رہی اور وہ معمولی آدمی بن کر کنول کے ساتھ آدمیوں میں رہنے لگا۔

حیات اللہ انصاری

(نیا ادب)

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے فلسفہ مذہب تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عدد رعایتی ۱۲ محصول علاوہ۔

نورنگار کتب خانہ لاہور

اخبارِ کپنی کے عہدِ حکومت میں

ہر ملک کی حیات ملی و قومی میں اخبارات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، ہمارا وطن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اگرچہ ہندوستانی اخبارات یہاں کی رائے عامہ کے اتنے پر زور ترجمان نہیں ہیں جتنا مغرب کے یورپ میں اخبارات اٹھ سوئس صدی کے آغاز ہی میں بہت زور پکڑ چکے تھے اور ان کی بڑی وقعت تھی اسی بنا پر نیپولین کہا کرتا تھا کہ ”چار مخالف اخبار ایک لاکھ نیزوں سے زیادہ خطرناک ہیں“ ہندوستان میں ایسے خوفناک حربے کی ابتدا اور نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا لیکن قبل اس کے کہ ہندوستانی اخبارات پر قلم اٹھایا جائے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر مختصر آری بھی بتا دیا جائے کہ دنیا میں اخبارات کس طرح وجود میں آئے۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اطلالیہ اخبارات کا مولد ہے ”ایکشا دای ریانا“ (Aeksha Dairana) جس میں روزمرہ کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا اور جس کا حوالہ سنیکا (Seneca) نے بھی اپنی تصانیف میں دیا ہے دنیا کا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے۔ یہ اطلاعات نہایت معتبر اور مستند ہوتی تھیں کیونکہ یہ حکومت روم کی طرف سے شائع کی جاتی تھیں لیکن جریس سیر کی وفات کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا چامرس (Chambers) کی تحقیق کے مطابق طرزِ جدید کا پہلا اخبار ۱۵۲۶ء عیسوی میں نکلا۔ ایک قلمی اخبار تھا اس کا مقصد اہل و عیال کو وقت کے اہم سیاسی مسائل سے باخبر رکھنا تھا۔ اور ہر ماہ میں صرف ایک بار شائع ہوتا تھا سب سے پہلا انگریزی اخبار ”دی ویلی نیوز“ ۱۸۲۳ء مئی ۲۲ء کو نکلا۔

ان ابتدائی اخبارات کے متعلق ایک مربرانی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے ”یہ اخبارات فخرِ اہل بد سے کاغذ کا ایک پلندہ ہوتے تھے۔ جن میں کبھی منظرِ ملت و واقعات اور مشکوک قصوں کا ذکر ہوتا تھا یا لوگوں کی بیجا درج و ستائش کی جاتی تھی یا مخالفین پر فحش و رکیک حملے ہوتے تھے ان کی اشاعت پوشیدہ طریقہ سے ہوتی تھی ان کا مطالعہ زیرِ لب ہوتا تھا اور باتھوں یا قہ خفیہ طور پر ایک سے دوسرے تک پہنچتا تھا“

ہندوستان میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی یہاں نہ ان کی صورت آقا ہی اس درجہ شرمگاہ تھی اور نہ ان کو اپنی زندگی پر قرار رکھنے کے لئے کوئی خفیہ راہ عمل اختیار کرنی پڑی۔

یورپ میں اخبار کے اجراء کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد ہندوستان میں اس کا وجود ہوا اور اس عرصہ میں لوگوں کے زاویہ نگاہ میں بین تبدیلی اور تغیر ہو چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مستحکم سیاسی قوت بن چکی تھی انتظامی امور اور جدید تجارتی جہات کے لئے انگریزوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان آئے گی۔

تینوں احاطوں کے صدر مقام کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزوں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی یہ لازمی امر تھا کہ نیا عنصر بہت دور رس فتاح اور اہم تبدیلیوں کا حامل ہوتا۔ سرزمین ہند میں نئے خیالات اور اداروں کی تخم ریزی ہونے لگی اخباری پریس انھیں اداروں میں ایک تھا اس کی ابتدا انفرادی مساعی اور ہمت کی بدولت ہے، کمپنی نے اس سلسلہ میں کوئی پیش قدمی نہیں کی۔

۱۷۶۸ء میں ایک شخص مسی مسٹر بولٹس (Boulton) نے ایک اخباری مطبع قائم کرنیکی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ اس کے منصوبے علی جامہ پہن سکیں فورٹ ولیم کی کونسل نے اس کو ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیدیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے شخص مسی جے۔ اے۔ کے (J. A. Kaye) نے ایک پریس قائم کیا جس کو پرنٹنگ (چھپائی) پر ایک رسالہ کلکتہ کے جیل میں مل گیا تھا وہ قرضہ کے عدم ادائیگی کے جرم میں ناخود گھائے اس الزام کی تردید کی لیکن وہ اس قدر تند اور جھکی مزاج کا تھا کہ کوئی وکیل اس کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا، بالآخر اس کے ہمنام دوست نے جو ”تزک ولیم کے“ کا مصنف بھی تھا اس کے مقدمہ کی پیروی کا بیڑہ اٹھایا جس وقت وہ بحث کر رہا تھا، بکے مجنونانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اس وکیل کو کچھ نہیں آتا اور میں اپنے مقدمہ کی بحث اور پیروی خود کروں گا، اس صریح بیجان نے وکیل کو بہت صدمہ پہونچایا اور اس نے مزید بحث اور پیروی سے انکار کر دیا۔ دوبارہ اس استدعا پر اس نے مقدمہ چرا اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے دوست کو بری کرادیا۔

اپنی رہائی کے بعد کے نے کلکتہ میں ایک پریس قائم کیا اور سن ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ کے نام سے نکالا اس اخبار کے اب صرف دو نسخے موجود ہیں ایک وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں۔ یہ اخبار ابتداء ہی سے بہت مقبول تھا اخبار ہندوستان میں بالکل ایک نئی چیز تھی اور اس لئے لوگ اس کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، طنزیہ قصبے اور کلکتہ کے مختلف اشخاص کو جو عرفیتیں دی جاتی تھیں پڑھنے والوں کی دلچسپی کو دوبالا کر دیتی تھیں۔

ایک شخص مسی مسٹر ٹریٹا (Treaty) پرچہ کلکتہ ہی کے تھے ان کی خود نمائی اور بیجا طمطراق کی وجہ سے سخت حملے ہوتے تھے اس زمانہ میں جب ہندوستان میں معدوم چند انگریز تھے گورنمنٹ ہاؤس کی

محلِ قص و سرود میں ہر شخص شریک ہوتا تھا، مسٹرٹی ریٹا ایسے مواقع پر کبھی دچکتے اگرچہ جون کا مہینہ اور دم گھٹنے والی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔ یہ شخص موزوں قد و قامت کا تھا لیکن بد قسمتی سے ناگ بہت بڑی تھی اخبار نے لکھا ”نلکول“ (Nasey jargon) نے سرخ محل کے سوٹ میں ایسا سالانہ قص دکھلایا، اس روز سے مسٹرٹی ریٹا نلکول (Nasey jargon) کے نام سے پکارے جانے لگے۔

اس اخبار میں محض حلقے اور لوگوں کے متعلق بلا تفریق افترا پر داڑیاں ہونے لگیں اس کے اڈیٹر نے مارن ہٹنگنز پر بھی جو اس وقت گورنر جنرل تھا حملہ کرنے کی جرأت کی حکومت نے محسوس کیا کہ اس بڑھتی ہوئی دبا کا تدارک کرنا چاہئے اور سرکاری ڈاکخانہ سے اس اخبار کی اشاعت بند کر دی پھر بھی اخبار کی اشاعت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حوالی کلکتہ میں بھی چیرا سیوں کے ذریعہ اخبار پہنچانے کا انتظام کر لیا گیا آخر کار بکے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں گرفتار ہو گیا اور اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ہوا اس طرح دارن ہٹنگنز کے عہد حکومت میں اس اخبار کا کلا گھونٹ دیا گیا اور اس شرمناک طریقہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ گو اس جاہلانہ طریقہ پر یہ اخبار بند کیا گیا تھا لیکن ابھی تک احتساب و نظارت نہیں قائم ہوئی تھی پریس کی کمزور ابتدا اور سست نشوونما ابھی ان پابندیوں اور سختیوں کی متقاضی نہیں تھی۔

بنگال گزٹ کے امتناع نے مزید جرات آدمیوں کا سلسلہ بند نہیں کیا، ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۸ء تک بہت سے انگریزی اخبار جاری ہوئے ان اخبارات میں جو احاطہ بنگال میں اس وقت جاری تھے کلکتہ جرنل۔ بنگال پرکار و جان بل کلکتہ کوئیر۔ انگلشمن۔ ریفارمر اور فرنڈ آف انڈیا جس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کرتے تھے قابل ذکر ہیں۔ ان اخباروں کے مالک و مدیر غیر سرکاری اشخاص تھے، حکومت بنگال کا اپنا ترجمان گورنمنٹ گزٹ الگ تھا دوسرے احاطوں بمبئی و مدراس کے اخباروں میں بمبئی ٹائمز بمبئی کوئیر اور مدراس گزٹ قابل ذکر ہیں ان پر اسے اخبارات کے نسخے امپیریل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں اور مطالعہ کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں صرف تھوڑے سے اشخاص کسی انگریزی اخبار کا چندہ دے سکتے تھے۔ جان بل جیسے روزنامہ کا چندہ چونسٹھ روپیہ سالانہ اور آٹھ روپیہ ماہانہ ہوتا تھا۔ چار صفحات سے زیادہ پڑھنے کے قابل مواد نہ ہوتا تھا اور اس میں بھی زیادہ تر کلکتہ کے آس پاس کی خبریں درج ہوتی تھیں کبھی کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامی پالیسی پر بھی رائے زنی ہوتی تھی اور گاہے گاہے انگریزی رسالوں اور مجلوں کے اقتباسات بھی نکلتے رہتے تھے۔ یہ بیرونی انگریزی پرچے ان لوگوں کے پاس مستقل طور پر آتے رہتے تھے جو ان کے خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں اخبارات ذاتیات اور گالی گلاچ میں بہت زیادہ حصہ لینے لگے ایک ڈیڑھ دوسرے اڈیٹر پر حملے کرتا تھا، اس وقت کے سب سے زیادہ مقبول اخبار کلکتہ جرنل نے معاصر اخبارات کے

ماسن و معائب پر رائے زنی کر کے اپنے سر مصیبت مول لی اور اپنی بڑائی اور فوقیت کا سک جانا چاہا معاصر اخبارات کے ڈیڑوں نے بے اس بنکھم اڈیٹر کلکتہ جرنل کے خلاف نہایت گندہ اور فحش پروگنڈا کرنا شروع کر دیا اس پر چار بیبیاں رکھنے کا الزام لگایا اور مشہور تھا کہ اس کی ایک بیوی بیبی پہونچکئی ہے ریورنٹ برائس نے جو ایشیا ٹک مر کا اڈیٹر تھا بنکھم پر نہایت ہیمانہ طے کے ۱۸۱۹ء میں کلکتہ جرنل نے ایشیا ٹک مر کی ایک ٹنگ کی کاروائی شایع کی اور اس سلسلہ میں کمپنی کے ایک کلرک مسی ڈارول کا بھی حوالہ دیا اخبار کی اس معاندانہ نکتہ چینی نے ڈارول کو بہت صدمہ پہونچایا ایک روز شام کے وقت جب بنکھم سیر و تفریح کے لئے جا رہا تھا اس سے ڈارول سے ملاقات ہوئی اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم کلکتہ جرنل کے اڈیٹر ہو اس سوال کے ساتھ اس پر چند کڑے بھی لگائے گئے بنکھم نے اس کا جواب اپنی چابک سے دیا۔ ایک دوسرے موقع پر بنکھم نے ایک شخص مسی ڈاکٹر جیمسن کے بیک وقت تین عہدوں کے قبول کرنے پر شدید نکتہ چینی کی جیمسن کو یہ نکتہ چینی بہت ناگوار گزری اور اس نے اڈیٹر کو دیول (کیلی) کی دعوت دی اس زمانہ میں (کیلی) ڈوئل کا عام رواج تھا۔ ڈوئل سے انکار بزدلی کے مراد خیال کیا جاتا تھا۔ درمیانی اشخاص نے معاملہ کو رفت و گزشت کرادیا۔

ان حملوں اور جوابی حملوں کے علاوہ اخبار اشتہارات سے پڑھتے تھے ان اشتہاروں کا نرخ چار آنے فی سطر ہوتا تھا زیادہ تر نیلاموں اور قہود خانوں کے اشتہار ہوتے تھے جہاں ہر قسم کے فواہات مل سکتے تھے بیرونجات سے آئی ہوئی نئی کتابوں کے بھی اشتہار دئے جاتے تھے کلیات باؤن گیمسیر کے اعترافات اور ایک مجھوش شخص کے اعترافات کے قسم کی کتابیں انگلش سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں قہیر کی خبریں اور گھوڑ دوڑ کے اشتہار بہت نمایاں طور پر شایع کئے جاتے تھے۔ سال بھر لائبریریوں کا سلسلہ جاری رہتا اور لوگوں کے جوش و خروش کا باعث ہوتا تھا۔ اس کے اعلانات اخبارات کی خصوصیت تھے ان کے علاوہ زیادہ تر اشتہارات نقالی رقص اور ازدواجی رشتوں کے متعلق ہوتے تھے یہ نقالی رقص فوجوانوں میں بہت عام تھا اور اکثر اس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ ازدواجی رشتوں کے اشتہارات میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا کہ لڑکی کو کسی قسم کی جگر کی بیماری نہ ہو۔

اخباری پریس کی تاریخ میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ہندوستان کے انگریز صحافت نگار اپنے انگلستانی معاصرین کے نقش قدم پر چل رہے تھے انگلستان کا پریس جماعتی حملوں کا شکار ہو چکا تھا انیسویں صدی کے اوائل کے اخباروں کے افتتاحیہ مقالے دگب اور ٹورے جگڑوں سے پر نظر آتے ہیں۔ اڈیٹروں کی باہمی جنگ اکثر اخباروں کے افتتاحیوں سے آگے بڑھ کر عدالت کے اکھاڑوں تک پہونچ جاتی تھی بیشتر اوقات ”ڈوئل“ سے کام لیا جاتا تھا ۱۸۳۱ء میں ”لندن میگزین“ اور ”بلیک وڈ میگزین“ کے اڈیٹروں کے درمیان ایک

یادگار ”ڈول“ لڑا گیا اخبار نویس خواہ وہ کسی جماعت کے حامی ہوتے کسی حالت میں بھی محفوظ و مامون نہ تھے۔
 یقیناً انگلستان میں بمقابلہ ہندوستان کے بہت زیادہ اخبار نکل رہے تھے اُنیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال میں ہندوستان میں تیس اخبار سے زیادہ کا وجود نہ تھا برطان اس کے برطانیہ میں دو سو چھ اخبار جاری تھے اور ان میں سے بعض کی صبح و شام دونوں وقت اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان میں چندے اور ڈاک کے محصولات کی زیادتی کی بنا پر بہت کم لوگ مستقل طور پر اخبار خریدتے تھے اس کے برعکس انگلستان میں ایک ایک اخبار کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔

اس طرح انگریزی سوسائٹی سے ہندوستان اور اس کے باشندوں نے ایک نیا ادارہ حاصل کیا، ہندوستانیوں نے بھی ایسے آلہ سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کی جو ان کے خیالات اور شکایات کی ترجمانی کرے اس وقت کلکتہ میں ہندوستانیوں کا ایک بڑھتا ہوا گروہ تھا جس کو مغربی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔
 صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر بعض سربراہان ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کوششوں سے ودالیریا اینگلو انڈین کالج قائم ہو چکا تھا، ہندوستان کے مسٹر ڈیوڈس اور راجہ رام موہن رائے دونوں جماعتوں کے سرگروہ تھے ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانیوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگی تھی اٹھارہ سو تیرہ عیسوی کے چارٹر ایکٹ کی اُس دفعہ کو جس میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی منظوری تھی عرصہ سے معرض التوا میں ڈال رکھا گیا تھا، اس حقیقت کے پیش نظر کہ مشنریوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور درس گاہیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں اور خود کمپنی اپنے بڑھتے ہوئے حدود اختیار کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی خدمات حاصل کرنے کی خواہشمند تھی، حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کوئی مستقل طرز عمل اختیار کرنے میں کسی قسم کی تعویذ برداشت نہ کی جاسکتی تھی، انگریز افسروں کی اکثریت اور ترقی پسند ہندوستانیوں کا گروہ انگریزی کو عدالتی زبان بنانے کے لئے بہت زور دیر با تھا جیسا کہ بالآخر ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ یہ ایک بالکل فطری اور قدرتی امر تھا کہ جس وقت ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور تعلیم کے لئے اس قدر آسانیاں ہم پہنچانی جا رہی ہیں اہل ہند صحافت کی طرف مائل ہو جاتے سب سے پہلا ہندوستانی اخبار ”دربن“ تھا۔ لیکن اس کی ادائیگی سیلیم پور کے عیسائی مبلغین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس لئے اس کو خالص ہندوستانی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔ ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو اسکا آغاز ہوا اور لارڈ ہسٹنگز نے جو اس وقت گورنر جنرل تھا اس کی نشوونما اور ترقی میں بڑی مدد دی اس نے ہندوستانی پریس کی نشوونما میں بڑی دلچسپی لی اور ان لوگوں کے خیالی خطرات سے متاثر نہ ہوا جو ایک آزاد ہندوستانی پریس کی موجودگی کو بہت مخدوش سمجھتے تھے، لیکن ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما راجہ رام موہن رائے تھے وہ اپنے

وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی تھے اور ان کو بجا طور پر ہندوستانی قومیت کا بانی کہہ سکتے ہیں، ۱۸۷۱ء میں کلکتہ جرنل کی ایک اشاعت میں ہفتہ وار بنگالی پرچہ "سمبد کو مودی" (Sambodh Mudi) کا کیفیت نامکلا میں اس ڈی کاٹ (S. D. Collett) نے راجہ رام موہن رائے کی سوانحی میں اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ ایک خالص ہندوستانی پرچہ تھا جس کو مقامی باشندے مقامی زبان میں نکالتے تھے" اس اخبار کو ہندوستانی (ورنیکولر) اخباروں کا پیشرو اور راجہ موصوف کو ان کا بانی کہنا چاہئے۔ اس اخبار کے دوش بدوش اور بھی کئی بنگالی اخبار نکلنا شروع ہوئے ان اخباروں میں اقتصادی ادبی اور سیاسی مضامین کی بھرمار ہوتی تھی۔ سمبد کو مودی کی ایک اشاعت میں کلکتہ کے مجسٹریٹوں کے نام ایک اپیل بھی شائع کی گئی تھی جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلکتہ کے ہندو باشندگان کی جان کی حفاظت کے لئے عیسائی اعمال کی بے لاگ گاڑی پانی کے انسداد کے لئے سخت ترین قوانین مرتب کریں جو نہایت لاپرواہی سے اپنی گاڑیاں بھگاتے ہیں اور بلا امتیاز عمر و جنس راگیروں پر ہنر چلاتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۷۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار نکالا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک برہمنی میگزین جاری کیا۔ راجہ موصوف غیر متعصب "وسیع النظر" جماعت کے سرگروہ تھے اور ان ترجمانوں (آرگن) کے ذریعہ ہندو سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس وقت بنگال میں سستی کا عام رواج تھا راجہ مودوچ اور رائے ہمشرب اس کے نہایت پر جوش مخالف تھے لیکن متعصب اور تنگ نظر گروہ اکثریت میں تھا اور ترقی پسندوں کی مخالفت میں انھوں نے اپنا ترجمان "چندریکا" نکالا جو اس وقت کے تمام ہندو مذہبی اداروں کا علمبردار تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے اخبار مودو میں آئے ۱۸۷۳ء میں صرف کلکتہ سے سولہ اخبار نکل رہے تھے دوسرے احاطوں اور کے صوبہ متحدہ میں جو اس وقت نشیبی صوبہ کہلاتا تھا (لوہر پراونس) بھی صحافتی جرات آزمائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ہندوستانی (ورنیکولر) اخبارات نہایت آزادی کے ساتھ ہر مسئلہ پر اظہار رائے کرتے تھے یہاں تک کہ برطانیہ کی یورپی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کرنے سے باز نہ آتے تھے اور کپنی کی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا نہایت طنز یہ طریقہ پر اعادہ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مقالات سے انگریزوں کے احساسات کو جوٹ لگتی تھی اس لئے انکی یہ بے لگامی عرصہ تک جاری نہ رہ سکتی تھی انگلستان کا ٹوری پرپس ہندوستانی پرپس کی آزادی سلب کرنے کے لئے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا۔ اب ہم تاریخ صحافت و اخبار نویسی کے سب سے زیادہ اہم دور کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی احتساب و نظارت کا قیام۔

۱۹۱۷ء کے قبل ہندوستانی پرپس انگلستان کے قانون امانت کے علاوہ کسی اور قانون کے ماتحت نہ تھا اس طرح ہندوستانی پرپس انگریزی پرپس کے بمقابلہ تھا۔

گورنر جنرل "اجازت نامہ" ضبط کر سکتا تھا اس لئے نہیں کہ کپنی کے حدود اقتدار میں پریس نہ چلایا جاسکے بلکہ اس لئے کہ انگریز ہندوستان میں سکونت پذیر ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان میں سکونت کے لئے "اجازت نامہ" کی ضرورت ہوتی تھی اور کسی قابل اعتراض حرکت کی پاداش میں ہندوستان بدر کئے جاسکتے تھے۔ بکے کے گزٹ کے امتناع و ضبطی میں اسی حربہ سے کام لیا گیا تھا اور اس کے اڈیٹر کو مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑا ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیانی وقفہ میں عسکری واقعات پر نکتہ چینی کرنے کے جرم میں دو اڈیٹروں کی شدید گوشمالی ہوئی اور ایک فوجی افسر جو کپنی کے عہدہ پر فائز تھا انگلستان واپس کر دیا گیا اس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے فوجی ملازمین کے نام ایک نہایت اشتعال انگیز پیغام شایع کیا تھا ۱۹۷۸ء میں ایک شخص مسیٹر میکین صرف اس جرم میں ہندوستان سے نکالا گیا کہ اس نے ایک سنج پر شدید نکتہ چینی کی تھی کپنی کے بعض برہمن ملازمین نے ان ہی اخبارات میں اپنے غم و غصہ کا اظہار شروع کر دیا تھا یہ "اقتدار علی" کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اب کپنی کا سیاسی اقتدار بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے انتظامی شعبہ کے متعلق بے لگام نکتہ چینی کسی طرح برداشت نہ کی جاسکتی تھی کپنی کو خوف تھا کہ ان مملوں سے پہلے کی نگاہوں میں اس کی وقعت کم ہو جائے گی۔

لارڈ ویلزی نے اخبارات کے لئے نہایت سخت قوانین مرتب کئے اور ان کی نگرانی کے لئے احتساب و نظارت قائم کیا ان قاعدوں کی رو سے ہر اڈیٹر اخبار کے نیچے اپنا نام لکھنے پر مجبور تھا اسکے لئے ضروری تھا اپنے نام و پتہ سے گورنمنٹ کو باخبر رکھے، اتوار کے دن کوئی اخبار نہ نکلتا تھا، ان قواعد کی خلاف ورزی اور نظارت کے احکام کی عدم پابندی کی پاداش میں اجازت نامہ ضبط کر لیا جاتا تھا، ان پابندیوں سے انگلستان کی برسر اقتدار جماعت کے رویہ کا اندازہ ہوتا ہے اس وقت وہاں ٹوری جماعت برسر اقتدار تھی۔ اور اس کو ہندوستان میں ایک آزاد پریس کی ترقی سخت ناپسند تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستانی عوام کی بہالت اور حکام کے اعمال کی علانیہ نکتہ چینی کی بندش ان دو ستونوں پر قائم ہے۔ ۱۹۷۱ء میں حکومت بنگال کے حکم سے ایک سرکاری پریس قائم کرنے اور ایک سرکاری اخبار کا خاکہ (پلان) طیار کیا گیا آخرالمر پر اس قائم ہوا اور اخبار کا نام گورنمنٹ گزٹ رکھا گیا یہ کارروائی اس وقت کے اخبارات کی مخالفانہ نکتہ چینی کے رد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

۱۹۷۱ء اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے مختلف ضابطے اور قاعدے بنتے رہے، عسکری احکامات اور جنگ کی خبریں اس وقت سے شایع ہونا بند ہو گئیں ۱۹۷۱ء میں پریسوں کے مالکوں کو اخبارات میں اپنا نام لکھنے کا حکم ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں مزید قیود اور پابندیاں بڑھا دی گئیں اخبارات اور ان کے مضمینوں کے تمام مسودوں کا چیف سکرٹری (مختص خصوصی) کی نظر ثانی کے لئے پیش ہونا لازمی قرار دیا گیا

دستی اشتہارات و نوٹوں کے مسودے بھی نظر ثانی کے بغیر شایع نہ ہو سکتے تھے۔ سابق قاعدے اور قانون بدستور اپنی جگہ پر تھے بلکہ ان پر پہلے سے زیادہ عملدرآمد ہونے لگا تھا سمسٹر ایڈمس (۱۹۸۱ء) جو اس وقت احتساب و نظارت کے عہد پر فائز تھا، ٹوری رائے کا نہایت مبیاک حامی تھا اس کی سختی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ پریس کو پوری قوت کے ساتھ قابو میں رکھنا چاہئے پریس کے احتساب و نظارت کی تاریخ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بھٹی اور مدراس کے احاطوں نے پریس کے قوانین کے لئے بھی بنگال کی خوشہ چینی کی جیسا کہ اس سے قبل وہ اور امور میں کیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا احاطوں میں پریس سے متعلق بنگال ہی کے ایسی پابندیاں رائج تھیں۔ اڈیٹروں کو اکثر تنبیہ کی جاتی تھی اور بعضوں کو ہندوستان سے نکال بھی دیا جاتا تھا۔

مارکوس آف ہسٹنگز نے جو ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کینی کے سیاہ و سپید کا مالک تھا نظارت و احتساب کو ۱۹۱۹ء ہی میں منسوخ کر دیا اس کا خیال تھا کہ ایک آزاد پریس اچھی حکومت کے حق میں بہت حد تک مدد و معاون ثابت ہوگا کینی کی حکومت کا سب سے بڑا عیب اس کے عمال کی سستی و کاہلی تھی ایک شخص سٹیٹن ہوپ نے اپنے رسالہ ہندوستان میں ”برطانوی پریس کے اثرات“ میں لکھا ہے ”حکومت مدراس کو معتد عسکری سے کسی معمولی مراسلہ کا جواب حاصل کرنے میں اسی قدر کاغذ روشنائی اور وقت صرف کرنا پڑتا تھا جتنا کہ لارڈ جانسلر کی عدالت کے کسی بہت بڑے مقدمہ کے تصفیہ میں ہوتا ہے۔“ پریس کی نکتہ چینی اور اعتراض سے معاملہ میں عجلت ہو سکتی تھی اس کے علاوہ، ہسٹنگز کا ایک خیال اور بھی تھا۔ اس وقت تک یہ بے قاعدگی تھی کہ ہندوستانی اپنے قلم کو آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے کیونکہ ان کو ملک بدر کئے جانے کا کوئی خوف نہ تھا اور ان کو ہندوستان میں رہنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ پریس کو آزادی حاصل ہو گئی تھی تاہم اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ جملہ قیود و پابندیاں ہٹا دی گئی تھیں چند قاعدے ایسے بنائے گئے تھے جن کی پابندی ہر اڈیٹر کے لئے لازمی تھی۔

نمبر ۱۔ نوٹ آف ڈائریکٹریس کی کارروائی گورنر جنرل کے احکام کو نسل کے ممبر اور جج گٹا خان و بے باکانہ نکتہ چینی سے بالاتر تھے۔ نمبر ۲۔ فیضیت آمیز واقعات اور ذاتیات بالکل ممنوع تھی نمبر ۳۔ ہندوستانیوں کے احساسات کا پاس و لحاظ لازمی تھا نمبر ۴۔ بیرونی رسالوں کے ایسے اقتباسات کا شیوع ممنوع قرار دیا گیا جن سے تمغہ اور خون و ہراس پیدا ہو۔ ان قوانین کے نفاذ سے پہلے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ میں) اٹکی رجسٹری لازمی تھی۔

کورٹ آف ڈائریکٹریس کو لارڈ ہسٹنگز کا یہ اعلان پسند آیا اور وہ لارڈ موصوف کے احکامات کو منسوخ کر کے اذری نظارت و احتساب قائم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک سرکاری مراسلہ کا مسودہ بھی طیار کیا گیا اور ۱۹۸۲ء کو وہ مراسلہ بورڈ آف کنٹرول کو اس واسطے ارسال کیا گیا کہ وہ اس میں تحریر کردہ معروضات کے مطابق گورنر جنرل کے نام احکامات صادر کر دے لیکن بورڈ مذکور نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ جس سال نظارت و احتساب منسوخ کیا گیا بلکہ:

سے ایک اخبار کلکتہ جرنل نامی نکالا گیا اس کا مدیر ایک شخص مسی مسٹر جے اس بنگلہم تھا۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے احتساب و نظارت کی تاریخ میں جو حصہ اخبار مذکور اور اس کے مدیر نے لیا قابل یادگار ہے احتساب و نظارت کی منسوخی پر تمام احاطوں میں اظہار مسرت کیا گیا اگرچہ مدراس میں اس وقت بھی اس کا نفاذ تھا کلکتہ جرنل کے افتتاحی مقالوں میں گورنر جنرل کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کیا گیا اور حکومت مدراس کے رویہ کی سخت مذمت کی گئی یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول ہو گیا اور اس نے نہایت جرأت آموز رویہ اختیار کیا۔ اخبار کا کافی حصہ انفرادی شکایات کے رفع کرنے کے لئے وقف تھا حکومت کے مختلف احکامات پر نکتہ چینی کرنے کے لئے تعداد میں مراسلے بکھنے لگے۔ ایک شخص مسی کرنل رابنسن (C. Robinson) نے جس نے اپنا اخباری نام ”سیمول سو بر سائیس“ (Simul Soobrisais) سے استفادہ کیا انگلستان واپس جانا پڑا اخبار کے اڈیٹر کو اس قسم کے مراسلات چھاپنے کی معذرت کرنی پڑی۔

مسی بنگلہم نے اپنے سر دوسری مصیبت یہی کہ مسٹر ایلیٹ کی مدراس کی گورنری کی خبر کو چوڑے سیاہ حاشیہ کے ساتھ شائع کیا گیا یہ امر عمومی قلم کا باعث تھا مدراس گورنمنٹ نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور حکومت بنگال نے بنگلہم کو معافی مانگنے پر مجبور کیا کلکتہ جرنل حکومت کی ہمدردی سے محروم ہو گیا مسٹر ایڈمس جو چیف سکرٹری کی حیثیت سے نظارت اور احتساب کے فرائض بھی انجام دیتے تھے وہ اب سینیئر ممبر کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے اس اخبار کے جانی دشمن تھے۔ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ہسٹنگز اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ان کے منتخب جانشین لارڈ ڈام پر سٹ کے پہنچنے تک گورنر جنرل کے تمام فرائض بوجہ کونسل کے سینیئر ممبر ہونے کے مسٹر ایڈمس کے سپرد ہوئے مسٹر ایڈمس نے اپنے عہدہ کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی ایک شخص مسی ریورنٹ ڈاکٹر برائش کا جس کا ذکر ایشیاٹک مرور کی ادارت اور بنگلہم کے سلسلہ میں آچکا ہو بحیثیت اسٹیشنری فرائض کرنے والی کمیٹی کے کلرک کا انتخاب کیا اس تقرر کا اعلان گورنمنٹ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں ہوا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا اور کلکتہ جرنل کے اڈیٹر نے اپنی اشاعت مورخہ ۸ فروری ۱۸۲۳ء میں اس پر نہایت طنزیہ رائے زنی کی اس مقالہ نے قلم مقام گورنر جنرل کو بہت مشتعل کر دیا اور ۱۲ فروری ۱۸۲۳ء کو مسٹر بنگلہم کا احاطہ ضبط کر لیا گیا اور ان کو انگلستان واپس کر دیا گیا۔ یہ غیر متوقع مصیبت تھی اخبار مذکور کے کافی خریدار تھے اور مسٹر بنگلہم کا کام بھی بہت فروغ پر تھا اس کو اپنا کاروبار اپنے ایک ماتحت کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو خیر باد کہنا پڑا اگرچہ عرصہ تک اخبار جاری رہا لیکن دوسرے اڈیٹر پر بھی عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور اس کے چلے جانے کے بعد پرچہ بند ہو گیا مسٹر بنگلہم کی مالی حالت بالکل خراب ہو گئی اس نے پریوی کونسل میں اپنے معاملے متعلق ایک غیر جانبدارانہ تحقیقات کی درخواست دی کمیٹی مقرر ہوئی اور اس کی سفارشوں کی بموجب مسٹر بنگلہم کے نقصان کی تلافی بھی کر دی گئی، لیکن ہندوستان کی واپسی کی درخواست منظور نہ ہوئی۔

ایڈمس کی گورنمنٹ نے پریس کی آزادی کو محدود کرنے کے لئے مزید قاعدے بنائے لیکن نفاذ سے قبل انکی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں رجسٹری ہونا لازمی تھی سرفرائس میکناٹن نے جو اس وقت تنہا قائم مقام جج تھے شاکی جماعت کو اپنا محضر نامہ (میموریل) پیش کر کے اجازت دی مقررین میں پیش پیش راجہ رام موہن رائے تھے، دو عرضداشتیں پیش کی گئیں، دوسری عرضداشت کو جو بالعموم راجہ موصوف کے زور قلم کا نتیجہ سمجھی جاتی تھی مس کالیٹ نے ہندوستانی تاریخ کے ”ایریوٹیک ٹیکا“ کے نام سے موسوم کیا ہے سرفرائس نے جدید قواعد کی تائید کی اور مقررین کے خلاف فیصلہ دیا۔ راجہ مدروح اور ان کے حلیفوں نے شاہی دربار میں اپیل کی ان کا اپیل انگریزی مضمون نویسی کا ایک نادر نمونہ تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، راجہ رام موہن رائے نے احتجاجی طور پر ”مراۃ الاخبار“ کی ادارت بند کر دی ان کا یہ اقدام کلکتہ کے انگریزوں کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔

لارڈ ام ہرسٹ نے حکومت کی بالگور ناتھ میں لیتے ہی کمپنی کے ملازمین کو پبلک پریس سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی ممانعت کر دی لارڈ موصوف کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ان کے جانشین لارڈ ولیم ہٹنگ نے بھی وہی مروجہ طرز عمل اختیار کیا پریس کی آزادی اس سے زیادہ کبھی سلب نہیں ہوئی ہٹنگ کے مالی ضابطوں اور بالخصوص ”نصف بھتے“ کی منسوخی نے فوجیوں میں سخت غم و غصہ اور اشتعال پیدا کر دیا۔ مقالات کی بھرمار شروع ہو گئی اور بالآخر حکومت کو اسے زبردستی بند کرنا پڑا گورنر جنرل نے تمام اخبارات کے نام احکامات صادر کر دیے کہ ”بھتے“ کے مسئلہ پر مزید مضامین نہ قبول کیے جائیں کلکتہ جنرل کی ضبطی سے اڈیٹروں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور اس موضوع پر مزید مضامین نہیں نکلے۔

۱۹۳۵ء میں ہٹنگ کی جگہ سر چارلس ڈکاک گورنر جنرل ہوا، پریس کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام خاص طور پر قابل یادگار ہے اس نے احتساب و نظارت کو یک قلم منسوخ کر دیا اس خیال کا موجب لارڈ میکالے تھا جو ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پہلا مشیر قانونی (لاممبر) ہو کر آیا اور سر چارلس ڈکاک نے اس کو علی جامہ پہنایا اس واقعہ کی یادگار منانے کے لئے کلکتہ میں ایک عظیم الشان ہال طیارہ کرایا گیا اور اس کا نام ”ڈکاک ہال“ رکھا گیا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اس اقدام کو بہت ناپسند کیا گورنر جنرل کی کونسل کے بعض ممبروں کو شدید بریگنیاں تھیں، انگلستان میں دارالعوام کی رائے بھی ایسے اقدام کے قطعاً مخالف تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ایوان مذکور میں ہندوستانی پریس کی آزادی کے لئے بہت پرزور تقریریں ہوئی تھیں لیکن اب حالات بالکل بدل چکے تھے انگریزوں کو اپنے سامراجی مفاد ایک محکوم ملک میں آزاد پریس کے قیام کی بے آہنگی کا شعور بڑھتا جا رہا تھا آزاد پریس اور آزاد ادوار لازم و ملزوم چیزیں خیال کی جاتی تھیں۔

۱۹۵۷ء تک پریس آزاد رہے اس تاریخی سال میں ہندوستان کے افق پر بد امنی اور خوف و ہراس کے

بادل چھانے لگے فوجوں میں بغاوت شروع ہو گئی اور حکومت نے خطرات کی بوباس پاتے ہی پریس کو قابو میں لانے کے لئے فوری اقدامات شروع کر دیئے۔

۱۹۵۷ء کے ایکٹ ۱۵ نے بغیر لائسنس حاصل کئے ہوئے پریس کے قیام و استعمال کو ممنوع قرار دیا۔ حکومت اجازت نامہ دینے میں اختیارات تمیزی سے کام لیتی تھی حکومت کو حق تھا کہ جسوقت بھی وہ چاہے اجازت نامہ منسوخ کر دے اخباروں کی اشاعت کتاہیں یا کسی قسم کی اشتعال انگیز تحریر ممنوع قرار دی جاسکتی تھی۔ یہ ایکٹ ہندوستانی (ورنیکولر) اور انگریزی دونوں پریسوں کے لئے تھا یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اب تک ہندوستانی (ورنیکولر) اور انگریزی پریس میں کوئی امتیاز نہیں تھا ۱۹۵۷ء کے ایکٹ سے پریسوں کو جو آزادی ملی تھی وہ دونوں کے لئے یکساں تھی اسی طرح جب آزادی چھین لی گئی تب بھی دونوں یکساں طور پر متاثر ہوئے۔

پریس کی تاریخ اپنی اوایل عمر میں واقعات اور حادثات سے خالی تھی اس کے سن شعور کے پوپنچے تک اسمیر گونا گونیت اور مدوجزید پیدا ہونے لگا۔ لیکن اسوقت یہ دور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔
ذیل میں غیر آئینی دوسرے ان احکام و قوام کاغیمہ درج ہے جو اخبارات کے متعلق وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے۔

نمبر شمار	سال عیسوی نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۱)	۱۹۴۲-۸۶ لارڈ ہیڈنگ	اجازت نامہ	اجراء اخبار	۱۹۴۲ء میں بروئے رگولیشن ایکٹ گورنر جنرل عدالت عالیہ کا تقرر ہوا اس کے سات برس کے بعد حکومت نے اپنا گزٹ شایع کیا و نیز دواؤدو اخبارات انگریزوں نے جاری کئے۔ کوئی خاص حکم یا قانون نہ تھا۔	(۱) گورنمنٹ پنگال گزٹ ۱۹۴۰ (۲) کلکتہ گزٹ ۱۹۴۳ (۳) ہیکلی گزٹ ۱۹۴۰ (۴) ۱۹۴۵ء میں "ایٹس" ۱۹۴۵ء
(۲)	۱۹۸۶-۹۳ کارنوالس	"	"	+	لارڈ ہیڈنگ سمیر لڈ ۱۹۸۹ء و مبئی کو پریس ۱۹۹۰ء

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۳)	۱۷۹۳-۹۸ سر جان شور	احکام	ہر اخبار سرکاری طور پر پہلے معائنہ ہولیتا جاری نہ تھا اور کسی ہندوستانی نے کوئی اخبار جاری کیا تھا تب شائع کیا جاسکتا تھا بصورتہ الاملیان مغرب اخبارات جاری خلاف ورزی سزا کر رہے تھے۔ انگریزوں کے سامنے جلا وطنی تھی۔	اس وقت تک کوئی اخبار ملکی زبان میں جاری نہ تھا اور کسی ہندوستانی نے کوئی اخبار جاری کیا تھا تب شائع کیا جاسکتا تھا بصورتہ الاملیان مغرب اخبارات جاری خلاف ورزی سزا کر رہے تھے۔ انگریزوں کے سامنے جلا وطنی تھی۔	۹۹-۹۱ تک متعدد انگریزوں نے اہل یورپ ہندوستان سے ہرگز نہ لکھے کسی سرکاری عملہ یا ملازم کے متعلق کوئی تنقید یا اعتراض جرم سمجھا جاتا تھا۔ بغیر کسی باضابطہ مقدمہ کے سرائیں دیجاتی تھیں۔
(۴)	۱۷۹۹-۱۸۰۴ ولزلی	"	"	تھیں (۱) نیپولین ہندوستان چلے کرنے کا ارادہ کر رہا تھا نیپولین سلطان افغانستان سے نیپولین کی اعانت کے خطرات تھے جو ۱۷۹۹ء میں کم ہوئے۔ (۲) تیسری مرتبہ جنگ بھی چھڑ گئی تھی جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی	تھیں (۱) نیپولین ہندوستان چلے کرنے کا ارادہ کر رہا تھا نیپولین سلطان افغانستان سے نیپولین کی اعانت کے خطرات تھے جو ۱۷۹۹ء میں کم ہوئے۔ (۲) تیسری مرتبہ جنگ بھی چھڑ گئی تھی جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی
(۵)	۱۸۱۸-۱۸۲۳ مارکوس ٹیڈنگ	"	سر جان شور و ولزلی کے زمانہ میں جو سخت قوانین تھے وہ منسوخ کر دیے گئے۔	نیپولین کی شکست و اثر ۱۸۱۵ء کے بعد کوئی بیرونی حملہ کا خدشہ باقی نہیں رہ گیا تھا اور ہندوستانیوں سے کسی قسم کا خطرہ اس وقت تک نہیں تھا اس لئے اب ولزلی کے وضع کردہ قوانین کی ضرورت نہ تھی۔	(۱) ۱۸۱۵ء بنگالی زبان میں پہلا اخبار سماچار درپن جاری ہوا جسکی ادارت ایک مسیحی شہری کے ہاتھوں میں تھی مقام اشاعت سیرام پور۔ (۲) ۱۸۲۳ء میں پہلا ہندوستانی اخبار ایک ہندوستانی کی زبرداری سے جاری ہوا متعذر نامی بیٹی سے جاری ہوا متعذر دیگر انگریزوں نے بھی اخبارات جاری کئے۔

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جنہیں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۶)	۱۸۲۰ء ایڈم	خاص حکم	سلک کلنگم نامی ایک سولیس پیرمضامیں	ایڈم نے چند ہندوؤں تک بحالت غیر موجودگی لارڈ ہسٹنگس کی قائم مقامی کی تھی۔	
(۷)	۱۸۲۳-۲۸ لارڈ الیگزینڈر	احکام	ہسٹنگس کے قوانین احکام کی تقلید	۱۸۲۳ء میں لارڈ ہسٹنگس پہلے گورنر جنرل ہندوستان کے تسلیم کئے گئے اور بعض مشورہ ایک کونسل قائم کی گئی۔	
(۸)	۱۸۲۸-۳۳ ولیم ہسٹنگ	"	چونکہ اس وقت میں کوئی لڑائی جنگ بدلتی تھی اسلئے اس کی اصلاح کی جاتی تھی ہندوؤں کی لڑائی نہیں لڑ کر وراثت قوانین منسوخ کئے گئے	۱۸۳۵ء میں بیوی ٹائٹس جاری ہوا	
(۹)	۱۸۳۵ لارڈ ڈیکلن	"	اخبارات مطابقت کیلئے یہ دو مطالب کیلئے دو کتاویں کھاجاتا نہایت بہت افزائی ہے ایک سال کے دوران حکومت میں ٹیکس احکام صادر ہوئے	۱۸۳۵-۵۴ تک کوئی خاص حکم یا قانون مطابقت اخبار کے متعلق جاری نہیں ہوئے لارڈ ڈیکلن کی بہت افزائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً تمام بڑے شہروں میں ششماہی، آگہ و کوالیہر ولاہور میں اخبارات جاری ہو گئے۔ برس کے متعلق پہلا قانون تھا جو حکومت نے جاری کیا۔ اس کے پہلے بعض احکام و ریگولیشن سے کام لیا گیا۔ گیسٹنگ ایکٹ صرف ایک سال تک جاری رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ غدر کے بعد انگریزوں نے جو سزا دی کی صورتیں اختیار کیں وہ اس قدر برعبرت تھیں کہ ان کی صورتیں ہندوستانیوں کے دلوں پرانے کا رعب و خوف قائم رہا۔ بعد اختتام غدر ہندوؤں نے مسلمان اخبارات میں اس کا مظاہرہ کیا کہ کون حکومت کا زیادہ وفادار اور کارسلیں بچا سکتے کسی خاص قانون کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی	
(۱۰)					
(۱۱)	۱۸۵۸ لارڈ کیننگ	گیسٹنگ ایکٹ	زبان بندی	۱۸۵۷ء میں سلاہ کی فوج محسوس ہوئی کہ عوام میں غدارانہ سائل باخیاہ مضامین نے اشاعت کر دی اس لئے قانون جاری کیا گیا۔	

(نوٹ) غبرائیمید اصل مضمون میں نہیں تھا۔ میں نے اس کو ذاتی محنت و تلاش سے فراہم کیا ہے۔ غیر ترجمہ زیادہ تر آزاد ہے۔

مسٹر او۔ پی۔ بھٹناگر۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی۔
مترجمہ: سید محمد عبد العظیم ہاشمی۔ غازی پور

مکتوبات نیاز

بندہ نواز ، آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ، لیکن
غنیۃ الماشفقین با برک عافیت معلوم !
میں آپ کے احکام کی تعمیل فرض جانتا ہوں ، لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کے اور فرایض مجھ سے کب ادا ہوتے
ہیں کہ یہ ادا ہو سکے گا

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری ”طبع اندو گیس“ نے بہت سے احباب مجھ سے جدا کر دئے ہیں اور ہو سکتا ہے
کہ میرا یہ جواب آپ کو بھی مجھ سے متنفر کر دے۔ آپ کی محبت کی جو عظمت میرے دل میں ہے ، اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ بغیر
کسی پس و پیش کے آپ کے فرمان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتا ، لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ذات سے دشمنی
بھی تو ہے اور وہ شاید آپ کی محبت سے زیادہ دیرینہ سال ہے۔ پھر وہ شخص جس نے خود کشی پر کمر باندھ لی ہو اسکی
جان آپ کہاں تک بچائیں گے

در بغل دخت نہاں ساختہ غائب امروز

گزارید نہیں ، بلکہ ————— گزارید کہ مازودہ تنہا ماند !

معاف فرمائیے ، آپ جس زاویہ سے دنیا کا مطالعہ کر رہے ہیں ، وہ میرے زاویہ نگاہ سے بہت مختلف ہے
آپ کا زاویہ حادثہ ہے یا منفرد ، یا ————— اور میرا مستقیم ————— یعنی یا تو آپ تقریباً
سے کام لیکر فشار کی انتہا کر دیں گے یا افراط کو نہ نظر رکھ کر حقیقت سے بھی روگردانی کر لیں گے لیکن میرے یہاں تو وہی
ایک ۹۰ ڈگری والی نگاہ ہے۔ یعنی پہلے ایک رائے قائم کرنا اور پھر اسی کو سامنے رکھ کر سیدھا راستہ اختیار کر لینا ،
خواہ وہ حرکتان جاتا ہو یا عربستان ! بالکل اسی قسم کا اختلاف میرے آپ کے درمیان اس معاملہ خاص
میں بھی ہے۔ آپ چھان بین کی اس منزل پر ہیں جہاں ”سوائے“ ”کر کرنا“ کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا ، میں فطرت انسانی
کی لغزشوں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ سادہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ کی رائے میں وہ اصلاح کی حد

سے گزرتے ہیں جس سے میں متفق نہیں، تو بیشک مجبوری ہے، اور اس صورت میں مجھ سے کیا، سقراط و افلاطون سے بھی رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار اور غور کر لیجئے اور یہ سمجھ کر کہ انسان کی تمام تمنائیں پوری نہیں ہوا کرتیں اور پوری ہو بھی جائیں تو کوئی لطف نہیں !

کیا خوب ! آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھ سے ایک دن کی تاخیر ہو جائے تو میں نامعقول و بدتمیز، لیکن آپ میرے خط کا جواب کبھی نہ دیں تو آپ بدستور معقول و خوش تمیز بنے رہیں۔ کیا جو نپور میں اسی قسم کی نطق پڑھائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کے قاضی اسی قسم کے استدلال سے مشہور ہوئے تھے !

میں جانتا ہوں کہ آپ کا خط، کوئی تفریحی چیز نہ تھی کہ میں اسے نہس کر ڈال دیتا، بلکہ کاروبار سے متعلق تھا، آپ کی زندگی کی اس منزل سے تعلق رکھتا تھا، جس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کی تحقیق کے لئے مجھے کچھ وقت تو ملنا چاہئے تھا۔

خیر، یہ تو جواب تھا آپ کی فحاشی کا، اب اصل معاملہ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اول تو ان سے کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکی، باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کل واپس آئے تو گفتگو ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے آپ کی پیشکش کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا، لیکن جب میں نے تمام اعداد و شمار دکھائے تو انھوں نے مشکل وعدہ کیا کہ وہ خود جا کر دیکھیں گے۔ اسلئے اب آپ ان کی آمد کا انتظار کیجئے۔ تاریخ کی تعیین انھوں نے ابھی تک نہیں کی ہے، لیکن میں ان سے پوچھ کر آپ کو مطلع کروں گا۔ جلدی نہ کیجئے ورنہ وہ بھڑک جائیں گے، نہایت سخت قسم کے ”گرگ باران دیدہ“ انسان ہیں۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ کل کی خبر نہیں کیا ہو گا۔ آپ کو خبر نہ ہو، مجھے تو ہے۔ صبح سورج نکلے گا اور شام کو ڈوب جائیگا۔ اسی کا نام کل تھا، اسی کا نام آج ہے اور اسی کو فردا کہیں گے ! آپ کا ریشمی گدول پر سونا، میرا بوریر پر کروٹیں ملنا ان دونوں میں کوئی چیز اس نظام کو بدل نہیں سکتی، جو آفتاب صبح کو طلوع ہوا ہے وہ شام کو غروب ضرور ہو گا اور دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔

آپ دنیا کو اپنے نقطہ نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ آپ اس کی پوری کروی حیثیت کو سامنے رکھئے، جب تک ہم زندہ ہیں اس کے ساتھ گردش کرتے رہیں گے، ہمارے بعد جو آئیں گے وہ اسی چکر میں رہیں گے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ”ہیم ورجا“ کی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو جاتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ عمل محض عمل کے لحاظ سے خود اپنی جگہ زندگی کا ثبوت ہے۔ یعنی اگر دم آنکھوں میں ہو تو بھی ”ساغو وینا“ کو سامنے رہنا چاہئے۔ یہ تو آپ کی پہلی بات کا جواب ہوا اب دوسری بات لیجئے۔ آپ نے مسلم لیگ کی جس بڑی ہستی کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا کہ جو کچھ وہ

کہتا ہے اسے نہ سنئے، بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسے دیکھئے۔ زبان پر نعرہ آزادی اور ہاتھ میں برطانوی دامن لب پر ذکرِ پاک یزداں اور دل میں اہرن!

پھر جناب یہ شراب تو ہے نہیں کہ ”یا غفور“ کہہ کر آپ چڑھا جائیں اور کام چل جائے۔ یہ معاملہ دارورسن کا ہے جہاں ”انا الحق“ کہے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔

محمدؐ نے آزادی کا تخم بویا علیؑ نے اسے پردان چڑھایا لیکن آج محمد علی (دھینا) کے نزدیک اس کی حیثیت ”سم قند و بخارا“ سے بھی کم ہے کہ بجائے ”خال ہندو“ کے ”زلزلہ چلیپا“ پر قربان کر دینے کے لئے طیارہ ہے!۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس واقعہ کو تاریخ اسلام میں بھی شامل کیا جائے گا اور ان بردہ فروشوں پر آپ کی اولاد مغرب بھی کرے گی! معاذ اللہ!

کیا پوچھتے ہو ان کا کیا عالم ہے

رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے!

آپ کا پیام سنکر منس پڑے، لیکن ایک ایسی سوگوار سنہی کے ساتھ کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہیں! میں نے زیادہ گفتگو مناسب نہیں سمجھی، لیکن سنا میں نے بھی یہی ہے کہ تعلقات کی نزاکت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ صورت - ”دل گرفتار دیار بے پروا“ کی تو نہیں ہے، تاہم - ”دیر سے دست کہ خاطرش بجا نیست“ ابھی دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔

خدا کے لئے کبھی تو کوئی غلطی کیا کرو۔ آخر انسان ہو خدا تو نہیں ہو۔ پھر اس ہوشیاری و چالاکی کے کیا معنی! سچ کہتا ہوں، بعض وقت یہ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ نہ میں تم کو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں، نہ تم کسی کی مان سکتے ہو آئینہ میں ذرا اپنی صورت تو دیکھو، کیسی ”روڑھی“ ہوتی جاتی ہے۔ حائقوں کے ”بھولے پن“ کا کوسوں پتہ نہیں ہر وقت تمہارے چہرہ سے ایک ایسے خطہ کا سا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے دشمن کے ہوائی جہاز ہم پر سانے ہی والے ہوں۔ لاجول ولاقوۃ! یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے کہ انسان کسی کے دھوکے میں آئے، نہ کوئی اسے بیوقوف بناسکے۔

بولو، کب آؤ گے۔ واقعی مجھے تمہاری ضرورت ہے، میں جھوٹ نہیں بولتا اور بولوں بھی تو کس توقع پر؟

جناب من - جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے، تو غالب ہی کا سہی۔ بہر حال جس کا بھی ہو، بالکل لغو و مہمل ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ کچھ پوچھا نہیں، اس لئے تفصیل میں کیوں پڑوں اور آپ پوچھیں بھی تو میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا کہ مہمل ہے اور بلا دلیل مہمل ہے۔ خدا کے لئے کوئی اور مشغلہ اختیار کیجئے، یہ بالکل ذوق کی چیز ہے اور آپ منطق سے کام لیتے ہیں۔ عاقبت خراب ہونے کا تو اندیشہ نہیں، لیکن دماغ خراب ہو جانے کا ضرور ہے۔

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علاحدہ علاحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہریں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
۱۰ روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معجزہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان گل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	تائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

سوق الکساد — علیٰ ہذا القیاس

(مولانا ابوالکمال امید امیٹھوی)

مُشتري کو، جو ہری کو اندر میں سوق الکساد

ہست بیجا مسل کہ دہشا ہوارم کردہ اند

۱۔ شعر مندرجہ عنوان میں ”سوق الکساد“ کی ترکیب ایک معترض کے نزدیک محل نظر اور غلط ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ صفت موصوف میں مطابقت ہونا چاہئے اور یہاں نہیں ہے، یعنی اسے ”السوق الکساد“ ہونا چاہئے۔ الٹ لام سوق پر بھی داخل ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے، بلکہ ترکیب اضافی ہے، سوق مضاف، کساد مضاف الیہ۔

۲۔ یہی علامہ عصر ”علیٰ ہذا القیاس“ کے اطلاق کو بھی صحیح جانتا ہے اور دوسرے الٹ کو غیر فروری سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح ”علیٰ ہذا القیاس“ ہے۔

براہ نوازش استفسارات کے سلسلہ میں جواب تحریر فرمائے اور مثالیں مع دلیل بیان فرمائیے، تاکہ طریق مستفید ہو سکیں۔
مکن تھا کہ میں زبانی آپ سے اس مسئلہ کو حل کر لیتا لیکن اس صورت میں معترض مطمئن نہ ہوتا۔

(ننگار) ”سوق الکساد“ صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے بلکہ کھلی ہوئی ترکیب اضافی ہے۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہوتی تو ”سوق کاسد“ یا ”السوق الکاسد“ ہوتی۔ یہاں تو کساد بھی اسم ہے اور سوق بھی اسم۔

ہر چند شعراء فارسی نے "کساد" کو کبھی کبھی "کاسد" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ظہوری کہتا ہے:
شوقت نبرد بہ کارِ مادِ دست
بازارِ رفوگراں کسادِ دست
سن بہ حالت ترکیب کساد، کاسد کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

عربی میں صفت و موصوف کے ساتھ الف لام کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ یا تو دونوں پر الف لام ہوگا جیسے
ت المرأة الحشاء (میں نے ایک خوبصورت عورت دیکھی) یا کسی پر نہیں جیسے "جاؤنی بجل قبیح" میرے پاس ایک
عورت مرد آیا۔

ترکیب اضافی میں مضاف پر کبھی الف لام داخل ہوگا اور مضاف الیہ معرفت بہ لام بھی ہو سکتا ہے، جیسے:
قاعین (آئینہ کی سُرخ) اور فرس زید (زید کا گھوڑا) لیکن فارسی والے اس کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے
اخاقانی کا شعر ہے:

دنیاست کینہ چاکرانش، در دارالحکم داوراننش،
اور شاعر کہتا ہے:

منت خدائے را کہ علی الرغم روزگار منصور گشت رایت خان بزرگوار

یہ شعر میں حکم اور دوسرے شعر میں رغم مضاف ہے، لیکن الف لام دونوں پر داخل ہے۔ بات یہ ہے کہ
دونوں شعروں میں پورے کلمہ مرکب کو کلمہ واحد خیال کر لیا گیا ہے، یعنی "دارالحکم" اور "علی الرغم" دونوں کو
کلمہ یا لفظ خیال کر کے مضاف بنایا گیا ہے اور اس لئے مضاف پر الف لام داخل کرنے کا اعتراض دئے ہو گیا۔
گو اس کا تعلق مثلاً زیر بحث سے نہیں لیکن میں نے اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ آپ کا معرض الف لام کے
میں بہت زیادہ سخت گیر معلوم ہوتا ہے، مبادادہ فارسی کی اس قسم کی ترکیبوں پر بھی آئندہ اعتراض کی
ت کرے۔

الغرض "سوق الکساد" کی ترکیب بالکل صحیح ہے اور معرض نے یا تو غلطی سے کساد کے معنی کا سد سمجھ کر
وصفت و موصوف قرار دیا یا سرے سے وہ اس ترکیب کو سمجھے ہی نہیں۔

"سوق الکساد" کی ترکیب بالکل ایسی ہی ہے جیسے "نارالحب" (محبت کی آگ) اور اگر یہ صحیح ہے تو اسے
صحیح ہونا چاہئے۔ چند مثالیں عربی شعراء کے کلام سے ملاحظہ ہوں:

صلاح الدین لکھتا ہے:

یکفیک من ہولہ ان لست تبلغ الا اذا ذقت طعم الموت فی السفر

ت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو اس کے ہول کا خیال بھی نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تو سفر میں موت کا مزہ چکھے

اسی کا ایک شعر اور ہے :

واذا رايت بينك فاعلم انهم قطعوا ابيك مسافة الآجال
(جب تو اپنی اولاد کو دیکھے تو جان لے کہ انھوں نے موت کا راستہ تیری طرف بنا دیا ہے)
ابن لیح لکھتا ہے :

طويت سماء المکرما ت وکورت شمس المديح
(انعام و اکرام کے آسمان لپیٹ دے گئے اور مدح و ثناء کا آفتاب تاریک ہو گیا)
ایک اور شاعر السجادی کا شعر ہے :

ومن العجائب انی فی لج بحرا لجود راکب
(عجیب بات دیکھو کہ میں دریائے جود و کرم پہ چلا جا رہا ہوں)
ابو المنظر محمد الدین کا شعر ہے :

لم القہذ تصابنا فحين بدا ، لنا ظری افترقنا فرقة الابد
(جب تک ہم وہ ساتھ ساتھ رہے کبھی میں نے اسے نہ دیکھا لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے)

ان اشعار میں طعم الموت (موت کا مزہ) مسافة الآجال (موت کا راستہ) - سماء المکرما ت (انعام و اکرام کا آسمان) اور بحر الجود (عطا و بخشش کا سمندر) - فرقة الابد (ہمیشہ کی جدائی) یہ سب ترکیبیں سوق الکسادی کی قسم کی ہیں اور عربی میں بہ کثرت مستعمل ہیں -

۲ - علیٰ ہذا القیاس کا صحیح اطلاق وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں، یقیناً درمیان میں دو الٹ ہونا چاہئے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ اگر بجائے ہذا کے ”ہذہ“ ہو تو کیا وہ ہذا کی طرح ہذہ کی (لا) کو بھی اُڑا دیں گے اور اسے بھی علیٰ ہذا القیاس لکھیں گے۔

الغرض آپ کا معرض دونوں باتوں میں غلطی پر ہے۔ انشاء بھی غلط، اطلاق بھی غلط !

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

منیجر نگار لکھنؤ

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر - قیمت مہ محصول ۱۱۱ -

کلام ماہر لکھنوی

(مسلل)

تصوف - ماہر کے کلام میں متصوفانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

حُسنِ قدرت کا تری جو جلوہ گرتن میں مرے ہوں ترا عاشق جو اپنا آپ ہی دیوانہ ہوں
 جو آئینہ ہے وہ ترا صورتِ نا نہیں لیکتا وہ تو ہے جس کا کہیں دوسرا نہیں،
 دمام تشنہ عرفان کر دگار رہا وہ مست ہوں کہ جو غفلت میں ہوشیار رہا
 کیوں نہ فرقت میں بھی اب لطفِ لیں صلیتِ دل وہ پہلو میں ہے جس میں ہو محبت تیری
 کس کس حجاب میں نظر آیا جمالِ دوست کیا حُسن ہے حجاب میں دیدار عام ہے
 کس طرح کہدوں یہ میں عشاقِ وحدتِ بانے تھے کوئی صدا بھی تو تری آواز سے
 دکھیں بشو چشمِ بصیرت سے اک ذرا ہر رگ دکھائے معرفت حق کی راہ کو
 رنگِ صانع کا ہر اک گل سے نمایاں دیکھا سبز باغ کو خضرِ عرفاں دیکھا
 باغ سے صنعتِ صانع کو نمایاں دیکھا ہر رگ گل کو رہ منزلِ عرفاں دیکھا
 جو دیکھتے ہیں تامل سے ہر رگ تن کو وہ راہ معرفت کر دگار سمجھے ہیں
 نہاں وہ نظروں سے سمجھے ہیچ کہینا ہیں وہ کو رہیں جو تجھے آشکار سمجھے ہیں
 ہے تعدد بھی بتوں کا اُسکی وحدت کی دلیل کب خدائی کا سماں دیر پرہمن میں نہیں

مذہبی عقیدت - ماہر نے اکثر اشعار میں اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مرسلوں میں بھی دمِ حشرِ نعل ہے تر عرش سب ہمیں امتِ محبوبِ خدا آتی ہے
 نبی دیکوں خم ہوں مثلِ خام اٹھائے ہیں سرِ تاجِ عالم کیوں تو وضع سے ہوں کرمِ نشانِ پوشتِ پائیں کا
 میں نے کسے کسے اک سیر کیا کروں ماہر جہاں میں خاکِ درِ بو تراب باقی ہے
 ماہر کو قبرِ پستی ہے یا ابو تراب جلد آئے فشار ہوا استخواں جلے

بنے ہیں دیدہ ہائے منتظر نقش قدم ماہر نہیں بھی ہے یہ شایق جہدی ہادی کے مقدم کی وسعت تحمیل۔ یہی وہ انفرادی رنگ ہے جس کا نمایاں طور پر ماہر کے کلام میں مظاہرہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف اور متنوع اشیاء پر مختلف طرح سے نظر کی ہے اور اُس کے جدا گانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اُس سے برقعوں نتائج پیدا کئے ہیں۔

یوں تو بہت سے شعراء کے کلام میں جیسے جیسے اس طرح کا نمونہ ملتا ہے لیکن جس وسعت اور تجزیہ و تنوع کے ساتھ ماہر نے ہر شے کو دیکھا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

پہلو جن پر وہ نظر ڈالتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اخلاقی، فلسفی، نفسیاتی اور بعض بالکل شاعرانہ اور اسی میں تشبیہات کا ایک خزانہ ہے جو بڑی قیاسی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے۔ میں اُن اشیاء کو محروم نہجی کی ترتیب سے درج کروں گا اور اُن میں سے ہر ہر پہلو کے متعلقہ اشعار کو الگ الگ پیش کروں گا۔

(۱) آبلہ: مثال آبلہ ادنیٰ کے دکھ سے دکھ ہے مجھے دے جو پاؤں سے کاٹنا کٹشک سی سر میں ہے

کہتا ہوں یہ تپک پہ ہر اک آبلہ کی میں دل نلنے دینگا اس مرے پروردگار دل

عجب نہیں اس اشارے سے وہ چلے آئیں تپک کے بلاتا ہے آبلہ دل کا

خار ہائے دشت سے کہد و کہیں گے کب خبر آبلے بھی میٹھے جاتے ہیں مرے دل کی طرح

دشت و دشت نے بٹایا درد جب میر لکھی آبلے پاک، بنے چھالے زبان خار میں

وحشی نخل ہیں پاؤں جو گھر سے نکال کے شیشے ہیں آبلے عرق انفعال کے

(۲) آسیا: نہ جاصداے فخران آسیا خو پر یہ جتنا سیر ہوں اتنا سوال کرتے ہیں

مستحق جان نہ تو سائل سرگرداں کو آسیا کا جو بھرے پیٹ تو چکر میں رہے

میں سخت جاں قریب سوا آسیا سے کیا کوئی مرض نہیں ہے تو دودان سر تو ہو،

(۳) آشیاں: نظر گلچیں کی کیوں پڑتی اُجڑا کیوں مکان میرا چھپا لیتے جو برگ نخل ملکر آسشیاں میرا

وہیں سب ہنزاں ہیں، ہو رہا کچھ بیاں میرا چمن میں جس طرت اُجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

ہوا پر دیکھ کر تنکے افسس میں میں یہ کہتا ہوں کدھر ہو باغ والو، لٹ، رہا ہے آشیاں میرا

افسس میں میں ہوں ان پھول بھری شاخیں گلستاں غرض میرے لگاتی ہیں گلے سے آشیاں میرا

صیاد کچھ تو اہل قفس کا نشان رہے ہم ہوں نہ ہوں چمن میں مگر آشیاں رہے

اُسی کو ہوش میں دیکھا اُجڑے آنکھوں سے جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کے لئے

(۴) آفتاب: طلسم تھا کہ شعاعوں میں آفتاب آیا ہزار ہاتھ پہ اک ساغر شراب آیا

کیوں شفق گول ہونے لگ حسن باغ آفتاب
ہیں شعاعیں یا ٹکڑے ہوں میں پے جاتی ہو شمع
دیر سے اپنے درخت نازک کبھی کو لے شعاع
خوشبو کی طرح ہر تہق میں جو داغ ہوں
وہ محو خواب نہ ہیں، نکلا ہے آفتاب
سائے میں میرے خلق کو شکل قیام ہے
دکھلا رہا ہے آئینہ گردوں سحر نہیں

یہاں عربی کا یہ مصرع یاد کر لیجئے :-
والشمس کالمراة فی کف الاشمل

(۵) آئینہ: جو ہر سے آئینوں کا کیجی نگار ہے
اٹ رہے جذب دل اُتر آئی شبیہ دوست
آئینہ سائے رکھ کر بھی کھلا کچھ نہ تھیں،
آئینہ لیکے باتھ میں غیروں پہ طعن ہے
صاف کر قلب تو ہونیک میں وسعت تجھ کو
آئینہ لیکے بھی بڑھتی نہیں حیرت تیری
اُن کو جب ہوتی ہے منظور نظر خود بینی
(۶) اسپند: مثل اسپند بھی دی دل نے نہ آواز مجھے
ایک نالہ نے فنا مجھ کو کیا مثل سپند
مرد غیروں کے لئے دل کو جلا دیتے ہیں
(۷) اشک: اشکوں سے کچھ سکون ہے نہ کچھ پرگناہ کو
کس طرح رونے میں لے رہا ہوں دکھوں رونے دوست
کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو
کاندھا برتے آتے ہیں آنسو بھی سوئے چشم
بیجاں کریں گے عشق میں اشک رواں کجے
اشک ہر ایک مثال در غلطاں نکلا،
آہ دل سے جوش اشک چشم حیراں ہو گیا
مرے دامن کو نگین شک خوں سکودت ہو دیں
امنڈ آئے ہیں میری آنکھوں میں آنسو
حبابوں سے دریا بہا چاہتے ہیں،

- (۸) اگر: ڈھل آئے ہیں آنکھوں سے مڑگاں پہ آنسو جہازوں کے ٹنگر پڑا چاہتے ہیں
 وہی ٹکے ہیں بنگر اشکبا سائے سرمہ آلودہ بھرے تھے کوثر موتی جواں کی چشم جادو میں
 تری مڑگاں نے کچھ ڈھلکا کے اشک سرمہ لکڑ لگایا قفل بھی طرف طلسم چشم جادو میں
 جیسے جلتا ہے اگر پردہ خاکستریں چپکے چپکے یوہیں جلاتے ہیں جلنے والے
 وہ سلامت رہیں یا رب کہ اگر کی صورت دفن جو مجھ کو مری خاک میں کر دیتے ہیں،
 (۹) برق: ابر میں برق کی یہ جلوہ گری کہتی سب کوئی بے چین ہے پردہ سے ٹککنے کے لئے
 (۱۰) بگولہ: کیا ہوا سائے فقیروں کی جو تربت پر نہیں، سر بولا گنبد رگوں غریباں ہو گیا
 دھوپ میں دشت نور دی کو جو نکلے دشتی کھو لکر چتر بگولے سر منزل ٹھہرے
 مجھ سے دشتی کا جنازہ جو اٹھا صحرا میں کاندھا دینے کو بگولے سر منزل ٹھہرے
 بگولے پیچھے ہیں سر کو کھولے جنازہ آگے سب نجد حزیں کا،
 (۱۱) یو: چمن دہر میں جمعیت خاطر ہے کسے بوئے گل کو بھی جو دیکھا تو پریشاں دیکھا
 برنگ بوہوں نہ پوچھو مرے سفر کا حال ہوا جدھر کی چلی اُس طرف روانہ ہوا
 ظاہر ہو کی طرح غیر سے بازو میں قومی جنبش موج ہوا سب پر پرداز مجھے
 زور بازو نے کیا تھا بوئے غنچ جب مجھے سونفیں تھے پر نہ اک بھی مانع پرواز تھا
 (۱۲) پرکار: جامع مقام و کوچ کا پہ کار دار ہوں اک پاؤں ہے حصہ میں مرا اک سفر میں ہے
 (۱۳) پیری: بڑھاپا آستے ہی بیگانہ سر ینگانہ ہوا سحر طلوع ہوئی قافلہ روانہ ہوا
 فصل پیری میں کیوں نہ ہو دھڑکن دل میں یہ ماتم جو انی ہے
 تصویر انقلاب زمانہ ہوں شب میں پاؤں میں ہے سکون حرکت جبے سر میں ہے
 تاثیر شمع عالم پیری کو دیکھتے سایہ بھی بے عسائے جلا ہم جہاں چلے
 تکلیف عدم جلنے کی جب کرتی ہے پیری کس عجز سے کرتا ہوں نہیں سر کو ہلائے
 پیری میں روؤں کو نسے عضو بدن کو میں دل مرچکا ہے آنکھ کا لبریز جام سے
 شب شباب کٹی خوف روز پیری میں تمام رات ہم اندیشہ سحر میں رہے
 بحث ہونڈر کب جس میں کاکہ پیری آئی شباب گزرا سلاوہ ناز و اداس کیا وہ میں نہیں ہوں دل اندیش
 عروق پیری میں جوعیان ہوئے انھیں میں دنیا کے ہم نہاں میں کہاں انھوں نے جھریاں میں ہزار میں اک تیس ہے
 سب پہل بسیں گی دل سے بڑھاپے میں ستریں ٹکلی کا قافلہ بھی سراسر تو ہو،

- (۱۴) تسبیح: حال رشتہ کا سر تسبیح سے آخر کھلا کیوں نہ آنا اک زباں پر سو دلوں میں راز تھا
 کہتے ہیں پھر کے دائرہ تسبیح وقت ذکر کچھ ہونہ نکلے ہاتھ سے دل انقلاب میں
 گزریں تسبیح کا ہوں دائرہ جو اسکو کھونا تو اسکو پانا ہزار پھرا ہزار ناز نراقی دیکھا نہ ہمنشیں کا
 صورت دائرہ تسبیح رہے گردش میں گو سفر ہم نے کیا پر نہ وطن سے نکلے
 صفت دائرہ تسبیح ہوں، کیونکر ہو سکون چین اُس ہاتھ سے پاؤں تو مراد دل ٹھہریں
 (۱۵) تصویر: کوئی خود دار مصور سے کھنچا بیٹھا ہے اب نہ کاغذ پر گرے عکس تو کچھ دور نہیں
 انکی تصویر کا کیوں رنگ نہ رہے کے اڑے نچلے بیٹھیں کہیں بے چین یہ دست و نہیں
 ضعف سے ہوں ہم تن صورت تصویر ضعیف رنگ کے ساتھ خود اڑ جاؤں تو کچھ دور نہیں
 جن کی تصویر میرے پاس ہے ہمد و اُن سے آپ ہی اپنے سے تم دور ہو، ہم دور نہیں
 تصویر کھنچ رہی ہے، نزاکت میں مست ہیں کھنچ کر چلے کہاں سے کہاں کچھ غیب نہیں
 ملے ہیں آج بے قابو جو وہ نقیر سے رنگ کیا کیا کر رہے شوخیاں تصویر سے
 خود بھی تصویر بنے ہو، یہ تماشا کیا ہے منہ اترتا ہی چلا جاتا ہے، نقشہ کیا ہے
 مرغ تصویر ہوں پونچھو: مری حسرت کو پر تو ہیں بھی مگر آتی نہیں پر واز مجھے
 (۱۶) تلک: داہ کیا خوب ہوا ختم سفر مشل تلک ہمیں باقی نہ رہے جب سر منزل ٹھہریں
 (۱۷) چادو: خاکساروں کا سلوک اعجاز سے خالی نہیں بے پلے چادو رہا ہمارا ہی رہ گیا میں
 ہے کون مجھ غریب کی لے آ کے جو خبر پھیلائے پاؤں سوتے ہیں جانے بھی راہ میں
 سیراب آہوں سے: کس طرح میں کروں چادو زبان خشک دکھاتے ہیں راہ میں
 غربت ہماری ہے، صفت چادو طریق صحرا میں جا کے بھی قدم اپنا وطن میں ہے
 کس نے تھک کر راہ کو دیکھا تھا بستم یاں سے صورت مدنگ ہر چادو منزل میں ہے
 (۱۸) جرس: حبش لب ہے نالاں جرس راہ میں، کوئی قافلہ سے جدا ہو گیا،
 (۱۹) جگنو: بعد مردن فصل باران کا یہ احساں ہو گیا، جگنوؤں سے قبر پر میری چراغاں ہو گیا،
 ذرا سے سن میں وہ ترجیح کس کے حسن کو دیں فلک پہنچ ہیں، جگنو ہیں اُن کے بستر پر
 (۲۰) حباب: دیکھ مٹ جائے گام میں تیر حبابوں کی طرح بحر عالم میں جو سر بھولے سے بھی اٹھ جائے گا
 حباب آسا فلک کے دور میں مٹ کر یہ کہتا ہوں کسی کا ذکر کیا ملتا نہیں مجھ کو نشان میرا
 حباب بحر ہوں پونچھو نہ مجھ سے حال قسمت کا یہ گردش ہے کہ میرے ساتھ پھرتا ہے مکان میرا

ہوائے منزوی خانہ حباب ہوں میں رہے گا گھر بھی نہ باقی جو میں روانہ ہوا
 بحر جہاں میں ہوں میں ہوائے نہ حباب گر میں نہ ہوں تو گھر کا بھی میرے نشان نہ ہو
 جب بلند اپنا ہوا نام و نشان آپ سے آپ بنگیا مثل حبابوں کے مکاں آپ سے آپ
 جب کچھ کھلا نہ حال طلسمات دہر کا موجیں کلید بن گئیں قفل حباب میں
 یہ حباب آگے سر آب خبر دیتے ہیں دم جو لیتے ہیں زمانہ میں وہ سردیتے ہیں
 مسکن کسی کا مثل حباب رواں نہ ہو نکلے بدن سے سانس تو گھر کا نشان نہ ہو
 رواں روی کا جو غل تا بہ گوش آتا ہے حباب بحر میں خانہ بدوش آتا ہے
 آگے موجوں نے حبابوں کو طغیہ مارا اُن کا انجام یہ ہے جگہ ہوا سہریں رہے
 دم بخود کیوں نہ رہوں دہر میں مانند حباب سانس لیتا ہوں تو دم تن سے فنا ہوتا ہے

ع-ن

(باقی)

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زمین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ)
 یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲/-
 دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید
 ہے۔ از جی۔ سی کمار پاتا صاحب۔ قیمت ۲/-
 ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زمین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے
 (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے
 وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳/-
 شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و
 شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے
 جن سے اُن کی زندگی بالستہ ہے۔ قیمت ۳/-
 مینجر نگار۔ لکھنؤ

تنوعات

روس میں کچھلی دفعہ سالانہ پریڈ کے وقت ہر سائیکل سوار کے ساتھ ایک کتا بھی پایا جاتا تھا۔ گویا جنگ کے دوسرے ضروری اسلحہ کے ساتھ کتے کا رہنا بھی ضروری ہے۔ اور وہاں اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ روس سے کوئی کتا باہر جا ہی نہیں سکتا جب تک وہ فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ لیا جائے

گزشتہ سو سال کے اندر چھ لڑائیوں کا ایک دوسرے سے ریاضی کا عجیب و غریب تعلق پایا جاتا ہے یعنی پہلی لڑائی کے ختم سال میں اس کے ہندسوں کو ملحدہ ملحدہ جمع کر دیجئے تو آئندہ لڑائی کے آغاز کا سال نکل آتا ہے۔ چین کی لڑائی ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک جاری رہی۔ اب ۱۸۴۲ میں ۲، ۴، ۸، ۱۰ اور ۱ کے مجموعہ (۱۵) کو جوڑ دیجئے تو ۱۸۵۶ء ہو جائے گا، جب ہندوستان میں غدر ہوا۔ اب پھر دیکھئے کہ غدر ختم ہوا ۱۸۵۸ء میں۔

اس میں ۸، ۵، ۱، ۸، ۱۰ اور ۱ کے مجموعہ (۲۲) کو ۱۸۵۸ء میں جمع کیجئے تو ۱۸۸۰ء ہو جائے گا اور یہی سال مقرر کی لڑائی کا تھا۔ مقرر کی لڑائی ۱۸۸۱ء میں ختم ہوئی۔ اس میں ۸، ۸، ۱، ۸، ۱۰ اور ۱ کے مجموعہ (۱۸) کو جمع کیجئے تو ۱۸۹۹ء ہو گیا اور یہی سال جنوبی افریقہ کی لڑائی کا تھا۔ ۱۸۹۹ء سے انگریزوں کی سول و آرمی ہوئی بادشاہ قتل ہوا اور پہلی جمہوریت کراٹول کی سیادت میں قائم ہوئی ۱۸۹۹ء میں یورپ انقلابی سرگرمیوں کا شکار رہا اور زبردست قحط پڑا۔ اب دیکھئے ۱۹۰۰ء سے کس مصیبت کا آغاز ہوتا ہے

اٹلیا محبت کے خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط وہ ہے جو اس وقت برطانیہ کے عجائب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ خط ملکہ الزبتھ کے ایک درباری نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط چار سو بار یک لکھے ہوئے صفحات کو محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے۔ غالباً اس کی شادی اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تو باتوں ہی باتوں میں مار ڈالتا۔

امریکہ کا صدر فلکسن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک مرتبہ کسی ملک کا سفیر اس کے کمرہ میں ناگہاں داخل ہو گیا جہاں فلکسن اپنا جوتا صاف کر رہا تھا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا ”کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں“

فلکسن نے جواب دیا ”ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کیا کرتے ہیں؟“

ایک سائنس دان نے نظریہ پیش کیا ہے کہ گوشت کا استعمال گلے کے اعصاب اور رگوں کی نرمی کو ضائع

کر دیتا ہے اس لئے گوشت کھانے والے اچھے گانے والے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش کرتا ہے جو بہت گوشت کھانے اور بہت خراب گانے والے ہیں بر خلاف اُلی والوں کے جو گوشت بہت کم کھاتے ہیں اور عمدہ گانے والے ہیں۔

اس نے ثبوت میں اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ گانے والی چڑیاں جتنی ہیں سب گھاس پات کھاتی ہیں، بر خلاف اس کے چیل، گدھ وغیرہ گوشت خوار طیور سب اس نعمت سے محروم ہیں۔

لڑکوں کی پیدائش جنگ کے وقت زیادہ ہوتی ہے یا اس کے بعد۔ پروفیسر راسل تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ جنگ ختم ہونے کے بعد لڑکوں کی پیدائش زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۷۱ء کی لڑائی کے بعد جب ۱۸۹۶ء میں بیس سال کے نوجوانوں کی بھرتی شروع ہوئی ہے، تو ان کی تعداد اسی زیادہ تھی کہ انتخاب مشکل ہو گیا۔ اس کا سبب پروفیسر نوکرنے یہ بتایا ہے کہ مردوں کی زیادتی انحطاط کی علامت ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہترین قوار کے مرد لڑائی کے میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور صرف بیمار و کمزور آدمی رہ جاتے ہیں، جن سے بہ حالت امن مشکل سے عورتیں شادی کرنے پر راضی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انھیں مجبوراً انھیں چھپے ہوئے مردوں سے عقد کرنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں جو مردوں کے انحطاط کی علامت ہے۔

الامابا میں عورتیں پاؤں میں کوئی زیور استعمال نہیں کر سکتیں۔

اتامہ میں جوڑے کی ایڑی کی اونچائی ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بوسٹن میں ہر گھنٹے کی ٹانگ دس انچ سے کم ہونا چاہئے۔

سپسی میں بغیر جوتوں کا فیتہ باندھے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

نیویارک اسٹیٹ میں کوئی شخص گھوڑے کے پاس چھتری نہیں کھول سکتا۔

امریکہ کے کسی اخبار نے ایک ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کی لوگوں کو دعوت دی اور سب سے بہتر

کہانی پر انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں نے حصہ لیا اور انعام ذیل کی کہانی کو ملا:-

الونیا کو اپنے بھائی کا ایک تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ افریقہ کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے:- باب شیر کا شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا۔ الونیا بہت رنجیدہ ہوئی اور فوراً تار دیا کہ ”اُسے گھر

بھیجو“۔ تین ہفتہ کے بعد دیب بڑا کبس افریقہ سے پہونچا، جس کے اندر شیر تھا۔ الونیا نے پھر تار دیا کہ:- ”شیر پہونچ گیا، تم سے غلطی ہوئی، باب کو بھیجو“۔ اس کا جواب آیا کہ:- ”غلطی نہیں ہوئی۔“ باب شیر کے

اندر ہے۔

ج ۱

رجسٹرڈ نمبر ۱۴۶۶



تیت ۸

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی جہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ جہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس - قیمت یعنی ۸ کے ٹکٹ محصول ہونے پر -

مینجر "نگار"

تصانیف نیاز فختوری

نگارستان	چٹانستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سر
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مقصد و مقصد میں غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔	ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دورہ جو وہ جس میں ۲۰۲۰ افسانے شائع کئے گئے۔ یہ ہیں۔ زبان قدرت بیان علی تحلیل و پرکیرگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت: ۱۰ روپیہ (عقار) علاوہ محصول	ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان نگینی اور ایسے ہی کے خاتمہ سے فن انشاء میں یہ نکل پہنچی چیز ہے جس کے ساتھ مختصر طالعاب بھی چھپکے معلوم ہوتے ہیں معتقد ویر۔ حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر چھپا شائع ہوئی ہے۔ قیمت: ۱۰ روپیہ آٹھ آنے (عقار) علاوہ محصول	حضرت نیاز کا وہ مدیہ افسانہ جو اردو زبان کا پہلی مرتبہ سیرت نامہ اصول پر لکھا گیا اس کی زبان اس کی نزاکت بیان بلندی مشہور و انتشار عالیہ سمجھا جاتا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری اس کے تمام ادوار کا بیسٹ تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی ۱۰ کا اندازہ مقصود ہوتا ہے اردو میں آپ کے لئے صرف یہی کافی ہے۔ قیمت: علاوہ محصول ۱۰

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بیسٹ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین ادبی نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجموعہ ۵۶ صفحات۔ قیمت: ۱۰ روپیہ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۷

فہرست مضامین مئی ۱۹۶۷ء

شمار ۵

۵۱	مکتوبات نیاز	۱	ملاحظات
۵۴	جرمنی کو ناکر بندی سے شکست نہیں ہو سکتی	۹	فن تحریر و صحافت، پ۔ جلیل الرحمن اعظمی
۵۷	باب الاستفسار	۱۶	سوویت ادبیات میں اشتراکی "واقعییت"۔ ل۔ احمد
۶۱	تشکیل	۲۲	عندلیب شادانی و حسرت موہانی۔ اثر گلشن آبادی
۶۴	تنوعات	۲۸	معراج تمدن۔ رام
۶۵	مطبوعات موصولہ	۳۲	کوٹھی بھکارن۔ کشن پرشاد کول
۷۴	منظومات۔ آہ، احسان دانش، اثر مہدی بنی احمد، بکر، قیصر امید	۴۱	عروں کی سیاسی بیداری۔ محمد عتیق صدیقی

ملاحظات

موجودہ جنگ۔ اور۔ برطانیہ کی سیاسی غلطیاں

عام طور پر ہر شخص یہی سوال کرتا ہے کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا حالانکہ سوال کی صحیح صورت یہ ہونا چاہئے کہ "جنگ کا رخ کیا ہے" یونٹو پیشین گوئی جو بھی ہو غیر یقینی چیز ہے، لیکن جنگ کے متعلق پیشین گوئی کرنا غیر یقینی بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اس لئے لڑائی کے انجام پر کبھی غور نہ کیجئے بلکہ صرف یہ دیکھئے کہ اس وقت تک جو کچھ ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر اس سلسلہ میں از خود کوئی منطقی نتیجہ سمجھ میں آجائے تو مجبوری ہے۔ آج کی صحبت میں ہم یہی بتانا چاہتے ہیں کہ گزشتہ آٹھ مہینے میں کیا کیا ہو چکا ہے اور اس کو دیکھ کر فریقین میں سے کس کو کامیاب اور کس کو ناکام کہہ سکتے ہیں

اس زمانہ کی کسی جنگ پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ کس فریق کے کتنے سپاہی ہلاک ہوئے، کتنے جہاز تباہ کئے گئے بلکہ صرف یہ غور کرنا چاہئے کہ سیاسی چالیں کس کی زیادہ کامیاب رہیں، کس کی گھاتیں زیادہ فتیہ خیز ثابت ہوئیں اور وقت و موقع سے کس نے زیادہ فائدہ اٹھایا

چونکہ یہ جنگ فی الحقیقت گزشتہ جنگ عظیم ہی کا تتمہ ہے، اس لئے مختصر پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کچھلی لڑائی نے یورپ کے نقشہ میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور اس سے وہاں کی بین الاقوامی سیاست پر کیا اثر پڑا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کچھلی لڑائی میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی تھے، دوسری طرف روس، فرانس، جرمنی اور آئی۔ اسی کے ساتھ آپ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک برٹنی کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور انھیں کامیابیوں کا نتیجہ وہ عہد نامہ تھا جو

عہد نامہ برسط لٹوئک (Breast Litovsk) کے نام سے موسوم ہے

اس معاہدہ میں ایک فریق روس تھا اور دوسرا جرمنی و ترکی و بلغاریہ۔ چونکہ دوران جنگ میں روس کے اندر اشتراکی انقلاب پیدا ہو گیا تھا جسے جرمنی ہی نے زیادہ کامیاب بنایا تھا اس لئے روس نے ہتھیار ڈالنے اور جرمنی نے نہایت سخت شرائط صلح پیش کئے۔ ان شرائط کی رو سے، لتھوینیا، لیٹویا، اسٹونیا، روسی پولینڈ، اور بالٹک کے بعض برابر روس کے قبضہ سے نکل کر جرمنی و آسٹریا کو مل گئے اور اوکرائن، فن لینڈ اور جارجیا کی آزادی بھی روس کو تسلیم کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی بادی کام ۴۴ فی صدی حصہ صنعتی اداروں کا ۵۴ فی صدی حصہ اور کوئلہ کی کانوں کا ۹۰ فی صدی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معاہدہ ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا

لیکن اس کے تقریباً ایک سال بعد ہی حالات کا رخ بدلا اور جرمنی کو شکست ہوئی، اسی کا نتیجہ معاہدہ ورسائی (Versailles) ہے جس کو موجودہ جنگ کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ہوا اس معاہدہ کا نتیجہ ہوا کہ:

۱۔ آسٹریا ہنگری کی عظیم الشان سلطنت توڑ کر دو چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنادی گئیں، ایک آسٹریا (جس پر اب جرمنی قابض ہو) اور دوسری ہنگری

۲۔ آسٹریا ہنگری کا بہت بڑا علاقہ نکال کر ایک نئی حکومت نیکو سلووکیا کے نام سے قائم کی گئی

۳۔ پولینڈ کی حکومت پھر قائم ہوئی اور رومانیہ و سربیا (موجودہ یوگوسلاویا) کے حدود کو بلغاریہ و ہنگری کے علاقے چھین کر اور زیادہ وسیع کر دیا گیا

۴۔ پولستانی کریدور (Corridor) جرمنی سے لیکر پولینڈ میں شامل کر دیا گیا اور رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد بالائی سلیشیا کا معدنی علاقہ بھی بعد کو پولینڈ میں شامل ہو گیا

۵۔ شمالی سلسونگ (Silesia) ڈنمارک کو دیا گیا

۶۔ میکل لتھوینیا کی نئی وضع کی ہوئی حکومت کو دیا گیا

۷۔ نیکو سلووکیا کو ہبرگ اور ایٹین (Ettien) میں خاص حقوق دئے گئے

۸۔ بلجیم کو یوپن (Eupen) اور مالمدی (Malmedy) کے اضلاع دئے گئے

۹۔ علاقہ سار کی معدنی کوئلہ کی پندرہ سال کے لئے فرانس کو دیدی گئیں

۱۰۔ لورین کا بڑا حصہ جس میں لوہے کی کانیں ہیں اور الساک جس میں پوٹاشس کی معدنیں ہیں فرانس کو دیدیا گیا

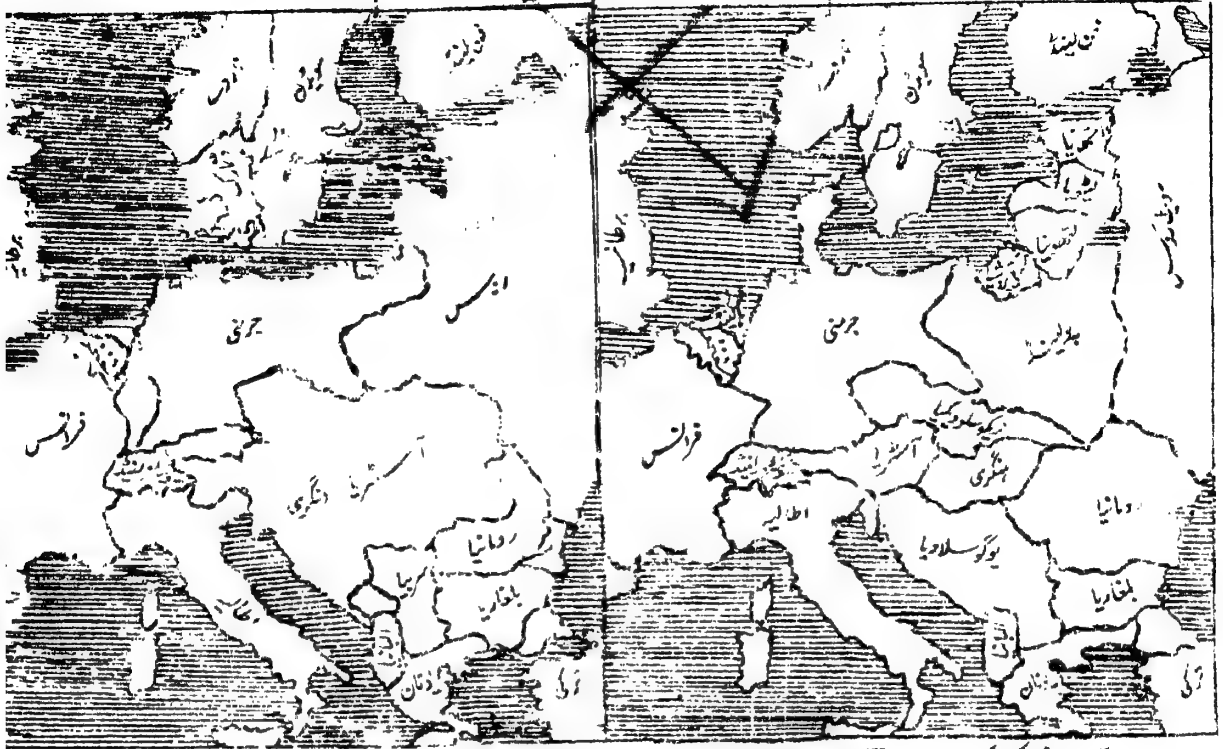
۱۱۔ رہائی لینڈ کا علاقہ بھی پندرہ سال کے لئے اتحاد میں کر لیا گیا

۱۲۔ جرمنی نو آبادیاں جو افریقہ میں پائی جاتی تھیں سب کی سب اس کے ہاتھ سے نکل گئیں اور اسی طرح بحرہ ہند کے جزائر بھی

بکری و بری افواج کو کم کر دینے اور زیر دست تادان جنگ ادا کرنے کی شرطیں ان کے

علاقہ تھیں۔

یورپ کا نقشہ گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے ۱۹۱۳ء اور یورپ کا نقشہ جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۹ء تک



آپ نے دیکھا کہ معاہدہ ورسائی نے جرمنی اور اس کے رفقاء کو بیدست و پا کر دینے کے سہ وسطیورپ کے سیاسی و جغرافیائی نقشہ میں کتنی غیر معمولی تبدیلیاں کیں لیکن افسوس ہے کہ معاہدہ ورسائی کی اسی غیر عاقلانہ تقسیم نے ایک دوسری لڑائی کا بیج بو دیا جس کا نتیجہ موجودہ جنگ ہے

گزشتہ جنگ عظیم نے دنیا کا اقتصادی نظام یونہی درہم برہم کر دیا تھا کہ معاہدہ ورسائی کی اس تقسیم نے اس کو زیادہ سخت بنا دیا، اور جرمن قوم مجبور ہو گئی کہ اپنے بقا کے لئے ہر جائز و ناجائز کوشش صرف کر دے۔

چنانچہ تیسوڑ ہی زمانہ گزرا تھا کہ معاہدہ ورسائی کی غلطی کو تسلیم کیا جانے لگا اور یورپ میں توازن قوت کی پالیسی درہم برہم ہوتی نظر آنے لگی۔ اس احساس کا نتیجہ ۱۶ نومبر ۱۹۳۵ء کو معاہدہ لوکارنو (Lochner) کی صورت میں نمودار ہوا

اس معاہدہ میں فرانس، برطانیہ، جرمنی، آئلی اور بیلجیم شریک تھے جس کی روسے بیلجیم، فرانس اور جرمنی نے وعدہ کیا کہ ان میں سے کوئی دوسرے ملک کی سرحد میں مداخلت نہ کرے گا لیکن جرمنی نے اس کی بھی پابندی نہیں کی اور ۱۹۳۶ء میں راین لینڈ پر قبضہ کر کے اس معاہدہ کو بھی درہم برہم کر دیا۔ تاوان جنگ ادا کرنے سے اس نے ۱۹۳۷ء ہی میں انکار کر دیا تھا میں نے ان تینوں معاہدہ کا ذکر اس لئے کیا کہ آپ کو موجودہ جنگ سے قبل کی یورپین سیاست کا حال معلوم ہو جائے کیونکہ سبھی اصل بنیاد ہے اس لڑائی کی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ جنگ عظیم میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی کو پہونچا، اس کے بعد روس کو اور چونکہ آئلی کو بھی کوئی فائدہ اٹھا دین کا ساتھ دینے سے نہ ہوا تھا اس لئے فی الحقیقت وہ بھی کچھ خوش نہ تھا۔ اب یورپ میں ایک ہلاک تو

وہ پیدا ہو گیا جو گزشتہ جنگ عظیم کے خساروں کو پورا کرنا چاہتا تھا اور جس میں جرمنی پیش پیش تھا، دوسری طرف برطانیہ نے معاہدہ ورسائی کی غلطی کی تلافی اس طرح کرنا چاہی کہ جہاں تک ممکن ہو جنگ سے احتراز کرے اور جرمن قوم کو ایک حد تک پھیلنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ وہ یورپ کے امن و سکون کو تباہ کرنے پر مجبور نہ ہو جائے

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۹ء میں سار کا علاقہ اور ۱۹۲۰ء میں رہائش لینڈ جرمنی نے پھر واپس لے لیا۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ اس کے بعد جرمنی مطمئن ہو جائے گا اور ہٹلر کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ اس دوران میں نازی حکومت نے زبردست فوجی طریقہ ریاں کر لی تھیں اور آٹمی کو بھی وہ اپنا طرز کار بنا چکا تھا، اس لئے اس نے اپنی جارحانہ پالیسی پر جاری رکھی اور مارچ ۱۹۳۶ء میں نازی حکومت نے آسٹریا پر بھی قبضہ کر کے، ۷ لاکھ آبا دی اور فرانسیسی چوب و آہن کے وسیع ذرائع پر دسترس حاصل کر لیا۔ برطانیہ پھر بھی خاموش رہا اور ہٹلر نے دوسرا قدم زیکو سلوویکیا کی طرف اٹھا کر، ستمبر ۱۹۳۸ء کے معاہدہ میونخ کی رو سے جو خود برطانیہ کی پیدا کی ہوئی چیز تھی، زیکو سلوویکیا کی ۱۰ لاکھ آبا دی پر بھی مدد اس کے تمام صنعتی اداروں کے قبضہ کر لیا اور آخر کار ۱۹۳۹ء تک بوہیمیا، سلوویکیا، میسل، ڈونرگ یہاں تک کہ نصف پولینڈ بھی نازی حکومت کے قبضہ میں آ گئے

ان فتوحات سے جرمنی کو جتنے صنعتی، اقتصادی و تجارتی فوائد حاصل ہوئے، ان کا صحیح اندازہ مشکل ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کا جو پوزیشن تھی اس سے اب کہیں زیادہ قوی ہے اور اسی پوزیشن کے بقا و قیام کے لئے اس نے صرف اٹلی سے ساز باز کی بلکہ روس کو بھی اپنا طرز کار بنالیا جو ہٹلر کی سیاسی چالوں میں سب سے زیادہ کامیاب چال سمجھی جاتی ہے

برطانیہ نے بھی اب تنگ آ کر اپنی صلح کوش پالیسی کو بے لاہ ہے لیکن وقت گزر جانے کے بعد۔ ایک ماہر جنگ کا خیال ہے کہ جرمنی کو روکنے کا صحیح وقت وہی تھا جب رہائش لینڈ میں اس نے اپنی فوجیں آرمی تھیں۔ اس کے بعد دوسری چیز جسے برطانیہ کی ساتھ کوسندہ پہونچایا اور جرمنی کی طرف سے تمام وسط یورپ و شمال کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو خالی بنا دیا، یہ ہے کہ برطانیہ نے نہ پولینڈ کی کوئی مدد کی اور نہ فن لینڈ کی، ہر چند پولینڈ کے باب میں برطانیہ یہ کہہ سکتا ہے کہ پولینڈ کا خاتمہ اتنی جلد ہو گیا کہ مرد کا کوئی موقعہ ہی ہاتھ نہ آیا اور فن لینڈ کی مدد اس لئے نہ ہو سکی کہ سوئیڈن و ناروے نے برطانوی فوجوں کو گزرنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن یہ تو جیہیں خود برطانوی پالیسی کی کم بینی و کوتاہ نظری کی دلیل میں پیش کی جاسکتی ہیں، کیونکہ برطانیہ کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ جرمنی پولینڈ پر حملہ کرنے والا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ روس کے مقابل میں فن لینڈ کی شکست یقینی ہے۔ اور روس کی یہ کامیابی فی الحقیقت جرمنی کی کامیابی ہوگی۔ پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ اتحادیوں نے فن لینڈ کے لئے سامان حرب اور فوجیں بھیجنے کا عزم تو کیا اور شاید تھوڑی بہت مدد بھی کی، لیکن روس کے خلاف اعلان جنگ اس وقت تک نہیں کیا گیا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ سوئیڈن و ناروے اس پر راضی نہ ہوئے تھے کہ ان کی حدود سے اتحادیوں کی فوجیں گزر کر فن لینڈ پہونچیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ نے قصداً اس سے احتراز کیا کیونکہ اس صورت میں کھلم کھلا روس سے لڑائی ہو جاتی اور روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے ہندوستان کا خطا میں ڈالنا ہے جس کی حفاظت کے لئے برطانیہ، فن لینڈ کیا تمام دنیا کی قربانیوں پر آمادہ ہو سکتا ہے

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ سے اس دوران میں متعدد سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں، ان غلطیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب جمعیت اقوام (League of Nations) کے گرتا دھرتا ہونے کی حیثیت سے اسے اول پنجو ریا کے مسئلہ میں جاپان کے سامنے سپر ڈال دی اور دوسری ضرب جس نے اس جمعیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اٹلی کا یہ پر حملہ کرنا اور حبشہ کی فریاد کو نہ پہنچنا تھا۔ ان واقعات نے یورپ کی تمام چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو یقین دلادیا کہ جمعیت لائبرے کسی مدد کی توقع رکھنا بیکار رہے اور ان میں پیر وہی اندرونی خفیہ معاہدوں کے ذریعہ سے اپنا اپنا بلاک بنانے کا لہ پیا ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خطرناک بلاک وہ طیار ہوا جسے روم برلن محور کہتے ہیں

دوسری غلطی برطانیہ نے یہ کہ وہ ہٹلر کی اندرونی سازشوں اور چارخانہ ارادوں کا صحیح علم حاصل نہ کر سکا۔ وہ یہی خیال رہا کہ رمان لیننڈ، آسٹریا اور زیکو سلوویکیا کے قلعے دے دیکر ہٹلر کو رام کرے گا، حالانکہ اسے سمجھنا چاہئے تھا کہ ایک *منصوبہ* (plan) اٹلی تک پہنچنے کے بعد ہمیشہ پہنچا پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسٹر جمپرلین کا فرشتہ امن دود و بار ہٹلر سے ملنے کے لئے جانا اور اس کے قول پر اعتبار کر کے معاہدہ میونخ کی رو سے بغیر اسے عام حاصل کے ہوئے۔

کا علاقہ اس کے حوالہ کر دینا اتنی بڑی سیاسی غلطی ہے کہ برطانیہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے۔ تیسری اہم غلطی یہ تھی کہ برطانیہ، روس کو اپنے ساتھ نہ ملا سکا۔ جس وقت مسدے میں روس کے خلاف جرمنی، اٹلی و جاپان درمیان (Anti Comintern Pact) ہوا ہے، برطانیہ کو چاہئے تھا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس کو ملا لیتا اور اس کے صنعتی اداروں کو کام دہی آسانیاں ہم پہنچاتا جو جرمنی سے اسے پہنچ رہی تھیں، لیکن برطانیہ کی عجیب و غریب پالیسی نے کہ باوجود ادعاے جمہوریت نہ وہ اشتراکیت کا حامی ہو سکتا ہے، نہ باوصف ملوکانہ انداز حکومت علم کھلا نازی و فاسسٹ کی قسم کی آمرانہ حکومت کا اعتراف کر سکتا ہے۔ اس میں بھی ناکامیاب رکھا اور ہٹلر اپنی موقر شاہی نام لیکر شاہین کو ملا لینے میں کامیاب ہو گیا

پھر روس و جرمنی کی اس ساز باز سے برطانیہ کو اس کی ساکھ کے علاوہ کوئی نقصان پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، لیکن جرمنی نا فائدہ پہنچا اس کے نتائج بہت دور رس نظر آتے ہیں

روس و جرمنی کے اس اتحاد کو فتح پولینڈ تک کوئی خاص اہمیت دینا چاہئے تھی یا نہیں، اس میں گفتگو ہو سکتی ہے لیکن روس نے اسٹولیا، لیتویا اور لتھوینیا پر قابض ہونے کے بعد فن لینڈ پر حملہ کیا تو برطانیہ کو یقین کر لینا چاہئے تھا کہ یہ تمام واقعات فی حوادث نہیں ہیں کہ اتفاقاً رونما ہو گئے ہوں، بلکہ نتیجہ ہیں کسی خاص سمجھوتے کا جو روس اور جرمنی کے درمیان ہو چکا ہو، برطانیہ نے اس کو نہیں سمجھا یا سمجھنا نہیں پایا، اور اس طرح جرمنی کی کامیابی کے گرد ایک اور مضبوط حصار قائم ہو گیا، فتح فن لینڈ کے بعد ہٹلر ایک اور زبردست چال چلا یعنی بلقان میں وہ اٹلی اور روس کی دیرینہ مخالفت کو تو دور نہ کر سکا، کم از کم وقتی مصالحت اس نے ضرور کرادی اور اس طرح وسط یورپ میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں یا عجیب ہے کہ اندرونی طور پر روس، اٹلی اور جرمنی کے درمیان ریاستہائے بلقان کی تقسیم کے متعلق بھی آپس میں کوئی وٹا ہو چکا ہو اور برطانیہ آخر وقت تک اس سے بے خبر رہے

جس زمانہ میں معرکہ فن لینڈ جاری تھا، اس وقت اس بات کے آثار نظر آرہے تھے کہ اس کے بعد جرمن اقدام کی باہمی

آئے گی اور بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ اقدام سویڈن و ناروے کی طرف ہو۔ برطانوی اربابِ مل وعتد بھی غالباً اس سے بے خبر نہ تھے، لیکن وہ اس نئے فتنہ کا سدباب کرنے کی فکر میں کمر ہی رہے تھے کہ جرمنی نے رشتہ دار ملک پر قبضہ کر لیا اور ناروے کے ساحلوں پر فوجیں اُتار دیں۔ جرمنی کا بیان ہے کہ برطانیہ خود ناروے پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھا، اور سواحلِ ناروے پر اسکا سرنگس بچھانا اسی مقصود کے لئے تھا۔ اگر ہم تھوڑی دیر سے لے اسے صحیح باور کھیں کہ واقعی برطانیہ کا ارادہ ناروے کو اپنی حفاظت میں لے لینے کا تھا، تو یہ کوئی گناہ نہ تھا، کیونکہ ناروے کا جرمن قبضہ میں پلے جانے سے بدرجہا بہتر یہ تھا کہ وہ برطانوی حفاظت میں آجائے، لیکن برطانیہ کا یہ گناہ سیاسی دنیا میں مشکل سے معاف کیا جاسکتا ہے کہ وہ جرمنی کے اس ارادہ سے باخبر ہونے کے باوجود اُس سے پہلے ناروے پر اپنا تسلط نہ جاسکا اور ”الفضل للمتقدم“ کا امتیاز جرمنی کو مل گیا

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ نے اس کا بڑا خیال رکھا کہ کسی غیر جانبدار حکومت کو اس کی طرف سے مداخلت کی شکایت کا موقع نہ ملے لیکن اس سے فائدہ کم ہوا اور نقصان زیادہ۔ فائدہ تو صرف اتنا ہوا کہ امریکہ نے برطانوی حکومت کے شریفانہ اخلاق کو بہت پسند کیا، لیکن نقصان یہ ہوا کہ برطانیہ کی گارنٹی کی وقعت کم ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو اس پر کوئی بھروسہ نہ رہا

اگر برطانوی سیاست زوردار ہوتی، تو کم از کم وہ سویڈن و ناروے کو راضی کر کے فن لینڈ کی مدد کو ضرور پہنچ سکتا تھا، کیونکہ اس حقیقت سے تو سبھی واقف ہیں کہ برطانیہ اپنی سلطنت بڑھانے کے لئے جنگ نہیں کر رہا اور جرمنی کا ایکبار کسی ملک کو اپنی عارضی حفاظت میں لے لینا بھی دائمی غلامی ہے

اتحادیوں کی پالیسی شروع سے اس جنگ میں مدافعانہ رہی ہے، یعنی انھوں نے پہلے ہی سے یقین کر لیا ہے کہ جرمنی ان کی سلطنتوں پر حملہ کرے گا اور وہ اس کی مداخلت کریں گے، حالانکہ محالات موجودہ اُس کا مقصود تو صرف قربِ جوار کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ہضم کر جانا ہے اور اس کے جواب میں اتحادیوں کا مدافعانہ پہلو اختیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اتحادیوں کو یقین ہے کہ وہ ناکہ بندی کے ذریعہ سے جرمنی کو سیدست و پاکر دیں گے، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔

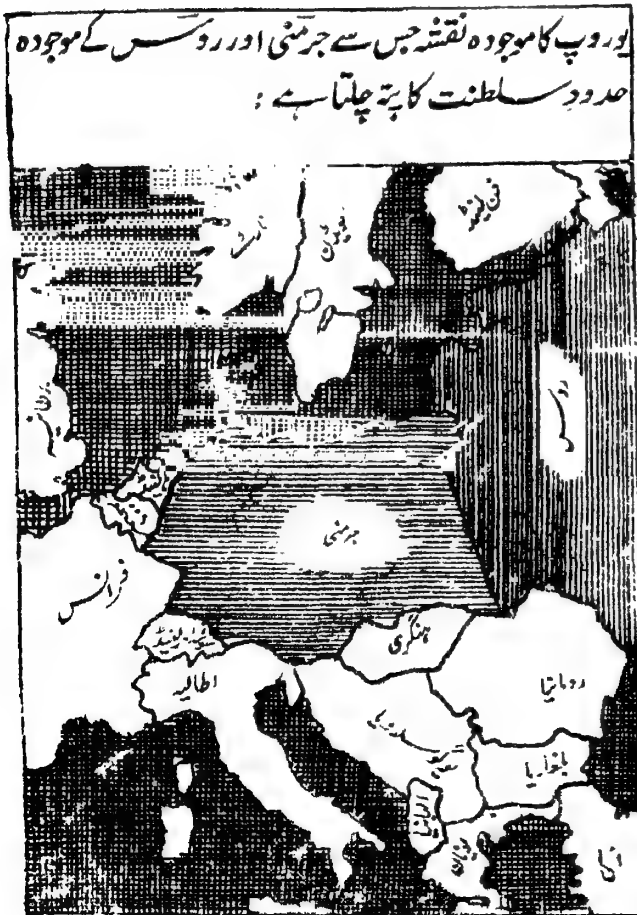
گزشتہ جنگ عظیم میں بھی تین سال تک جرمنی پر ناکہ بندی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا، چہ جائیکہ اب، جبکہ وہ ساہا سال سے اس جنگ کے لئے ذخائر جمع کرتا چلا آ رہا ہے اور آسٹریا، زیکو سلوواکیا، پولینڈ ایسے زرخیز اور صنعتی ملکوں پر قابض ہو دیاں کا غلہ، وہاں کے معدنیات اور وہاں کے صنعتی اداروں اور اسلحہ سازی کے کارخانوں سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے اس میں اگر آپ روس، فن لینڈ اور ریاستہائے بلقان کو بھی شامل کر لیں، جہاں سے ہر قسم کی درآمد برآمد کا تعلق قائم ہے اور ڈنمارک کو بھی سامنے رکھیں جو دودھ مکھن زئیرہ خراہم کرنے میں خاص شہرت رکھتا ہے، تو ناکہ بندی کی طرف سے ہماری توقعات بالکل ختم ہو جاتی ہیں

اس میں شک نہیں کہ بحرِ اٹلانٹک اس کے لئے خطرناک تھا اور وہ سویڈن و ناروے کا لوہا اور لکڑی حاصل کرنے کے لئے ضرور کوئی راستہ بحرِ اٹلانٹک میں اپنے لئے کھلار کھنا چاہتا تھا، سو اس غرض کی تکمیل کے لئے اس نے ناروے پر حملہ کر دیا اور بندرگاہ ناروے تک پہنچ گیا، کیونکہ ناروے ہی کا یہ بندرگاہ ایسا ہے جہاں سے باروں میں سوڈن و ناروے کا مال باہر بھیجا جاسکتا ہے، ورنہ دوسری بندرگاہوں کا پانی جاڑوں میں منجمد ہو کر ناقابلِ گزر ہو جاتا ہے

ناروے کے بعد جرمنی مجبور ہے کہ سوئیڈن پر قبضہ کرے کیونکہ اتحادین نے سرنگیں بچھا کر براہ بحر شمالی و بحر اطلانتک اسکی آمد و رفت سوانل ناروے تک دشوار کر دی ہے اور اب یہ صرف بحر بالٹک سے سوئیڈن ہو کر فوجی کمک پہونچا سکتا جو علاوہ اس کے ناروے پر حملہ کرنے سے اس کا مقصد وہی سوئیڈن پر قبضہ کرنا ہے کیونکہ لوہے کی معدنیں یہیں پائی جاتی ہیں اور جرمنی انھیں سے سالانہ کثیر مقدار میں لوہا حاصل کیا کرتا ہے

آئی اس وقت جرمنی کا ہم آہنگ ہے اور ناروے کے حملہ کو حق بجانب ظاہر کرتا ہے۔ روس البتہ خاموش ہے اور یہ خاموشی بالکل اسی قسم کی ہے، جیسی جرمنی نے روس کے حملہ فن لینڈ کے وقت اختیار کی تھی۔ لیکن وہ بے معنی تھی نہ یہ بے معنی ہے، اس خاموشی کا نتیجہ ڈنمارک و ناروے کو مضحک کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس خاموشی کا نتیجہ ممکن ہے بلقان کی قطع و برید کی صورت میں رونما ہو

بہر حال وقت بہت نازک ہے اور اس وقت تک اتحادین کا یوزیشن کمزور نظر آ رہا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے اس جنگ کا نتیجہ اتحادین کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کے لئے یہ نہایت تلخ تجربہ ہوگا لیکن چونکہ محض آرزوں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں، اس لئے ہماری دُعا میں اتحادین کے کچھ کام نہیں آ سکتیں اگر خود انھیں کی پالیسی اور عسکری تنظیم لوہے کا جواب لوہے سے دینے کے لئے طیار نہیں۔



آپ کو پہلو کے نقشہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ گزشتہ آٹھ مہینوں میں جرمنی وسطی یورپ کے کتنے بڑے حصہ پر قابض ہو گیا ہے اور اگر اس لڑائی کا اختتام انھیں حدود پر ہوا تو یقیناً یورپ کی توازن قوت اور اس کے ادعائے جمہوریت کو ناقابل تلافی صدمہ پہونچے گا، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا جنگ کی موجودہ رفتار اور اتحادین کی عسکری پالیسی زمانہ کو پھر آٹھ مہینے پیچھے دھکا سکتی ہے اور اگر اس کا امکان ہے تو غالباً وہ زمانہ کوسلہ عہد کوٹانے پر مجبور ہوگی اور اسکی اپنی خارجی پالیسی سے زیادہ داخلی پالیسی میں تغیر کو لازمہ گا جو شاید اس کی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔

اس گفتگو میں بحث کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ برطانوی حکومت کی موجودہ پالیسی کیا واقعی صلح و امن بر قائم ہے، کیا وہ فی الحقیقت کوئی جارحانہ پہلو اس لئے اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ اسے انسانیت کے ساتھ نہایت گہری ہمدردی ہے خواہ اس سے دشمن کی

فائدہ کیوں پہنچے، یا اسوقت کی بین الاقوامی سیاسی پیچیدگیاں جو غالباً خود اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اُسے خطرناک دادی میں قدم رکھنے سے روکتی ہیں؟

یقیناً برطانیہ کے مدبرین و ارکان وزارت کم از کم اس قدر تو سمجھتے ہی ہوں گے کہ اس لڑائی میں ان کی پوزیشن کیا ہے اور دشمن کی کیا، اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ اگر وہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی حفاظت کی ذمہ داری کو جس وجہ پر انہیں کر سکتے تو اس کا سبب داخلی ہے یا خارجی، اس لئے ہم برطانوی حکومت کی موجودہ روش پر زیادہ سے زیادہ ہی نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں کہ اگر اس کا سبب واقعی کوئی اندرونی کمزوری نہیں ہے تو اسے اپنی بیرونی پالیسی کو بھی مضبوط بنانا چاہئے اگر اسپین میں جمہوریت کی تباہیاں اور حبشہ میں فاسمی حکومت کی زیادتیاں اس کے خمیر کو اجازت دے سکتی ہیں، لیکن اگر اس کا سبب کوئی اندرونی احساس ہے تو حکومت برطانیہ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اپنے زمانہ لوٹ کر نہیں آ سکتا کہ پریسیڈنٹ ڈسن کے چودہ نکات صلح کو تسلیم کرنے کے بعد بھی عملاً اُن کو مردود قرار دیدیا جائے اور دنیا بدستور ملکیت کے جنگل میں بھنسی رہے

یہ جنگ حقیقتاً آخری معیار ہے جس پر کھوٹے گھرے کو ہمیشہ علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اتحادیوں نازیت کی ہلاک دنیا سے دور نہ کر سکے تو اس کا سبب صرف یہ ہو گا کہ اس کسوٹی پر گئے جانے کے بعد ان کی جمہوریت کا سونا کھوٹا نکلا

ہم کہتے ہیں کہ اگر جنگ میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو لیکن نازیت کو ضرور شکست ہوگی، لیکن یہ شکست نتیجہ ہوگی ایک ایسے زبردست انقلاب کا جو دنیا میں اکثر حکومتوں کی کارگاہ کو دم بہ دم برہم کر کے رکھ دے گا اور سیاسی وسیعہ کاریوں کو ہمیشہ کے لئے ختم گوشش نزدیک لم آہ کہ آوازے ہست !

ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا بہت کمزور ہے۔ مسلم لیگ کی پاکستان والی اسکیم کے خلاف خود مسلمانوں نے جتنا اور جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، وہ ایک سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ کے لئے بہت کافی ہے، لیکن گوش سخن شنو کجا، دیدہ اعتبار کو؟

اس طفلانہ تحریک کے خلاف آزاد مسلم کانفرنس اپنا فیصلہ کر چکی ہے جسے جمہور مسلمین کا فیصلہ سمجھنا چاہئے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ "مسز جینا اینڈ کو" کا "مقتضائے طبیعت" کیا ہے اور وہ کبھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں گے۔ اس کے آگے نہ سوچنے کی ضرورت ہو گئے کی، تو خود حدیث مفصل بخوان از میں مجمل

لارڈ رٹلینڈ کا فیصلہ آپ کے سامنے موجود ہے، ہندوستان بدستور غلام بنا رہے گا اور صرف اس لئے کہ مسلم لیگ یہی چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ کامیابی مسلم لیگ کی اور کیا ہو سکتی ہے !

ہفتہ وار جنگ کے اجراء کا خیال ترک کر دیا گیا، کیونکہ اسکی موافقت کرنے والا حلقہ ان مصارف کو دیکھتے ہوئے جو میرے سامنے تھے، تنگ ثابت ہوا لیکن گوشش کجا ایسی کو خود نگار میں جنگ و متعلقات جنگ پر ہر مہینے مفید مضامین شائع ہوتے ہیں چنانچہ اشاعت حاضر میں بھی علاوہ ملاحظات کے ایک اور مقالہ آپ کو نظر آئے گا جس میں بتایا گیا ہے کہ انگریزوں سے جرمنی کو شکست دینے کا امکان بہت ضعیف ہے۔ "عربوں کی سیاسی بیداری" کا سلسلہ قبیل کی چیز ہے جس کی آئندہ دو قسطیں بہت اہم ہیں۔ آئندہ مہینے سے روس اور اسکی اشتراکیت پر بھی ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جائے گا۔

فن تحریر و صحافت عرب

فن تحریر و صحافت کا رواج تہذیب و تمدن کے لئے پہلا سنگ بنیاد ہے۔ یہ ہر زمانہ میں علوم و معارف کا سرچشمہ رہا اور انسان کی ذہنی اور دماغی ترقی کے لئے ہمیشہ نمایاں خدمات انجام دیتا رہا۔ اُس نے نہ صرف قہراء کے نتائج افکار اور اُن کے علمی سرمایہ کو محفوظ رکھا بلکہ ہمارے لئے اُس نے ایسے اسباب مہیا کر دیے جن سے ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنے دائرہ معلومات کو وسعت دے سکتے ہیں۔

اگر دنیا اس فن سے محروم ہوتی تو قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ انسان آج جہالت و وحشت کے کس تاریک گڑھے میں سرنگوں پڑا ہوتا۔ ہم میں چونکہ اس فن کا رواج کافی ہو چکا ہے اس لئے ہمیں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان نے جس قدر حیرت انگیز علوم و فنون ایجاد کئے ہیں، اُن سب میں نوشت و خواند کو جو اہمیت حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔

فن تحریر ایک آرٹ ہے جس سے حروف مفردہ کی صورت اور ترتیب ظاہر ہوتی ہے، جو بغیر کسی اشارہ لفظی و معنوی اپنے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تکونین عالم کے بعد انسان کے لئے باہم تبادلہ خیالات کا وسیلہ صرف زبان تھی لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی اور قوت حافظہ انسان کے اُس علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے سے قاصر رہی جو اُس نے اپنے بزرگوں سے روایت و سماعت کے ذریعہ حاصل کیا تھا، تو وہ تحریر و کتابت کا طریقہ معلوم کرنے پر مجبور ہوا۔ جس کی وجہ سے ہزاروں برس کے علوم و فنون وجود میں آ گئے۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے عموماً مکان کی دیواروں پر کتابت کی جاتی تھی لیکن جب کوئی زبردست قوم دوسری کمزور قوم کو جبراً قہراً اُن کے ملک سے نکال دیتی تھی تو وہ حسرت سے درو دیوار پر اپنے نقوش دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ اسلئے لوگوں نے بعد میں مٹی کی خام سلوں، چوکوں اور ظروف پر لکھنا شروع کیا جن کو وہ آگ میں پکالیتے تھے۔

اس قسم کا کلی ذخیرہ محکمہ آثار قدیمہ نے پہلے مصر سے اُس کے بعد بابل سے بکثرت برآمد کیا۔ جس میں بڑا حصہ اینٹوں کا ہے، اگلی دور کے ختم ہونے پر جب زمین سے معدنیات کا خزانہ نکلا گیا تو لوہے، تانبے، سیسے اور پتیل کے

تروں پر کتابت شروع ہوئی جس کے ہزاروں نمونے اب بھی موجود ہیں۔

لیکن جب حضرت قلم نے غزوات کی تختیوں پر چلنے سے انکار کر دیا اور بجائے سنگلاخ زمین کے نرم زمین کی ضرورت پڑی تو حکماء مصر نے تقریباً پانچ ہزار برس قبل مسیح کا غذا بجا دیا اور رفتہ رفتہ کتابت کا غدی پر ہونے لگی فن تحریر کی تاریخ یہ عجیب بات ہے کہ فن تحریر نے ہماری تاریخی اور قومی روایات محفوظ رکھ کر ہمارے ہاتھوں فن تحریر کی تاریخ تک پہنچا دی مگر خود اس کی صحیح تاریخ آج تک معلوم نہ ہو سکی، پیدائش زبان کی طرح فن تحریر کے نشوونما کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

فن تحریر کے رواج نے کچھ ایسا حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ لوگوں نے ایجاد تحریر کو انسانی طاقت سے بالاتر خیال کر کے اُسے خدا کی طرف منسوب کر دیا، ہر مذہب میں اس قسم کی روایات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فن تحریر الہام ربانی سے انسان کو سکھایا گیا۔

مسلمانوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس قسم کی تمام روایات جو اس بحث سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی کتاب ”المزہر“ میں جمع کر دی ہیں۔ بہر حال اس سوال کا جواب کہ ”فن تحریر“ کی ابتداء کب اور کیونکر ہوئی؟ مشکل ہے۔ علامہ ابن ندیم کی روایت سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم نے پہلے اپنے ”صحائف“ کچی اینٹوں پر لکھے، پھر یہ اینٹیں آگ میں پکائی گئیں تاکہ یہ آسمانی خیرہ فنا ہونے سے محفوظ رہے۔ مگر حضرت آدم کا یہ کتب خانہ طوفان نوح میں غرق ہو گیا۔ جس کا بعد میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔

بعض محققین یورپ کی تصانیف سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے بعض کھنڈرات سے اس قسم کے کتب برآمد ہوئے ہیں جن کے موجد دراصل حضرت آدم تھے۔

اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ظاہر ہے کہ فن تحریر دنیا میں اُسی وقت سے موجود ہے جب سے انسان کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے مگر اب بھی یہ بات غور طلب رہ جاتی ہے کہ وہ تحریر جو انسان کے اولین دور حیات میں پائی جاتی تھی اُس کی شکل و صورت کیا تھی؟

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ ”فن تحریر“ کی ایجاد ایک دم سے وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنے اس اعلیٰ مرتبہ کو پہنچی ہے تاریخ کی اوراق گردانی بھی یہی بتاتی ہے کہ شروع میں انسان نے انتہائی غور و فکر کے بعد نقاشی سے کام لیا اور حالات و جذبات کی ترجمانی کے لئے اُس نے ہزار ہا تصویریں بنا ڈالیں، جس طرح آج کل بھی

کارٹون وغیرہ سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ اس سادہ وقائع نگاری کو ”دورِ صوری“ کہتے ہیں۔ بعد ازاں دنیا جیوں جیوں تہذیب و تمدن میں ترقی کرتی گئی اُسی قدر یہ جدت طرازی ناکافی ثابت ہوتی گئی۔ اس لئے مجبوراً انسان نے ”حروفِ ہجا“ ایجاد کئے اور اُن کی ترکیب سے الفاظ بننا شروع ہوئے۔ یہ زمانہ ”دورِ حرفی“ تھا، جس نے تصویر کشی کی زحمت کو بھی ختم کر دیا۔

تصادیر کے ذریعے جو خط جاری ہوا تھا اُس کا نام ”خطِ ہیرا گلیفی“ تھا۔ بعد میں اُس کی دو قسمیں ہو گئیں ”ہیرا طیقی“ (Hieratic) جس کا تعلق مذہب سے تھا۔ دوسری قسم ”دیو طیقی“ (Demotic) اُس کا تعلق عام کیا بت سے تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں قسموں کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایڈوگرافک (Ideographic) یعنی خیالات کا ظاہر کرنے والا۔ جس سے تصویر کی جسامت روز بروز کم ہوتی گئی اور خط رواں ہوتا گیا۔ دوسری قسم فونک (Phonic) یعنی کاشت الصوت جس کی وجہ سے اکبری، دُہری آوازوں کے الفاظ جدا گانہ لکھے جانے لگے اس آخری قسم سے ”حروفِ ہجا“ کی اصلیت وابستہ ہے۔

”حروفِ ہجا“ کی ایجاد ہوتے ہی خطِ عبرانی، سریانی، نبطی اور حمیری بہت سے خطوط پیدا ہو گئے اور اپنے اپنے زمانہ میں کچھ نہ کچھ اصلاح کے بعد ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ عربوں نے ”خطِ کوفی“ ایجاد کیا اور خطِ کوفی سے موجودہ ”خطِ نسخ“ تیار ہوا۔ یہ ہے فنِ تحریر کی مختصر تاریخ۔

حروفِ ہجا حروفِ ہجا کی تعداد اٹھائیس ہے لیکن اگر ”لام الف“ کا اضافہ کر دیا جائے تو کل اُن تیس ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل چوتھی صدی عیسوی کا اضافہ ہے، علماء ادب نے حروفِ ہجا کی ترتیب مندرجہ ذیل رکھی ہے۔

ابجد، ہوز، حطی، کلن، صغص، قرشت، شخز، ظفس۔ یہ ترتیب بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ابنِ مقلہ نے سہولت کے خیال سے اس قدیم ترتیب کو بدل دیا، اُس نے تمام حروف کو علیحدہ علیحدہ لکھا اور باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اُن پر نقطے بھی لگا دئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ”حروفِ ہجا“ کے ”موجدِ فنیقی“ ہیں مگر انھیں خود اس بات کا اعتراف ہو کہ انھوں نے اہل مصر سے سیکھا ہے پر ہم جب مصر کا بائبل عروج سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مصر سے ہزاروں برس پہلے فنِ تحریر آخری منزل طے کر چکا تھا اس اعتبار سے اہل بابل کو سب پر تفوق حاصل ہے۔

اہل بابل کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ درحقیقت وہ قومِ عاد یعنی ”عرب“ کے ابتدائی باشندے تھے۔ اس لئے اہل عرب ہی ”حروفِ ہجا“ کے جو ”فنِ تحریر“ کے لئے ”اجزائے لایتجزئی“ ہیں، موجد قرار پاتے

ہیں اور یہ قوم عرب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔
 سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں جانب سے لکھے جاتے ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہے
 نشانِ تحریر اس لئے کہ حرکتِ طبعی دائیں جانب سے بائیں جانب کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ہندی، قبطی،
 رومی اور مغربی اقوام میں کتابت کا رواج بائیں جانب سے دائیں جانب ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ خون
 کا دوران قلب سے شروع ہوتا ہے جو بائیں جانب ہے۔

عربوں میں فنِ تحریر کے اسباب ترقی پہلے دولِ عرب میں، حیرہ اور شام، تمدن و محضر سے خالی نہیں
 لیکن افسوس ہے کہ ان اقوامِ متقدمہ کے کسی مکتوب سے ہمیں واقفیت نہیں۔ تاریخ سے دولتِ حیرہ کے صرف
 ایک کاتب ”عدی بن زید“ کا پتہ چلتا ہے، زمانہ جاہلیت کے مکتوبات بھی ہم تک نہیں پہنچے، اس لئے ہم صحیح طور
 پر نہیں بتا سکتے کہ اُن کا طرزِ تحریر کیا تھا، لیکن عام طور سے عرب خطِ نبطی اور سریانی میں لکھا کرتے تھے۔
 عہدِ اسلام کے اوائل میں لوگ فنِ تحریر سے زیادہ واقف نہ تھے، آنحضرت صلعم چونکہ خود امی تھے اس لئے
 نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہونے پر انھیں کاتبوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں غزوہ
 بدر ہوا، قیدیوں میں ستر اشخاص ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسولِ خدا نے ان قیدیوں کو رہا کر دینے کا وعدہ
 کیا بشرطیکہ ان میں سے ہر ایک دس دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیوے، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ کے بعد
 مسلمانوں میں اس فن سے واقفیت رکھنے والے سات سو کاتبوں کا معتدبہ اضافہ ہو گیا۔

یہ گویا ”فنِ تحریر“ کا پہلا مدرسہ تھا جو مدینہ منورہ میں قائم ہوا اس دور کے کاتبوں میں زید بن ثابت،
 عبداللہ بن الزبیر، سعد بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث خاص شہرت کے مالک تھے جنھوں نے مصاحف عثمانی
 بھی لکھے تھے۔

خلافتِ راشدہ میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا اور تمدن نے غیر معمولی ترقی کی تو ایک ربع صدی کے
 اندر ریکروں کاتب اور فنی پیدا ہو گئے۔

عہدِ حجازی اُمیہ میں فنِ تحریر نے اور ترقی کی اور وہ بجائے خود ایک مستقل فن بن گیا۔ یوں تو ہر لکھنے والے کو
 کاتب کہہ سکتے ہیں لیکن جب اُس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی، تو لفظ ”کاتب“ سے ایک خاص
 قسم کی قابلیت رکھنے والا شخص مراد ہونے لگا۔ جیسا کہ مفسر، محدث، فقیہ وغیرہ سے ایک خاص علم کا ماہر مراد
 ہوتا ہے۔

اس عہد میں ایسے ماہر فن، کاتبین کی تعداد اچھی خاصی گزری ہے جن میں سے ”عبدالحمید بن کثیر“ بہت

مشہور کاتب گزرا ہے، جو ایک خاص طرز کا موجد بھی تھا۔ اس کو فن تحریر کا استاد اول مانا جاتا ہے اور اُس کا نام بطور ضرب المثل مشہور ہے۔

خلافت بنی اُمیہ کے زوال کے بعد جب اسلامی حکومت عباسیوں کے قبضہ میں آئی تو اس عہد میں علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ فن تحریر نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔

”ابوالعباس سفاح“ کے عہد میں جو دولت عباسیہ کا بانی تھا ”ضحاک بن عجلان“ شامی ایک نامور خوشنویس گزرا ہے جس نے قدیم رسم الخط میں بہت کچھ اصلاح کی۔ اُس کے بعد خلیفہ ”منصور عباسی“ کے زمانہ میں ”اسحاق بن ہما“ ایک مشہور خطاط پیدا ہوا۔ اُس نے ضحاک کے اصلاح کردہ رسم الخط میں اور بھی خوبصورتی پیدا کی پھر خلیفہ ”مہدی عباسی“ کے زمانہ میں ”خلیل ابن احمد“ نحوی، ایک نامور فاضل پیدا ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر سب سے زیادہ توجہ کی اور تکمیل کے درجہ تک پہنچا دیا۔

خط کوفی کچھ عرصہ کے بعد علامہ ”علی بن مزہر“ کسان نے اس فن پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور خلیل نحوی ہی کے اصلاح کردہ رسم الخط میں حسن کتابت کی ایسی شان پیدا کر دی جس سے اس کو عام مقبولیت حاصل ہو گئی، اُس کے اصلاح کردہ رسم الخط کو ”کوفہ“ والوں نے بہت سراہا اس لئے اُس کا نام ”خط کوفی“ پڑ گیا۔ کسائی نے ۱۸۲ھ میں انتقال کیا۔ وہ خلیفہ ”مامون الرشید“ کا استاد تھا۔ مامون کو قدیم خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں جمع کرنے کا بہت شوق تھا، اُس کی لائبریری میں بہت قدیم کے جملہ خطوں کے نمونے موجود تھے۔

خط نسخ باوجود ان تمام ترقیوں کے زمانہ کوفہ میں مسئلہ کی شدید ضرورت تھی، اس فخر و زکا کا کاتب کا نام ”ابوعلی محمد بن یحییٰ“ تھا۔ لقب ”ابن مقلہ“ تھا۔ اُس کی ولادت ۲۶۶ھ میں ہوئی۔ عالم شباب میں تکمیل علوم و فنون کے بعد جب اقبال پاؤں تو خلیفہ ”القاسم الرشید“ عباسی کا وزیر مقرر ہوا، اور جب ادبار آیا تو ہاتھ کے ساتھ زبان بھی کاٹ ڈالی گئی اور قید کر دیا گیا۔ اسی حالت میں ۳۲۸ھ میں انتقال کر گیا۔

اُس کے زمانہ تک گو ”خط کوفی“ میں غیر معمولی ترقی ہو چکی تھی مگر اس خط میں نمایاں شان اور دلچسپی ”ابن مقلہ“ ہی کا حصہ تھا۔ اُس نے کسائی اور متاخرین کی وصلیوں سے فائدہ اُٹا کر ۳۲۸ھ میں ”خط نسخ“ ایجاد کیا جس نے تمام قدیم رسم الخط کو مٹا کر اپنا سکھ جادیا۔

موجودہ حرکات و سکنات زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین، ابن مقلہ ہی کی ایجاد ہیں۔ رفتہ رفتہ ان حرکات و سکنات کا رواج عام ہوتا گیا، حتیٰ کہ اب ان کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس قسم کی غلطی طباعت کا بڑا نقص سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی دنیا میں ابن مقلہ کا ایجاد کردہ ”خط نسخ“ اس قدر مقبول ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر ظلم پھیر دیا۔

اُس کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب اُس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالا گیا تو وہ کہنی میں کھپچی بازو کر لکھا کرتا تھا، اس حال میں بھی اُس نے جو کچھ لکھا تھا وہ بجائے خود لا جواب تھا۔

ابن بواب ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً چوراسی سال بعد ایک اور نامور کاتب ”ابو الحسن علی“ پیدا ہوا اس کا باپ ”ہلال“ امیر تبوہ کے دروازہ پر چوکیدار تھا، اسی نسبت سے وہ ”ابن بواب“ کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ کس کو خبر تھی کہ بعد میں ”ابن ہلال“ آسمان شہرت پر بدرِ کامل بنکر چلے گا اور دنیا اُس کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

ابن بواب دراصل ابن مقلہ کا معنوی شاگرد تھا اس لئے کہ اُس کو سمسائی اور محمد بن اسد سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو ابن مقلہ کے شاگردِ رشید تھے، اسی وجہ سے ابتدا میں اُس کی بھی شانِ تحریر ابن مقلہ کی جیسی تھی لیکن بعد میں اُس نے خطِ نسخ میں جو خامیاں رہ گئیں تھیں اُن کی اصلاح کی اور اُس میں وہ حسن پیدا کیا جو سب پر فوقیت لے گیا۔

ابن فلکان اور امام یافعی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی کاتب ابن بواب کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ ابن مقلہ اگرچہ خطِ نسخ کا موجد ہے لیکن اُس کی تہذیب اور حسن و جمال کا سہرا ابن بواب ہی کے سر ہوا۔

یہ مشہور روزگارِ خطاط ۱۳۷ھ میں فوت ہوا آج دنیا میں جہاں سے جہاں تک ”خطِ نسخ“ جاری ہے وہ سب طفیل ہے ابن مقلہ اور ابن بواب کی کوششوں کا۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا عرب پران دونوں کاتبوں کا لایک ایسا احسان ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

صحافت زمانہ جاہلیت میں نہ کوئی علم مدون ہوا اور نہ کوئی کتاب تصنیف کی گئی، عربوں کی سب سے قدیم کتاب ”قرآن پاک“ ہے۔ کچھ معابدات و فرامین اور وہ خطوط بھی آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جمع کر لئے گئے تھے جو آپ نے مختلف سلاطین و امراء کے پاس روانہ فرمائے تھے۔

خلفاء راشدین کے عہد میں اسی تحریری ذخیرہ کے اندر ”احادیث کا کچھ اور اضافہ ہوا، لیکن کسی قسم کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اُس وقت سوائے ”کتاب اللہ“ کے کسی اور کتاب کا وجود نہیں تھا۔ ”ہر بنی امیہ میں سب سے پہلے ”عبید بن شریہ“ نے قدام کی تاریخ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا۔ ”کتاب الملوک و اخبار الماضیین“ افسوس ہے کہ یہ کتاب ضائع ہو گئی جس کا اب ہمیں پتہ نہیں۔

عبید بن شریہ کے بعد عہدِ اموی میں اور بڑے بڑے اہل قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے جو ہمیشہ سلاطین و امراء کے دربار سے وابستہ ہوتے تھے اور اُمورِ مملکت میں ہمیشہ ان کی طرف سے قوم و ملک کے

سامنے پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔ ”عبدالحمید بن یحییٰ“ جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اس دور کا آخری صاحبِ قلم اور فنِ صحافت کا ماہر اُستاد تھا۔

ابو مسلم خراسانی نے جب بنو عباس کے لئے پروپیگنڈہ شروع کیا تو عبدالحمید نے دورِ اموی کے آخری تاجدار ”مردان“ کی طرف سے اُس کو ایک طویل خط لکھا اور مردان سے کہا کہ میں نے ابو مسلم خراسانی کو ایسا خط لکھ دیا ہے کہ جب وہ اُسے پڑھے گا تو اُس کی ساری تدبیریں بیکار ہو جائیں گی۔ لیکن یہ خط جب ابو مسلم کے پاس پہنچا تو اُس نے بغیر پڑھے جلوا ڈالا اور مردان کو لکھ بھیجا :-

محا السیف استار البلاءة دانتحی،
علیک لیوث الغاب من کل جانب

دورِ عباسیہ میں بے شمار علماء و فضلاء، بڑے بڑے اہلِ قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے تصنیف و تالیف کا باقاعدہ محکمہ قائم ہوا۔ جس میں علومِ شرعیہ اور علومِ انسانیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ علمِ تاریخ کی بھی تدوین ہوئی، علومِ یونانی کے بھی ترجمے کئے گئے اور علومِ عقلیہ و نقلیہ کی ہزار ہا کتابیں تصنیف ہو گئیں جو آج تک ہمارے لئے سرمایہٴ صداقت و افتخار ہیں۔

جلیل الرحمن اعظمی

”نگار“ کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دوتین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(۱۳۲۷ء) جنوری ۵ء - (۱۳۲۷ء) مئی ۴ء - (۱۳۲۷ء) جولائی تا دسمبر ۴ء فی پرچہ (۱۳۲۷ء) جنوری ۱۱ء
فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ء فی پرچہ - (۱۳۲۳ء) فروری و جولائی ۴ء فی پرچہ - اکتوبر ۵ء
(۱۳۲۷ء) جنوری ۶ء - فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ء فی پرچہ - (۱۳۲۷ء) جنوری ۷ء - مارچ
تا اگست ۶ء فی پرچہ - (۱۳۲۷ء) پورا فائل ص ۷ -
مینجر نگار لکھنؤ

سوویت ادبیات میں اشتراکی "واقعت"

یہ سلسلہ مضامین خود روسی مصنفین کے مضامین سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے اس مطالعے سے ہمارے "پڑانے اسکول" کے ادیب "واقعت نگاری" کا انشا، سبھی سکیں اور "نئے لکھنے والے" محسوس کر سکیں کہ خود سوویت مصنف بھی اپنے پڑانے ادب کو ترک نہیں کر سکا اور اس وقت وہ جو کر رہا ہے "انقلاب" کے بعد کر رہا ہے، قبل انقلاب اُس کی حالت بھی ہماری موجودہ حالت سے مختلف نہ تھی

ل۔ احمد

بورژوا طبقے کا پرانا عقیدہ تھا کہ پروتاریا جماعت تخریب تو کر سکتی ہے، لیکن تعمیر کی اہل نہیں۔ لیکن روس کے پہلے پنچسار پلان کی کامیابی نے اس روایتی عقیدے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں سنٹرل کمیٹی اور سنٹرل کنٹرول کمیٹی کے عام اجلاس میں اسٹالن نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ :-

"پنچسار پلان کے نتائج نے ثابت کر دیا ہے کہ مختہ طبقہ نئی تعمیر کا اُسی قدر اہل ہے جتنا کہ پرانی عمارت کو ڈھانے کا۔" ہمیشہ سے بورژوا طبقہ اس خیال پر عقیدہ پراڑا ہوا تھا کہ مختہ طبقہ اقتصادی اور حرفتی تخلیق ہی کی استعداد سے محروم نہیں بلکہ وہ کلچر، صنعت اور ادب میں ہی کوئی تخلیقی اہلیت نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس "روایتی" عقیدے کے باوجود مختہ طبقہ نے (کسانوں مزدوروں ہی میں سے) اپنی سولہ سال کی ڈکٹیٹری کے زمانے میں بہت سے اہل قلم اور ادیب پیدا کر دکھائے ہیں اور سوویت یونین میں ایک نیا ادب جو متمول ہونے کے ساتھ متنوع بھی ہے، پیدا ہو گیا ہے یہ ادب پڑانے "انقلابی" ادب اور نئے بورژوا ادب، دونوں سے بالکل مختلف اور جدا گانہ ہے۔ انقلاب سے قبل روس کا ادب یعنی اُس بورژوا روس کا ادب جس میں "سرفیت" (کسانوں کی موروثی غلامی) جاری تھی، اگر دکھایا جائے گا اور اُس زمانے کے مصنفوں کی کتابوں پر سے رائے قائم کی جائے گی تو صاف نظر آئے گا کہ وہ ادب عمال

لہ دسلہ *Bourgeois* یعنی سرمایہ دار جماعتیں اور *Proletaria* یعنی مختہ جماعتیں۔

جماعت کے عندیات کا ترجمان ہے۔ یہ صنعت ادب اگرچہ حکمران طبقوں کی پالیسی پوری کرتی تھی، لیکن اس کے اندر بورژوا طبقے کی فضا بھی جھلکتی تھی۔ کیونکہ قبل انقلاب کا یہ بورژوا ادب آخری حد تک قنوطی (Pessimism) ہو گیا تھا۔ اس ادب کو مستقبل پر مطلق عقیدہ نہ رہ گیا تھا۔ وہ انسانیت کے صرف منفی پہلو کو دیکھ سکتا تھا اور اس ادب کی یہی خصوصیت تھی جس کے باعث قبل انقلاب کے ذہین طبقے میں سب سے زیادہ محبوب شاعر (Leonid Andreyev) سمجھا جاتا تھا۔

انقلاب سے پہلے کا اشرافی (Arshiforatie) اور بورژوا ادب زندگی سے کس قدر ناخوش تھا، اس کے جواب میں (Pablok) کا ایک شعر سنایا گیا کافی ہے:

"بیس سال کی عمر میں، میں ایک روغن کی ہونی لاش تھا"

یہ وہ ادب تھا جس کے اندر حقیقی اور زندہ جذبات کی جگہ ایک نہایت مصنوعی و مردہ احساسات پیش کی جاتے تھے اور ادیب ان احساسات کو بیان کرنے میں "زندگی" کو بھلا دینا چاہتا تھا عندیات کے اعتبار سے یہ ادب روز بروز دیوانہ ہوتا جا رہا تھا: (Moye dno) مختصر یہ کہ اس نے:

"بہتوں سے غداری کی" اور اس نے "میدان جنگ میں جھڑپ کو چھوڑ دیا"

ایسے بورژوا ادب میں جس کا کوئی نصب العین نہ ہو، جو زندگی سے رشتہ توڑ چکا ہو، جو بناوٹی احساسات کا ادب ہو، اس ادب میں اگر خلافت "واقیت" صنعت کو اتنی زبردست قبولیت لمبائے توحیرت کی بات نہیں۔

قبل انقلاب کا بورژوا ادب "واقعاتی مرقعوں" کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور اس ادب کے روایت پرست تعلیم دے رہے تھے کہ دنیا کا بیان اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کی فہم دشوار ہو۔ چنانچہ ایک مبہم قسم کی بعید المذاقی اشارہ وجود میں آ رہی تھی۔

لیکن اس مسموم ماحول میں چند اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے ادب کی جڑیں محنت کش اور مظلوم انسانوں کی زندگی کے اندر پھیل رہی تھیں اور جو آئندہ ایک بہتر زندگی کی پالیسی کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ان پر وہ آدھی مصنفوں میں سب سے پہلا نام میکسم گورکی کا ہے۔ ان چند ادیبوں نے اس وقت بھی وہ ادب پیش کیا جو سمجھ میں نہ آتا تھا، جو عوام سے قریب تر تھا اور سچے احساسات کی بنا پر زندگی کے تجربوں سے مالا مال تھا۔

سوویت ادب، طبقاتی جدوجہد کے ماحول میں پھلا پھولا اور طاقتور بنا۔ اور انقلاب کے ابتدائی سالوں میں بہت سے اہل قلم اپنے ادب کو ان خیالات و عقائد کے خلاف صرف کرنے میں لگے رہے جو انقلاب کے لئے مضر سمجھے جاتے تھے۔ ادب کے اندر یہ ہفتائی جنگ تو ہونا جاری ہے۔ مگر اب مزدوروں کا یہ دشمن کھلے سامنے نہیں آتا بلکہ ادب کے اندر مارا ستین بن گیا ہے۔ حال ہی میں شاعر (Zabolodsky) نے نظریات اشتراک میں

اشتراکی تعمیری زراعت کا مضحکہ اُسی طرح اُڑایا ہے جیسے زمیندار طبقہ (Kulak) اُڑاتا تھا۔ اسٹالن نے ایسے اہل قلم کو ”اندر ہی اندر (خون) چوسنے والا“ کہا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اب حالات و اسباب پروتاریا کے زیادہ موافق ہو گئے ہیں۔

سوویٹ طاقت کے وجود میں آنے کے بعد سے، مزدوروں اور کسانوں کی جماعتوں میں اہل قلم کی بڑی تعداد پیدا ہو گئی اور ہو رہی ہے۔ علاوہ بریں ذہین طبقے کے اُن اہل قلم کی بڑی تعداد جو کسی پارٹی میں شامل نہ تھے اشتراکی تعمیر کی جدوجہد میں شریک ہو گئی ہے۔

س. پ. ک. کی مرکزی کمیٹی ادبی پیداوار کی طرف سے کسی وقت غافل نہیں رہتی اور اُسے ہر امکانی مدد پہنچاتی رہتی ہے اور یہی مقصد ہے کہ کمیٹی نے سوویٹ اہل قلم کی تنظیم کو بھی اشتراکی تعمیر کے کام میں ضروری قرار دیا، اور مصنفین کی ایک ”یونین“ قائم کر دی۔

چنانچہ آج سوویٹ مصنفین کی بہت بڑی تعداد اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ ان کی دماغی قلمی پیداوار نئے سماج کی تعمیر میں کارآمد ثابت ہو اور سوویٹ ادب کو فحنتی جماعتوں اور اشتراکیت کے اعلیٰ اصول سے جو تعلق حاصل ہے، اُس نے اس ادب میں ایک شدید قسم کی زندگی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ قبل انقلاب کے ادب سے اس نئے ادب کا جب کبھی مقابلہ کیا جائے گا تو اس کی یہ خصوصیت نمایاں نظر آئے گی کہ اس کے اندر زندگی کے ساتھ ایک خاص نشوونما کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے۔

ایک بلند پایہ سوویٹ ادیب اس حقیقت پر فخر کرتا ہے کہ اُس کے ادب میں لکھو کھا مزدوروں اور کسانوں کے دلوں اور آرزوں کا، اُن کی جدوجہد اور فحنتوں کا، اظہار ہے۔ سوویٹ ادب ”زندگی“ کا جتنا پیا سا ہے، اس کا اندازہ کر سنا دشوار ہے۔ اُس کی ہر گھڑی زندگی پر رہتی ہے اور وہ ہر وقت زندگی سے سبق لیتا رہتا ہے اور کسی سوویٹ مصنف کا قلم ایسے موضوع پر نہیں چلتا جس کی نوعیت اشتراکی نہ ہو یا اُس موضوع پر اس کا مطالعہ کامل نہ ہو۔

اور یہ مصنف زندگی کا یہ علم خود اُس زندگی میں شامل ہو کر حاصل کرتے ہیں۔ تعمیری کاموں میں، زراعت میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں، کام کر کے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے اور سوویٹ ادب کے اس قدر بشاش اور زندہ دل ہونے کا راز یہی ہے کہ لکھنے والا اُس جم غفیر کی زندگی سے رشتہ جوڑ لیتا ہے جو اپنی زندگی کو نئے سرب سے منظم کر رہا ہے اس پروتاریا ادب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے رجائی (Optimism) پہلو کو دیکھتا

ہے اور اس طرح یہ دنیا کے حزنی ادب کی مشکلوں کو بھی حل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر موت ہی کے مسئلہ کو لیجئے گھچلے زمانے کے ادب میں اس سوال نے بے حد مایوسی کا اظہار کر دیا ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والی آہ و زاری نے زندگی کو بے معنی ٹھیرا دیا ہے۔ موت ہی کا ڈر تھا کہ الٹائی ساز زندگی کا پجاری انسان، دنیا کی خوشیوں کو تیاگ کر

گوشہ نشین ہو گیا !

سوویٹ ادب اس بات کو اتنا ہے کہ مرنے والے کی موت اس کے دوستوں عزیزوں کے لئے واقعی رنجہ ہے، کیونکہ یہ فطرت ہے، لیکن موت اس کے سامنے ایک جدوجہد کی صورت میں آتی ہے۔ اس ادب کی نظر میں ایک ایسی موت جو نوع انسان کے لئے جلد سے جلد مسرت حاصل کرنے کی فکر میں لاحق ہو وہ ایک ”ذہین موت“ ہوگی ! اور ایسی موت، موت نہیں زندگی کا اثبات ہے ! تصدیق حیات کی ایک علامت ہے ! اس بات کی علامت ہے کہ زندگی کے لئے بہترین نظام کو ممکن العمل بنالینے کی کوششوں کو چند در چند کر دیا جائے۔

چنانچہ فیڈرٹف کے ناول میں حامی انقلاب جماعت کا بہت بڑا حصہ سائبریا میں اسی نصب العین پر قربان ہو جاتا ہے۔ وٹسکسکی کی کتاب (Optimistic tragedy) یا کوڈونوف کی (Past script) بھی اسی ذیل کی تصانیف ہیں۔

سوویٹ ادب کا مقصود یہ ہے کہ اشتراکی مسئلے کے حل میں صناعت ادب کا آمدنات ہو۔ چنانچہ اسس مقصود کے تحت سوویٹ ادب کی ”واقعت نگاری“ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس اشتراکی واقعت نگاری کو اُس ”واقعت“ سے مماثل سمجھنا ایک غلطی ہوگی جو فقید المثل اور منفرد باتیں پیش کرتی ہے۔ اشتراکی ”واقعت“ اپنے ہیرو کو اُسی کے ماحول میں پیش کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ افراد کی حرکت و عمل تاریخ کو بدل دینے میں کس درجہ موثر ہو سکتی ہے۔

ایسی کامیاب تصانیف میں شلوخوف کا ناول (Dante Don) روس میں سول وار کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ اُسی کا دوسرا ناول (Sankhaptur mek) ”سب ل“ کہیتی کا ماحول پیش کرتا ہے۔ مزدوروں کے اندر ”اشتراکی مقابلہ“ یعنی سبقت لے جانے کی کوشش کا پورا مرقع کٹائیٹ کے ناول (Time forward) میں نظر آتا ہے۔ اور بھی بہت سی تصانیف ہیں جو اسی قسم کے ماحول اور حالات کی تصویریں کھینچتی ہیں۔

نیا سوویٹ ادب تاریخی موضوع کو بھی نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ گرامسکی کو وہ عوام کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جن کے خیالات و نظریات کا وہ حامل ہے ! سوویٹ مصنف جب تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کے سامنے اُس زمانہ کے جفاکش عوام کی حالت اور اُن طبقوں کا ”سماجی منصب“ بھی آتا ہے۔ اس کے برخلاف بورژوا ادب بالعموم اس پہلو کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔

حال میں جو تاریخی ناول شائع ہوئے ہیں، اُن میں (Kostel) کا ”پیٹر اول“ پیروٹنی کا ”سیما“ اور السو بولیف کا ”کپلیٹ ادر ہال“ بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ آخر الذکر کے اندر قبل انقلاب روسی بیڑے کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

”اشتراکی واقعت نگاری“ جسے سوویٹ ادب قائم کر رہا ہے، وہ اُنیسویں صدی کی ”واقعت نگاری“ سے بالکل جدا چیز ہے۔ میکسم گورکی کی باریک بین نظر نے اس فرق کو جس طرح دیکھا، وہ اُس نے انشا پر دازوں کے مجمع سے گفتگو کے دوران میں ان لفظوں میں پیش کیا تھا۔

”اُنیسویں صدی کی واقعت نگاری تنقیدی تھی جس کا مقصد سماجی خرابیوں پر تلے زنی کرنا یا عیب دکھانا تھا، اس کے آگے وہ کوئی قطعی بات پیش نہ کرتی تھی۔ اشتراکی واقعت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قطعی اور اثباتی پہلو کو پیش کرتی ہے، اور ہماری واقعت نگاری کا قطعی اور اثباتی ہونا اُسے سوویٹ زندگی کے عیبوں کے خلاف جدوجہد سے باز نہیں رکھتا!“

چنانچہ سوویٹ ادب اشتراکی عندیوں پر مبنی ہے اور یہ عندی حقیقی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ سوویٹ ادب حقیقی اور سچے ہیرو پیدا کرتا ہے، جو پرانے ادب کے ہیرو کی طرح محض اخلاقی نظریات کے پتلے یا صرف معدوم کرنے والے ہیرو نہیں ہوتے بلکہ وہ خود ”معمار“ ہوتے ہیں، خلاق ہوتے ہیں، ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک ایسی سماج کو منظم کر رہا ہے جس کے کردار، خیالات کی پُرچ اور دولت مندی کا ثبوت ہوتے ہیں۔

یہاں ہم، سوویٹ روس کے لکھنے والوں میں بورژوا مصنفین کی طرح اعلیٰ داد دے، قومی دکرور لکھنے والے بھی ہیں۔ لیکن چونکہ سوویٹ مصنف کا رشتہ محنتی عوام اور اشتراکی حقیقتوں سے ہوتا ہے اور ہر سوویٹ مصنف ان حقیقتوں کے اظہار کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کسی درجے کا بھی مصنف ہو اس کے اندر ”نیا“ ہونے کا وصف ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سوویٹ مصنف ادبی مشکلات سے دوچار نہیں ہوتا اور اُس کا کام سہل ہے۔

دنیا کے ”روایتی“ ادب میں بالعموم بادشاہ، اشراف، بورژوا، یا انفرادیت پرست شخصیات (مذکورہ بالا) فہم انسان ہیرو ہوتا ہے، لیکن سوویٹ ادب کا ہیرو ایک بالکل ہی نئی ہستی ہے (کوئی مزدور یا کسان ہے جسے استحصال یا بکری جھول اتار دینا کی ہے) اور یہ حقیقت ہر سوویٹ مصنف سے ایک ایسا ”نیا“ کردار پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے جس کی مثال پہلے سے موجود نہیں۔ چنانچہ یہی وہ خصوصیت ہے جو سوویٹ ادب کو ”نیا ادب“ بناتی ہے۔ سوویٹ ادب محض اس بنا پر ”نیا“ نہیں کہ اس کے اندر انشاء و بیان کی ندرت یا فنکاری ہے، بلکہ وہ ”نیا“ ہے اس لئے کہ اس میں نیا نظری و موضوعی مسالا ہے جو اس وقت تک کی تاریخ ادب میں مفقود تھا۔ اس ادب کے کردار سے دنیا اس وقت تک ناواقف تھی۔

سوویٹ ادب اپنے عیبوں یا کمیوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ بورژواک ”خود تنقیدی“ بھی سوویٹ ادب میں اتنی ہی ضروری شرط ہے جتنی دوسرے کاموں میں سوویٹ ادب کی بڑی کمی سمجھی جا رہی ہے کہ

وہ ابھی تک سوڈیٹ زندگی کے دوش بدوش چلنے سے عاری ہے، وہ سوڈیٹ تعمیر اور اشتراکی کاموں کے ہیر و کوپوری طبع صناعت تکمیل کے ساتھ نہیں دکھا سکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ سوڈیٹ زندگی جتنی تیز رو ہے انکا ادب اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ سوڈیٹ مصنفوں کو احساس ہے کہ ابھی تک ان کے ادب میں ”ذہین طبقے“ (*intelligencia*) کے ہیر و کوپڑی جگہ ملی ہوئی ہے، حالانکہ اصل زندگی یعنی تعمیری کاموں میں طبقاتی جنگ میں، ”سب مل“ مزدور اور کسان چھایا ہوا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں محنتی طبقہ جو کارخانے اور فیکٹریوں میں قائم کر رہا ہے، ”سب مل“ کسان جو زراعت کر رہا ہے، آگے آگے ہے اور یہی لوگ ہیں جو زندگی کی سب اچھی چیزیں پیدا کر رہے اور دنیا کو روٹی کھلاتے اور کپڑا پہناتے ہیں، جو اپنے اعلیٰ دھڑکنے والے کام کے بارے میں زبان بھی نہیں کھولتے۔ یہ لوگ نئی زندگی کے ڈھالنے والے ہیں اور یہی سچے ہیر و کوپڑی ہیں۔

”سب مل“ زراعت کے (*Commonwealth*) کی آل یونین کانگریس میں اسٹالن نے اسی بات پر زور دیکر کہا تھا کہ:-

”یہ نئی زندگی کو پیدا کرنے والے ہی اصل ہیر و ہیں — ہمارے ادب میں انھیں کو جگہ ملنا چاہئے۔“

سوڈیٹ کسان مزدور اپنے ادیبوں اور انشاء پردازوں سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ دوسرے پنجبالہ پروگرام میں یہ کمی باقی نہ رہنا چاہئے۔ چونکہ اشتراکی تعمیر کے عند نے سوڈیٹ ادب کے مہم ہیں اس لئے یہ ادب رول جفاکش انسانوں کا محبوب بن گیا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اس محبت کا مستحق بھی ہے۔ کیونکہ سوڈیٹ ادب نئے آدمیوں کا ادب نہیں بلکہ ایک ایسا ادب ہے جو اشتراکی تعمیر میں اپنا پورا فرض ادا کر رہا ہے۔

آل یونین کمیونسٹ پارٹی نے اپنی سترھویں کانگریس میں اپنی کامیابیوں اور اپنے کاموں کے نتیجوں کا جائزہ لیکر دوسری پنجبالہ اسکیم اور اُس کے اقتصادی و کلچری پروگرام پر تصدیق کی مہر لگا کر پھر ایک دفعہ نین کے اصول کی روشنی دہایت میں آئندہ کی فتح و کامیابی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ اس عظیم الشان اور مشترک کام کی انجام دہی اور اسکی اہمیت کو سمجھ کر اپنا فرض ادا کرنے میں، سوڈیٹ مصنف کو وہ ولولہ مل جاتا ہے جو ”سب مل“ اسپرٹ اور اشتراکی تخلیق کا دلہہ ہے، اور جو پارٹی اور اُس کے مقتدر لیڈر اسٹالن کی بلند خیالیوں سے حاصل ہوتا ہے۔

سوڈیٹ ادب اپنے پڑھنے والوں کو شخصی ملکیت اور انانیت پر فتح پالنے کے لئے طیار کرتا ہے، اختصاص بالبحر کے پنچے سے مکلی ہوئی انسانیت کو براہدانہ اتحاد کے نام پر، ملکیت اور انانیت کے شعور کو زیر کر لینے کے لئے طیار کرتا ہے۔ نئی فتوحات کا یہ زمانہ یعنی سوڈیٹ یونین کے میدانوں میں مقام رکھنے کا زمانہ، بلاشبہ سوڈیٹ ادب کے لئے بھی نئی فتوحات کا زمانہ ہوگا۔

ل۔ احمد

عندلیب شادانی و حسرت موبانی

جناب پروفیسر عندلیب شادانی نے مولانا حسرت موبانی کے کلام پر بعض اعتراضات کئے ہیں، جو میرے نزدیک بالکل غلط ہیں۔ میں اس مضمون میں انہیں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔
مولانا کا شعر ہے:

یوں شکر جو کرتے ہیں تیرے اداسناں، گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا
اس پر جناب شادانی کا اعتراض یہ ہے کہ فعل حال جب مثبت سے منفی بنایا جاتا ہے تو اس کے آخر سے ”ہے“ ”ہوں“ اور ”ہیں“ کو گرا دیتے ہیں اور اس کے پہلے علامت نفی لگا دیتے ہیں۔ شادانی صاحب نے اس قاعدہ کو کلیہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ منفی حالت میں ہے اور یہیں وغیرہ کا حذف کر دینا جائز ہے ضروری نہیں۔ چنانچہ تمام اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہاں تک کہ بعض غزلوں کی ردیف ہی ”نہیں ہے“ یا ”نہیں ہیں“ ہے۔ تیر کی ایک غزل کا شعر اسی زمین میں ملاحظہ ہو:

مری آنکھوں میں قدر ہستی نہیں ہے پسند ایک دم کی یہ مستی نہیں ہے
میرا نہیں فرماتے ہیں!

کی عرض میرے جسم پہ جسوقت تک ہے سر ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بدگہر
شادانی صاحب کے اصول کے مطابق تیر کی غزل کی ردیف ہی غلط ہے اور میرا نہیں نے بھی نہیں کے بعد ہے کا استعمال غلط کیا ہے۔

حسرتیں وقف طرب ہیں آرزو مجھ سرور بخت نے کھولا ہے روئے شوق پر باب نشاط
شادانی صاحب کا اعتراض ہے ”حسرتیں“ جمع اور ”آرزو“ واحد لکھنا درست نہیں۔ اس اعتراض کا سبب یہ ہے کہ معترض نے جس کا فاعل آرزو کو بھی قرار دیا ہے، حالانکہ ایسی صورت میں آرزو کا فعل ”ہے“ محذوف مانا جائیگا یعنی نشر کرنے پر صورت یہ ہوگی کہ ”حسرتیں وقف طرب ہیں، آرزو مجھ سرور ہے۔“

سب آئے پر اک تو: آیا نہ آیا تیرا دیر دیکھا کیے راستہ ہم (مولانا حسرت)
 اعتراض :- مصرعہ ثانی محل نظر ہے اگر اس کی نشتر کی جائے تو یہ ہوگی ”ہم دیر تیرا راستہ دیکھا کئے“ مگر اردو میں اس طرح
 نہیں بولتے ”دیر تک راستہ دیکھا کئے“ یا ”بہت دیر راستہ دیکھا کئے“ کہنا چاہئے ”تہا“ ”دیر“ صحیح نہیں۔
 اس وقت کے محاورہ کے لحاظ سے اعتراض درست ہے، لیکن حسرت نے اکثر جگہ اساتذہ قدیم کے قبیح میل اس
 قسم کی ترکیبوں کو جائز قرار دیا ہے۔

تمیر کا شعر ہے :

غش سرا ختام تھے وہ جلد جو ہشیار ہوئے ہمتو! ہمنفساں دیر خبر دار ہوئے
 جھوٹ ہر چند نہیں یار کی کفار کے بیچ دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ
 ملا بتو نہ وہ ملنا سخت اس کا، نہ ہم سے دیر آنکھ اس کی ملا کی
 مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے بیدار سارے فتنہ خواہیدہ کر چلے (مولانا حسرت)
 ترانا ز بھول بیٹھا مری سب نیاز مندی بغرور دلربائی بقیں دل پسندی ()
 ”سب“ اور ”سارا“ پر اعتراض ہے لیکن یہ وہ نکتہ ہے کہ پروفیسر صاحب کے علاوہ کسی نے اس کا لحاظ نہیں کیا!
 جب یہ نہ ہو تو کیوں نہ ہو دنیا و دیں خراب سارے لگاؤ رہتے ہیں دل کی لگی کے ساتھ (داغ)
 مجھے ساری بلائیں بھر کی شب دکھنی ہوگی جگامے لیکے چٹکی درد دل صوبت غافل ہوں ()
 ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہہ چلے منہ پر ہمارے کام سارے دیدہ تر ہی ڈلوتا ہے (تمیر)
 حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی (اقبال)
 آبلہ پہلے پڑا پھر زخم اس کے بعد داغ مختصر یہ ہے یونہی سب گھر ہمارا جل گیا (عزیز کھنوی)
 شام ہو یا کہ سحر یا داغ نہیں کی رکھنی، دن ہو یا رات ہمیں ذکر انھیں کا کرنا (حسرت)
 اعتراض یہ ہے کہ: ”یا“ اور ”کہ“ کی یکجائی صحیح نہیں کیونکہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اس کے جواب میں اقبال کے
 چند اشعار پیش کرتا ہوں :

نہ تھا اگر تو شریک محفل، تصویر تیرا یا کہ میرا مرا طبقہ نہیں کر رکھ لوں کسی کی خاطر سے آئینا!
 دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد، سالک رہ ہو تیار! سخت ہے یہ مرحلہ
 میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات
 محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن کہ ہم ہو گئے جسم خاکی سے نور می
 لفظ ”جسم“ پر اعتراض ہے اور ارشاد ہے کہ ”زندہ انسان پر مطلق جسم کا اطلاق صحیح نہیں“ حالانکہ اساتذہ نے جسم

کا استعمال اس معنی میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جسم سے نکلی تو پہنچی کعبہ مقصود کو
بتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ

بے لباسی بن گئی ہے جامہ احرام روح (خواہد تیر)
کس قدر ہمدرد سارے جسم میں ہوتی ہے آنکھ

خود جناب پروفیسر صاحب کا شعر ہے:

کیا مرے خواب میں بھی آنیکا قدغن ہے تمہیں
آگئی کس کے جمال عرق آلود کی یاد

قید ہے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں،
رات بھر تجھ میں گنتے رہے تارے عاشق (مولانا حسرت)

اعتراض یہ ہے کہ ”جمال عرق آلود“ کی ترکیب معنوی اعتبار سے محض مہل ہے پسینہ چہرے پر آتا ہے جمال پر نہیں یہاں ”جمال“ سے ”شخص جمیل“ مراد لینا بھی ممکن نہیں کیونکہ ”کس“ اس کے منافی ہے ”جمال“ کی جگہ چہرہ عارض رُخ کوئی لفظ ہونا چاہئے۔

عرض ہے کہ ”جمال“ سے یہاں مجازاً چہرہ ہی مراد ہے۔ اس لئے غلط نہیں۔

شوق لقاے یار میں مرتے تو ہو مگر
اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں

حسرت جو نقد جان نہ ٹھہرے بہانے ناز
تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آج کل

مجھ کو معلوم ہے پیمائے میں ساتی،
تو نے جو کچھ کمری آنکھ بچا کر چھوڑا

پہلے شعر میں اعتراض، اعلان نون پر ہے، دوسرے شعر میں (سہ آکل) پر اور تیسرے میں (کہا پر) اس کے جواب میں خود شادانی صاحب کے دو شعر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

دل کا خون آنکھ میں کھینچ آئے تو کیا اسکا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ دراز نہ ہو،

پہلے مصرع میں خون کا اعلان نون ضروری تھا اور دوسرے مصرع میں ”یہ“ بالکل بیکار ہے صرف اتنا کہنا کافی تھا ”نالہ روکا تھا کہ پردہ دراز نہ ہو“ لیکن صرف مصرع پورا کرنے کے لئے ”یہ“ اضافہ کیا گیا۔ نون غنہ بہت آسانی سے یوں دور ہو سکتا تھا:

”خون دل آنکھوں میں کھینچ آئے تو کیا اس کا علاج“

شادانی صاحب کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

ہو کے یا یوس بھی ہم جیتے ہیں ہاں ہم جیتے ہیں
وائے وہ زیست اجل پر بھی جسے ناز نہ ہو

پہلے مصرع میں بقول پروفیسر صاحب ہم جیتے ہیں کی تکرار غلط ہے۔ اور ”ہم“ تو بحر سے دامن چھڑا چکا ہے۔

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ آج کل
تکلیف اضطراب کی شدت ہے آج کل

روح نے پانی ہے تکلیف جلدائی سے نجات
آپ کی یاد کو سراپا راحت کمرے کے

اعتراض یہ ہے کہ ”تکلیف“ عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ”مطافعت سے زیادہ کام لینا“ اور فارسی

میں مطلق ”کام لینا“ کے معنی میں آتا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں دکھ، رنج، ایذا، مصیبت، پتلا، دشواری۔ ان معنوں میں اگر استعمال ہو تو ”تکلیف“ اردو کا لفظ ہے مذکورہ بالا اشعار میں معنی ”ایذا“ استعمال ہوا ہے لہذا ”تکلیف اضطراب“ اور ”تکلیف جدائی“ کی ترکیب غلط ہے۔

حسرت نے تکلیف کا استعمال اس کے اصل معنی میں کیا ہے۔ اردو کے مستعمل معنی کے لحاظ سے نہیں کیا۔
 اک ہونے دیکھ مجھے شیوہ یاری آیا وہ بھی کچھ کام خدمت میں تمھاری آیا (حسرت)
 اعتراض۔ ”یاری“ فارسی لفظ ہے اور فارسی میں معنی ”مدد و نصرت“ مستعمل ہے ظاہر ہے کہ اس شعر میں یاری معنی مدد و نصرت استعمال نہیں ہوا۔ لہذا ”شیوہ یاری“ کی ترکیب نادرست ہے۔
 اس کے جواب میں میر کا شعر ملاحظہ ہو:

داں سے شرم و عتاب ناز و ادا یاں سے اخلاص و دوستی، یاری،
 ناز بردار الم کھتا ہے نامہ میں مرے اس سر اپنا زکی منش، داں نگاری دیکھئے (حسرت)
 اعتراض۔ ناز بردار فارسی میں متعمل نہیں فارسی کا محاورہ ناز کشیدان ہے اس لئے ناز بردار الم کی ترکیب معیوب ہے۔
 اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ناز بردار لب ہے جاں جب سے تیرے خط کی خبر کو باقی ہے۔ (میر)
 ناز بردار جنوں حسن حسیناں کیوں نہیں شمع کے سر پر ہے روشن داغ سودا دیکھئے (زکی دہلوی)
 وصل کی جیب سے گئی ہے چھوڑ دل لاری مجھے ہجر کی کرنی پڑی ہے ناز برداری مجھے (میر)
 اردو زبان کا یہ مسئلہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کا نام لیکر خطاب کرتے ہیں تو پھر اس کے لئے ”آپ“ کا استعمال نہیں کرتے حسب اقتضائے سن و مرتبہ ”تو“ یا ”تم“ کہتے ہیں مثلاً:

اصغر! تم کلکتہ کب جاؤ گے؟ یا۔ اصغر! تو کلکتہ کب جائے گا؟
 حسرت! جھانے یا رکھو سمجھا جو تو دنا آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا
 تم سے گدا کو اس شہ جو باں کی آرزو حسرت! یہ اور کیا ہے جو دیوانگی نہیں
 کوئی نہ کہے گا! کہ اصغر! آپ کلکتہ کب جائیں گے؟ اظہار احترام مقصود ہو تو پہلے نام کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیتے ہیں تب ”آپ“ کا استعمال کرتے ہیں مثلاً اصغر صاحب! آپ کلکتہ کب جائیں گے۔ لیکن ”بادشاہ“ متغزلین مشرق کے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح کسی آئین کے پابند نہیں۔ ان کی زبان قانون ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں
 کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت آپ جاتے ہیں جو روزانہ سر شام کہیں
 حال کھل جائے گا بیتابی دل کا حسرت بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھنا نہ کریں

حسرت! اس کوچہ کا پھیرا روزِ نو اچھا نہیں
 نہاں نہ ہو کرم یار میں ستمِ حسرت
 رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی،
 بہت نہ کیجئے اظہارِ شادمانی کا
 مجروح نام کے ساتھ خطاب ہے تو ”کیجئے“ کی جگہ ”کرد“ یا ”کر“ چاہئے۔ اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار
 ملاحظہ ہوں :-

- (۱) وفا وہ کرے داغ یہ کس نے مانا
 (۲) یہ داغ قدحِ خوار کے کیا جی میں سمائی
 (۳) داغ پھر جھانک تانک کرتے ہیں
 (۴) جلال آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے جواب
 کہنے ہزاروں ناز تھے جس دل پہلے جلال
 بند کر دینا کلب یار کو بوسوں کا بھوم،
 عمر کی بجائے صرف یاد کیسوں و رخسار میں
 پھر کہئے کس امید پہ ہم زندگی کریں
 کامیابی جلد ہوگی آکے پا بوس امید
 تیری خوش بھوکے بعد روح مری
 کہہ بر آئے گی سکون جان مضطرب کی امید
 ہجر ساقی میں بھلا کس کو خوش آئے گی شراب
 بادۂ عیش سے مینا سے تمنا نکلیں،
 کچھ نہیں خوق جہ و دستار
 میں اس بت بد خو کی اس آن پر تاہوں
 لگی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں
- مگر آج کا زعم باطل یہی ہے، (داغ)
 سنتے ہیں کئے بیٹھے ہیں وہ رات سے توبہ
 اب گھر اب بھٹکتے کہیں نہ کہیں
 جگر کا خون کیا ہے اُسے چھپاتے ہو (جلال لکھنوی)
 دل کیا ہوا وہ آپ کا وہ ناز کیا ہوئے
 آج بھی ہم سے جو وہ ہر سرانکار آیا، (حسرت)
 یوں بسر لیجائے لیل و نہار انتظار
 جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے
 کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار الکی برس
 گلِ جنت بھی ہو تو بو نہ کرے
 کب بسر آئے گا یارب یہ زمان اضطراب
 ہم نشینو! طلب ساغر و مینا ہے عبث
 ساغر شوق مئے ذوق سے گلزار آیا
 دل سر ساغر و سبب نہ کرے
 کھینچا نہ کبھی جس نے اندوہِ پیشانی،
 کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا

پروفیسر صاحب کو ان تصرفات پر اعتراض ہے۔ ممکن ہے وہ حضرات جو تاریخِ اردو سے واقف نہیں وہ
 عذیب صاحب کی نکتہ رسی کی داد دیں لیکن جو بالغ نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے اپنے ذہن سے نہیں
 پیدا کی ہیں بلکہ بہت پہلے آزاد مرحوم ”آبِ حیات“ میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ملاحظہ فرمائیے :-

”ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جایز نہیں۔ مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد
 ہو گیا کہ یہ فرق بھی اُٹھ گیا اور اپنے کار آمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں

دیکھے انہیں کبھی بجنسہ اور کبھی ترجمہ کر کے لیا "برآمدن" اور "بسر آمدن" ہندی میں اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو یہیں ہے۔ مگر اہل زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تفسیم کر لیا۔ سودا نے کس خوبصورتی سے کہا:

اس دل کی تفت آہ سے کب شعلہ برآئے بجلی کو دم سرد سے جس کے جذبات آئے

افقی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے پیر آئے وہ زلف سیاہ اپنی اگر ہیر پر آئے

یہ تو آزاد مرحوم کی عبارت تھی اس کے بعد تمام اساتذہ کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جن میں محاورہ تصرف کر کے

لیا گیا یا علیٰ حالہ لکھا گیا ہے چند اشعار درج کرتا ہوں:

(۱) خوشم نمی آید۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا (میر)

بوکردن = سونگھنا - (سودا)

دیکھوں نہ کبھی گل کو تیرے منہ کے میں ہوتے سنبل کے سوا زلف تری بونہ کروں میں

کوش کردن = سننا - (سودا)

کب اسکو کوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال یہ سنگ ریزہ ہوا ہے در عدن مجھ سے

زنجیر کردن = قید کرنا

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

ایسے کافی تصرفات کا ذکر آزاد نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی میر صاحب نے کافی اشعار اس قسم کے تصرفات کے ساتھ لکھے ہیں:

چمن کا نام سنا تھا ورنہ نہ دیکھا ہائے جہاں میں میں نے نفس ہی میں زندگانی کی

اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوے کرنے شب ہائے ماہ چندے تھلکو چھپا رکھیں گے

ایذا بھی کھینچ چکے جو ہفتہ عشرے کی ہو اس طرح مرتے رہئے اسے تیرا آہ تا چند

ہجران میں اسکی زندگی کرنا بھلا نہ تھا کوتاہی یہ ہوئی نہ اس عمر دراز سے

زمانہ ہجر کا آسان کیا بس آ یا ہزار مرتبہ دل کو مرے جگر آ یا

کیونکہ سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار آ یا

غرض اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں زیادہ سے زیادہ پروفیسر صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ اب یہ سب متروک ہیں۔ لیکن متروکات کا استعمال اپنی خوشی پر ہے۔

اثر گلشن آبادی

معراج تمدن

متذکرہ عنوان سے ایک مقالہ گزشتہ دسمبر کے نگار میں میری طرف سے شایع ہوا تھا۔ اُس سے قبل دو مقالے میرے فائنل دوست گلاب چند کے قلم سے نگار کے صفحات کی زینت بن چکے تھے۔ میں نے اپنے مضمون میں اشتراکیت اور جمہوریت۔ دونوں کے سیاسی۔ مجلسی اور معاشی پہلوؤں پر مختصر بحث کی تھی جس سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک گھٹلا خط فروری کے نگار میں شایع کر دیا ہے۔ جواب الجواب کے قائل آپ نہیں ہیں، شاید اسی لئے جواب الجواب کی زحمت آپ نے گوارا بھی نہیں کی۔ بلکہ اصل موضوع سے ہٹ کر اشتراکیت اور اُس کے مباحث کو کوسنے کے علاوہ سوویت روس کے خلاف بہت الزامات اور بہم شبہات کا اظہار کر کے اپنی بیچارگی کا ثبوت دیا ہے جو جس رقابت میں پست سے پست الفاظ استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔

آپ کا گزشتہ اسلوب بیان۔ عالمانہ اور معتقدانہ انداز تحریر دیکھ کر سیاسیات کا ہر غیر جانبدار طالب علم آپ کو سیاسی تعصب سے پاک سمجھنے پر مجبور تھا۔ لیکن ایک ہی نشتر سے فاسد مواد بہنا شروع ہو گیا اور آپ اپنے اصلی روپ یعنی روس کے خلاف زرخیز مبلغ کی صورت میں ظاہر ہو گئے۔

آپ کو شکایت ہے کہ ننانوے فیصدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے معلمانہ انداز گفتگو اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا یہی طرز نگارش اظہار فضل و کمال کی علامت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت میں اکثریت غریب اور محنت کش طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کوئی اشتراکی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو نمائش اور ظاہر داری سے گریز کرتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کا مفہوم متعین کرنے میں میرے اور آپ کے درمیان بنیادی اختلاف ہے۔ دارالعلوم کی اعزازی ڈگریاں ہی عالم تجربہ ہونے کی کافی دلیل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک دردمند دل نازک احساس۔ اور بین الاقوامی صورت حالات سے ہمہ گیر واقفیت کی ضرورت ہے۔ ایسی تعلیم جو انسان کے دل اور دماغ کو مفلوج اور ماکون بنائے زندگی کے حقائق کا آئینہ دار بنانے کی بجائے اُس میں قومیت اور وطنیت کے لحاظ سے اجنبیت سی پیدا کر دے۔ تعلیم نہیں میرے نزدیک مہذب قزاقی ہے۔ اگر میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ تو یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ گروہ سیرت و

صورت دونوں حیثیت سے قطعی الگ شے بن گئی ہے، جس کو نہ ہندوستانی کہہ سکتے ہیں اور نہ یورپین بلکہ ایک تیسری ہی مخلوق ہے جس کا کوئی نام ابھی تک نہیں رکھا گیا۔

آپ کا بیان ہے کہ گارنر کا خواب جمہوریت آج تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔ جسے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کی ریاستیں بھی صحیح معنوں میں جمہوری ریاستیں نہیں ہیں۔ گویا اس لحاظ سے آپ ایک ایسی چیز کا ذکر کر رہے ہیں جو ابھی تک دنیا کے تخیل سے عالم وجود میں نہیں آئی۔ جمہوریت کا مفہوم آپ کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ حکومت کا ہر کام عوام کی مرضی سے عوام کے فائدہ کے لئے اور عوام کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے۔ معاشری اصلاح بھی اور مذہبی تخیل بھی۔

لیکن اشتراکیت، اصلاح کا ایسا قدم اٹھانا چاہتی ہے کہ پھر کسی اصلاح کی گنجائش نہ رہے۔ آپ رائج الوقت نظام سے مطمئن بھی ہیں۔ اس کی تخریب بھی گوارا نہیں کرتے۔ صرف موجودہ اقتصادی و سیاسی انتشار سے عارضی نجات حاصل کرنے کے لئے اس میں تھوڑی سی ترمیم چاہتے ہیں۔ آپ بھی مانتے ہیں کہ براہ راست عوام حکومتی کارروائیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ ان کو صرف اپنے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار ہے اور تا وقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح حکومت اور انتخاب کے معنی کو سمجھ سکے، عام رائے دہندگی ایک لایعنی چیز ہے۔ عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے۔ اشتراکیت چونکہ عوام کو جاہل اور عام تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے، ناقابل قبول ہے اور اسی ہمہ گیر واقفیت پر آپ دوسروں کو جاہل سمجھ رہے ہیں، حالانکہ اشتراکیت کا اولین پروگرام نہ صرف عام تعلیم بلکہ عام سیاسی تربیت بھی ہے۔

واقعی کارل اور انگلس کو سمجھنے والے اشتراکیوں کی تعداد قلیل ہے، لیکن جمہوریت کے نغمہ راؤں میں کتنے ہیں جو آپ کی طرح گارنر اور روسیو کو جانتے ہیں۔ کتنے ہندو ہیں، جو ویدوں کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ کتنے مسلمان قرآن شریف کے حافظ ہیں؟ فلسفہ عدم تشدد کے بانی مہاتما گاندھی ابھی تک عدم تشدد کا صحیح مفہوم اپنے تخیل میں متعین نہیں کر سکے۔ ہری جن کا مقالہ افتتاحیہ عدم تشدد کی نئی تاویلات سے مزین ہوتا ہے کسی نظریہ یا اصول کی پیروی کے لئے یہ لازم نہیں کہ پیروی کرنے والے اُس کے موجد کے شجرہ نسب سے بھی واقف ہوں۔ ایک گنوار بھی اپنے ذاتی نفع و نقصان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ گوا اشتراکیت ایک خالص اقتصادی مسئلہ ہے۔ تاہم وہ عوام کے مجلسی، سیاسی، اور مذہبی حقوق کا کفیل و ضامن بھی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دائرہ اثر اور حلقہ عمل وسیع سے وسیع تر نہ ہوتا جائے۔

نفس اشتراکیت پر آپ نے صرف دو جزئی اور سطحی اعتراض کئے ہیں اول اعتراض یہ ہے کہ انسان کبھی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا کہ اُسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ساری دنیا بیک وقت فلسفہ کارل مارکس

کی معتقد نہیں ہو سکتی۔

میری عرض یہ ہے کہ ریاست بجائے خود کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے ہے کہ باقی ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ اگر دیگر ضروریات بغیر اس کے پوری ہو سکیں۔ تو اس کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ برعکس اسکے ذاتی ملکیت جھگڑے کی بنیاد ہے، کیونکہ ہر شخص اپنی ریاست پر قانع نہیں رہتا یہیں سے انفرادی مقابلے کا یہ ہم سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور انسان ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں انسانی اوصاف کو چھوڑ کر درندگی و وحشت پر اتر آتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ساری دنیا بیک وقت فلسفہ کارل مارکس کی معتقد نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی طرز کا قطعی اعتراض ہے۔ اس طفلانہ استدلال کی بغیر کسی احساس خجالت کے آپ مندرجہ ذیل الفاظ میں تردید بھی کر دیتے ہیں۔

(our legislation) ہماری حکومت کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تادان وغیرہ سب اسی مقصود کے ذریعے ہیں۔ اور جب ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میں صرف اتنا اضافہ کر دیتا ہوں۔ کہ ابھی کل تک اشتراکیت کا نام لینا بھی اس ملک میں مسلح بغاوت کے مترادف تھا، جمہوری دستور العمل میں جتنی زیادہ اشتراکی اصطلاحات رائج کی جاویں گی، اقتصادی مشکلات کا حل اتنا ہی نزدیک تر ہوتا جائے گا۔

یہ اعتراض کہ پست کاموں سے ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے اس لئے بلند و پست کی تفریق کو مٹایا نہیں جاسکتا لغو ہے۔ کیونکہ جسمانی مشقت اور شب و روز کی مصروفیت سے ذہنی پستی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کی محنت کے سہارے عیاشی اور تنعم پسندی کی زندگی بسر کرنا انسانی انحطاط اور ذہنی خلفشار کا موجب ہوتا ہے۔ شہر اور دیہات میں جنس عصمت کی ارزانی و گرائی کا یہی تفاوت اس کا مظہر ہے۔ اگر خوش فخر اور خوش گفتار ہونا ہی مہذب ہونے کی دلیل ہے تو یہ اوصاف خشن فردش طبقہ میں بافراہ ہوئے ہیں۔ شعبہ منظرہ کے معاوضہ میں امتیاز سے طبقہ بندی شروع ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا خیال اسی طبقہ بندی کی پیداوار ہے۔

روس کے متعلق آپ کی ہمہ دانی جمہوری ممالک کے منظم پر پانگڑا پڑ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں نہ شخصی الماک رکھنے کی اجازت ہے اور نہ عوام پر بزرگ حکومت کی جاتی ہے۔ فروری کے نگار کے مقالہ افتتاحیہ میں ذیل کے الفاظ آپ کے شکوک کی تردید کر دیتے ہیں۔ ”روس کے جنرل سکریٹری جنرل ڈیمی ٹرو نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن یہ بھی ہماری

ترکیب ہوگی۔ جس کے ذریعہ سے اخترا کی مقاصد کو پورا کیا جائے گا۔

کسی ملک کا سیاسی انقلاب سیاسیات عالم پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انقلاب روس کے بعد عوام کو احساس ہوا کہ جمہوری طرز حکومت نہ تو عوام کے مفاد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ اکثریت کو مطمئن رکھ سکتا ہے جرمنی اور روس میں تقریباً بیک وقت شہنشاہیت کا خاتمہ کیا گیا، اسی دور اضطراب میں نازیت و فٹائیت ظہور میں آئے۔ یعنی ہٹلر و موسولینی نے اشتراکیت کی متجانس اصطلاحات سے معاشرہ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی لیکن برائی کی جڑ یعنی نظام سرمایہ داری اور شخصی مقابلہ پھر بھی جاری رہا۔ مشین کی بنی ہوئی اشیاء کی نکاسی اور خام پیداوار کی طلب کے لئے منڈیوں کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ اٹلی نے جوش اور البانیہ پر قبضہ کر لیا اور جرمنی نے آسٹریا، یوگوسلاویا اور پولینڈ پر۔ روس پر بھی فن لینڈ کی آزادی سلب کرنے کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روس کا یہ اقدام توسیع مملکت کے لئے نہیں بلکہ حفاظت خود اختیاری کے لئے ہے۔

آپ کا یہ فرمان کہ ”کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہو سکتی“ عجیب منطق ہے۔ حالانکہ اچھے اصول وہی ہوتے ہیں جو قابل عمل ہوتے ہیں۔

”رام“

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ)
یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲
دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ ارجی۔ سی کارپالتا صاحب۔ قیمت ۲

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ)
اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴
منیجر نگار لکھنؤ

کوڑھی بھکارن

حال کی بات ہے۔ بہت زمانہ نہیں گزرا، اودھ کے ایک ضلع میں ایک بزرگ تھے کہ زمانہ کارنگ دیکھے ہوئے دیئے اب کم دکھائی دیں گے۔ قوم کے ہندو تھے اور پیشہ وکالت تھا، عمر ساٹھ باسٹھ برس کی ہوگی۔ آدمی دبے پتلے تھے لیکن بدن میں سکت بہت تھی رنگ سرخ و سپید تھا چہرہ سے شرافت و متانت ٹپکتی تھی بردبار لیکن خوش مزاج معلوم ہوتے تھے گواپنے ضلع کے وکیلوں میں اُن کا درجہ سب سے اونچا تھا اور آمدنی کافی تھی دیسے بھی گھر سے خوشحال تھے لیکن وضع سیدھی سادی اور رہنا سہنا معمولی تھا۔ کروفر سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ عام طور سے کھا دی کی دھوٹی، کُرتہ اور اُس پر جاگٹ پہنتے تھے۔ کچہری کے وقت پانچامہ اور اچکن پہن لیا کرتے تھے۔ مہاں نوازی میں خاص لطف آتا تھا۔ آئے دن عزیز۔ دوست۔ احباب اُن کے مہاں ہوا کرتے تھے۔ خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں کھی جاتی تھی۔ سادھو مشنوں کی صحبت کا شوق تھا۔ ایک دو مفتوں نہیں بلکہ مہینوں مہاں رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں انھیں کے ساتھ ساتھ۔ ہر دور۔ رشی کیش بلکہ جمنو تری اور گنگو تری تک کا دھادالگ جاتا تھا۔ جڑی بوٹیوں کی بھی تلاش رہا کرتی تھی۔ بیسیوں نسخے معلوم تھے اور ہومیو پتھک علاج میں بھی دخل رکھتے تھے۔ غریب غریبا دوست احباب میں جس کسی کو جس وقت ضرورت ہو علاج اور تیمار داری کے لئے حاضر تھے۔ آمدنی کا کافی حصہ خیرات اور غریبوں کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ موکلوں سے گھر پر صبح اور کچہری میں دوپہر کو بات چیت کرتے تھے شام کو کبھی دفتر میں نہیں بیٹھتے تھے۔ لیکن کوئی عزیز دوست یا مریض اگر ادھی رات کو بھی بلا بھیجتا تو دوڑے چلے جاتے۔ بالعموم شام کو ہوا خوری کے لئے ٹہلنے جایا کرتے۔ راستہ میں فقیر۔ بھکارن۔ لنگڑے۔ لولے۔ اپا رنج اگر پیسے کا سوال کرتے تو کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر ضرور دیدیتے۔ اگر کسی کو زیادہ قابل رحم دیکھتے تو گھر ساتھ لے جاتے۔ کھانا کھلاتے اور دھننے پہنتے گو کپڑا مکمل دیدیتے۔ یا بازار ہی میں دوکان سے پوری اور مٹھائی خرید کر کھلا دیتے۔ دماغ سلجھا ہوا تھا اُس پر تعلیم کی جلا تھی جو جاپاٹ یا کسی اور ایسے ڈھکوسلے کے قریب نہیں جاتے تھے، نہ چھوت چھات کے قابل تھے، لیکن دل میں کچھ ایسا درد پایا تھا کہ اس سے سچپن رہتے اور اس درد کی دوا ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت وکیل صاحب ٹہل کر واپسی پر بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے کے قریب سڑک پر پڑی اور نالی کے لگ بھگ

دیکھا کہ ایک کوڑھی بھکارن بے کسی کی حالت میں پڑی روٹی کے دو ٹکڑوں کا سوال کر رہی ہے۔ قدم وہیں ٹھنک گئے اور اُس کی حالت زار پر ایک نگاہ ڈالی۔ بھکارن ادھیڑ عمر اور بھاری بدن کی عورت تھی، رنگ کوڑا کا سا کالا، سر گھٹا ہوا، چھاتیاں ڈھلی ہوئی، ایک ہاتھ پر سوجن تھی لیکن بھریاں پڑی تھیں، انگلیاں آدھے سے زیادہ کاٹ کر گر گئی تھیں۔ انگلیوں اور ہاتھ پر سپید داغ تھے۔ دوسرے ہاتھ کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی، گو اُس کی انگلیاں ثابت معلوم ہوتی تھیں لیکن پوریں اور ناخن اس کے بھی گھس گئے تھے۔ ایک ٹانگ صحیح و سالم تھی دوسری اس طرح سوچی ہوئی جیسے فیل پا، پنڈلی اور جہنگ پر بڑے بڑے زخم تھے اور کوڑھ ٹپکتا تھا تاہم بدن برتیل کی مالش کی ہوئی تھی۔ لیکن زمین پر پڑے پڑے آدھے جسم پر دھول جم گئی تھی جس نے سیاہی کی چمک کو دھندلا کر دیا تھا تاہم اس کے زخم تیل کی مالش اور ہرے ہونے کی وجہ سے اس طرح چمک رہے تھے کہ جیسے چولھے یا بھٹی میں انگارے دہکتے ہوں سا راہنہ نکالتا تھا۔ صرف کمر اور کولہوں کے گرد ایک سگے سے ٹاٹھ کا میلا کچیللا چتھڑا لپٹا ہوا تھا اور اُس پر سوت کی ایک ڈوری کسی ہوئی تھی۔ ہاں سر پر ایک کنوٹ بھی تھا جو کمر کے چتھڑے سے کم میلا کچیللا تھا، خدا کی مارتے ترائی ہوئی آنکھیں نیم باز تھیں۔ سر دو منٹ بعد آدھے دھڑ کو اٹھاتی، ہاتھوں سے زمین ٹیٹولٹی دو ٹکڑے روٹی کا سوال نہایت دردناک لہجہ میں کرتی اور پھر کراہتی ہوئی مردہ ہو کر زمین پر پڑ جاتی۔ وکیل صاحب کو اس کی یہ حالت دیکھ کر دل پر چوٹ لگی اور ترس آیا۔ بولے

وکیل صاحب - لے مائی (پسہ سانے ڈال کر) یہ پسہ لے۔

بھکارن - (زمین ٹٹول کر اور پسہ اٹھا کر) لا بابا! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔ اس اندھی اپاہج کا دو ٹکڑے روٹی کا سوال ہے۔ اللہ جانتا ہے دو روز سے ایک دانہ بھی اناج کا جو منہ میں گیا ہو۔

وکیل صاحب - اچھا۔ ہمیں بیٹھی رہ۔ روٹی بھی لمبائے گی۔

بھکارن - جگ جگ جیو بابا جگ جگ جیو۔ ایسے مائی کے لال کہاں جو اس اندھی اپاہج کو دو ٹکڑے روٹی دیں اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب - یہیں بیٹھی رہنا، روٹی ابھی آتی ہے (یہ کہہ وکیل صاحب نان بائی کی دوکان کی طرف بڑھ گئے بھکارن - اچھا، بابا۔ بیٹھی ہوں (یہ کہہ بھکارن پھر اپنے دو ٹکڑوں روٹی کی صدا لگانے لگی) بپانچے ہی منٹ بعد وکیل صاحب ایک پیالے میں شوربا اور چار چپاتیاں ہاتھ میں لے آئے۔

وکیل صاحب - لے مائی، روٹی لے کھالے۔

بھکارن - لاؤ بابا، لاؤ۔ بھوکی کی آتما تمہیں دعا دے گی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب نے چپاتیاں اور شوربے کا پیالا بھکارن کے سامنے رکھ دیا اُس نے ہاتھ سے ٹٹولا اور چپ لگائے

بیٹھی رہی۔ وکیل صاحب نے کہا مائی کھالے اب کیا سوچتی ہے۔ بھکارن بولی کہ بابا روٹیاں ان انگلیوں سے ٹوٹیں گی نہیں۔ ٹکڑے کر دو تو اٹھا کر کھالوں گی۔ وکیل صاحب نے روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے کر دے۔ تب وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگی۔ وکیل صاحب کچھ سوچ میں کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ برابر ہی سوداگری کی ایک دوکان تھی۔ دوکاندار ایک سیٹھ جی تھے جو وکیل صاحب کے جان پہچان اور موکل بھی تھے وہ یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے بولا

”وکیل صاحب کھڑے کب تک رہنے گا۔ آئیے بیٹھ جائیے۔ مجھے حکم دیجئے کیا چاہتے ہیں“

وکیل صاحب۔ ابا سیٹھ جی۔ بندگی، معاف کیجئے گا میں نے آپ کی طرف دھیان نہیں کیا، ہاں بیٹھا جاتا ہوں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بھکارن کو ایک کلیمٹر میں پانی بھی لادیتا۔

سیٹھ جی۔ آپ بیٹھیں آپ یہ تکلیف کریں۔ پانی میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔ جگو جگو اڑے چل۔ بازار سے ایکہ بدھنا لے کر کھنڈا اپنے کا پانی لے آ۔ (لوکر پانی لینے گیا اور سیٹھ جی اور وکیل صاحب میں باتیں ہونے لگیں)

وکیل صاحب۔ کہنے سیٹھ جی مزاج تو اچھا ہے۔

سیٹھ جی۔ دیا ہے آپ کی مہاراج۔ بال بچے تو سب اچھے ہیں۔

وکیل صاحب۔ شکر ہے۔ سب خیرت ہے۔ اور کہئے سب کاروبار اچھا چلا جاتا ہے۔

سیٹھ جی۔ ہاں چلا ہی جاتا ہے۔ مہاراج۔ زمانہ کارنگ دیکھتے ہوئے، غنیمت ہے بہت غنیمت ہے۔۔۔۔۔

وکیل صاحب پھر وہ زمین کا معاملہ دیرسا ہی کا دیرسا رہ گیا آپ نے کچھ دھیان نہیں دیا۔

وکیل صاحب۔ ارے بھائی، اونے پونے مل جل کر ملے کر لو، عدالت میں جانے سے کس کا بھلا ہوگا۔

سیٹھ جی۔ اچھی تو فریق ثانی بھی مانے۔ اب تو عدالت جائے بغیر کام چلتا نہیں۔ نالاش دائر کر دیجئے۔

وکیل صاحب۔ آپ کی مرضی۔ تو صبح کاغذات لے کر آئیے گا۔ بات چیت ہو جائے گی۔

سیٹھ جی۔ جو حکم۔

جگو۔ پانی لے آیا۔ حضور۔

وکیل صاحب۔ اس بھکارن کے سامنے رکھ دو (بھکارن سے مخاطب ہو کر) کیوں مائی پیٹ بھرا۔ یہ لو پانی رکھا ہے پی لو۔

بھکارن۔ (پانی اٹھا کر) ہاں بابا۔ پیٹ بھر گیا۔ میری آتما دعا دیتی ہے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ اندھی، لولی کی خبر لی۔ جگ جگ جیو، اللہ بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب۔ تمہارے ان زخموں میں درد بھی ہوتا ہے۔

بھکارن۔ ہاں۔ بابا۔ بیٹے رہتے ہیں۔ ترختے رہتے ہیں۔

وکیل صاحب - تو تم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں۔ وہاں علاج ہو جائے گا، ہم تمہیں اسپتال پہنچا دیں؟
 بھکارن - ارے بابا۔ اس کا علاج تو اب اللہ ہی کرے گا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسپتال میں کب تک پڑی رہو گی۔
 سیٹھ جی - اجی کبھی نہیں جانے والی اسپتال کو تو یہ لوگ جیل سمجھتے ہیں۔
 وکیل صاحب - (بھکارن سے) اچھا تو تم تمہیں دوا دیں، دوا کرو گی؟
 بھکارن - ہاں بابا کروں گی۔ پر دوا سے کچھ ہوتا نہیں۔

وکیل صاحب - (سیٹھ جی سے) میرے پاس ایک بوٹی ہے۔ آزمائی ہوئی۔ دو تین آدمیوں کو فائدہ ہوا ہے۔
 کمال کی دوا ہے۔

سیٹھ جی - ہاں مہاراج آپ تو ساتوں دینا دھن ہو۔ ایسے غریب پرور لوگ اب کہاں۔
 وکیل صاحب - واہ سیٹھ جی۔ آپ تو شاعری کرنے لگے۔ اچھا تو اب چلنے میں اس کے لئے کل دوا لادو مٹکا
 اگر مجھے ذرا دیر ہو تو اسے ٹھہرائے رکھنے گا چلی نہ جائے۔

سیٹھ جی - آپ اطمینان رکھئے۔ اُس کی چارچھ آنے روز کی شام کو یہاں سے آمدنی ہوتی ہے۔ چھوڑ کر کہاں جاگی
 دوسرے روز شام کو وکیل صاحب حب وعدہ سیٹھ جی کی دوکان پر پھر آئے اور نوکر کے ہاتھوں کھانا پانی
 دوا سب ساتھ لیتے آئے۔ بھکارن بھی حسب معمول وہیں پڑی اپنے دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی تھی۔ وکیل صاحب
 نے پہلے تو اسے کھانا کھلوا دیا۔ پانی پلویا۔ پھر وہیں دوکان کے آگے والے برآمدے کے پتھر کے فرش پر اطمینان سے
 بیٹھ کر اس کوڑھی بھکارن کے زخم اور ٹانگ گرم پانی سے دھوئی۔ جڑی بوٹی کی کوئی لیپ ساتھ لائے تھے وہ خود
 ہاتھوں سے اُس کے زخموں پر لگائی۔ بھکارن نے سیکڑوں دوائیں دیں اور پھر تھوڑی دیر اطمینان سے چپ
 لگا پڑی رہی وکیل صاحب سیٹھ جی کی دوکان پر بیٹھ کر صابن سے اپنے ہاتھ دھوئے لگے۔

سیٹھ جی - دھن ہے مہاراج دھن ہے۔ اب ایسے راج رشی کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔
 وکیل صاحب - سیٹھ جی آپ پھر وہی کل کی سی شاعری کرنے لگے۔ پانچ منٹ دوکان پر بیٹھنے دیکھ گایا نہیں
 سیٹھ جی - مہاراج آپ خوشامد سمجھتے ہیں مگر میں تو سچ کہتا ہوں کہ تم تے تو ایسے سخی دانا اور دیا لو دیکھ نہیں۔
 وکیل صاحب - سیٹھ جی کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ ہر شخص اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔

سیٹھ جی - پر ایک بات ہے وکیل صاحب۔ راہ چلتے ایسے بھکاری اور بیراگیوں کو پیسہ دینا کہ جنہوں نے بھیک
 مانگنا ہی اپنا پیشہ کر لیا ہے۔ ہمیں تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس میں تو بڑی دھوکا دھڑی ہوتی ہے۔ میں اس
 کوئی ابا بچ کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ پر آپ تو راہ چلتے سدا برت بانٹتے ہیں۔ پھر اب آج کل کے نانا
 میں تو یتیم خانے، محتاج خانے، کوڑھی خانے سب ہی قائم ہو گئے ہیں۔ ہماری رائے میں تو جو خیرات کرنی ہو

انہیں کے ذریعہ سے کرے۔

وکیل صاحب - آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے چندہ میں بھی دیتا رہتا ہوں پر سیٹھ جی اُس سے تسکین نہیں ہوتی۔ اول تو دولت کا نشہ آدمی کو دینے ہی بہت رہتا ہے پھر جب دروازے پر لوگ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر دینے کی عادت پڑ جاتی ہے تو آدمی کا ٹھنڈا اور بڑھ جاتا ہے لیکن اگر آپ دُکھ درد اور دلدر کی دنیا میں جائے اور اس سے دوچار ہوئے تو گردن جھک جاتی ہے اور ایشور یاد آتا ہے پھر اگر اپنے سے کچھ خدمت بن پڑے تو دل کو بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔

سیٹھ جی - ہمارا ج بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، یہ تو ہمارے کچھ سمجھ میں آتا نہیں پر یہ آپ کے صابن سے ہاتھ دھونے سے ہماری بھی تسکین نہیں ہوتی۔ میں لائسول (ایک دوا کا نام ہے) کی شیشی کھولے دیتا ہوں مہربانی کر کے اُس سے ہاتھ دھو ڈالیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے، اگر کہیں لگ لگا گئی تو غضب ہو جائے گا۔

وکیل صاحب - سیٹھ جی کیا وجہ کی باتیں کرتے ہو۔ ان دُکھوں سے کیا ہوتا ہے۔ صابن سے ہاتھ دھولے، کافی ہے۔ اچھا اب چلے۔ دیکھئے گا ہک آئے ہیں، اُن کی سنئے ان باتوں میں خواہ مخواہ نقصان ہوگا۔ یہ کہہ کر وکیل صاحب چلے۔

چار پانچ روز بعد سیٹھ جی اپنے مقدمہ کی ضرورت اور عدالت کے کام سے وکیل صاحب کے دفتر میں صبح حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے توجہ کر کے اُس کا کام آدھ گھنٹے میں نبٹا دیا، سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔ لیکن ابھی دروازے تک پہنچے نہیں تھے کہ کچھ بڑا آگیا واپس ہوئے اور بولے :-

سیٹھ جی - یہ سیٹھ وکیل صاحب میں بھول ہی گیا تھا آپ کو ایک ضروری خبر سنانی تھی۔ وہ آپ کی مریض بیجاری کوڑھی بھکاری رات کو گزر گئی۔

وکیل - میں کیا ہوا۔ بیجاری مر گئی!

سیٹھ جی - ہاں آپ کے یہاں آتے ہوئے میں پہلے دوکان چلا گیا تھا تو وہاں دیکھا کہ وہ بیجاری مری پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو سردی کھا گئی، یا فالج گر گیا معلوم نہیں کیا ہوا۔ جہاں وہ پڑی ہے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا کھڑا رہا تھا اور ایک اور فقیر بھی تھا اُسی کے محلہ کا۔ جب رات کو بہت دیر ہو گئی اور وہ اپنی جھوپڑی میں نہیں پہنچے تو اُس کا یہ نواسہ اور وہ آدمی اُسے دیکھنے نکلے۔ یہاں اُسے مردہ پڑا پایا۔

وکیل صاحب - اچھا ہوا بیجاری عذاب سے چھوٹی۔

سیٹھ جی - اُن کے محلے کا فقیر جو اُس کے پاس کھڑا تھا جنگی کے بعد اس سے کہہ رہا تھا کہ اُس کو اٹھو اگر کہیں بھکواؤ تو میں نے کہا ایسا مت کرو، اس کے کفن اور مٹی دینے کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا دیا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ آپ کہہ

وکیل صاحب - ضرور ضرور۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھے کہہ دیا (جیب سے روپیہ نکال کر) یہ لیجئے چار روپیہ تو جیب میں پڑے ہیں۔ لیتے جائیے۔ اگر اور ضرورت ہوگی تو پھر دیدوں گا۔

سیٹھ جی - پانچ سات روپیہ میں سب کام ہو جائے گا۔ دو روپیہ میں دیدوں گا۔ ہمارے برابر میں شیخ جی کی دوکان ہے کچھ وہ دیدیں گے، ہو ہی جائے گا۔

وکیل صاحب - تو پھر تکلیف کر کے آپ اس کا کچھ انتظام کرا لیئے میں بھی کچھری جاتے ہوئے اوسرے ہوتا جاؤں گا۔ وکیل صاحب کچھری جاتے ہوئے جب سیٹھ جی کی دوکان پر پہنچے تو دیکھا کہ اُس بھکارن پر ایک ٹاٹ کسی نے ڈال دیا ہے۔ ایک لڑکا اُس کے برابر بیٹھا ہوا رہا ہے اور دوسرا فقیر بھی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ شیخ جی اور دو ایک اور دوکانداروں نے چندہ کر کے دس روپیہ کی سیدل کر لی ہے اور بھکارن کے مٹی دینے کا انتظام اُسی فقیر کے ذریعے سے کرایا جا رہا ہے۔ وکیل صاحب کا اطمینان ہو گیا اور وہ کچھری چلے گئے۔

پانچ سات روز بعد ایک دن شام کو وکیل صاحب پھر بازار سے گزر رہے تھے۔ جب سیٹھ جی کی دوکان کے قریب پہنچے تو سیٹھ جی نے دور ہی سے بڑے تپاک سے سلام کیا اور بولے۔
سیٹھ جی - وکیل صاحب، ذرا ادھر تشریف لائیگا آپ سے ایک بات کہنی ہے۔
وکیل صاحب - کہئے کیا بات ہے؟

سیٹھ جی - اچی بڑے مزے کی خبر آپ کو سنانی ہے۔ آپ منکر بڑے خوش ہوں گے وہ کوڑھی بھکارن جو مر گئی تھی اور جس کے مٹی دینے کے لئے ہم نے اور آپ نے چندہ کیا تھا وہ پھر جی گئی۔
وکیل صاحب - جی گئی کیا معنی؟

سیٹھ جی - (ہنس کر) اچی وہ ہیتی جاگتی، اچھی خاصی، چلتی پھرتی موجود ہے۔

وکیل صاحب - کیا باتیں کرتے ہو، سیٹھ جی، کچھ دھوکا ہوا ہوگا۔

سیٹھ جی - دھوکا تو ہوا ہی مہاراج اور دھوکا بھی کیسا دھوکا۔

وکیل صاحب - واقعی؟ تم سے کس نے کہا؟ کس نے دیکھا؟

سیٹھ جی - اچی، میرا شو فر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہے۔ وہ اُسی کے محلہ میں رہتی ہے۔ اب اُس نے ادھر کا آنا جانا چھوڑ دیا اب صدر ہی کی طرف دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگاتی ہے۔

وکیل صاحب - میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں۔

سیٹھ جی - وہ دیکھئے موٹر آگیا۔ ابھی اپنے شو فر سے آپ کو سب حال سنوائے دیتا ہوں (موٹر آکر کھڑا ہوا)۔
اے میلان رمضان، ذرا وکیل صاحب کو اُس بھکارن کا حال تو سنا دو۔

شوقر - حضور میں اُسے یہاں پڑا دیکھا کرتا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ مر گئی۔ لیکن تیسرے ہی دن دیکھتا کیا ہوں کہ صدر بازار میں سڑک پر پڑی دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ دھوکا ہوا۔ پھر قریب سے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی ہے۔ وہیں بستی ہی میں رہتی ہے۔ اُس کا تو بڑا کارخانہ ہے۔ ایک نان بائی کی دوکان ہے۔ ایک کباڑ خانہ ہے۔ کئی نوکر چاکر ہیں، نصیبین نام ہے۔ آس پاس کے لوگ سب جانتے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم ہو کر بڑا تعجب ہوا تو میں نے سیٹھ جی سے آکر کہا۔

وکیل صاحب - تم ہمیں وہاں لیجا کر اُسے دکھا سکتے ہو۔

شوقر - ضرور، ابھی چلیں حیدر۔

وکیل صاحب - کیوں بھی سیٹھ جی چلو ذرا دیکھ آئیں۔ موٹر تو ہے ہی دس منٹ لگیں گے۔ چلتے ہو۔ سیٹھ جی - چلے، ابھی چلے۔

وکیل صاحب - تمھاری دوکان کا کچھ سرج تو نہیں ہوگا۔

سیٹھ جی - نہیں سرج کیا ہوگا، لڑکا موجود ہے، چلے سوار ہوئے۔

سیٹھ جی اور وکیل صاحب موٹر پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ صدر بازار پہنچے تو موٹر نان بائی کی دوکان پر جا کر ٹھہری۔ دوکان پر ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ کچھ لنگڑے، لولے، فقیر، بھکاری تو دوکان کے اندر بیٹھے شور باچاتی کھا رہے ہیں اور کچھ دوکان کے سامنے بیٹھے لنگے کھڑے ہیں۔ کئی آدمی دوکان میں کام کر رہے ہیں۔ کوئی آٹا گوندہ رہا ہے۔ کوئی روٹی بنا رہا ہے۔ کوئی گاہکوں کو کھانا رہا ہے۔ کوئی پیسے لیتا جاتا اور شور باچاتی دیتا جاتا ہے۔ پھر آگے چل کر گلی میں دوکان کے پیچھے ایک بڑے پڑے ٹوٹے چھوٹے کپے کپے مکان میں پہنچے جس میں کئی ایک تنگ و تاریک کوٹھریاں اور کمرے تھے۔ کئی دالان تھے اور صحن بہت وسیع تھا۔ کوٹھریوں میں دال، آٹے اور مسالے کی بوریاں چنی ہوئی لٹی تھیں۔ گھی کے کنسٹرکٹ رکھے تھے۔ ہر طرح اور وضع کے پڑے کپڑے، ٹوپیاں، جوتے، لحاف، کھل گدے، لکڑیاں۔ لاکھیاں وغیرہ سب ہی کباڑ خانہ جمع تھا۔ ایک تخت پر بی نصیبین یعنی وہی کوڑھی بھکارن بڑے رعب داب سے بیٹھی تھی۔ اُس کا بدن اسوقت نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ ایک سپید چادر تمام بدن پر لپیٹے ہوئے تھی، آنکھیں کھلی اور چمک رہی تھیں۔ جو نوک مکان میں چل پھر رہے تھے اُن کو تحکمانہ لہجہ میں ہدایتیں کر رہی تھی، وکیل صاحب کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ ہلا ارادہ اٹھ گیا اور بولی۔

بھکارن - وکیل صاحب۔ سلام

وکیل صاحب - کہو بی نصیبین۔ تم تو مر گئیں تھیں پھر جی اٹھیں۔

بھکارن - وکیل صاحب۔ اللہ ہی مارتا ہے اللہ ہی جلاتا ہے۔ اُس کا عجب کارخانہ ہے۔

وکیل صاحب۔ مگر تم نے تو حد کر دی۔ دھوکا دھڑی بھی تو کیسی۔

بھکارن۔ بابا پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ اور دنیا کا چلن ہے، تم بھی دہی کرتے ہو میں بھی دہی کرتے ہوں، تم پجھری اور عدالت میں سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کمر کے دکھاتے ہو، میں کوچہ و بازار میں بازی گری کرتی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمھارا کارخانہ بڑا اور اجلا ہے، میری دوکانداری نیچے اور میلی کچیلی ہے ورنہ مکاری تو ہم سب کا چلن ہے۔ دنیا کا چلن ہے۔ پیٹ بڑا مکار بابا پیٹ بڑا مکار! وکیل صاحب۔ بی نصیبین وکالت کا روپیہ بڑی گاڑھی کمائی کا روپیہ ہوتا ہے۔ بڑی دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، تب چارٹکے ملتے ہیں۔

بھکارن۔ تو بابا ہمیں کیا مفت میں ملتا ہے۔ جلتے پتے جیٹھ کی دھوپ اور لو لگتی ہے۔ جلتی زمین پر رٹے رہتے ہیں۔ برسات میں پانی کچھڑ میں بھیکتے اور جاڑے میں ننگے بدن ٹھٹھرتے ہیں۔ دن بھر چنچتے چنچتے گھولگ جاتا اور زبان تھک جاتی ہے۔ تب ہمیں چار پیسے پیدا کرتے اور دو ٹکڑے روٹی کے نصیب ہوتے ہیں۔ اوپر سے تم جھوٹا اور مکار بتاتے ہو۔ نہ تم مکار نہ ہم مکار۔ بس پیٹ بڑا مکار! بابا! پیٹ بڑا مکار۔ وکیل صاحب نے یہ سب کچھ سنا۔ لمحہ بھر کے لئے اُن کی گردن جھک گئی اور چپ رہ گئے۔ پھر بولے:-

”تو تمھارا تو یہ سب اتنا بڑا کارخانہ ہے تم یہ ڈھونگ کیوں رچتی ہو“

بھکارن۔ بلا مشقت لئے بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنی حرام ہے اور بابا یہ سب کارخانہ میرا تھوڑی ہے یہ تو بھائی بندوں کا ہے۔ مجھے چلائے جانے کو کہتے ہیں، میں چلائے جاتی ہوں اس میں سب کا بھلا ہوتا ہے، اللہ میرا بھی بھلا کرے گا۔ یہ سمجھو کہ سیکڑوں لوے، اپاہج، ننگے بھوکے، اندھے دھوندے روزیہاں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ دونوں وقت پیٹ بھر شور باچا پاتی اور صبح چائے اور کچے اور یہ سب پانچے پیسے میں۔ وکیل صاحب بازار میں تین چار آنے سے کم میں پیٹ بھرنا مشکل ہے یہاں آدھے داموں میں کام چلتا ہے۔ اسی طرح کپڑا اتال جاتا ہے۔

وکیل صاحب۔ بہت سے ایسے بھی آتے ہوں گے جو پورے دام دیسکتے ہیں لیکن آدھے داموں لیجاتے ہیں۔ بھکارن۔ ہاں۔ شاید۔ سو یہ کہاں نہیں ہوتا۔ تمھارے بھنڈاردوں، آشرموں، اور یتیم خانوں میں کیا نہیں ہوتا وکیل صاحب، یہ دنیا فرشتوں کی نہیں آدمیوں کی ہے۔ آدمی کچھ بنا ہی ایسا ہے کہ گناہ کرنا اور پھر توبہ کرنا۔ توبہ کر کے پھر گناہ کرنا اور گناہ کر کے پھر اپنے دامن کے داغوں اور دھبوں کو دھونے کی کوشش کرنا جو یہ نہیں کرتا اُس کی حالت البتہ افسوس کے قابل ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ نیکی کرا اور دریا میں ڈال۔ ہم اور آپ کچھ خدائی فوجدار تو ہیں نہیں کہ خدائی کو بھی بھلا نہ بیٹھنے دیں۔ رہا جھوٹ اور فریب تو بابا میں تو پہلے ہی کہہ چکی کہ پیٹ بڑا مکار! بابا پیٹ بڑا مکار!

وکیل صاحب - سچ کہتی ہو بی نصیب!

بھکاری - وکیل صاحب آپ نے جو اس دن دوا لگا دی تھی اس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے، اگر اور دیدو، لگا لوں گی، بھلا ہوگا۔

وکیل صاحب - تو کسی کو ہمارے گھر بھیج دینا، دوا بھیج دیں گے۔ اچھا جاتے ہیں۔

بھکاری - اللہ بھلا کرے گا۔ وکیل صاحب آئے ہو تو کچھ غریب غنا کو دیتے بھی جاؤ۔

وکیل صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپے نکال کر بی نصیب کے ہاتھ رکھے۔

بھکاری - جگ جگ جیو، بابا، جگ جگ جیو۔ ایسے سخی دانا نہیں دیکھے۔ اللہ بھلا کرے گا، اللہ بھلا کرے گا۔

جب وکیل صاحب چلنے لگے تو سیٹھ جی جو سب باتیں کھڑے سن رہے تھے اور یہ تماشہ دیکھ رہے تھے

حیرت زدہ ہو کر بولے:-

”آخر سیدھے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، وکیل صاحب آپ تو اندھیر کرتے ہیں۔

وکیل - بھائی تم سمجھے نہیں۔ یہ اس سے کہیں زیادہ کی مستحق ہے۔ میرے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں!

کشن پر شاد کول

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علامہ علامہ خدیفر مائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہوں:

نگارستان جمالستان ترغیبات جنسی شہاب کی سرگزشت استفسار و جواب ہر سہ جلد

دو روپیہ

چار روپیہ

ایک روپیہ

تین روپیہ

نور روپیہ

معرکہ سخن

مکتوبات نیاز

اردو شاعری

ہندی شاعری

سینا کل

دھانی روپیہ

دھانی روپیہ

دو روپیہ

ڈیڑ روپیہ

تائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

عربوں کی سیاسی بیداری

۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۳ء تک

عربوں کی قومی تحریک سیاسی بیداری کے متعلق اردو کیا انگریزی میں بھی کوئی مستقل تاریخ نہیں ملتی۔ اس کا ایک سبب تو مغربی سیاست کی مسئلہ اندیشی ہے اور دوسرا یہ کہ ان ذرائع تک دسترس بھی مشکل ہے، جن سے اس تحریک کی صحیح تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

عربی لٹریچر میں جو کچھ موجود تھا اس کا بڑا حصہ تو نیا لکھا گیا اور کچھ حصہ اُن لیڈروں کے خزانوں کے پاس محفوظ چلا آ رہا ہے جنہوں نے اس سیاسی انقلاب میں کام کیا تھا۔

جارج الٹانی ایک شامی عیسائی کو اتفاق سے برسوں کی محنت و کاوش کے بعد یہ پتہ چلا کہ غزات، ہلہ، اور اس نے ایک مستقل تصنیف اس موضوع پر پیش کی جس کا نام ”بیداری عرب“ ہے۔ یہ سلسلہ متعدد حصوں پر مشتمل ہے۔ اس نے ایک متناہی اس کتاب سے آغاز و اقتباس کا نتیجہ ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلا حصہ جو اس اشاعت میں دیا گیا ہے ان حالات و واقعات پر مشتمل ہے جو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۵ء تک عربستان میں ظاہر ہوئے۔ دوسرا حصہ میں دوران جنگ کی عرب سیاست سے بحث کی جائے گی اور تیسرا حصہ جو نہایت اہم حصہ ہے ”عرب سیاست بعد از جنگ“ سے متعلق ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ دنیا میں جہاں دو میں بالکل نئی چیز ہے، دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا، کیونکہ جب تک خود ہم عربوں کی سیاست کا خارجی ارتقاء نہ معلوم ہو، ہم شرق اوسطی کی سیاسی پیچیدگیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ نیاز

(۱)

عربوں کی قومی تحریک مصریوں کے دور اقتدار کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اُن کے ٹکٹے کے بعد اس کا فیصلہ فرادشا ہے۔ یوں تو ایک تحریک مصریوں کی آمد سے پہلے ہی ملک میں شروع ہو چکی تھی جس نے بہت جلد منظم عسکری ورت اختیار کر لی تھی اور یہ عربوں میں بڑی حد تک انقلاب کی مناسبت کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ یہ بھی دہائی تحریک لیکن یہ کوئی سیاسی چیز نہ تھی بلکہ خالص مذہبی تھی۔ اس تحریک کا سر رکھنے والے نے سلطان ابراہیم نے محمد علی پاشا والی مصر کو اسلئے میں مجبور کیا۔ محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی اور کئی سالوں کی کوششوں کے بعد محمد علی کو کامیابی نصیب ہوئی۔

سلطان نے ۱۹۶۹ء میں ایک فوج پتولین کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مرتب کی تھی اور محمد علی کو بھی اس فوج کا ایک افسر مقرر کیا تھا۔ پتولین نے اس فوج کو توبہ آسانی پسپا کر دیا، لیکن اس شکست نے محمد علی کی ترقی کے لئے دروازے کھول دیئے۔ دو سال کے بعد جب فرانسیسی فوجوں نے مصر خالی کیا تو محمد علی وہاں پوری فوج کا افسر مقرر ہوئے۔ اس موقع سے اُس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خوب خوب سیاسی و عسکری جوہر دکھلائے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ مصر کا فوجی بادشاہ بن بیٹھا۔ دہائی تحریک کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُس کے ذہن میں 'عرب حکومت' کے قیام کا تصور پیدا ہوا۔ شام پر تسلط ہو جانے کے بعد اُس نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کی۔ اس کے بھی بہت کافی شواہد موجود ہیں کہ محمد علی خلافت کا بھی خواب دیکھ رہا تھا۔

عرب حکومت کی تحریک کے سلسلہ میں محمد علی اور ابراہیم پاشا کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ عرب نہ تھے۔ ابراہیم پاشا نے تو کچھ عربی سیکھ بھی لی تھی مگر محمد علی عربی زبان سے بالکل نا آشنا تھا۔ باپ بیٹے کے دماغ میں مستقبل کی حکومت کا یکساں تخیل نہ تھا۔ اس خیال سے تو دونوں متفق تھے کہ تمام عرب صوبوں کی ایک متحدہ حکومت بنائی جائے اور وہاں اُن کے خاندان کی حکومت ہو لیکن وہ بھی جلتے تھے کہ یہ خواب اُس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک عربوں میں علی طور پر اُن کے ساتھ ہمدردی نہ پیدا ہو۔ محمد علی عربوں سے قطعاً نا اہل نہ تھا۔ وہ عربی بولنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ برخلاف اس کے ابراہیم کو اس کا پورا احساس تھا کہ اگر اُس کے باپ کی حکومت کی بنیادیں عرب قوم کی تجدید کے خیال پر استوار ہوں تو پائیدار ہوں گی۔ چنانچہ ابراہیم نے اپنی گورنری کے ابتدائی دو سال میں پوری طرح عرب قومیت کے خیالات کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا۔

لیکن ابراہیم پاشا کی حکومت کا یہ دور زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ مشرقی ایشیا میں ابراہیم پاشا کے بڑھتے ہوئے دفاعی ایک طرف اور پ کی طاقتوں کو اہد دوسری طرف سلطان کو خائف کر دیا۔ انھیں حالت نے محمد علی کو فوجی طاقت بڑھانے پر مجبور کیا۔ ابراہیم پاشا بھی اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور تھا۔ اُس نے جبریت فوجی بھرتی شروع کی اور ملک پر طرح طرح کے نئے ٹیکس لگائے، جس کی وجہ سے ایک طرف اُس نے اپنی ہر دلعزیزی کھوئی اور دوسری طرف لوگوں کے دلوں میں اُس کی حکومت کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال بعد جب ابراہیم نکال دیا گیا تو اُس کا ایک بھی خیر خواہ یا ہمدرد وہاں نہ تھا۔

یوں تو محمد علی کی ناکامی کے بہت سے اسباب تھے مگر اصل سبب پامراسٹون کی مخالفت تھی۔ پامراسٹون اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ مارچ ۱۸۳۳ء میں لکھتے ہیں:

”اُس (محمد علی) کا مقصد تمام عربی بولنے والی قوموں کی ایک متحدہ حکومت کا قیام ہے۔ یونٹو اس میں کوئی ایسی خطابی نہیں، مگر

ترکوں کا اقتدار اس سے عرب میں ختم ہو جائیگا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں کیونکہ ہندوستان کے راستے کا بہترین محافظ ترک ہے“

ابراہیم پاشا کی روادارانہ دور حکومت نے عیسائی مبلغین کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی اور امریکی مبلغین کے ادارے قابل ذکر ہیں، جو آگے چلکر قومی تحریک کا گہوارہ بننے والے تھے۔ ملک کی تعلیمی اور ادبی ترقی انھیں کی مرہون منت ہے۔ ۱۸۲۶ء میں چار قابل ذکر بقیں ہوئیں اول تو بیروت میں ایک کالج کھولا گیا جسے آگے چل کر بہت بڑی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرے امریکی مبلغین نے اپنا پرس مائٹا سے بیروت منتقل کیا۔ تیسرے مسٹر ایلی اسمتھ اور اُن کی بیوی نے لوزیوں کا ایک اسکول کھولا، جو تھے خود ابراہیم پاشا نے لوگوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے در سر کھولے۔ ابراہیم پاشا کی اسکیم تو زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی اور مصریوں کے اخراج کے ساتھ وہ اسکیم بھی ختم ہو گئی مگر اُس نے ملک میں غمنا اور مسلمانوں میں غصہ و انقلاب پیدا کر دیا۔

(۲)

۱۸۴۷ء میں مصریوں کے اخراج کے وقت ملک کی جو سیاسی حالت تھی اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ملک میں ہر طرف بے اطمینانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ابراہیم پاشا نے عیسائیوں کے ساتھ جو غیر معمولی مراعاتیں کی تھیں، مسلمانوں دروہی مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت منافرت پیدا کر دی تھی۔ جس سے یورپ کی تمام طاقتوں نے خاص کر انگلستان نے پورا فائدہ اٹھایا۔

۱۸۴۷ء میں سلطان نے ان حالات کے پیش نظر انتظامی امور میں تبدیلیاں کیں۔ لبنان کو دو اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ ایک میں عیسائیوں اور دوسرے میں دروہیوں کی آبادی تھی۔ مگر اس تقسیم نے صورت حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ دوسری طرف فرانس اور انگلستان لبنان میں اپنا اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس چیز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ فرانس نے عیسائیوں کی اور انگلستان نے دروہیوں کی پشت پناہی شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں فساد ہوا اور دونوں نے خوب داد بھیمیت دی۔

اس کے بعد یورپ کی قوتوں نے فلسطین کا رخ کیا جہاں اُس وقت مختلف عیسائی فرقوں میں مقامات مقدسہ کے تحفظ کا اعزاز حاصل کرنے کے سلسلہ میں کشمکش جاری تھی۔ یہاں بھی یورپی طاقتوں نے اپنی عیارانہ سیاست کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جس کا نتیجہ کچل کچل کر جنگ کریمیا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر سلطان نے اپنی عیسائی رعایا کو بہت کافی حقوق عطا کئے۔

یوں تو ملک میں امن و امان قائم ہو گیا مگر اب بھی دو طاقتیں ایسی موجود تھیں جن سے ہر وقت خانہ جنگی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ایک تو عیسائی کسانوں کی جماعت تھی جو جاگیردارانہ نظام سے عاجز آچکی تھی اور اپنی گردن سے غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لئے مضطرب تھی۔ (یہ جاگیردار بھی عیسائی ہی تھے) دوسری طرف عیسائی پیشواؤں کا گروہ تھا جو ان حقوق سے مطمئن نہ تھا جو سلطان نے عطا کئے تھے۔ ان دونوں گروہوں کے مفاد میں یوں تو کوئی چیز بھی جنس مشترک کا درجہ نہ رکھتی تھی مگر چونکہ دونوں کا مقابلہ ایک ہی حریت سے تھا اس لئے وہ متحد ہو گئے۔ مگر آگے چل کر ان مذہبی پیشواؤں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ان کو غلط راہ پر لگا دیا۔ جس وقت ۱۸۶۵ء میں کاشتکاروں اور جاگیرداروں کے درمیان لبنان میں فساد شروع ہوا تو ان مذہبی پیشواؤں نے اُس کا رخ بدل کر اُس فساد کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا اور پھر تو اس فرقہ وارانہ فساد کی آگ لبنان سے دمشق تک پہنچ گئی جو شام کی تاریخ کا سب سے بڑا فرقہ وارانہ فساد تھا۔

فساد کے اختتام پر سلطان نے اپنے قابل وزیر فواد پاشا کو روانہ کیا۔ جنھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر یورپ کی طاقتوں کے مابین بھی وہاں موجود تھے، ان لوگوں کے مشورہ سے لبنان کی حکومت کے لئے ایک نیا خاکہ تیار کیا گیا۔ شام کو دو حصوں میں تقسیم کر کے لبنان کو علیحدہ کر دیا گیا۔ شام کا تعلق مرکزی حکومت سے ہو گیا اور لبنان کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنائی گئی اور وہاں کا گورنر ایک عیسائی مقرر کیا گیا۔ بین الاقوامی سیاست پر اس کا اثر پڑا اور یورپ کی قوتوں کو شام کی سیاست میں دخل اندازی کا موقع مل گیا جس سے وہ پورے پچاس سال تک فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس سے قطع نظر ۱۸۶۵ء کا حادثہ شام کی تاریخ میں اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے جس نے اہل ملک کے دماغوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور پورا احساس پیدا ہو گیا کہ ملک کی غلامی و اخلاقی پستی کا اصل سبب فرقہ وارانہ تعصب اور قومی جہالت ہے۔

اس دور میں دو قابل ذکر ہستیاں پیدا ہوئیں، ایک ناصف یازجی اور دوسرے بطرس بستانی، عربوں کی قومی اور ذہنی زندگی کی تشکیل میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ دونوں عیسائی تھے۔

ناصر یازجی ۱۸۷۰ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ گاؤں کے مکتب میں

میں ان دنوں جو ناقص تعلیم رائج تھی ان کو بھی نئی تحصیل علم کے شوق میں گھبراتے باہر نکلا۔ خانقاہوں کے کتب خانوں میں جو قلمی کتابیں ملیں ان کو پڑھا، اکثر کتابوں کی نقل بھی کی جو آج تک ان کے گھرانے میں محفوظ ہیں۔

دو سال تک ایک خانقاہ کے مکرم سیرمی رہے، پھر لبنان کے امیر شہر کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۷۷ء میں ابراہیم پاشا کے اخراج کے ساتھ امیر کو عیلا وطن کیا گیا تو یہ بھی ملازمت سے برطرف ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد امریکی مبلغین نے اپنے شعبہ تصنیف و -الیف کے لئے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ ۱۸۷۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ عربی زبان سے ناصت نازجی کو عشق تھا اور اپنی پوری زندگی اسی زبان کی توسیع و اشاعت پر صرف کردی۔ ان کا بیان تھا کہ عربوں کی نجات کی واحد شکل یہی ہے کہ عربی زبان اور عربی تمدن کا احیاء ہو۔ ناصت یازجی مسلمانوں اور عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہتے کہ عربی زبان تم دونوں کی مشترکہ وراثت ہے اور اسی چیز کو تم لوگ دائمی اتحاد کا سنگ بنیاد بناؤ۔

پطرس بربطانی ۱۸۷۸ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا، اس لئے تعلیم بھی ان کو بہتر قسم کی نصیب ہوئی۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی ان کو سکھائی گئیں۔ ۱۸۷۸ء میں بیروت آئے۔ یہاں مسئلہ اعلیٰ اسمتہ اور ان کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ان کو استادوں کی ٹریننگ کے کالج میں جگہ مل گئی۔ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے پطرس بربطانی نے بے حد مفید کتابیں تصنیف کیں۔ عربی زبان کا ایک لغت بھی انھوں نے مرتب کیا جو محیط المحيط کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے بعد میں اسی لغت کی غنیمت کم کر کے طلباء کے استعمال کے لئے قطر المحيط کے نام سے شائع کیا۔ عربی زبان کی انسائیکلو پیڈیا بھی پطرس بربطانی نے مرتب کرنی شروع کی تھی جس کی چھ جلدیں ان کے انتقال کے وقت تک شائع ہوئی تھیں۔ عربی زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار بھی پطرس بربطانی نے نفع سوریہ کے نام سے جاری کیا۔ ۱۸۷۸ء کے قتل و غارتہ نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعصب اور نفرت کی خلیج بیدار کر دی تھی۔ اس اخبار کا مقصد اسی خلیج کا پرکھنا تھا۔ پطرس بربطانی نے اسی خلیج کے پیش نظر ایک اسکول بھی نیشنل اسکول کے نام سے کھولا اور ایک پندرہ روزہ رسالہ بھی جاری کیا اس کا بھی مقصد تعصب کا ازاد اور قومیت کے جذبہ کو بیدار کرنا تھا۔ اس رسالہ کے سرورق پر لکھا رہتا:

”حب الوطنی جزو ایمان ہے“

ناصر یازجی اور پطرس بربطانی نے ایک ادبی انجمن بھی قائم کی جو صرف شام ہی میں نہیں بلکہ پورے عرب میں اپنے طرز کی پہلی انجمن تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی ملک میں اور بھی ادبی انجمنیں بنائی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ انجمن تھی جو ۱۸۷۸ء میں بنائی گئی۔ اس کی درخواستیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے تمام ممبر عرب تھے اور دوسرے یہ کہ اس کے ممبروں میں عیسائی و مسلمان بھی شامل تھے۔ پہلی انجمن کے قیام کے وقت تو فرقہ وارانہ تعصب بہت تھا اسی وجہ سے مسلمان اس انجمن سے علاحدہ رہے لیکن رفتہ رفتہ تعصبات کی بندشیں ڈھیلی پڑتی گئیں۔ بالآخر مسلمانوں نے خود تجویز پیش کی کہ اگر عیسائی مبلغین کا اثر اس انجمن سے دور کر دیا جائے تو وہ شرکت کریں گے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء میں ایک سوسائٹی سینئرین مائٹفک سوسائٹی کے نام سے قائم ہوئی۔ شام کی تاریخ میں عموماً اور ۱۸۷۸ء میں عثماني دور میں خصوصاً کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں بنا تھا جس پر عیسائی اور مسلمان کسی مشترکہ مقصد کے لئے جمع ہوتے۔

تھہر سلطان عبدالحمید کے دور خلافت کی ابتدا سے پورے ایک سال پیشتر کا ہے۔ اسی خفیہ انجمن نے پہلی بار منظم طریقے پر عربی قومی تحریک شروع کی۔ یہ سب کے سب عیسائی تھے مگر پہلے ہی دن ان لوگوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں اور درویشوں کو بھی اس انجمن میں شامل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ملک کے بائیس اور روشن خیال اصحاب اس خفیہ جماعت میں شامل ہو گئے اب یہ قومی انجمن تھی جس میں مسلمان اور عیسائی سب شامل تھے۔ انھیں دنوں یورپی انداز کی فرمیں بھی شام میں نئی نئی شریعت ہوئی تھی۔ اس خفیہ انجمن نے اپنے ایک ممبر کی مدد سے اس نوزائیدہ فرمیں لانچ کی بھی اپنی تحریک کا ہمدرد بنایا۔

اس انجمن کا مرکز بیروت تھا اور اس کی شاخیں دمشق، طرابلس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس انجمن کا مصلح نظر واضح انداز میں انقلابی تھا۔ ابتدائیں تو یہ انجمن نشستیں دگفتگو برخواستہ کے آگے نہ بڑھ سکی، خفیہ جلسے ہوتے، ممبر آپس میں تبادلہ خیال کرتے یا کچھ اسکیمیں مرتب کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ بالآخر کانامچھوسی کی سازشوں کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وسیع پیمانے پر کام شروع کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ موثر طریقہ ان لوگوں نے یہ سوچا کہ بڑے بڑے اشتہار ہاتھ سے لکھ کر شہر کی دیواروں پر چسپاں کئے جائیں۔ ترکی دور استبداد میں کوئی دوسرا موثر طریقہ ممکن بھی نہ تھا۔ ان نوجوان سازش کرنے والوں نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ اشتہار کا مضمون مرتب کر کے رات رات بھر وہ لوگ خط بگاڑ بگاڑ کر ان کی فائیں کرتے اور رات کے آخری حصہ میں گوند کی شیشیاں جیب میں ڈال کر شہر کے مختلف حصوں میں جا کر جتنے اشتہارات چسپاں کر سکتے تھے سب کے وقت ان اشتہارات کے گرد سیکڑوں انسانوں کا مجمع ہوتا۔ ایک شخص بہ آواز بلند اس کا مضمون مجمع کو پڑھ کر سناتا۔ یہاں تک کہ پولیس موقع پر آجاتی اور اشتہار کو نوچ کر دو چار بے قصور راہ چلتوں کو گرفتار کر لیتی۔ بیروت میں ان اشتہاروں کا چرچا ختم نہ ہونے پایا تھا کہ دمشق، طرابلس سے بھی اسی طرح کے اشتہارات کی اطلاع موصول ہوئی۔ لوگ آپس میں پہچان کر رہے تھے کہ ان اشتہارات کی شان نزول کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے۔ انجمن کے ممبر بھی اپنے راز کو چھپائے ہوئے ان حلقوں میں گریہ کر کے بحث کرتے وہ اس کا بھی غور سے مطالعہ کرتے کہ عوام پر ان اشتہاروں کا کیا اثر پڑا ہے اور انھیں تاثرات کی روشنی میں وہ دوسرا اشتہار مرتب کرتے ان اشتہارات میں ترکی حکومت کی بری طرح دھجیاں اڑائی جاتیں اور عربوں کو بغاوت کی ترغیب بھی دی جاتی۔ شام اور فلسطینیہ دونوں جگہ کے حکام سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ سلطان نے دارالخلافہ سے اپنے چند معتد جاسوسوں کو اس کی تفتیش کیلئے روانہ کیا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی ہوئی، سیکڑوں بے قصور انسانوں کو صحنہ پر قید کیا گیا۔ عام طور سے شہر اور قضا کا شام کے گورنر محنت پاشا کو اس تحریک سے گہرا تعلق ہے کچھ لوگ اس سلسلہ میں بہت آگے بڑھ جاتے اور کہتے کہ جس طرح مقررین محمد علی نے اپنے خاندان کی حکومت قائم کی ہے اسی طرح محنت پاشا شام میں اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، محنت پاشا کو اس انجمن کا کوئی علم نہ تھا، بلکہ ان کے واپس بلائے جانے کے تین چار سال بعد تک یہ انجمن قائم رہی۔ جب سلطان عبدالحمید کا استبداد ناقابل برداشت ہو گیا تو انجمن کے ممبروں نے اپنی کارروائی کو ختم کرنا ہی مناسب سمجھا اور اس کی تمام کارروائیاں ضائع کر دی گئیں اور پیشتر ممبر ہجرت کر کے مقرر چلے گئے۔ عوام کو یہ حکومت کو اس انجمن کے کسی ممبر کے متعلق کوئی علم نہ ہو سکا۔

اس انجمن کے متعلق اگر کہیں کوئی رکارڈ مل سکتا ہے تو صرف لندن کے رکارڈ آفس میں، وہ بھی صرف مراسلات کی شکل میں جو وقتاً فوقتاً برطانوی قونصل نے روانہ کئے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلا تاریخ برطانوی قونصل نے ۱۸۷۸ء کو

روانہ کیا تھا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے :

”بیروت میں انقلابی اشتہارات چسپاں کئے گئے ہیں۔ ان کا مصنف محنت کو سمجھا جا رہا ہے تفصیل آئندہ ڈاک سے“

اس کے ساتھ ہی کچھ اور مراسلات ہیں جو بیروت اور دمشق کے برطانوی قنصلوں نے روانہ کئے تھے۔ سب سے زیادہ اہم مراسلہ بیروت کے قنصل کا ہے، جس کے ساتھ تین اشتہارات بھی منسلک کئے گئے تھے۔ ان میں ایک تو اصلی اشتہار ہے جو پریس کے پہونچنے سے پہلے ہی کسی نے اڑا دیا تھا اور دو مختلف اشتہاروں کی نقلیں ہیں۔

پہلا اشتہار جو ۳ جولائی ۱۹۷۷ء کے مراسلہ کے ساتھ منسلک ہے۔ وہ بہت مختصر اور کم و بچسپ ہے۔ یہ سب سے پہلا اشتہار ہے جس کی اطلاع برطانوی قنصل جنرل کو ہوئی مگر یہ خفیہ انجن کا پہلا اشتہار نہیں ہے کیونکہ اس میں خود کسی پہلے اشتہار کا حوالہ موجود ہے۔ اس اشتہار میں اہل شام کو ترکوں کے مظالم کے باوجود ان کی گراں خواہی پر ملامت کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ عربوں کی نا اتفاقی نے آج ان لوگوں کو یورپ کی حکومتوں کی خواہشات کا شکار بنا دیا ہے۔ اسی اشتہار میں ”عربی غرور“ کا واسطہ دلا کر اپیل کی گئی ہے کہ اپنے کل اختلافات کو ختم کر کے پوری قوم ظالموں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو جائے۔

ان مراسلات کے ساتھ دوسرے اشتہارات جو منسلک ہیں ان میں اور زیادہ تلخی کے ساتھ ترکوں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ ایک اشتہار جو ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷ء کی شب میں چسپاں کیا گیا وہ بیدار ہم ہے، کیونکہ اس میں عربوں کے سیاسی مطالبات درج ہیں جو پہلے پہل عوام کے سامنے پیش کئے گئے۔ اسی اشتہار میں اس کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اس انجن کے ممبر تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان مطالبات کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اگر ضرورت ہوئی تو تلوار اٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے گا۔

اس اشتہار میں حسب ذیل مطالبات درج ہیں :

- (۱) شام اور لبنان کو آزاد کیا جائے اور پہلے کی طرح متحد کر دیا جائے۔
- (۲) عربی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔
- (۳) سسٹر ختم کیا جائے اور اظہار خیال نیز تحصیل علم پر کوئی پابندی عاید نہ ہو
- (۴) مقامی فوجی خدمات کے لئے صرف مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔

ان مطالبات کے متعلق یہاں پر چند باتیں جان لینا ضروری ہے۔ شام اور لبنان کو ۱۹۶۷ء میں تقسیم کیا گیا تھا جس کا ذکر ادھر آچکا ہے۔ اس تقسیم کی وجہ سے شام اور لبنان کا سیاسی ڈھانچا ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو گیا تھا۔ اور یہ چیز ”عرب قومیت“ کے احیاء کی راہ میں سنگ گراں بن رہی تھی۔

دوسرا مطالبہ بھی کافی اہم تھا۔ شام میں عربی زبان کی جگہ ترکی زبان نے لے لی تھی۔ اُس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بعض سرکاری افسر تھے وہ سب ترکی تھے اور وہ عربی سے بالکل نا بلند تھے چنانچہ سرکاری دفاتر میں عام طور پر ترکی زبان رائج تھی۔

حکومت نے غیر ملکی کتابوں کا داخلہ قطعاً ممنوع قرار دیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عام نہ ہونے پائے۔ عربوں میں قومی بیداری تعلیمی ترقی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اس لئے حکومت نے بھی مناسب سمجھا کہ پہلا جڑھی پرکاری ضرب لگائی جائے تاکہ شاخیں خود بخود خشک ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں تحریر و تقریر کی آزادی بھی بالکل سلب کر لی گئی۔

(۴)

اٹھسویں صدی کے آخر میں ایک قابل ذکر ہستی منظر عام پر نمودار ہوئی جس نے بڑی حد تک قومی تحریک کا رخ ہی بدل دیا۔ اُس نے لیڈر شپ عیسائیوں کے ہاتھ سے لیکر مسلمانوں کو سونپ دی۔ یہ تھی عبدالرحمان کو ایک ہی تھی۔ اُن کا تعلق شام کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی مسلم کالج میں تعلیم پائی۔ اخبار نویس اور وکیل کی حیثیت سے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔

کچھ دنوں کے بعد سیاسی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اسی سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں رہائی کے بعد مصر ہجرت کر کے چلے گئے کچھ دنوں مقرر میں قیام کرنے کے بعد عالم اسلامی کی سیاحت کے لئے نکلے۔ سائی لینڈ، زنجبار اور تین ہوتے ہوئے مکہ پہنچے جہاں چند روز قیام کیا اور پھر قاہرہ واپس آ گئے۔ ۱۹۰۷ء میں یکایک ۵۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی سب ہی شامل تھے۔ غریبوں سے اُلو فاضل لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایک دفتر انھوں نے کھول رکھا تھا جہاں غریبوں کو بلا قیمت قانونی مشورہ دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور سے وہ "غریبوں کے باپ" کے نام سے مشہور تھے۔

کو ایک ہی نے ایک کتاب "ام القرون" کے نام سے لکھی اور اس کتاب میں بڑے دلچسپ انداز سے خلافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سیاسی تحریک کی باگ ڈور عیسائی ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی اس میں بھی اس کتاب کا بہت بڑا حصہ تھا۔

نوجوان ترک اور نوجوان عرب

(۱)

۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو ترکی میں ایک سیاسی انقلاب ظہور پذیر ہوا اور اُس کے ساتھ ہی سلطان عبدالحمید نے اپنی رعایا کو ایک نیا دستور عطا کیا۔ دوسرے ہی دن سنسکاسلسلہ ختم کر دیا گیا، سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے اور جاسوسوں کی فوج جو تین لاکھ افراد پر مشتمل تھی معطل کر دی گئی۔

یہ انقلاب انجمن اتحاد و ترقی نے کیا تھا جس میں ترکوں کے ساتھ عرب بھی شریک تھے چنانچہ دستور کے نفاذ کے وقت ترکوں کے ساتھ عربوں نے بھی بہت خوشی کا اظہار کیا۔ شریف حسین جن کو سلطان نے قسطنطنیہ بلا کر نظر بند کر دیا تھا، اتحاد و ترقی نے ان کو شریف مکہ کے عہدہ پر مقرر کیا۔ سلطان نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ شریف حسین مدینہ پہنچنے کے بعد بجائے خود ایک مستقل خطہ بن جائے گا مگر اُن کی بات نہ سنی گئی اور شریف حسین حجاز کے لئے روانہ ہو گئے۔

انقلاب کے بعد جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو نئے دستور کے مطابق عام انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقع پر عربوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پارلیمنٹ میں ۵۰ اترک اور صرف ۲۰ عرب منتخب ہوئے اگرچہ عربوں کی آبادی نصف سے زائد تھی اور سینٹ (Senate) جس کے ممبروں کو خود سلطان نے نامزد کیا تھا اس کے ۴۰ ممبروں میں صرف ۳ عرب ممبر تھے۔ ہوئے۔ انقلاب سے پہلے اور اُس کے بعد ترکوں نے عربوں سے جو عہد و پیمان کیا تھا، یہ تھی اُس کی پہلی قسط۔

اس تلخ تجربے نے عربوں کو اندر دینی کارروائی کے لئے مجبور کیا۔ متعدد خفیہ سیاسی ادارے تیزی کے ساتھ ملک میں قائم ہوئے جن میں سے اکثر کا حکومت کو اخیر وقت تک کوئی علم نہ ہو سکا۔ ان تمام انجمنوں کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے بلکہ ان میں ایک حد تک اتحاد بھی تھا۔ ان انجمنوں کے بعض ممبروں کو دوران جنگ میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک انجمن اُن مسلمان طلبہ نے قائم کی جو پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس انجمن نے بہت زیادہ نمایاں کام انجام دئے۔ پہلے دو سال میں اس کا مرکز پیرس ہی رہا لیکن ۱۹۱۲ء میں اُس کا دفتر دمشق میں قائم ہوا اور اُس کی شاخیں تمام ملک میں پھیل گئیں۔ یہاں عیسائیوں نے بھی اس میں کافی دلچسپی لی۔ اس انجمن کا صحیح راز حکومت کو اخیر وقت تک نہ معلوم ہو سکا۔ اس کے ایک ممبر کو حکومت نے گرفتار کیا اور جس قدر اذیتیں دیا جاسکتی تھیں اُس کو دی گئیں مگر اُس نے اپنا راز ظاہر نہ کیا۔ جب مصیبتیں ناقابل برداشت ہوئیں تو اُس نے خودکشی کر لی۔

۱۹۱۲ء میں ایک سیاسی ادارہ عرب کو ترکی حکومت سے علیحدہ کرنے کے لئے بیروت میں قائم کیا گیا۔ اس کا نام دستور ساز کمیٹی تھا اور یہ کمیٹی ۸۶ ممبروں پر مشتمل تھی جس میں عیسائی اور مسلمان سب ہی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ملکی دستور کا ایک خاکہ تیار کیا اور وسط فروری ۱۹۱۲ء میں ملک کے سامنے اُس کو پیش کیا گیا، جس کی حمایت میں شام اور عراق کے تمام شہروں میں جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ یہ تحریک اتحاد و ترقی والوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۱۲ء کو جبکہ اس کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا پولیس نے اُس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا اس حکم نے ملک میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگا دی۔ بیروت میں دوسرے دن مکمل چڑتال ہوئی اور اخباروں نے اس خبر کو سیاہ حاشیوں میں شائع کیا۔ حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ تحریک کے سربراہ اور وہ لیڈروں کو گرفتار کیا اور ملک کے بہت سے اخبار بند کر دئے لیکن تحریک رک نہ سکی اور شام سے مکمل کربت کے دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی۔ مجبوراً حکومت نے اعلان کیا کہ دستور ساز کمیٹی کے مطالبات مغرب پرے لے جائیں گے۔ اس کے بعد ہی لیڈروں کو بھی رہا کر دیا گیا اور تحریک ختم ہو گئی۔

۱۵ مئی ۱۹۱۲ء کو سرکاری طور پر ایک اعلان شائع کیا گیا اس میں اصلاحات کا ذکر ضرور تھا مگر عرب مطالبات اُس سے پورے نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض اعتبار سے تو عربوں کو جو حقوق حاصل تھے وہ بھی چھین لئے گئے تھے۔

اب تحریک کا مرکز پیرس منتقل ہوا۔ عام طور پر تحریک کے لیڈروں کا خیال تھا کہ اب وسیع پیمانے پر پروپگنڈا کا کام شروع کیا جائے مگر صورت حالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ترکی حکومت کسی طرح بھی اب اس کو چلنے نہیں دے گی چنانچہ اکیلے غیر جانبدار ملک کی تلاش ہوئی جس پر ترکوں کا کوئی اثر نہ پڑ سکے اور اس سلسلہ میں پیرس کو منتخب کیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کے پیش نظر ایک کانفرنس کی تجویز تھی جس میں تمام عرب صوبوں کے نمائندے شرکت کریں اس تجویز کی تائید کم و بیش ملک کی تمام انجمنوں نے کی اور اُس کے انتظامات پوری قوت کے ساتھ شروع کر دئے گئے۔

بالآخر ۱۶ جون ۱۹۱۳ء کو کانفرنس کا افتتاح پیرس میں ہوا۔ ملک کے ۴۴ بڑے بڑے لیڈر اس اجتماع میں شرکت تھے۔ اتحاد و ترقی نے پہلے تو کانفرنس کے ممبروں کو توڑنے کی کوشش کی اور جب کوئی کامیابی کی شکل نظر نہ آئی تو فرانس کی حکومت پر اُس نے زور ڈالا کہ کانفرنس پیرس میں منعقد ہو سکے اور جب اس میں بھی ناکامی ہوئی تو اتحاد و ترقی کے سکریٹری کو پیرس روانہ کیا گیا کہ وہ کانفرنس کے ممبروں سے مصالحت کی گفت و شنید کرے، اُس نے اپنا مشن بڑی کامیابی کے ساتھ

پورا کیا، اور کانفرنس کے عرب ممبر خوشی خوشی واپس لوٹے۔ لیکن جب سرکاری اعلان شائع ہوا تو وہ امیدوں کے سرسرخ لٹاؤ تھا اور اُس وقت کانفرنس کے ممبروں کی سمجھ میں آیا کہ یہ تمام شرائط ان چالیس کانفرنس کو ختم کرنے کے لئے چلی گئی تھیں۔

(۲)

ایشیا، اسی سلطان کے مقبوضات تو سلاسل میں وہی تھے جو ان کے تحت نشین ہونے کے وقت ان کو ورثہ ملے تھے۔ لیکن جزیرہ نمائے عرب میں برطانیہ کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ حکومت ہند نے عرب سرداروں سے کئی معاہدے بھی کئے تھے۔ عدن کے اردگرد کی کوچھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی برطانیہ کی حفاظت میں آگئی تھیں اور مسقط و بحرین سے بھی حکومت ہند نے معاہدہ کر لیا تھا۔ ان حالات نے قدرتنا حکومت ہند کے اقتدار کو بڑھا دیا۔ تین میں بھی سلطان عبدالحمید کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں وہاں شدید بھینچ پیدا ہوئی جس کو دبانے کے لئے پائے تخت سے ایک فوجی دستہ روانہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ابھی اس طرف سے پورا اطمینان نہ ہوا تھا کہ ۱۹۱۳ء میں پھر وہاں بغاوت شروع ہوئی۔ اس کی قیادت امام بیک کر رہے تھے۔ پر امام کا قبضہ ہو گیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ امام بیک کی پرقبضہ ہوا۔ اس مرتبہ سلطان نے عاجز آکر امام سے مصالحت کر لی، اس کامیابی نے تین میں امام بیک کا اقتدار بہت بڑھا دیا۔

تین کے شمال میں اسیریا کا صوبہ تھا وہاں سید محمد ابن علی ادنیسی کا زور بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اُسے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام بیک اُس کی پشت پناہی کر رہے تھے، مگر اُس کو شکست ہوئی۔ دوسری مرتبہ اُس نے پھر بغاوت کی اس مرتبہ اطالوی امداد اُس کے ساتھ تھی۔ ابکی بار وہ پہاڑی علاقہ کا مالک بن بیٹھا۔ حجاز میں بھی اب سلطان کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ شریف مکہ کے عہدہ پر شریف حسین کے تقرر نے سلطان کے لئے ایک مستقل مصیبت پیدا کر دی تھی۔ حجاز میں اب شریف حسین کا اس قدر اقتدار پیدا ہو گیا تھا کہ سلطان شریف حسین کو اُس کے عہدہ سے معزول کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

(۳)

حجاز میں شریف حسین کے بعد دوسری اہم شخصیت خود اس کے بڑے لڑکے امیر عبداللہ کی تھی۔ شریف حسین کی جلاوطنی کے زمانہ میں اُس کو ترکوں کے ساتھ رہنے کا بہت کافی موقع ملا تھا اور اس وقت وہ عثمانی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا عبداللہ تیز جلد باز اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والا انسان تھا۔ اپنے باپ سے دور اندیشی کا بھی کچھ حصہ اُس نے پایا تھا۔ وہ ہمت کے ساتھ لارڈ کچنر کے پاس انگلستان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے گیا۔ یہ قصہ فروری ۱۹۱۷ء کے پہلے ہفتہ کا ہے۔ کچنر اس وقت مصر میں برطانوی ایجنٹ تھا۔ ان دونوں کی گفتگو روزنامہ اسٹورس کی موجودگی میں

ہوئی جو اس وقت برطانوی ایجنسی کے محکمہ مشرقیات کے سیکریٹری تھے۔ عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ گفتگو کی اور یہ بھی بتلادیا کہ اتحاد و ترقی والے اُس کے باپ کو شریفیہ کے عہدہ سے معزول کرنے کی فکر میں ہیں اور اگر ان لوگوں نے ایسا کیا تو وہ حجاز میں ترکوں کے خلاف قطعاً بغاوت کرے گا۔ عبداللہ نے پیرکارانہ انداز سے دوران گفتگو میں اس کا بھی اندازہ لگانے کی پوری کوشش کی کہ بغاوت کی صورت میں انگلستان کا کیا رویہ ہوگا۔ کچرنے بھی درپردہ یہ ظاہر کیا کہ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات چونکہ دوستانہ ہیں۔ اس لئے عبداللہ کا ساتھ انگلستان شاید ہی دے سکے مگر اُس نے کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ کچرنے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا مخاطب کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا ہے مگر پہلی ملاقات میں اُن کا اظہار وہ مناسب نہیں سمجھتا۔ چنانچہ کچرنے دوسرے دن روزنامہ اسٹورس کو باز دید کے لئے بھیجا۔

عبداللہ نے اپنے ارادے، عرب لیڈروں کے خیالات اور حجاز کی پوری صورت حال صاف اور واضح انداز میں روزنامہ اسٹورس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ آخر میں پھر اُس نے انگلستان کے رویہ کے متعلق سوال کیا اور یہ بھی دریافت کیا کہ اگر یہ اس کے لئے کچھ مشین گنیں فراہم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اسٹورس نے بھی وہی کہنا جو کچرنے کہا تھا۔

ظاہر تھا اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مگر آنے والے واقعات پر یہ ملاقات بہت زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس گفتگو نے کم از کم کچرنے کی تو آنکھیں کھول دیں۔ ایک طرف اُس کو عربوں اور ترکوں کے تعلقات کی صحیح حقیقت معلوم ہوئی اور دوسری طرف عربوں کے جذبہ آزادی کا صحیح اندازہ بھی اس کو ہو گیا۔

(باقی)

حصہ دوم : عربوں کی سیاست دوران جنگ میں
تیسرا حصہ : عربوں کی سیاست بعد از جنگ

محمد عتیق صدیقی

فلسفہ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت ۷۵ روپے، رعایتی ۱۲ روپے محمول علاوہ۔
مینجرنگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

کرمی

رحمت تو ہوگی، لیکن میرا بڑا کام نکل جائے اگر آپ سلام صاحب کو فوراً میرے پاس روانہ کرا دیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ”وے برنڈش“ قسم کے انسان ہیں اور جب کبھی وہ سفر کرنا چاہتے ہیں تو ریل ہمیشہ وقت سے پہلے چھوٹ جاتی ہے۔

وہ وعدہ کریں بھی تو یقین نہ کیجئے بلکہ اپنے آدمی سے کہئے کہ کشاں کشاں انھیں اسٹیشن تک لیجائے بلکہ ممکن ہو تو گاڑی میں بٹھانے کے بعد دروازہ کو بھی مقفل کرا دے، اور جب تک ریل کی رفتار کافی تیز نہ ہو جائے، نہ کھتاڑی کہ کہیں کھڑکی۔ نہ باہر کودنے کی کوشش تو نہیں کرتے۔

میں روز ایک خط بھیجتا ہوں اور وہ روز وہاں سے لکھ بھیجتے ہیں کہ آ رہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ قیامت کا آنا برحق ہو یا نہ ہو لیکن ان کا نہ آنا ضرور برحق ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اُن کے نہ آنے سے بتنا حرج ہو رہا ہے، اس کا اندازہ آپ میری اس یتیمی سے اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

جناب کی تحریر قضاے مہرم کی طرح پہنچی اور اسی وقت میں۔ نہ تعمیل ارشاد بھی کر دی، لیکن اگر ناگوار نہ ہو تو یہ بتا دیجئے کہ اس تدبیر سے آپ نے کیا فائدہ سوچا ہے۔ بفرض محال اگر وہ آپ کی خواہش کے مطابق تحریر دے بھی دیں، تو اس کی پابندی کی ضمانت کیا ہے۔ جس کام کا آغاز ہی بے اعتمادی ہو۔ اس کا انجام معلوم! اگر سب کچھ بر بنائے احتیاط ہے، تو میری رائے میں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زہر کھا کر مر جانے کے لئے تو طیار ہو، لیکن شرط یہ قرار دے کہ پہلے تریاق مہیا کر دو۔ تریاق کی فکر ہو تو زہر کھانا ہی کیا ضرور ہے۔ اگر آپ کو اُن کی طرف سے بد عہدی کا اندیشہ ہے تو میری رائے میں یہ رشتہ مناسب نہیں۔ ٹوٹنے والے دل کہیں دستاویز و تحریر سے جڑا کرتے ہیں

گرامی عزیز
غزل دیکھی۔ یوں آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو تعریف کر دوں، لیکن میری رائے میں آپ کی غزل کا ایک شعر بھی صحیح رنگ تغزل نہیں رکھتا۔ آپ اس باب میں میری رہنمائی و ہدایت چاہتے ہیں، لیکن میں کیونکر سمجھاؤں کہ تغزل کس چیز کا نام ہے اور اس کا صحیح معیار کیا ہے۔
ذوق کا شعر ہے :-

راہ آہ کے شب، دل سے وہ پیکان نکل آیا
تھا کام تو شکل مگر آسماں نکل آیا
فن کے لحاظ سے اس میں کوئی نامی نہیں، لیکن شعریت یا تغزل سے اسے کیا واسطہ؟ اسی دل سے پیکان نکلنے، گو میر اس طرح کہتا ہے :-

سب ہوتے نادم پئے تو ہیر ہو، جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت
آپ ان دونوں میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر میر کا شعر آپ کے دل پر کوئی اثر چھوڑ جاتا ہے تو خور کیجئے کہ یوں؟ اسی چیز کا نام تغزل ہے، لیکن اگر آپ کو ذوق کا شعر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، تو پھر آپ کو کسی رہبری و ہدایت کی ضرورت نہیں، آپ آزار ہیں؟ چاہے کہئے اور جو چاہئے سمجئے۔
ذوق کی ایک مشہور غزل ہے :- ”قابل ہوتا۔ مقابل ہوتا۔ قابل کا قافیہ انھوں نے اس طرح نظم کیا ہے
سینہ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا،
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا،
دوسرا مصرعہ بہت پاکیزہ ہے، لیکن پہلے مصرعہ کے سینہ چرخ اور اختر نے شعر کو تغزل سے علاحدہ کر دیا۔ اسی قافیہ میں شہیدی کا شعر سنئے:

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا
ذوق کے سانسے دیوان پر بھاری ہے۔

افسوس ہے کہ شعر کا صحیح ذوق بالکل خدائی دین ہے اور کوشش کر کے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص شعر بھی ضرور کہے۔ شاعر ہونا کوئی بڑی عمدہ بات نہیں جس پر آپ کو رشک آئے۔ لیکن اگر آپ اس مشنہ کو ترک کرنا نہیں چاہتے تو غزلوں کا خیال چھوڑ دیجئے، اور بہت سے اصناف سخن ہیں ان کا تجربہ کیجئے۔

بندہ نواز، کمزور نامہ کا شکر یہ۔ آپ نے جن محبت بھرے الفاظ سے مجھے یاد دلایا ہے، انکی قوت کو محسوس کرتا ہوں

یہی بات میں جو کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

لیکن

اور سچ پوچھئے تو سوال اعتماد دے کا بھی نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ
زینم بخیرہ نتوان کرد چاک داسن گل را
اس سے زیادہ بر قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

شعرا کہا کرتے ہیں کہ در عدد سے گزر کر دوا ہو جاتا ہے، یہاں دو ائیں صد سے گزر کر در وین گئی ہیں۔ پھر آپ کیوں
اپنی محبت رائگاں کر میں زمین شور سنبل بر نیار دیا

کس قدر تکلیف ہوئی مجھے یہ سن کر کہ آپ ادھر سے گزرے بھی واپس بھی گئے! میں جانتا ہوں کہ مجھ سے ملنا
نہ ضروریات زندگی میں داخل ہے نہ نشاط زندگی میں، لیکن کم از کم آپ کے لئے معیار انسانیت ضرور تھا! آپ کے لئے
اس لئے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ انسان سمجھتے ہیں۔

خیر میں یہ تو پوچھ نہیں سکتا کہ سفر کا مقصد کیا تھا، لیکن اس قدر بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ آئندہ کب جانے کا
مقصد ہے۔ مجھے آپ سے بعض باتیں نہایت ضروری کرنا ہیں، چاہتا ہوں کہ اسٹیشن ہی پر مل کر کہہ لوں جو کچھ کہنا ہے،
یونٹوں میں لکھوں گا نہیں اور لکھوں بھی تو آپ جواب کب دیتے ہیں۔

خط پہونچا۔ کیا بتاؤں ان کا کیا حال ہے۔ کسی استاد کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا

پڑی تو سن عشق کی ٹاپ رے رے باپ رے، باپ رے، باپ رے
بس یہی عالم ہے۔ کل تشریف لائے تھے، نہایت بدحواس و پریشان حال، مینے قصد اگوئی ذکر نہیں چھڑا، ورنہ
روپڑ تے کیا یہ ممکن نہیں کہ چند دن کے لئے تم اپنے پاس بلاؤ۔ شاید سنبھل جائیں۔

کمری - میں آپ کی رائے سے تو متفق ہوں، لیکن تدریس و عمل کی راہ سے نہیں، یعنی یہ تو ضرور چاہتا ہوں کہ اُن کو ہموار
کر کے یہ کام کیا جائے، لیکن ہموار کرنے کی جو صورت آپ نے سوچی ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔
آپ جانتے ہیں وہ نہایت خاموش بلکہ گھٹا انسان ہے، ایک عمر گزرنے کے بعد بھی میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب وہ خفا ہوتا ہے تو
مُسکراتا کیوں ہے، اسلئے اس کے دل میں گھر کرنا تو مشکل ہے، خدا معلوم کیا سوچتا ہے کس ادھیر بن میں لگا رہتا ہے۔

ایسے انسانوں کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ جب تک انکے دماغ کو کوئی سخت ضرب نہ پہونچائی جائے انکی زبان نہیں کھلتی اسلئے زیادہ مہیا
ہے کہ جیسے صلح و آشتی کے آپ شروع ہی سے معاندانہ پہلو اختیار کیجئے اور اس کو یقین دلائے کہ اس نزاع میں آپ کی
اعدادیاں دوسرے فرقہ کے ساتھ ہیں، یہ بات جو کلاسیکی توقع کے خلاف ہوگی، اسلئے وہ گھبرا جائیگا اور ہو سکتا ہے کہ شکوہ و شکایت کے
سلسلہ میں دل کی بات زبان پر آجائے۔ مجھے بھی انکے ساتھ پوری ہمدردی ہو لیکن پہلے یہ قواطع بنانے ہو جائے کہ وہ کس قسم کی دشمنی کو دوستی سمجھتا ہے!

جرمنی کو ناکہ بندی سے شکست نہیں ہو سکتی

یہ خیال کہ جرمنی کی شکست کا باعث ناکہ بندی ہوگی درست نہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پولستان کے قبضہ سے جرمنی کو کتنا فائدہ پہونچا۔

پہلی ستمبر کو نازی افواج نے مغرب اور شمال اور جنوب کی طرف سے پولینڈ پر حملہ کیا اور ۱۷ اکتوبر کو مشرق کی طرف سے اور بارہ دن بعد ۲۹ ستمبر کو دونوں نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس سے قبل بھی تین بار پولینڈ کی تقسیم ہو چکی ہے (۱۷۹۲ء - ۱۷۹۵ء - ۱۸۹۵ء) اب چوتھی مرتبہ پھر قومی پڑوسیوں نے اس کے حصے کر لئے اور فرق صرف اتنا ہے کہ پچھلی تقسیموں میں آسٹریا بھی شریک ہوتا تھا اور اس مرتبہ چونکہ جرمنی اسے پہلے ہی ہضم کر چکا ہے اس لئے اسے کوئی حصہ نہیں ملا۔

اس مرتبہ جرمنی کو پولینڈ میں جتنا کچھ ملا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ گلیشیا کا حصہ جس میں پٹرول کے چشمے پائے جاتے ہیں جرمنی کو نہیں ملا لیکن یوں سب سے زیادہ زرخیز حصہ اسی کے ہاتھ آیا ہے۔

پولینڈ کا رقبہ ۵۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس میں سے ۵۵۰۰۰ مربع میل کا رقبہ جرمنی کو ملا اور ۹۵۰۰۰ مربع میل روس کو لیکن آبادی کی تقسیم میں دو کروڑ دس لاکھ آدمی جرمنی کے حصہ میں آئے اور ایک کروڑ چالیس لاکھ روس کے حصہ میں

جرمنی کے مقبوضہ حصہ میں مختلف قوموں کی آبادی کا تناسب یہ ہے:-

پولستانی ۱۸۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۴۰۰۰۰۰ — جرمن ۸۰۰۰۰۰ — اوکرائینی ۲۰۰۰۰۰ — روسی تقریباً ۶۰۰۰۰

روس کے مقبوضہ حصہ میں اس تناسب کی صورت یہ ہے:-

پولستانی ۴۵۰۰۰۰ — اوکرائینی ۶۰۰۰۰۰ — سفید روسی ۲۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۵۰۰۰۰ — جرمن ۹۵۰۰۰ — روسی ویز کی ۱۲۵۰۰۰

اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ بھی روس کو پولینڈ کا بڑا رقبہ مل گیا لیکن زیادہ آباد حصہ جس میں بڑے شہر، اور خاص خاص صنعت گاہیں شامل ہیں جرمنی ہی کے حصہ میں آیا۔ یعنی پولستان کے دس بڑے شہروں میں سے آٹھ جرمنی کو ملے اور صرف دو روس کو۔ بہترین زراعتی زمین، بڑے بڑے فارم، لوہے کے کپڑے کے کارخانے اور کوئلہ کی معدنیں سب جرمنی ہی کے ہاتھ آئی ہیں۔

پولانی سے پہلے پولستان میں ۳۲ لاکھ زراعتی فارم پائے جاتے تھے جن میں نصف سے کچھ کم یعنی ۱۴ لاکھ فارم جرمنی کو ملے لیکن بہت زیادہ ترقی یافتہ وزیر خیز زمینیں ۶۰ فی صدی کے حساب سے ہاتھ آئیں جو اب ریاستہائے ہانگ سے ہجرت کرنے والے جرمنوں کو دی جا رہی ہیں۔ قابل کاشت زمینوں، جنگلوں اور مویشیوں کی جو تقسیم ان دونوں کے درمیان ہوئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

جرمنی =	قابل کاشت زمین	چراگاہیں	جنگل
ایک کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ	۴۰ لاکھ ایکڑ	ایک کروڑ ایکڑ	
دس =	تین کروڑ ۱۰ لاکھ ایکڑ	x	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ

علاوہ اس کے جانوروں میں ۱۶۰۰۰۰ گھوڑے - ۴۰ لاکھ گائیں - ۴۰ لاکھ سور اور ۷ لاکھ بھیڑیں بھی جرمنی کے ہاتھ آئیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک رقبہ و کاشت کا تعلق ہے، روس کو جرمنی سے زیادہ ملا ہے، لیکن اس کو سب سے بڑا فائدہ کوئلہ کی معدنوں اور صنعت گاہوں سے ہوا ہے جن میں روس کا حصہ بہت کم ہے۔ کوئلہ کی پیداوار کے لحاظ سے پولستان کا دنیا میں ساتواں نمبر ہے۔ یہاں تین اضلاع میں ستر کوئلہ کی معدنیں ہیں جہاں ۶۵ ہزار کان کن کام کرتے ہیں اور تین کروڑ ٹن سے زیادہ کوئلہ سالانہ یہاں سے نکلتا ہے اور اب ان تمام معدنوں پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ جنگ کے دوران میں اندیشہ تھا کہ پولستانی فوجیں ان معدنوں میں پانی بھر کے بیکار کر دیں گی، لیکن جرمنی نے حملہ کرتے ہی سب سے پہلے ان معدنوں کا محاصرہ کر لیا تاکہ وہ پانی بھر کے خراب نہ کر دی جائیں اور اس طرح تمام کانیں جو ان کی تول جرمنی کے ہاتھ آ گئیں۔

پولستان میں نمک کی کانیں بھی بہت بڑی بڑی ہیں، یہ بھی سب کی سب اچھی حالت میں جرمنی کو مل گئیں اور وہاں برابر کام جاری ہے۔

پٹرول کے چٹنے البتہ روس کے ہاتھ آئے۔ یہاں سے سالانہ پانچ لاکھ ٹن پٹرول نکلتا ہے لیکن گزشتہ جنگ سے قبل دس لاکھ ٹن پٹرول یہاں سے نکلتا تھا اور اب بھی اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ نکل سکتا ہے

اگر انتظام معقول ہو -

سیمنٹ، کاغذ، چمڑا اور ربر کے چند کارخانوں کے علاوہ باقی سب کارخانے (یعنی تقریباً ۹۰ فیصدی) جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح نہ صرف لوہے، فولاد کے کارخانے بلکہ اور صنعتی ادارے بھی جرمنی کو مل گئے۔ پولینڈ کا کارخانہ *Wspolczesna Interesowna* دنیا کے بہت بڑے آہنی کارخانوں میں شمار ہوتا ہے اسی طرح *Katowice* کا کارخانہ بھی دھات حسانت کرنے کا نہایت عظیم الشان و ترقی یافتہ کارخانہ ہے۔ جہاں ۲۰ ہزار مزدور، ۵ ہزار عہدہ دار اور سیکٹرول انجینروں ماہرین فن کام کرتے ہیں اور جرمن فوج نے حملہ کے پہلے ہی دن ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ الغرض پولستان کے جست، سیسہ، ٹین، لوہے وغیرہ کے تمام کارخانے جرمنی کو مل گئے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جست کی پیداوار میں پولستان کا نمبر پانچواں ہے اور گزشتہ جنگ سے پہلے تقریباً دو لاکھ ٹن جست یہاں سے نکلتا تھا۔

پولستان کے پارچہ بانی، ادویہ سازی اور مشین ڈھالنے کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی ہی کو ملے۔ روس کو الکحل، شکر، تانور اور لکڑی کے کارخانے زیادہ ملے ہیں۔

پولستان میں تین شہر پارچہ بانی کے بڑے بڑے مرکز تھے ان میں سے دو مرکز جرمنی کو ملے ہیں اسی طرح دوا سازی اور برقی اینیاء کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی کے ہاتھ آئے ہیں، چمڑے کی صنعت گاہیں دونوں میں برابر تقسیم ہو گئی ہیں لیکن کاغذ کے کارخانے زیادہ تر جرمنی کو ملے ہیں۔ طیارہ سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی اکثر جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح پولستان کے تمام صنعتی اداروں میں سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار جرمن کو ملے اور ۲۰ ہزار روس کو۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ جرمن کو خام پیداوار کی فراہمی پولستان ہی کی طرف سے کتنی ہو رہی ہے اور اس میں اگر آپ روس، یونان اور بالٹک کی ریاستوں کو بھی شامل کر لیں تو یہ کہنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ ناکہ بندی سے جرمنی کو اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دس فیصدی نقصان پہونچا ہے جو ان ذخائر کو دیکھتے ہوئے جو جرمنی میں غنیمت سے جمع کئے جا رہے ہیں، کچھ نہیں ہے، اور اتحادیوں کا یہ خیال کہ وہ صرف ناکہ بندی سے جرمنی کو شکست دے سکتے ہیں، درست نہیں ہے۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

مینجرنگار لکھنؤ

نگار سائز کے ۲۴×۳۲ صفحات پر۔ قیمت مع محصول ۱۱/۱۱

باب الاستفسار

کلام مومن

(جناب محمد یحییٰ صاحب - بھاگلپور)

اس سے قبل کلام مومن کے مشکل اشعار پر نگار میں جتنا حصہ شایع ہوا ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستفسرین نے ترتیب کو پیش نظر رکھا تھا جو بہت مفید بات تھی اس لئے میں اسی سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے گزشتہ استفسار متعلقہ کے بعد والے اشعار پیش کرتا ہوں۔ آئندہ جو صاحب استفسار فرمائیں وہ اس کا لحاظ رکھیں تو بہتر ہے، کیونکہ اسکے بعد آخر میں ایک کتاب طیار ہو جائے گی۔

حل طلب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱ - یہ کاہ ربا سے بھی ہیں کم اکے کشش دل، مذکور کچھ ایسا پس چلن ہے ہمارا

اس میں ہیں کا فاعل کون سا لفظ ہے۔ شعر میں موجود نہیں ہے۔

۲ - تفریح نہ کیونکر ہو، ہوا آ نہیں سکتی گویا در درلہار نشیمن ہے ہمارا

ہوا کا نہ آنا باعث تکلیف ہوا کرتا ہے یا باعث تفریح۔

۳ - گر پاس ہے لوگوں کا تو آ جا کہ قلع سے ہے لاش کہیں اور کہیں دفن ہے ہمارا

پہلے مصرعہ کا تعلق دوسرے مصرعے سے سمجھ میں نہیں آیا۔ لاش و دفن کا تفرقہ اور لوگوں کا پاس

دونوں باتیں بے ربط سی معلوم ہوتی ہیں۔

۴ - چشمہ حیوان بنا اس کے لبوں کی شرم سے پانی پانی بکے اعجاز مسیحا ہو گیا

۵ - بیوفائی ہے سرشت اسکی سودہ ہم میں کہاں ہم مزاجی کے سبب سے غیر اپنا ہو گیا

مومن اور غیر میں ہم مزاجی کیونکر ہو گئی جبکہ ایک بیوفا ہے اور دوسرا نہیں۔

۶ - رو دیا اس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر قطرہ اشک نہ امت مجھ کو دریا ہو گیا

- ۷۔ میں تو دیوانہ تھا اس کی عقل کو کیا ہو گیا قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا
دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا۔
- ۸۔ یہ کس سے ہو کہ ان لظنوں پر گستاخی نہ ہو غیر ہمساکب ہوا ہر چہ ہمساکب ہو گیا
دوسرے مصرعہ میں ہمسادو جگہ آیا ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے ان میں کیا فرق ہے۔
- ۹۔ کیا اشکب غیر بھٹاکہ تحمل نہ ہو سکا میں جو انکر حریت تغافل نہ ہو سکا
۱۰۔ اس نے جو دل کو منہ نہ لگایا دو نیم ہے یہ باجم جم ہوا قدح مل نہ ہو سکا
۱۱۔ کہتے ہیں کہ شبن اپنی لگی اس کے دم سے تھی دشمن جو ہم تراڈ بلبل نہ ہو سکا
۱۲۔ وہ عکس زلف چشم عدد میں پڑا نہ ہو نظارہ بچہ سے جانب سنبل نہ ہو سکا
۱۳۔ تنگی وہی رہی دل صد چاک کی ہوا یہ غنچہ پاش پاش مگر گل نہ ہو سکا
۱۴۔ یضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا خود رفتگی کے صدمہ سے غش مجھ کو آگیا
۱۵۔ جلتی ہے جان آتش حسن پوش دیکھ کر چلن سے شعلہ رو کوئی جلوہ دکھایا گیا
۱۶۔ بوئے سمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز اس گل کو اعتبار نسیم و صبا گیب
۱۷۔ وہ ہنسے سُن کے نار بلبل کا مجھے رونا ہے خندہ لگی کا
۱۸۔ درِ شان سے تراجمو نزاکت خوش ہے کہیں ہمدوش ہوں گو غیر بھی جہد و جد

- (نگار) ۱۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں جہن غلط ہے اس کی جگہ ہے ہونا چاہئے۔ اس کا فاعل یہ ہے جو
کشش دل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ معشوق پس چلن بیٹھیکر ہماری کشش دل پر طعنہ زن ہو
کہ اس میں تو کاہ زبانی سی بھی کشش نہیں، ورنہ یہ چلن کہیں پڑی رہ سکتی تھی، آپ اٹھ جاتی۔
- ۲۔ ہوا نہ آسکنے سے مومن کو صرف اس وجہ سے تفریح ہے کہ ان کا نشیمن، بھی معشوق کے گھر سے مشابہ ہو گیا۔
یعنی کسی طرح وہاں ہوا تک نہیں باسکتی اسی طرح ان کے نشیمن میں بھی ہوا کا گز نہیں۔ دونوں جگہ معنی کا فرق
ضرور ہے، لیکن مومن نفسی ممانعت میں سے لطیف حاصل کرنا چاہتا ہے۔
- ۳۔ اگر لوگوں کا لحاظ ہے تو بھی میرے مدفن پر آنے میں کیا زحمت ہے کیونکہ فریاد قلاتی سے میری لاش وہاں موجود
ہی نہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاش و مدفن کا تفرق تھا ہمارے آنے سے مرٹ جائے گا اور یہی ایک بات ایسی
تھی جس کا لحاظ تھا۔
- ۴۔ جس چیز کو دنیا چشمہ حیواں کہتی رہے وہ فی الحقیقت اعجازِ مہیا ہے جو محبوب کے لبوں کے اعجاز کو دیکھ کر

شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اس کے لبوں کا اعجاز، مسیحا کے اعجاز اور آبِ حیات کی جان بخشی سے کہیں بڑھا چڑھا ہے۔

۵۔ دوسرے مصرعہ کا تعلق محبوب سے ہے اور اسی کی ہم مزاجی غیر سے دکھائی گئی ہے۔ مومن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۔ لا غری کی یہ مدعا ہے کہ ایک قطرہ اشک بھی ڈبو دینے کے لئے دریا کا حکم رکھتا ہے۔

۲۔ دوسرے مصرعہ کے دو ٹکڑے یوں کیجئے :-

قیس کہتا ہے مجھے۔ ناصح کو سودا ہو گیا

یعنی ناصح مجھے قیس کہتا ہے اور یہ اس کا سودا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قیس کو مجھ سے کیا نسبت !

۸۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کسی پر مہربان ہو اور وہ گستاخ نہ ہو جائے لیکن مومن اپنے آپ کو اس سے متشنی سمجھتا ہے اور غیر کے مقابلہ میں اپنا امتیاز اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ ہر چند غیر موردِ الطاف ہونے میں تو ہم سا ہو گیا لیکن ضبط و تحمل میں وہ ہمسائے ہو سکا، یعنی وہ گستاخ ہو گیا اور میں نے یہ غلطی کبھی نہیں کی۔

۹۔ محبوب کا تغافل کوئی رشک غیر تو تھا نہیں کہ تحمل نہ ہو سکتا۔ میں تو جان بوجھ کر متحمل نہ ہوا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ میں تمہارے تغافل کو تو برداشت کر سکتا ہوں لیکن رشک غیر کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر تم مجھ سے تغافل کرتے ہو تو کرو لیکن غیر سے بھی انتقام نہ رکھو کہ اس کی برداشت مجھ میں نہیں ہے۔

دوسرے مصرعہ میں ہو سکا بجائے ہوا کے استعمال ہوا ہے، کیونکہ جان کر کے بعد ہو سکا کا کوئی موقع نہیں۔

۱۰۔ چونکہ اس نے دل کو منہ نہ لگایا اس لئے دو نیم ہو گیا۔ اگر وہ منہ لگاتا تو قدح شراب بن جاتا لیکن اب صرف

جامِ خم ہو کر رہ گیا۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا دل وہ ہے کہ دو نیم ہونے کے بعد جامِ خم بن جاتا ہے۔

۱۱۔ محبوب کہتا ہے کہ میری گلی دشمن کی وجہ سے گلشن بنی ہوئی تھی، حالانکہ اس کو ہم ترانہ بلبیل ہونے کا بھی سلیقہ حاصل نہ تھا یعنی وہ بلبیل کے برابر بھی ناز نہ کر سکتا تھا۔

۱۲۔ مومن سبیل کی طرف نہ دیکھ سکا اور اس کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ چشمِ عدو میں عکسِ دل یار پڑا ہو۔ اور اس کا اثر مجھ پر یہ ہوا ہو کہ سبیل کی طرف نہ دیکھ سکوں انتہائی رشک و احساسِ رشک کو ظاہر

کیا گیا ہے۔

۱۳۔ پہلے مصرعہ میں ہوا کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے، یعنی یہ غنچہ پاش پاش ہوا مگر گلی نہ ہو سکا۔ دل کی

تنگی باوجود چاک چاک ہو جانے کے بھی وہی باقی ہے۔

۱۴۔ پہلے مصرعہ میں چلا گیا، ”چلا جائے گا“ کی بجائے استعمال ہوا ہے یعنی جب ”خود رفتگی“ کے صدمہ سے

مجھ کو خش آجاتا ہے تو دم سے کیونکر چلا جائے گا۔ اس شعر کی بنیاد ”خود رنگی“ پر قائم ہے جس میں چلنے کا مفہوم یہاں ہے
 ۱۵۔ چلن کے پیچھے سے کسی شعلہ زد کے جلوہ کو مومن ”آتش خس پوش“ سے تعبیر کرتا ہے۔
 ۱۶۔ نسیم و صبا تو اس گل (محبوب) کی خوشبو کو لے گئیں لیکن بے تمیز اغیار نے اس خوشبو کو بوئے سمن سمجھا
 اس لئے اب نسیم و صبا کا بھی اعتبار گیا کہ وہ کیوں بوئے محبوب کو ایسے بد تمیز تک لے گئیں۔
 ۱۷۔ اُن کی سخت دلی کا یہ عالم ہے کہ بلبل کی آہ و زاری پر بھی ہنسی آتی ہے اور یہاں خندہ گل کے انجام کو
 دیکھ کر اس پر بھی رونا آتا ہے۔

۱۸۔ شانہ میں درود دونوں کے ہے مومن کے بھی اور محبوب کے بھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محبوب کے شانہ میں
 درود اس لئے ہوا کہ وہ غیر سے ہمدوش ہوا تھا اور مومن کے شانہ پر اتفاقاً کسی وجہ سے درود پیدا ہو گیا۔ لیکن مومن خوش
 ہے کیونکہ اس طرح وہ محبوب کا ہمدوش تو ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں پہلے ”ہمدوش“ کے معنی ہمسرا برابر ہونے
 کے ہے اور دوسرے ہمدوش کے معنی ہم بغل ہونے کے ہیں۔

”Fjord“

(جناب کرم اللہ تھاں صاحب - علی گڑھ)

آجکل جرمنی اور ناروے کی جنگ یہ لفظ (Fjord) بعض مقامات کے نام کے ساتھ اکتونہیتر
 ملحق دیکھا جاتا ہے۔ اس کا لفظ و ترجمہ کیا ہے۔

(نگار) اس کا لفظ فیورڈ (Fjord) ہے ترجمہ کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں ہوئے
 اس کے کہ بجائے اسی لفظ کو لے لیا جائے۔ اس سے مراد سمندر کا وہ محدود تنگ حصہ ہے جو اونچی اونچی چٹانوں
 سے گھرا ہو۔ چونکہ ناروے کے سوا حل پر پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اس لئے وہاں اکثر جگہ فیورڈ بن گئے ہیں۔ یہ فی الاصل
 وہ وادیاں ہیں جو سمندر سے ملتی ہیں (برٹ کے چشموں یا دریاؤں) سے کٹ کر بنتی ہیں۔ ان وادیوں
 اور دوسری وادیوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ان کی شکل ل اور معمولی دریاؤں کی وادیاں V شکل کی ہوتی
 ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برٹ کا وزن سیدھا عمودی خط میں ساحل کو کاٹتا ہے اور پانی میں اتنا وزن نہیں
 ہوتا کہ وہ عمودی خط میں ساحل کو کاٹے۔ یہی چھوٹی چھوٹی گہری وادیاں فیورڈ کہلاتی ہیں جہاں سمندر کافی
 گہرا ہوتا ہے۔ رچا روں طرف چٹانوں کی وجہ سے جہاز آسانی کے ساتھ ان میں چھپ سکتے ہیں۔

کشل

سنسکر کا دفتر جب گزشتہ جنگ شروع ہوئی تو سنسکر کے دفتر میں صرف ۷۰ آدمی کام کرتے تھے لیکن ۱۷۰ تک ان کی تعداد پانچ ہزار ہو گئی تھی جو رات دن پارسلوں اور خطوں کی جانچ میں مصروف رہتے تھے۔

اس جنگ کے آغاز ہی میں تین ہزار آدمیوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو موز تحریریں (Code Letters) اور غیر مرئی روشنائیوں (Cryptograms) کی جانچ کیا کرتے ہیں۔ یہاں کے اسٹاف میں زندگی کے ہر شعبہ کا انسان پایا جاتا ہے یعنی اسکول کے اساتذہ، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ارباب کلیسا، قانون پیشہ لوگ، ساہوکار غرض سبھی یہاں موجود ہیں جن کو ان کی خدمت کا معاوضہ ۵۰ پونڈ سالانہ کے حساب سے ملتا ہے۔

یورپول اور دوسرے بڑے بڑے مرکزی مقامات پر پانچ ٹن یا کم از کم سے زیادہ وزنی ڈاک کے قتلے روزانہ جانچے جاتے ہیں اور ستمبر سے اس وقت تک ایک کروڑ پونڈ سے زیادہ قیمت کی ممنوع اشیاء و ڈاک برآمد ہو چکی ہیں۔ خطوں کے جانچنے والے سب کے سب موز تحریریں اور غیر مرئی روشنائیوں کے ماہر ہیں لیکن پھر بھی بعض بعض تحریریں پر انھیں گھنٹوں صرف کرنا پڑتے ہیں۔ کیونکہ اگر کسی پیغام کے الفاظ پڑھ بھی لئے جائیں تو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پیغام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

خبر رسانی کے لئے لوگ عجیب و غریب طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض ٹکٹ کے نیچے اپنا پیغام درج کر دیتے ہیں، محض کسی فہرست کے صفحات پر چند چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے اپنا مدعا ظاہر کر دیتے ہیں۔

اکثر و بیشتر خطوط کو کھول کر ان کی تصویر لے لی جاتی ہے اور پھر انھیں لفافہ میں اس طرح رکھ دیا جاتا ہے کہ کتبہ الیہ کو شبہ نہ ہو۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ لفافہ کے ایک کنارہ پر نہایت باریک دھار کے اوزار سے شرکات کر دیتے ہیں اور پھر خط اس کے اندر رکھ کر ایک خاص قسم کی گوند سے چپکا دیتے ہیں اور کوئی نشان کھولے جانے کا باقی نہیں رہتا۔ لفافہ کے اندر سے خط نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ٹکٹ علیحدہ کر کے اسی جگہ دھارنے دار شرکات دے لیتے

ہیں اور تار ڈالکر وہیں سے فطشکل لیتے ہیں۔ جب پڑھ لیتے ہیں تو پھر خط کو اندر رکھ کر شکاف جوڑ دیتے ہیں اور ٹکٹ چسپاں کر دیتے ہیں۔ تصور کے گیرے سے بھی کسٹہ کر۔ نہ میں بڑی مدد لے جاتی ہے، کیونکہ بہت سی ایسی باتیں جو نگاہ کو نظر نہیں آتیں، نوٹوں کی پلٹ پالٹیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خط میں صرف ایک حرف پر نہایت باریک سا موراخ ہوتا ہے جس سے مکتوب الیہ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس خط کے ظاہری الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے پھر یہ موراخ نگاہ کو تو نظر نہیں آتا، لیکن فوٹو سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

غیر دینی۔ روشنائی کا استعمال۔ جاسوسی کی دنیا میں بہت قدیم چیز ہے، لیکن اب اس نے بالکل علمی صورت اختیار کر لی ہے اور ان روشنائیوں کو ابھارنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بعض خطوط ایسے سامنے آتے ہیں جو بظاہر کسی شبہ کی گنجائش نہیں رکھتے، لیکن جب انھیں دواؤں کے پانی میں ڈالا جاتا ہے تو بین السطور میں غیر مرئی روشنائی سے کچھ اور عبارت نظر آتی ہے۔ پھر یہی نہیں کیا جاتا کہ اس عبارت کو بڑھکر خط ضائع کر دیا جائے بلکہ نمایاں ہونے والی عبارت کو پھر اس کی اصلی حالت پر لا کر مکتوب الیہ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ انکی باہمی سلت سے مزید اطلاعات حاصل ہو سکیں۔

پارسلوں کے ذریعہ سے جو چیزیں بھیجی جاتی ہیں ان کی جانچ بڑی دشوار ہے، پارسل کے ڈورے اور اوپر کے کاغذ سے لیکر اندر تک بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ سے خبر رسانی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک فلم ٹین کے اندر بند کر کے بھیجا جا رہا ہے۔ جس میں بظاہر کوئی بات شبہ کی نہیں معلوم ہوتی، لیکن جس وقت کھولکر اس کے سلولائیڈ کا نوٹو لیا جاتا ہے تو کنارے کنارے کچھ لکیریں سی نظر آتی ہیں جو درحقیقت مرموز پیغام ہے۔ جو تے کی ایڑیوں، صابونوں، چاکلٹ کی ٹکیوں، بکسوں کے جوڑوں، کتاب کی دفینوں، قمیصوں کے بٹنوں اور گیندوں کے اندر بھی یہ پوشیدہ پیغامات پائے گئے ہیں۔

ایک شخص پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا لیکن اس کے اسباب میں کوئی چیز ایسی نہ ملی جس سے اس شبہ کو تقویت پہنچتی، اتفاق سے اس کے کنگھے کو خوردین سے دیکھا گیا تو اس کے دانتوں پر کچھ نشانات نظر آئے جو فی الحقیقت پیغام تھے۔

۶۰ لاکھ پونڈ روزانہ کہاں جاتا ہے کو روزانہ ۶۰ لاکھ پونڈ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی تقریباً سوا سات کروڑ

روپیہ۔ لیکن یہ روپیہ کہاں جاتا ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

۸ پونڈ

رائفل

۵۴ ہزار پونڈ

۱۶ انچے دہانے کے بھری توپ

۱۰ لاکھ ۲۲ ہزار پونڈ	جنگی جہاز (۳۵۰۰ ٹن)
۳۰۰ پونڈ	ویکٹر مشین گن
۵۰، ۳۴، ۹ پونڈ	آبدوز (۱۰۹۰ ٹن)
۲۵ ہزار پونڈ	ٹینک (۳۵ ٹن)
۲۰، ۱۵ پونڈ	۴، ۲ انچ دھانے کی توپ
۶ پونڈ	۴، ۲ انچ کا پھٹنے والا گولہ
۲۰ ہزار پونڈ	بڑا بمبار ہوائی جہاز
۶۰ پونڈ	لیوس گن
۶۰ پونڈ	غبارہ کی چھتری

اشتہار کا ایک نیا طریقہ یورپ کے ایک اخبار میں اشتہار شایع ہوتا ہے کہ ”ایک لکھ چتی کو ہیں۔“ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اس ناول کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو گئیں۔

پیرس میں جوانی کا معیار

تم جوان ہو اگر روزانہ چاکو لٹ کا ایک پیکٹ پورے لطف کے ساتھ کھا سکتے ہو

لیکن تم کم جوان ہو اگر تم یہ کہو کہ ”چاکو لٹ“ مسرت رساں چیز ہے۔

تم جوان ہو اگر تمہیں ایسے فلم یا ایسا لٹریچر پسند ہے جو تمہیں روسیہ پر مجبور کر دے، لیکن تم جوان ہو اگر تم سب سے پہلے ایک آدمی کی آنکھیں دیکھتے ہو، لیکن تم کم جوان ہو اگر تمہاری نگاہ پہلے اس کے ہاتھوں پر پڑتی ہے۔

تم جوان ہو اگر تم لوگوں سے اپنی ذہانت کی داد چاہتے ہو، لیکن کم جوان ہو اگر اپنے حسن کی داد چاہتے ہو

ایک ڈاکٹر کی فیس

اس وقت تک سب سے بڑی فیس جو کسی ڈاکٹر کو دی گئی۔ وہ تھی جو انگلستان کے ایک ڈاکٹر ڈس ڈیل (Dr. Disdell) روس کی ملکہ کتھرائن درم نے ادا کی۔

ملکہ نے اس ڈاکٹر کو چیک کا ٹیکہ لینے کے لئے روس بلایا تھا اور اس کا معاوضہ اس نے یہ دیا:

۹۰۰۰ پونڈ فیس — ۱۸۰۰ پونڈ مصارف سفر — ۵۰ پونڈ سالانہ کی پنشن —

ستاروں کی دوری ”نوری سال“ سے معلوم کی جاتی ہو اور ایک ہوسکا کھانے کا اندازہ میلوں سے وقفہ غلم کی طوالت سے، لیکن جوانی جہازوں میں کھانے کا اندازہ

میلوں سے کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک فٹ آبلے ہوئے انڈے کا آرڈر دیا جائے تو اسکے طیار ہونے، سامنے آنے اور کھانے میں ۵۷ میل طے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہلکے ناشتے میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ہوائی جہاز پر ۵۷ میل کے کھانے کا آرڈر دیا جائے گا تو آپ کو صرف ایک آبلہ ہوا انڈا ملے گا اور سو میل کے آرڈر پر ہلکا ناشتہ۔

عام طور پر میرے کو صرف زیب و آرائش کی چیز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اگر اس کا وجود **ہیمر اور اسلحہ سازی** نہ ہو تو بعض عجیب آلات جنگ طیارہ ہی نہ ہو سکیں۔ جن دھاتوں سے آلات حرب طیارہ کئے جاتے ہیں وہ خاص طور سے نہایت سخت طیارہ کی جاتی ہیں اور ان کے کاسٹنگ کے لئے جن اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی دھار بغیر میرے کی مدد کے بن ہی نہیں سکتی۔ یہ ہیمر ابھی ہے جس کی مدد سے ٹینک اور جنگی جہاز طیارہ ہوتے ہیں۔ پٹرول کی فراہمی بھی بہت کچھ میرے پر منحصر ہے، کیونکہ بعض چٹائیں اتنی سخت آجاتی ہیں کہ بغیر میرے کی مدد کے ان کو کاٹا ہی نہیں جاسکتا۔ اس وقت دنیا میں جتنی معدنیں میرے کی ہیں، ان میں سے دو تہائی ہیمر آلات بنانے کے کام آ رہا ہے۔

ایک جرمن لیڈر کی دعا
اے خدا اگر بیماری مدد نہیں کرتا تو نہ کر، لیکن کم از کم یہی کر کہ ہمارے دشمنوں کو مدد نہ دے۔ مدعا یہ کہ جرمی کا مخالف صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کوئی غیبی امداد اسے پہنچنے والیوں ممکن نہیں۔

تنوعات

اٹلی میں باہر سونا بجانے کی مانعت ہے۔ خفیہ قرضوں نے یہ ترکیب کی کہ سونے کی کھونٹیاں اس قسم کی طیارہ کرائیں جیسی ریل کے فرسٹ کلاس ڈبوں میں لگائی جاتی ہیں اور ان پر نکل کی پالش کرا دی۔ ریل میں بٹھنے کے بعد اس کی کھونٹیوں کو علیحدہ کر لیا اور یہ کھونٹیاں لگا دیں۔ مقصود یہ تھا کہ جب اٹلی کی سرحد سے نکل جائیں تو سونے کی کھونٹیاں نکال لیں اور اسلی کھونٹیاں لگا دیں۔

گٹھیا اور اسی قسم کے امراض کا علاج شہد کی مکھیوں کے ڈمک سے، عہد قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا۔ اگر انسان کے جسم سے تمام نمک نکال لیا جائے تو وہ ۴۸ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ زمین کا سب سے زیادہ گہرا سو راج ۵۰۰ ہے جو کیلی فورنیا میں پایا جاتا ہے، یہ پٹرول کا کنواں ہے جو ۵۰۰ فٹ گہرا ہے۔

مطبوعات موصولہ

کلام الملوک | حیدرآباد میں ایک انجمن "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کے نام سے قائم ہے جس کو نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شعراء و صاحبان تصنیف کے غیر مطبوعہ کلام کو شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، انہیں میں سے ایک "کلام الملوک" ہے۔

اس میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کا فارسی کلام نہایت محنت و کاوش کے ساتھ لکھا کر دیا گیا ہے اور مغربی انداز تحقیق و ترتیب کو سامنے رکھ کر یہ مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔ میر سعادت علی رضوی ام۔ اے نے جو اس انجمن کے شریک متہم ہیں اس مجموعہ کو ترتیب دیا ہے اور ایک مختصر مقدمہ لکھ کر بتایا ہے کہ انھوں نے اس مجموعہ کی ترتیب میں کن کن کتابوں سے مدد لی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان پر تاریخی و ثقافتی کیا ہے۔

اس قسم کے جو اہر ریزے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یقیناً انجمن کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو ایسے خوش ذوق ناظر کتب خانہ رکھنے والے امیر کی سرپرستی حاصل ہو سکی۔

جن بادشاہوں کا کلام دیا گیا ہے ان کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے اور ان کا شجر و نسب بھی مع مختصر حالات کے دیدیا گیا ہے۔ اس لئے کتاب کی اہمیت و دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ "آرٹ پیپر" استعمال کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں حسب ذیل بادشاہوں کا کلام پایا جاتا ہے:-

(بہمنی خاندان) سلطان محمد ثانی (یہ سلطان حسن لنگو بہمنی کا پوتا تھا) ۸۷۰ھ - ۹۹۹ھ -

سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۷۵ھ - ۸۸۵ھ)

(عادل شاہی خاندان) یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ - ۹۱۶ھ)۔ اسماعیل عادل شاہ (۹۱۶ھ - ۹۴۱ھ)

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۱۱ھ - ۱۰۳۶ھ)

(قطب شاہی خاندان) یار قلی جمشید قطب شاہ (۹۵۵ھ - ۹۷۵ھ)۔ محمد قلی قطب شاہ (۹۷۵ھ - ۱۰۲۰ھ)۔

— سلطان محمد قطب شاہ (۱۵۲۵ء - ۱۵۵۵ء)

سب سے زیادہ کلام سلطان محمد قطب شاہ کا ہے جو اس خاندان میں اپنے علم و فضل اور ذوق مطالعہ کے لحاظ سے بہت مشہور فرما کر رکھتا ہے۔ دوسرے بادشاہوں کا کلام چند اشعار سے زیادہ نہیں ہے۔ لہذا بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

سلطان فیروز شاہ بہمنی (تخلص و ترجمہ)

یہ قطب راہ بہت بخیر است

یوسف عادل شاہ احمدیوسف

آب و تاب شمع از شمع فانی

ما ملنا نقمہ در نیم چرخ بوسنت

اسماعیل عادل شاہ (تخلص و فانی) :-

سب ہجر تو گرہ کار سے نہ ادا

از اس بخشش تو گر نہ تو فانی

یا قلی جمشید قطب شاہ (تخلص بہمنی)

آہانک باندک چھانکے تو نہ گشتند

سلطان محمد قلی قطب شاہ (تخلص قطبشاہ)

باشمے گو گزنی دیدائے خود را

حرفے زب یا رشتنیدیم شنیدیم

گہ توافل و گاہ سہ سلام می سود

سلطان محمد قطب شاہ (تخلص قطب شاہ)

کامین و دل ہمیں بہار است

ہر دست دیدائے ستار خود

خوش شوالہ دل خوش و کار و آگاہ ہم ساخت

سیتہ دارم کار لعلش شراب زندگی بار

چو بر خیزی زرد سے نازانہ یلین زبانی

ملنے کا بہت :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن

کہ ثابت ابدش اجدائے قرنگ ست

مکہا شاہ ہر طرت از مرعلہ ما

آساں شدہ از عشق بیتاں سلک ما

بجز دیدہ اسنک بار سے نہ ادا

کہ خیر از بخشش غما سار سے نہ ادا

تج سے نہ خوردہ تیر و گرا کر زو گشتند

کاش زندان شب تو پر وائے خود را

صد کہ کہ کہ با زہ چشمیدیم چشمیدیم

چہ کدیت کہ دلم را کہم می سود

آراہ کسے زگر چہ کار ست

دست من و دامن نگار ست

یار اگر با ما سازد ماہ او خواہیم ساخت

ز گلبرگ رخ رنگش آب زندگی بار

ز چشمانت ہمہ سبب آب زندگی بار

طوطی نامہ | یہ کتاب بھی ”مجلس اشاعت دکنی مخطوطات“ نے شائع کی ہے اور اس کے مرتب بھی میر سعادت علی رشتوی ام۔ اسے ہیں۔ یہ مثنوی غواصی کی ہے جو دکن سے بہت پہلے ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں مثنوی سیف الملوک بدیع الجلال لکھنا شروع کی اور سلطان عبدالکبیر کے عہد میں طوطی نامہ لکھا (۱۵۷۷ء) یہ شاہی دربار کا ملک الشعراء تھا اور بڑی عزت و مرتبت اس نے حاصل کی تھی طوطی نامہ اسی کی مثنوی ہے جسے فارسی زبان سے اس نے دکنی زبان میں منقل کیا۔ اس فسانہ کا اصل ماخذ سنسکرت کی کتاب شوکا شپ تپتی جس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔

اس کے مقدمے میں تمام متعلقہ مسائل سے بسیط بحث کر کے طوطی نامہ کی شاعرانہ حیثیت اور عہد غواصی کی زبان پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کی طباعت و کتابت بھی نہایت نفیس ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہے۔

سیف الملوک و بدیع الجلال | یہ بھی غواصی کی مثنوی ہے اور انھیں خصوصیات کی حامل ہے جو طوطی نامہ میں پائی جاتی ہیں۔

پھول بن | ابن نشا طمی کی مشہور مثنوی ہے اور عبدالقادر سروری ام۔ اسے نے مرتب کی ہے۔ پہلے دکن میں اردو مثنوی کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے اور پھر ابن نشا طمی کے حالات لکھ کر مثنوی کا قصہ نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں مثنوی پھول بن سے اس کی طباعت و کتابت میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

قصہ بے نظیر | صنعتی کی مثنوی ہے جو محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر تھا۔ یہ مثنوی پھول بن سے پہلے کی ہے اور گیارہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ اس کی ترتیب بھی عبدالقادر سروری نے کی ہے۔

اردو مثنوی کا ارتقا | جناب عبدالقادر سروری ام۔ اسے کی تصنیف ہے جس میں ابتداء سے اس وقت تک مثنوی کے تاریخی ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ فہرست مضامین یہ ہے:

مثنوی کا درجہ اصناف شعریں — اردو مثنوی کے اولین نمونے — طویل تر مثنویاں — قائم مثنوی کا سنہ ازانہ — بجا پور کی مثنویاں — گولکنڈہ کی مثنویاں — مغلیہ عہد کی مثنویاں — دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں — دور متوسط میں مثنوی کی ترقی — مثنوی دور جدید میں — کتاب بہت مفید و کارآمد ہے۔

لئے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدر آباد دکن اور قیمت ۴۰ روپے

اُردو سکھانے کا سٹ جامعہ ملیہ کا | مذکورہ بالا سٹ کے ساتھ جامعہ ملیہ نے اپنا مرتب کیا ہوا سٹ بھی ریویو کے لئے بھیجا ہے، اس میں یہ کتابیں ہیں:

ہندوستانی قاعدہ — ہندوستانی کی پہلی کتاب — اُردو پڑھنے کا قاعدہ — حریت کا قاعدہ — بچوں کا قاعدہ — رہنمائے قاعدہ — آسان قاعدہ — نئی کتاب۔

یہ تمام کتابیں طبعی الصوت کے اصول پر لکھی گئی ہے اور نفسیاتی حیثیت سے بچوں کے لئے زیادہ قابل قبول ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتابیں اسی وقت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں، جب ان کے پڑھانے والے ملک میں پیدا ہو جائیں اور چونکہ جامعہ ملیہ کا ٹریننگ کالج اس کی کو بھی پورا کر رہا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کی یہ کوشش ”کار آگہانہ“ طریقہ سے جاری ہے جس سے ملک میں تعلیم کی عام ترویج کو بہت فائدہ پہونچے گا۔

تذکرہ وقار | اس کتاب میں مولوی محمد امین زبیری نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ نواب وقار الملک، سرسید کے خاص اعوان و انصار میں سے تھے اور نواب محسن الملک کے بعد ام۔ اے۔ او کالج میں سکریٹری کی خدمات بھی انھوں نے عرصہ تک انجام دی تھیں۔

اس تصنیف کے تین حصے ہیں، ایک حصہ میں ان کی قیام حیدرآباد کے زمانہ کے حالات درج ہیں، دوسرے میں سکریٹری شپ ام۔ اے۔ او کالج کے عہد کا حال بیان کیا گیا ہے اور تیسرے حصہ میں ان کے زمانہ آخر میں کے مشاغل سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب اپنی ترتیب و تہذیب اور فراہمی مواد کے لحاظ سے سیرت نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے اور اس کے مصنف چونکہ اس نوع کی تصانیف کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں اس لئے بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو فروگزاشت ہو گیا ہو۔ عبارت بہت صاف و شگفتہ ہے اور طباعت و کتابت نہایت پسندیدہ۔ قیمت درج نہیں ہے اور نہ ملنے کا پتہ لیکن غالباً کتب خانہ مسلم یونیورسٹی سے دستیاب ہو سکے گی۔

حیاتِ سلطانی | یہ تصنیف بھی مولوی محمد امین صاحب زبیری کی ہے جس میں نواب سلطان جہاں بیگم فرما نوازے بھوپال کے سوانح حیات درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کو عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم کے حضور میں باریانی کا موقعہ حاصل رہا ہے اس لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص اس تصنیف کا ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور نہایت صحت خوبی کے ساتھ۔ بھوپال کے انسانی دور حکومت میں نواب سلطان جہاں بیگم کو کل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب کو تصنیف کیا گیا ہے۔ جا بجا تصاویر بھی پائی جاتی ہے جنھوں نے ظاہری

حیثیت سے بھی اس کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ غالباً مسلم یونیورسٹی ہوگا۔

دیوان انیق | مولانا محمد یعقوب انیق صدیقی مجموعہ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب انیق جو پورہ کے ایک صاحب علم خاندان کے فاضل بزرگ تھے اور تصوف کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپ نہایت اچھے خطیب بھی تھے اور اردو، ہندی، فارسی، عربی زبانوں میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ اس نعتیہ مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ذاتِ نبوی سے واقعی غیر معمولی محبت تھی اور بعض اشعار سے ان کے اس شغف کا پتہ چلتا ہے۔

فن شعر میں لغت گوئی، مہینہ گوئی، سے زیادہ بیعت نہیں رکھتی، لیکن کلام انیق میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو واقعی شعر بھی ہیں اور لغت بھی۔ کتاب کا طباعت بہت معمولی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ دفتر طارق جو پورہ سے خدا و کتابت کی جائے۔

بغداد کا جوہری | ایک ناول ہے جناب اشرف جتوئی نے لکھا ہے، انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے، لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ترجمہ سلاطین نہیں ہوتا۔ جناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے اس کی تمہید لکھی ہے اور صہبوحی صاحب کی اس اہمیت و کاوش کی نہایت اچھے الفاظ میں داد دی ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

دوشیزہ صحرا | ترجمہ ہے مس جون کوکوشٹ کے انگریزی ناول کا۔ یہ قصہ عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے جس میں عربوں کی تمام خصوصیات کو نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ جناب صادق الحزری ام۔ اسے نے ترجمہ کرتے ہیں، اس کا بڑا خیال رکھا ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ قیمت پندرہ روپے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی | یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی کاوش کا نتیجہ ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن مقصود غالباً مسلم لیگ کی تاریخ کو خوشنما الفاظ میں پیش کرنا اور اس کے وجود کی اچھی تعبیر کرنا ہے۔ جس حلیہ فراہمی واقعات کا تعلق ہے کتاب کے اچھے ہونے میں شک نہیں لیکن استخراج نتائج کے لحاظ سے مجھے اس سے جا بجا اختلاف ہے۔ فاضل مصنف کا آخر میں ایک جگہ یہ ظاہر کرنا کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں میں صرف مسلم لیگ ہی کو تعمیری لائحہ عمل پیش کرنے کا فخر حاصل ہے، ایسا عجیب و غریب اکتشاف ہے جس پر جتنی حیرت کی جائے کم ہے۔ اس کی قیمت پندرہ روپے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

باسی پھول | مجموعہ ہے جناب علی عباس حسینی کے تیرہ افسانوں کا جسے مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا ہے

جناب عباس حسینی کے فسانے ملک میں عام طور پر بہت مقبول ہیں اور غالباً یہ افسانے بھی مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہوں گے۔ قیمت ۸ پیسے۔

ہندو ادیب جناب ناظر کاگوروی نے اس کتاب میں فرسج و ایسٹ کے ساتھ بتایا ہے کہ ہندو اہل قلم نے اردو کی ترویج و ترقی میں اس وقت تک کتنا حصہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کو جتنے واقعات و حالات مل سکے ہیں وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر دیے ہیں۔ اس زمانہ میں جبکہ ہندی واردہ کا مسئلہ ملکی سوال بن کر رہ گیا ہے اس کتاب کی اشاعت بہت بر محل رہے اور امید ہے کہ اس کا مطالعہ ہندو مسلم دونوں دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ قیمت ۸ پیسے اور ملنے کا پتہ انوار لک ڈپو کھنٹو۔

سلطان احمد وغرنوی ترجمہ ہے مولوی محمد حبیب صاحب برقیہ سترتاریہ مسلم دینیوری کے ایک انگریزی مقالہ کا جو انھوں نے سلطان محمود وغرنوی کے حالات پر تبصرہ کی حیثیت سے لکھا تھا۔ پروفیسر حبیب چونکہ مسلم الثبوت مورخ ہیں اس لئے اصل مقالہ کے ساتھ کچھ کہنا بیجا نہ رہے اور ہاں ترجمہ سوا اس کی خوبی کا بھی اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترجمہ معامد ہی نہیں ہوتا۔ یہ کتاب ہندوستانی اکادمی کے شایعہ کی ہے اور ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

حسین ابن علی اس کتاب میں جناب مکہ شہید صاحب پورٹو نے انسانی حیثیت سے حسین کی ہستی پر نگاہ ڈالی ہے اور اسی سلسلہ میں بعض اور ایادات کا ترجمہ کیا ہے جو واقعہ کربلا کے سلسلہ میں آپ پر عاید کئے جاتے ہیں۔ گو کتاب مختصر ہے لیکن قوت بیان و زور استدلال کے لحاظ سے جامع حیثیت رکھتی ہے گو اس باب میں کوئی قاطع فیصلہ نہ اس وقت تک ہوا ہے نہ ہونے لگا۔ کیونکہ مذہب و اہل اپنے اکابر کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی نہیں اور یہیں پر اگر انتقادی قوت سپردالہ یا کرتی ہے۔ بہر حال کتاب کافی محبت و ارادت کے ساتھ لکھی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے خوب ہے۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور۔

پس پردہ چند رہنمائی سنگھ صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے۔ زبان، پلاٹ اور انداز بیان سب میں کافی دلکشی پائی جاتی ہے اور ان کے مطالعہ سے ہم کو سوسائٹی کے بہت سے مسائل پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لکھا سا مزاج بھی کہیں پایا جاتا ہے جس نے ان افسانوں میں اور زیادہ جان ڈال دی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲ روپے میں ٹھاکر اربھیراج سنگھ وکیل جوئپور سے مل سکتا ہے۔

جنبطی ناول ہے محمد علی صاحب واحدی کا جو فی الحال طالب علم ہیں اور جنھوں نے طالب علمانہ زندگی ہی سے اس کا پلاٹ پیدا کیا ہے۔ ہر چند واحدی صاحب ایک ذہین طالب علم ہیں اور ادب کا ذوق بھی رکھتے ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اس کتاب کی اشاعت پر کس چیز نے مجبور کیا۔ مشق و مطالعہ کے زمانہ میں شہرت کی طلب کوئی اچھا جذبہ نہیں، اگر وہ تعلیم سے فارغ ہو سکے اور اپنی تحریر میں پختگی پیدا کرنے کے بعد یہ جرات کرتے

تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس کی قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ ازار بک ڈپو لکھنؤ۔
جناب بھیم سین صاحب ظفر ملتان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب ظفر ابھی نوعمر ہیں لیکن نظموں سے کافی
جو شمار | بچگی خیال ظاہر ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں امتنا کے قابل ہیں، معلوم ہوتا ہے ظفر صاحب فطری شاعر
پیدا ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ عالم وہی نزاکت رکھتا ہے جو ایک فطری شاعر کے مطالعہ میں پایا جانا چاہئے اگر ظفر صاحب
کی مشق جاری رہی تو ایک وقت آئے گا کہ اردو کے اچھے کہنے والوں میں ان کا شمار ہو گا۔ اس مجموعہ کی قیمت ۱۲ روپے
اور ملنے کا پتہ قصر اردو۔ ملتان چھاؤنی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے حلقہ ادب مال روڈ لکھنؤ نے اس کتاب کو شایع کیا ہے
آزادی کی نظمیں | اور سبط حسن صاحب اس کے مرتب ہیں، اس میں تقریباً تیس شعراء ماضی و حال کی وہ
نظمیں کیا کر دی گئی ہیں جو وطن کے جذبہ آزادی یا سامراجی حکومت کی طرف سے جذبہ بیزاری سے متعلق ہیں۔

میرے خیال میں یہ پہلا مجموعہ ہے جو اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اردو میں شایع کیا گیا ہے، قیمت ایک روپیہ ہے
جناب ذاکر لکھنوی کے چند سلاموں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے۔ جناب ذاکر، حضرت آرزو لکھنوی کے
دارالسلام | شاگرد ہیں اور انھوں نے اپنے استاد کے سادہ و سلیس لیکن پر معنی رنگ کو ان سلاموں میں
پوری طرح نبانے کی کوشش کی ہے۔

یہ مجموعہ ہم میں شائنگ بک ڈپو امین الدولہ پارک لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔
محبت کے افسانے | مختصر سا مجموعہ ہے الطاف حسین راشدی (بیاور) کے چند عشقیہ مقالوں کی جو انھوں نے
پورے جوش شباب کے ساتھ لکھے ہیں۔ گو جناب راشدی نوعمر ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا

ہے کہ ان کے اندر ”عشق کہن سال“ پنہاں ہے، خدا خیر کرے۔
یہ مجموعہ محمد سعید خاں آزاد سے جامع مسجد بیاور (راجپوتانہ) کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

دفترا مت مسلمہ امرتسر نے یہ رسالہ شایع کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی فرقہ بندی کو
قول اس | مٹا کر ایک مرکز پر لانا ہے۔ اس میں تمام استدالات کلام مجید سے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ روپے۔

مجموعہ ہے جناب برق کرمانی کی قومی و ملی نظموں کا، جن میں سے کوئی اس وقت تک میری نگاہ
برق و باران | سے نہ گزری۔ معلوم نہیں رسائل و جرائد میں ان کی اشاعت ہوئی ہے یا نہیں۔

تمام نظمیں انقلاب انگیز جذبات سے لبریز ہیں اور اسی جوش و ولولہ کے ساتھ لکھی گئی ہیں، جو ایک جانب مخلص
انقلابی کے دل میں پایا جانا چاہئے۔

انہوں نے شاعری کے لحاظ سے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان بلکہ کمسن شاعر کیونکر اس نچرے کا راز اسلوب بیان پر قادر ہو سکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ صرف اردو ادب کے موجودہ طوفانِ خیزِ حجابات کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو ”برق و باران“ کے ذکر سے اس کے صفحات خالی نہ ہوں گے اور تنقید کر مافی کا نام بھی قلمی مجاہدین کی فہرست میں نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

یہ مجموعہ مجلہ شایع ہوا ہے اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی پسندیدہ ہے اور ایک خصوصیت اس مجموعہ کی جو مجھے بہت پسند آئی، یہ ہے کہ اس میں کسی کا ”مقدمہ“ شامل نہیں ہے۔

قیمت ایک روپیہ ہے اور طے کا پتہ انڈین بک ڈپو لکھنؤ
شیشم سن اور ساتھ ہی ساتھ ”مسافر“ بھی، یعنی غزلوں کے ساتھ سہرے بھی سنائے گئے تھے۔

سید شبیہ الحسن صاحبہ رضوی نے انھیں غزلوں اور سہروں کو ایک مقدمہ اور رواد کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ پہلے پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا تعارف ہے اور اس کے بعد حکایات بیگانہ کے عنوان سے شبیہ الحسن صاحب نے اردو ہندی کی بحث چھیڑی ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ اس کے بعد زیادہ مشاعرہ بیان کی ہے، جسے کلام شعرا پر ایک سرسری تبصرہ کہنا چاہئے اور آخر میں سہرے اور غزلیں درج کر دی ہیں۔ قیمت ۳ روپے اور طے کا پتہ ۳۱ - مارین کورٹ علی گڑھ۔

انڈین میوزک اس کتاب کے مولف جناب ام۔ محترم ہیں، جو علمی و علمی دونوں حیثیتوں سے موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور تمام مبادیات نہایت سہل و صاف الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

پندرہ مشہور و متداول راگوں کا نوٹیشن بھی دیا ہے اور تال کو بھی اچھی طرح سمجھایا ہے۔ ہارمونیم کھینے والوں کے لئے بھی نہایت مفید نقشے اس میں پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی جس سے اس قسم کی اردو کتابیں خالی ہوتی ہیں، اس کی طباعت و کتابت ہے۔ یہ کتاب مجلہ نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین اہتمام کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

طے کا پتہ یہ ہے :-

میوزک پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

علم

تم نے سمجھا ہی نہیں علم کا انداز و مقام
 تم نے کاغذ کے تراشوں کو بنایا ہے امام
 تم پرستار ہوا عدد کے، نقطوں کے غلام
 ایک ہی شے کی بنائی ہیں، بہت سی اقسام
 تم نے تختہ دہلی سے تعمیر کئے ہیں اصنام
 وہ مسایل جو بہت دن سے ہیں مشہور عوام
 علم ہے معرفتِ انفس و آفاق کا نام
 علم فطرت کی صدا، علم خودی کا پیغام
 علم کی زد میں لرزتے ہیں شکوک و ادبام
 علم آرام بھی دیتا ہے شکل الہام
 علم مستقبل واضی میں ہے اک ربط تمام
 علم سے فکر و تصور کا معطر ہے مشام
 علم سب کچھ ہے اگر اُس سے لیا جائے کام
 علم نے فکرِ غزالی کو بنایا بھتا امام
 اُس کی تقدیر! جسے علم کا حاصل ہو مقام
 علم کے رہبر و رہرو پہ ٹھہرنا ہے حرام
 علم ہے صبحِ چین، جہل ہے مرگھٹ کی شام
 اس میں منطق ہو کہ سائنس ہو یا علمِ کلام

معنی و لفظ کے پیچوں میں الجھنے والا
 کوششِ نقش و دو اثر پہ تھاری نہ نگاہ
 علم کو تم نے لکیروں میں کیا ہے محدود
 اصطلاحات کے بباد کا آخر ہے تم پر
 تم نے الفاظ کو بڑا ہے کھلونوں کی طرح
 اُن پر تم علم و بصیرت کا سمجھتے ہو مدار
 علم ہے منزلِ عرفان و ہدایت کا چراغ
 علم سے تربیتِ فکر و نظر ہوتی ہے
 علم سے رمزِ حقایق کی گرہ کھلتی ہے
 علم بے چین بھی کرتا ہے بے عنوانِ عمل
 علم، ہر غیب کے پردے کو بناتا ہے شہود
 علم ہے کلکدہٗ جذب و یقین کی خوشبو
 علم ہے مرہمِ دل، علم ہے تسکینِ ضمیر
 علم سے رومی و عطار نے پایا تھا فروغ
 علم ہے فقر میں بھی رہتا ہے شادی سے بامد
 ”رب زدنی“ کی صدا، علم کی آوازِ جبرس
 علم ہے نور، جہالت ہے بھیا نک ظلمت
 علم بے سوز یقین کیا ہے؟ حجابِ اکبر

علم بے جذبِ خودی کچھ نہیں جز کمر و فریب
 جس طرح جو ہر مشیر سے خالی ہو نیام

ماہر القادری

ایک گمراہ دوست سے !

چمن میں تجھ کو مثل آفتاب نوا بھڑنا تھا
دکھاتا ہی رہا میں تجھ کو آئینہ حقیقت کا
بھرا دکھا رہا امت ترے گل رنگ پیالوں میں
تجھے تھی جستجو اک قلب امین زار کی شاید
پہونچنا تھا بہر صورت تجھے بروقت منزل پر
پکارا کی حقیقت تجھ کو اکثر گوشہ دل سے
خلوص و صدق کی آنکھوں نے برائے بہت موتی
جفا اک چیز ہے مردود، دنیا بھر کی نظروں میں
ضرورت تھی کہ مہر علم تیری رہبری کرتا
تری خاطر تو اٹھ سکتے تھے بزم طور کے پرے
چھری تو پھر دی تو نے بروٹس بنے سیزر پر
اسے میں تجھ کو شہزادہ بنا کر تاج پہنا !

مجھے معلوم ہے انسان اسلیت میں حیا ہے
مگر میں نے تجھے کیوں ان حدوں سے ماورا سمجھا ؟

فضل الدین اثر ایم۔ اے

اعتذار

کل وعدہ خلافی پہ تجھے دیکھ کے نادم
وہ تجھے نظر کر کے مری شکر گزار می
وہ ضبط سے باہر سے جذباتِ محبت
ماستھے پہ بھڑکتے ہوئے بیتابی کے شعلے
نیچان سے گویائی گرا نبار، مگر ہاں
گردن میں خم۔ آنکھوں میں تری جرم کا اقرار
آنچل میں گرہ دے کے کسا زور سے اسکو
نظروں کو بچانا کہ مبادا مجھے لمبائے
گیسو میں لگاتا رشتہ کن فرق حسین تک
وہ دیدہ میگوں میں اُبھرتا ہوا آفسو،
وعدے پہ اگر تو نہیں آیا تو ہوا کیا؟

آیا مری شکوؤں کی جبینوں پہ پسینا،
وہ حال مرا دیکھ کے آنسو ترا پینا!
وہ تنگ منے کہنہ پہ گنجائشِ مینا
چہرے پہ برستا ہوا ساون کا مینا
غماز اُدھر حال اُدھر دیدہ مینا،
دیکھے ہوئے رخسار۔ دھڑکتا ہوا سینا
قالین کے ریشوں سے نکالا کبھی کینا
آنکھوں میں جو جذبات کا رہتا ہے خزینا
بتا ہوا زائر کی نظر کے لئے زینا،
سونے کی انگوٹھی پہ وہ ہیرے کا نگینا
میں نے کوئی دم، نزع کی شدت ہی سہی نا؟

مرزومی صدیقی (بی۔آ)

مرنے پہ بھی گریہ نہ کرے۔ تجھے ہو یہ ندامت
منظور۔ نہ شکین ابد تک مجھے جینا

غزل:

ہے سہل جو تو عقدِ شریا سے گزر جا
اے راہِ زو عشق یہ تو بین و نا ہے
اب دل کو بنا آئینہ حسنِ حقیقی
اس بزمِ گہ ہوش کے جلوے ہیں سرائی
تخیل کے رُفرت کو اڑاتا ہوا دم لے
یہ ادبی پیرِ خار ہے اور راہِ زو عشق
لیلائے تخیل پہ تو اس طرح فدا ہو
گافہ ہے تجھے اس دل پر شوق کی سستی

پر غوث و خطر لمبا دواوی سے گزر جا
اب آرزو و شوق کی دنیا سے گزر جا
اور عارض و کاکل کی تمنا سے گزر جا
اس بزم کے ہر ذوقِ تماشا سے گزر جا
پر داز وہ کر عرشِ معلیٰ سے گزر جا
دامن کو بچاتا ہوا دنیا سے گزر جا
رخسار سے اور زلفِ چلیپا سے گزر جا
ہاں آرزوِ مستی صہبہ سے گزر جا

نبی احمد بریلوی

لا اپنی نظر میں : یہ پستی و بلندی
یوں بنو و دستار تو دنیا سے گزر جا

جگر بریلوی :

رہیں غم تو رہے رازِ غم سمجھ نہ سکے
 اُسے حیات سی نعمت عطا نہ کرنا تھا
 بچے تمھارے لئے جان دی تمھارے لئے
 نہ بچنے میں ہمیں راحت ملی نہ مرنے میں
 حیات و مرگ تھی مرگ و حیات کی اقرب
 جنوں جنوں تھا خرد بھی تھی ایک فوج جنوں
 گداگری کا بھرم بے نیاز یوں سے رہا
 عطا ہوئی ہمیں ہستی بھی نیستی بھی مگر
 کبھی خوشی میں تھا غم اور کبھی خوشی غم میں
 گزارنے کو تو ہم نے گزار دی اک عمر
 ظہور جلوہ بھی تھا اک حجاب حسن جگر
 کچھ اور اس کے سوا خود کو ہم سمجھ نہ سکے

قیصر :

قدم جنونِ محبت میں ڈگمگا نہ سکے
 کھلی ہیں سیکڑوں راہیں جنوں زدوں کے لئے
 نرالی وضع ہے تیرے نیاز مندوں کی
 بہارِ فلد سکونِ دلِ حزیں کے لئے ؟
 وہی ہیں داد کے خواہاں بھی مجھ سے محشر میں
 نقابِ عیشِ غم جاوداں کے چہرہ پر !!
 نخل کھڑے ہیں سرِ حشرِ حمتِ حق سے
 بہار ہو کے خزاں مسکرا کے رہ جائے
 نکال اپنی خزاں میں بہار کے پہلو
 فریبِ رنگ نہ دے مجھ کو کارِ سازِ بہار
 خیال آتے ہی قیقرٹک پڑے آنسو
 ہماری راہ میں کانٹے بھی سر اٹھانے سکے
 بلا سے ہوش پرستوں میں بار پانے سکے
 یہ روٹھ جائیں تو دنیا انھیں منانے سکے
 خطا معاف اگر اعتبار آنے سکے
 بگاڑ کر جو مقدر مرا بنانے سکے
 خزاں نصیبِ فریبِ بہار کھانے سکے
 وہ بد نصیب جو لطفِ گنہ اٹھانے سکے
 جو اپنے غم کو غمِ جاوداں بنانے سکے
 وہ چشمِ تر ہی نہیں پھول جو کھلانے سکے
 بہار کیا جو کلیِ دل کی شکرا نہ سکے
 ہم اپنا درد کسی بزم میں سانے سکے

قندپاری

ہست، ای یصل کن از مے بگذر از اہل عقول
نقش غم را از دلم شوید با آب طرب
تا نمیکیری سراجی تا نہ بگزار ہی سراج،
جز بنور بادہ کشت را از حق باشد محال
آتش تر زن دریں طوار خشک قبل و قال
در کتاب ہر دولت نیست حرف خوشدلی
معنی عیش منجلد در خط ما غریب جوئے
مالیا من زندہ ام ہر انچہ خواہی زود کن
اے سحاب لطف باری بر من خاک کی بار
کشتہ بیداد و ادت از کر گیر د داد دل
مدعی و انجمن آرائی نام و نمود،
شرم بادت اے فلک امید و ہم کنج نمود

(ابوالکمال) اُمید اٹھو

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے
سپنجی ہوئی کشت زعفران، ترقی و تازہ شادابی و فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۸
میدان عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۸
بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات و درناک پیرائیں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ
کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ۷

یہ نگر لکھو

سرگزشت

۵۸۳

۵۵۷۵



قیمت

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پچھلے دور کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ ملے گی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر
دو بارہ روپے ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد
قیمت یعنی ۸ روپے کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
منیجر "نگار"

نگار کی بک

تصانیف نیاز پختوری

نگار کی بک

نگارستان	جمالستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت دو روپے (عار) علاوہ محصول	ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دور مجموعہ جس میں ۱۲۰ افسانے ملک کے رائج ہیں زبان فصیح تخلیہ پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ ادب و عقل انجام دہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپے (لحد) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم	مکتوبات نیاز کے تمام وہ خطوط نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور بلیغی کے نما سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی پیکی معلوم ہوتے ہیں موصوف حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجملہ شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (چار) علاوہ محصول	شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے مصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تفصیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی وفاقت عالیہ سحر حلال کے درجہ ایک پہلو ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عار) علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۷ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ
اس کے تمام ادوار کا اسیطہ تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی
کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر
کا اندازہ مقصود ان تو اردو میں آپ کے لئے ضرورت ہی ایک مجموعہ
کافی ہے۔ قیمت چار روپے (عار)
علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۷ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی
جدید و جدید ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر سید نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع
انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی اور اس میں سات مضامین ادبی نگار کے لئے ہوتے ہیں
مجموعہ ۲ صفحات۔ قیمت چار روپے (عار)
علاوہ محصول



ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپے یا بارہ شینگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بروز اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ چرچہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی جینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ جینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دو بارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پچ گنا وصول کرتا ہے اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
مینجر "نگار"

جلد (۳۸)	فہرست مضامین جولائی ۱۹۴۷ء	شمار (۱)
----------	---------------------------	----------

۲	ملاحظات	
۹	عربوں کی سیاسی بیداری	محمد عتیق صدیقی
۱۹	مکتوبات نیاز پر اظہار خیال	رشید احمد صدیقی ایم۔ اے۔
۲۹	روسی نظام حکومت پر ایک تاریخی و اقتصادی تبصرہ	
۳۶	مشین کا اثر ہماری معاشرت پر	سید و ہاج الدین احمد بی۔ اے۔ (علیگ)
۴۴	تیاگ	شبلی ابراہیمی
۴۹	مرزا ابوالحسن آصف خاں	کوثر چاند پوری
۵۹	کیا قرآن خدا کا کلام ہے ؟	
۶۶	بعض حیرتناک سیاسی اکتشافات	
۷۳	مکتوبات نیاز	
۷۵	باب الاستفسار	
۷۶	تنوعات	
۷۷	منظومات	غانی، اختر، حکیم

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۳۸	جولائی ۱۹۷۶ء	شمار - ۱
----------	--------------	----------

ملاحظات

رفقہ جنگ

دنیا کی تاریخ میں فتح و شکست کی شاید ہی کوئی ایسی عجیب و غریب مثال آپ کو نظر آئے جیسی اس وقت فرانس کے میدان جنگ میں نظر آئی ہے

فرانس ایسی عظیم الشان سلطنت، جو تمام نوآبادیوں کو ملا کر گیارہ کروڑ انسانوں پر حکمران تھی، جس کی ۵۵ لاکھ فوج دنیا کی بہترین آراستہ فوج سمجھی جاتی تھی، جو دنیا کی بڑی بڑی بحری قوتوں میں چوتھے نمبر پر شمار ہوتی تھی، جس کی زمین سالانہ ۴۸ ملین ٹن کوئلہ، ۳۸ ملین ٹن لوہا اور ۸ ملین ٹن فولاد کی دولت اُگلنتی رہتی تھی اور جس کے پاس ۴۰ کروڑ پونڈ کا سونا محفوظ تھا ایسی زبردست حکومت کا صرف دو ہفتہ کے اندر جرمن افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اور باوجود برطانیہ کی حمایت و تقویت کے، نازی حکومت کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لینا، تاریخ عالم کا اس قدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری مثال اس کی مل سکے

یقیناً جرمن فوجوں کی تعداد زیادہ تھی، ان کے اسلحہ بھی بہتر تھے، ان کا طریق جنگ بھی نیا تھا، تاہم فرانس کا اس بڑی طرح ہمت ہار دینا گو وہ پولینڈ کے برابر بھی حملہ نہ جمیل سکے اور دس بارہ دن کے اندر ہی اندر صدیوں کی بنی بنائی

شوکت و جبروت خاک میں مل جائے، کوئی خاص معنی رکھتا ہے اور بلاشبہ اس کا تعلق کسی ایسے راز سے ہے جس کا صحیح حال دنیا کو غالباً اختتام جنگ ہی کے بعد معلوم ہوگا

جس وقت نازی فوجوں نے اپنا رخ فلائڈرس کی طرف کیا تو جنرل ویگان نے اس کو اپنے لئے غالب نیک قرار دیا، کیونکہ اس طرح انھیں مہلت ملگئی تھی کہ وہ پیرس اور نازی افواج کے درمیان ایک زبردست خطِ مدافعت قائم کر کے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے، لیکن جب جرمن فوجیں، فلائڈرس سے فارغ ہو کر فرانس کی طرف پیش تو جنرل ویگان اور ان کی فوجوں کو بہت جلدی بات معلوم ہو گئی کہ ان کا کلا سکل طریق جنگ جرمنی کے نئے اندازِ حرب کا حریف نہیں بن سکتا اور ابتدا ہی سے فرانسیسی فوجوں میں بردی کے آثار پیدا ہو گئے چنانچہ جرمنی کے ہزاروں ٹینکوں نے بڑھنا شروع کیا اور فرانسیسی افواج نے ہٹنا، یہاں تک کہ اس آگ کے شعلے پیرس تک پہنچ گئے اور سارے ملک میں انقلاب کی ایک لہر دوڑ گئی جس نے ریتوں کی وزارت سے جو جنگ کی حامی تھی استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور اسکی جگہ جنرل بیٹاں کی وزارت قائم ہوئی جو اس جنگ کو ختم کرنے کا حامی تھا۔ فرانسیسی فوج کے انتشار اور ملک کی بردی کا جو عالم تھا، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے جو سکتا ہے کہ جس وقت بورڈو کے وائس میں رات کو جنرل بیٹاں کی بد ریگنٹ کا جلسہ ہوا تو ایک فرانسیسی سپاہی بھی پہرہ دینے کے لئے موجود تھا

نازی فوجیں تعاقب کر کر کے فرانسیسی افواج کو گزرتا کر رہی تھیں، خطِ میز فوج سے اس وقت تک ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا، بچوں کے گھر دندے کی طرح ٹوٹ رہا تھا، سولین آبادی انتہائی انتشار و اضطراب کے عالم میں کوہِ دھمرا کی خاک چھانتی پھر رہی تھی اور مطلق سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جرمنی کے اس سیلابِ آتش و آہن کو کیونکر روکا جائے۔ اب سے ۱۰ سال پہلے بھی ٹیڈ ہانک توم کا خیر فرانس کے حلق تک پہنچا تھا، لیکن اس مرتبہ جس بلے سی اور بے کسی کا اظہار فرانس کی طرف سے ہوا وہ تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ ہے

امداد کا وعدہ کرنے والوں کی طرف سے نازی دیتا پر مبنی قربانیاں چڑھائی جاسکتی تھیں، چڑھائی جا چکی تھیں اور فرانس کے لئے جو بد قسمتی سے برطانیہ کے ”ایف اے ایچ“ تک زندہ نہ رہ سکا سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو نازیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، چنانچہ ٹھیک اسی جگہ اور قریب قریب اسی تاریخ کو جب سلسلہ میں جرمن حکومت کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تھے، اب فرانس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے اور دنیا حیرت سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔ جرمن و فرانس کے درمیان عارضی شرائطِ صلح کا اجالی حال اخباروں کے ذریعہ سے سب کو معلوم ہو چکا ہے میں نے ”احمال“ کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ جو صلح نامہ فلس کیپ سائز کے تیس گجائٹ ٹائپ کے ہونے لکھا کو محیط ہو وہ یقیناً بہت سی ایسی تفصیلی باتوں کا بھی حامل ہوگا جن سے اس وقت تک دنیا کو بے خبر رکھا گیا ہے لیکن جہاں جالی بیان شایع ہوا ہے وہ بھی اتنا سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ فرانس کی عظمت دیرینہ بالکل ختم ہو چکی اھا وجود

اس کے کہ جبریل پٹیاں کی وزارت اس صلحنامہ میں کوئی بات ایسی نہیں پاتی جو فرانس کی عزت کو صدمہ پہونچانے والی ہو، فرانسیسی قوم یقیناً ذلیل ہو چکی اور اس کی باعزت زندگی اب اس وقت تک واپس نہیں آ سکتی جب تک نازی حکومت کو شکست نصیب نہ ہو اور اس کے حلق سے تمام ان حکومتوں کو ایک ایک کر کے نہ اٹکھوایا جائے، جن کو وہ اس وقت تک ہضم کر چکا ہے

اس صلحنامہ کی رو سے، تمام شمالی وسطی فرانس مع تمام مغربی سواحل کے جرمنی کے قبضہ میں رہے گا، فرانس کے بحری بیڑے کا بڑا حصہ جرمنی کی نگرانی میں چلا جائے گا اور تمام فوجی ادارے۔ حملہ ذخائر جنگ کے ناومی حکومت کے حوالہ کر دئے جائیں گے اور اسی کے ساتھ فرانس کو ان نازی افواج کے مصارف بھی ادا کرنے پڑیں گے جو اختتام جنگ تک فرانس پر قابض رہیں گی

ان شرائط کے مطالعہ سے نازی حکومت کا اصل مقصود پوری طرح واضح ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فرانس کی طرف سے برطانیہ کی تمام امیدیں بالکل منقطع ہو جائیں اور انجیم فرانس کے مغربی سواحل پر قابض ہو کر وہ چلیج بسکے (چیلنج) اور رودبار انگلستان کو برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کے لئے خطرناک بنا دے۔ اسی کے ساتھ آپ اگر ان شرائط کو بھی پیش نظر رکھیں جو اٹلی اور فرانس کے درمیان طے پائی ہیں تو اس خیال کو اور مزید تقویت پہونچتی ہے، کیونکہ ان شرائط کی رو سے فرانس کا اقتدار بحر روم اور سواحل افریقہ سے بھی ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا بحر شمال سے لیکر بحر روم تک سارے حصہ آب کو برطانیہ کی بحری نقل و حرکت کے لئے خطرناک بنانے کی اسکیم منظر کے پیش نظر ہے

گزشتہ جنگ کے بعد اس میں شک نہیں کہ برعظیم یورپ میں فرانس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور مشرقی یورپ کی اتحادی پالیسی میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ یورپ کی بین الاقوامی سیاست اور مجلس اقوام کی کمزوری نے فرانس کی اس اہمیت کو رفتہ رفتہ کم کرنا شروع کیا اور جرمنی کو موقع دیا جاتا رہا کہ وہ معاہدہ ورسائی کی خلاف ورزی کر کے آہستہ آہستہ اپنی قوت کو بڑھاتا رہے۔ پھر فرانس اور برطانیہ یہ تو نہ سمجھے تھے کہ جرمن قوم اپنے گزشتہ نقصانات کی تلافی اپنی صنعت و تجارت کے ذریعہ سے پوری طرح کر سکتی ہے، لیکن اس کی فوجی طیاروں کی طرف سے دونوں کی آنکھ بند تھی اور یہ بے خبری برابر قائم رہی یہاں تک کہ ایک ایک کر کے اس نے پولینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ و بلجیم پر قبضہ کر لیا اور جب آخر میں اس نے ۲۰ ہزار ٹینکوں اور بے شمار طیاروں سے فرانس پر حملہ کیا تو اقرار کرنا پڑا کہ جرمنی کی یہ کامیابیاں صرف اس کی زبردست فوجی طیاروں اور خوبی اسلحہ کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اتحادیوں کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ اس قسم کی طیاریاں نہ کریں اس کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک نے دوسرے کی قوت کا غلط

اندازہ لگایا تھا، نہ اتحادیوں کے وہم گمان میں یہ بات آسکتی تھی کہ نازی حکومت کی فوجی طیاریاں اس قدر زبردست ہو سکتی ہیں اور نہ نازی حکومت اس سے واقف تھی کہ فرانس فوجی طیاروں کے لحاظ سے اس قدر پیچھے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نازی حکومت کی گزشتہ سات سال کی تاریخ سوائے مکروفریب اور جھوٹ کے کچھ نہیں لیکن اس جھوٹ کے انبار میں ایک بات سچ بھی تھی وہ یہ کہ اس کی فوجی طیاریاں غیر معمولی حد تک پہنچ گئی ہیں اور اسی ایک سچ کو جھوٹ سمجھنے کا خیال نہ اس وقت سارے یورپ کو بھگتنا پڑا ہے۔

اب جنگ جس نقطہ پر پہنچ گئی ہے اس نے بیشک ہمیں فیصلہ کن سعادت سے قریب تر کر دیا ہے لیکن سوال یہی ہے کہ وہ فیصلہ کیا ہوگا اور یہ دور آمریت ختم ہوگا یا نہیں۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں انگلستان کی طرف لگی ہوئی ہیں جو جمہوریت کی طرف سے اکھاڑ میں تنہا مقابلہ کے لئے رہ گیا ہے اور اسی کی پوزیشن پر ہمیں غور کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرانس کے بہت بار دینے سے برطانیہ کا ایک بازو ضعیف ہو گیا ہے، لیکن چونکہ انگلستان جزیرہ ہے اور جرمنی کو یہاں ٹینکوں سے حملہ کرنے کی وہ آسانیاں حاصل نہیں جو فرانس میں حاصل تھیں، اسلئے لامحالہ فیصلہ جبری جنگ پر آکر ٹھہرے گا جس میں برطانیہ کا تفوق ظاہر ہے۔

ہر چند عارضی شرائط صلح کی رو سے فرانسیسی بیڑے، جرمنی کی نگرانی میں چلے جاتے ہیں اور اس نگرانی کے معنی یہ ہیں کہ وہ عہد شکنی کر کے ان سے کام بھی لے سکتا ہے لیکن چونکہ فرانسیسی نوآبادیاں اس صلح کی طرفدار نہیں ہیں اور وہ فرانس کی آزادی کے لئے اب بھی لڑنے کے لئے طیارے، چنانچہ شام کے فرانسیسی سپہ سالار، انڈوچینا کے گورنر اور تونس و مراکش وغیرہ کے حاکموں کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ مرکزی حکومت کے احکام کی تعمیل نہیں کریں گے، اس لئے ممکن ہے کہ فرانسیسی بیڑے کا بڑا حصہ جو بحر روم یا دوسرے سمندروں میں پایا جاتا ہے بدستور آزاد رہے اور برطانیہ کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لے۔ اگر یہ قیاس صحیح نکلا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جرمنی کبھی انگلستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کرے گا۔ بغیر اس کا خیال ہے کہ اگر فرانسیسی بیڑے جرمنی کے قبضہ میں نہ آئے یا انھوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا، تو اٹلی اس کمی کو پورا کرے گا، لیکن یہ خیال درست نہیں اٹلی نے تو اپنے اندازہ کے مطابق اس وقت جنگ میں اپنی شرکت کا اعلان کیا تھا جب اس کے نزدیک میدان صاف ہو چکا تھا اور فرانس کی شکست کو اس نے لڑائی کا انجام سمجھ لیا تھا، لیکن فرانس کی شکست کے بعد بھی صورت وہی باقی رہتی ہے اور بحر روم میں وہ اپنی مرکزی کوپوری طرح محسوس کر چکا ہے، اس لئے اٹلی جرمنی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، بلکہ خیال یہ ہے کہ کہیں اس کا بوجھ خود جرمنی کے لئے ناقابل برداشت نہ ہو جائے، کیونکہ اب چاروں طرف سے اس کی ناکہ بندی ہو چکی ہے اور اس کے سوا حل اتنے کھلے ہوئے ہیں کہ وہ عرصہ تک مقابلہ کی تاب لائی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں جرمنی کی ایک چال اور بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اپتین کو بھڑکا کر

شرکت جنگ پر آمادہ کرے کیونکہ جنرل فرانکو کی حکومت ہٹلر اور موسولینی ہی کی مدد سے قائم ہوئی ہے، چنانچہ ہسپانیہ کی طرف سے مطالبہ جبرالٹر کی خبریں اس دوران میں ایک دو بار سننے میں آئی ہیں، لیکن چونکہ وہاں کی جمہوری جماعت میں بدستور بے چینی پائی جاتی ہے اس لئے اگر جنرل فرانکو نے جبرالٹر کے لئے جنگ چھیڑ دی تو یہ بات خلاف قیاس نہیں کہ وہاں پھر خانہ جنگی شروع ہو جائے اور فرانکو کی نئی قائم کی ہوئی حکومت جو ہنوز متزلزل حالت میں ہے ختم ہو جائے بہر حال اٹلی اور اسپین کی طرف سے نازی حکومت کو کوئی توقع نہیں ہے اور نہ ان کی امداد کے بھروسہ پر وہ انگلستان پر حملہ کر سکتا ہے

اس مسئلہ میں روس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کی پالیسی اس قدر مشتبہ ہے کہ نازی حکومت اس پر بھروسہ کر سکتی ہے نہ برطانوی حکومت۔ عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پہلے ہالٹک ریاستوں پر قبضہ کیا اور اب رومانیہ سے بسربیا اور بکووینا بھی لے لیا ہے۔ اس سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ اگر روس نے رومانیہ کی طرف پیش قدمی کی تو سارے بلقان میں آگ لگ جائے گی، کیونکہ برطانیہ رومانیہ کی حفاظت کی ذمہ داری لے چکا ہے اور اٹلی بھی روس کی اس مداخلت کو پسند نہیں کر سکتا، لیکن چونکہ اس دوران میں خود رومانیہ کے فرمانروا شاہ کیرل نے ڈیکٹرولڈ کی سی حیثیت قائم کر لی ہے اور اس کا میلان نازی حکومت کی طرف زیادہ ہے اس لئے اگر وہ خود اپنی محوشی یا ہٹلر کی مرضی سے بسربیا روس کو واپس دینا پسند کرتا ہے تو برطانیہ کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، لیکن عجیب نہیں اگر بلغاریہ بھی اپنا کھویا ہوا علاقہ ڈبروچار رومانیہ سے واپس مانگے اور ہنگری بھی ٹرنسلوینیا کا مطالبہ کرے۔ بلغاریہ روس کی طرف مایل ہے اور ہنگری جرمنی کی طرف اس لئے معاملہ پھر وہی روس و جرمنی کے سمجھوتہ کا رہ جاتا ہے اور چونکہ جرمنی کی موجودہ پالیسی بلقان میں جنگ چھیڑنے کی حامی نہیں ہے اور روس کی مصلحت اندیشی بھی جرمنی سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی اس لئے ممکن ہے کہ ان جنگجوؤں کا فیصلہ آسانی سے ہو جائے، لیکن اگر بلغاریہ نے اپنا مقدونیا والا علاقہ بھی یونان اور یوگوسلیویا سے لینا چاہا تو کپڑی الجھ جانے کا اندیشہ ہے اور پھر ترکی کو بھی اس آگ میں پھاندنا پڑے گا اور برطانیہ کو بھی

ایشیا پر اس وقت تک جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا، لیکن فرانس اور ہالینڈ کی شکست نے انڈو چائنا اور ایسٹ انڈیز کے معاملہ کو البتہ اہم بنا دیا ہے اور جاپان دونوں پر لپٹی ہوئی نگاہیں ڈال رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ قصداً پھر ہمالیہ کے ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس صورت میں امریکہ کا خاموش بیٹھا رہنا مشکل ہو گا۔ سنگھائی میں بھی جاپان کی پالیسی جارحانہ صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور برما کا نام بھی اس کی زبان پر کئی بار آچکا ہے، لیکن چونکہ مغربی حکومتیں اس وقت یورپ میں الجھی ہوئی ہیں اس لئے امید نہیں کہ جاپان کو اپنے اقدام کے لئے ان کی طرف سے کوئی بہانہ ہاتھ آئے بہر حال اس وقت تک ایشیا اور بلقان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان سے متعلق جنگ کے امکانات پر بحث کی جائے

اور ہر بھر کر وقت کا سب سے زیادہ اہم سوال یہی رہتا ہے کہ اب جرمنی کیا کرے گی؟
یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جرمنی سمندر کے راستے سے اپنی فوجیں سواحل انگلستان پر اتارنے میں کامیاب نہیں
ہو سکتا اس لئے ممکن ہے کہ وہ انگلستان کا محاصرہ کرنے کی فکر میں ہو۔ انگلستان کا مشرقی و جنوبی حصہ تو بیشک خطہ میں
ہے کیونکہ خلیج بسکے (Biscay) اور رودبار انگلستان دونوں طرف سے وہ برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کو
روک سکتا ہے اور سواحل بلجیم و فرانس پر برہنہ قسم کی توپیں نصب کر کے مشرقی سواحل انگلستان پر گولہ باری بھی کر سکتا ہے
لیکن شمال و مغرب کے سواحل انگلستان ابھی تک خطہ سے دور ہیں۔ اگر روس کے بیڑے نے جرمنی کی حمایت میں ٹرس لینڈ
پر قبضہ کر کے شمالی راستہ بند کر دیا جس کا خطہ تو پھر جرمنی ضرور آئر لینڈ کی طرف سے محاصرہ کی کوشش کرے گا بشرط آنکہ بحر روم
میں برطانوی بیڑوں کو اُلجھائے رکھے اور فرانسیسی بیڑا بھی اس کے ہاتھ آجائے، لیکن چونکہ اٹلی کی طرف سے اس کی
توقعات بلند نہیں ہیں اور فرانسیسی بیڑے بھی ہنوز اس کی دسترس سے باہر ہیں، اس لئے بحالات موجودہ جرمنی
کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انتظار کرے یا کسی اور طرف برطانیہ کو اُلجھائے یاں سکی بحری قوت کو کئی جگہ تقسیم
کر دینے کے بعد اس پر حملہ کرے۔

کیا جنگ میں ہمیں برطانیہ کا ساتھ دینا چاہئے

یہ ہے وہ سوال جو حلقہ نگار کے احباب کی طرف سے اس دوران میں مجھ سے بار بار کیا گیا ہے۔ گو اس کا جواب
الغرضی طور پر بھی مستفسرین کو دیا جا چکا ہے، لیکن نگار کی وساطت سے بھی میں اپنی رائے اس باتیں ظاہر کر دینا
مناسب سمجھتا ہوں

اس وقت ہندوستان میں دو جماعتیں پائی جاتی ہیں ایک وہ جو یہاں برطانوی حکومت کے قیام کی حامی ہو
اور دوسری وہ جو ملک کو بالکل آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور کسی غیر حکومت کو پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے اس
جماعت سے بحث نہیں جو برطانوی حکومت کی طرفدار ہے، کیونکہ اس کو تو لامحالہ انگریزوں کی مدد کرنا ہی ہے، بلکہ میرا
خطاب دوسری جماعت سے ہے جو ملک کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے

کہا جاتا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہیں کہ موجودہ جنگ نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا کا نقشہ بدل کر رہے گی اور
یقیناً ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بہت کچھ اس جنگ کے انجام پر منحصر ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک
سوال ہے اور اس پر ہمارے طرز عمل کا انحصار ہونا چاہئے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اگر انگریزوں کو اس لڑائی میں
شکست ہو گئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا؟

اس کا جواب مشکل نہیں۔ بحالات موجودہ ہندوستان کا انگریزی تسلط سے علیحدہ ہونا کسی نہ کسی دوسری حکومت کا غلام ہو کر رہنا ہے، خواہ وہ حکومت جاپان و جرمنی کی ہو یا روس کی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہم نے انگریزوں کی مدد کی تو زیادہ سے زیادہ ہندوستان کے حالات میں اتنا ہی تغیر ہو سکتا ہے کہ ہم بجائے ایک آفاقی دوسرے آفاقی خدمت پر مجبور ہوں اور غلام رہے کہ اس کو کوئی غیر متہندوستانی گوارا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان جس منزل سے گزر رہا ہے وہ یقیناً آزادی سے قریب تر ہے، لیکن اگر آج یہاں کوئی دوسری حکومت آجائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے پیرانہ زنجیروں کو اپنے پاؤں میں ڈال لیا جن کو مشکل ایک کر کے توڑا تھا اور ہم کو آزادی کی بدوجہد پیراز سر نو کرنا پڑے گی جس کی کامیابی کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ اسوقت یہ خیال کرنا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے، تو ہم آزاد ہو کر وہ اپنے ملک کی مداخلت کر لیں گے۔ بچوں کی سی باتیں ہیں۔ انگریزوں کی غلطی کہنے والے دانشمندی سب سے بڑی یہی تھی کہ انھوں نے ہندوستان میں اسوقت تک ملک کی حفاظت و مداخلت کے لئے طیارے نہیں کیا جس کو اب وہ محسوس کر رہے ہیں اور یقیناً اس سے زیادہ سخت غلطی ہماری ہوئی اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنی حفاظت کے مسئلہ میں بدستور دوسروں ہی کا دست نگر بنا رہنا پسند کیا۔

حکومت ہند نے اسوقت حفاظت ہند کے مسئلہ کو زیادہ وسعت نظر سے دیکھنے کا ارادہ کیا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم نہایت حریصانہ طور پر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ علاوہ اس کے کہ حکومت کی موجودہ تجاویز مداخلت پر عمل کرنے سے ملک کی بیکاری کم ہوتی ہے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد جدید اصول جنگ سے واقف ہو جائیں گے اور اگر کسی دشمن سے ہم پر حملہ کیا تو کم از کم یہ تو نہ ہوگا کہ ہندو کی شکل دیکھ کر جسم پر لڑہ طاری ہو جائے۔

اس لئے میری آزادانہ رائے یہی ہے کہ اسوقت ہم کو جوق در جوق فوج میں بھرتی ہونا چاہئے اور جو جوان تعلیم یافتہ ہیں ان کو خصوصیت کے ساتھ بحری و فضائی فوج میں داخل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیونکہ سوالیہ اسوقت انگریزوں کی مدد کا نہیں بلکہ خود اپنی مدد کا ہے اور اگر اسوقت ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پسند نہیں کرتے اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ آزادی کا لفظ زبان سے نکالیں۔

دنیا میں تاریخوں کو پلٹ دینے والی ساعتیں شان و نادر ہی کبھی آتی ہیں اور اسوقت ہندوستان انھیں ساعتوں سے گزر رہا ہے، پھر اگر ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ غلطی نہ انگریزوں کی ہوگی نہ انگریزی حکومت کی بلکہ ہماری غلطی ہوگی اور ایسی سخت غلطی جس کی تلافی شاید کبھی ممکن نہ ہو!

عربوں کی سیاسی بیداری

(جنگ عظیم کے بعد)

(مسلل)

جنگ عظیم کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار عرب کی قومی تحریک اپنی قسمت کے فیصلہ کی منتظر تھی۔ شریف حسین نے عرب حکومت کے جو وعدے متعین کئے تھے وہ تمام کے تمام ترکوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے، قومی تحریک کے لیڈر اور عوام اپنی جگہ مطمئن تھے کہ شریف حسین نے برطانیہ سے جو وعدے کئے تھے انکو عربوں نے پورا کر دیا۔ اب عربوں کی نظریں برطانیہ پر لگی تھیں کہ وہ بھی اپنے وعدے پورے کرے۔ مگر جب صلح کانفرنس میں ایف اے عہد کا وقت آیا تو صورت حال بالکل مختلف تھی اور وہاں عجیب عجیب اکتشافات ہوئے، برطانیہ انٹرنیشنل سے جو وعدے کئے تھے ان کی اب نئی نئی تاویلیں ہونے لگیں جو عربوں کے خیال میں کبھی نہ آ سکتی تھیں۔

۱۹۱۹ء میں آزاد شدہ عرب علاقوں کی حیثیت ایک "مفتوحہ علاقہ" کی سی تھی جہاں مارشل لا کا دور دورہ تھا اور تمام انتظامی احکامات برطانوی کمانڈر انچیف سے حاصل کئے جاتے تھے، ملک کو مختلف حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا، اور ہر حصہ میں مختلف انداز کی حکومت تھی۔ عراق کی حکومت کا انصر اعلیٰ برطانوی سول کمشنر کو مقرر کیا گیا اور وہاں تمام اعلیٰ افسرانگریز ہی تھے۔ شام اور فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک پریس انگریزی حکومت، دوسرا میں فرانسیسی اور تیسرے میں عرب حکومت قائم کی گئی۔

صلح کانفرنس میں حجاز کی نمائندگی کے لئے جب فیصل پیرس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ عربوں سے اتحادیوں نے جو وعدے کئے ہیں ان کی راہ میں تین طاقتیں حائل ہیں۔ عراق و فلسطین میں برطانوی شہنشاہی مفاد، شام میں فرانس کا شہنشاہی مفاد اور فلسطین میں یہودیوں کا قومی مفاد۔ فیصل ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو مارسیل (فرانسیس) پہنچا۔ دو فرانسیسی افسروں نے حجاز پر اس کا خیر مقدم کیا اور یہ بھی بتلایا کہ

حکومت فرانس اُس کا استقبال بحیثیت ایک سیاح کے کر رہی ہے اور کسی حال میں بھی اُس کی ناپیدہ حیثیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نہایت شائستہ الفاظ میں اُس کو مغربی عیاد جنگ کے معائنہ کی بھی دعوت دی گئی، فیصل نے بھی اسی شاہکی کے ساتھ دعوت قبول کی ۱۳ دسمبر کو فیصل لندن پہونچا یہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اُس کو ہر طرف پابوسی کی فضا نظر آئی۔ دو ایک روز بعد اس کو معلوم ہوا کہ ساکس پی کاٹ معاہدہ (Mackay Agreement) صرف بالشو کوں کا پرچہ نہ تھا بلکہ ایک سنگین حقیقت ہے۔

اُس زمانہ میں ہر جہہ سے معاہدہ زیر بحث تھا خصوصاً برطانیہ اور فرانس کے مابین تو اس مسئلہ نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ فرانس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے پر مصر تھا اور برطانیہ کو اس سے گریز تھا۔ برطانیہ کا استدلال یہ تھا کہ یہ معاہدہ روس، برطانیہ اور فرانس کے مابین ہوا تھا اب جبکہ روس اُس معاہدہ سے دستکش ہو گیا تو اسکو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہئے۔ نیز برطانیہ اس معاہدہ کو ناقابل عمل بھی سمجھ رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس سے برطانیہ کے مفاد کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ بھی تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے اول تو ولایت موصل فرانس کے حصہ میں آتا تھا، جہاں لاتعداد تیل کے چشمے تھے اور دوسرے فلسطین کو ایک بین الاقوامی انتداب کے حوالہ کرنا پڑتا اور پھر وہاں برطانیہ کا کوئی اقتدار باقی نہ رہتا جب لائڈ جارج نے دیکھا کہ فرانس اپنی ضد پر اڑا ہے تو اُس نے ایک دوسری تجویز فرانس کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ فرانس بحوثی موصل اور فلسطین برطانیہ کے حوالہ کرے اور اُس کے معاوضہ میں اُس کو دوسرا علاقہ دیدیا جائے۔ نیز موصل کے تیل کے چشموں میں بھی فرانس کا حصہ رہے۔ یہ تجویز فرانس نے بڑی مشکلوں سے قبول کر لی۔

فیصل کو تفصیل کے ساتھ تو ہمیں گھر گھر سری طور پر حالات سے آگاہ کیا گیا اور برطانیہ نے اُس پر زور ڈالا کہ لائڈ جارج کی تجویز کی وہ بھی تصدیق کر دے۔ سب سے زیادہ زور فلسطین کے علاقہ کے لئے ڈالا گیا کہ عربوں کی طرف سے وہ برطانیہ کی اسکیم منظور کر لے۔ دوسری طرف یہودی بھی زمین و آسمان کے تلابے تلابے تھے کہ وہ یہودیوں سے ایک معاہدہ کر لے۔ فیصل کی جان سخت مصیبت میں پھنسی تھی اُسکے وہائیٹ ہال (White Hall) کے دوست وہ شرطیں اُس سے منوانا چاہتے تھے جو اُس کے مشن کے بالکل منافی تھیں۔ اُس نے اپنے باپ کے احکامات حاصل کر کے ان کو شش کی تو وہاں سے صاف جواب دیا کہ برطانیہ نے عربوں سے جو وعدے کئے ہیں ان کا ایفاء اور مکمل آزادی سے کم کوئی چیز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یورپ میں فیصل کا شناسا سوا انگریزوں کے اور کون تھا جن سے وہ مشورہ کرتا۔ چنانچہ اُس نے لارنس (Lawrence) سے مشورہ کیا اُس نے وہی مشورہ دیا جو دفتر خارجہ کا مشورہ تھا۔ لارنس نے بھی فیصل پر زور ڈالا کہ وہ یہودیوں سے معاہدہ کر لے مگر اس شرط کے ساتھ کہ عرب کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

[illegible]

فیصل نے کانفرنس میں جو تقریر کی وہ بھی سچیدار تھی۔ دورانِ تقریر میں فیصل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ کسی حکومت کے قیام سے قبل ضروری ہے کہ ملک کے بسنے والوں کی رائے اور خواہش بھی اس مسئلہ میں معلوم کر لی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صلیح کانفرنس ایک کمیشن مقرر کرے جو شام و فلسطین کا دورہ کر کے لوگوں کی خواہش معلوم کرے۔ یہ تجویز پریسیڈنٹ ولسن کو بہت پسند آئی اور اُس نے اس کی پوری حمایت کی۔ فرانس نے اُس کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کیونکہ اُس کو معلوم تھا کہ شام کی پوری آبادی اُس کے خلاف ہے۔ برطانیہ نے اُس کی کھلی مخالفت تو نہیں کی مگر دہرہ دھکی بھی یہی خواہش تھی کہ یہ تجویز کامیاب نہ ہو۔ ایک خفیہ جلسہ لائڈ جارج کی قیام گاہ برہما، وہاں پریسیڈنٹ ولسن نے اس تجویز کو پیش کیا اور سب سے منوا بھی لیا، چنانچہ طے یہ پایا کہ کمیشن کی شرکت کے لئے متعلقہ حکومتیں اپنے دو دو نمائندے مقرر کریں۔ صدر ولسن نے امریکہ کی طرف سے ہنری اسی کنگ (Henry C. King) صدر ایوانِ کانج (Oberlin College) اور مسٹر چارلس آر کریگ (Charles R. Crane) کو منتخب کیا۔ برطانیہ نے سر ہنری مک ایہون (Henry Mc Mahon) اور کمانڈر ڈی جی ہاگرتھ (D. G. Hagroth) کو مقرر کیا۔ فرانس نے اس سلسلہ میں کسی سرگرمی کا اظہار نہ کیا بلکہ

خاموشی اختیار کی۔

لوگوں کا بیان ہے کہ اس خفیہ اجلاس کی اطلاع جب فیصل کو ہوئی تو اس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی اور جی کھول کر پی، پھر موٹر پر بیٹھ کر برطانوی اور امریکی نمائندوں کے پاس گیا اور وہاں صوفوں کے گدوں کو پیچ کر کہا کہ میرے پاس بم کے گولے نہیں ہیں اس لئے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کر رہا ہوں۔

ادائل مٹی میں فیصل دمشق واپس لوٹا، اُس نے دیکھا کہ مستقبل کے متعلق لوگوں کے فیصل کی دمشق کو واپسی اندر شدید بھینپی واضطراب ہے۔ عوام اور لیڈروں کا اصرار تھا کہ وہ صاف صاف

بیان کرے کہ برطانیہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اُس نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اپنی ناامیدیوں اور تلخ تجربات کو اس نے ایک محدود طبقے تک محدود رکھا اور عوام کو مطمئن کرنے کی اُسے پوری کوشش کی مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ملک کے ذمہ دار لیڈروں نے ایک قومی اسمبلی کے قیام کی تجویز عوام کے سامنے پیش کی جس کی ہر طرف سے تائید ہوئی۔ ایک خفیہ انجمن ”حزب الاستقلال العرب“ کے نام سے بنائی گئی۔ فیصل نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ فوجی تحریک کے سلسلہ میں کوئی غیر آئینی اقدام ظہور میں نہ آئے جلدی جلدی اس اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے اور دوسری جولائی کو دمشق میں اُس کا اجلاس (General Syrian Congress) کے نام سے منعقد ہوا۔ شام کے بعض علاقوں کے نمائندوں کو فرانسیسی حکومت نے جبراً شرکت کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ ۸۹ ممبروں میں صرف ۶۵ ممبر شرکت کر سکے۔ ان نمائندوں میں عیسائیوں کی تعداد اُن کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی اس کانفرنس نے متعدد تجاویز پاس کیں اور ایک بیان ملک کی موجودہ حالت کے متعلق شائع کیا یہ بیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے عظیم تھا ان تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

(۱) شام کو (مذہب فلسطین کے) آزاد و خود مختار تسلیم کیا جائے۔

(۲) امیر فیصل کو شام کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔

(۳) عراق کی آزادی تسلیم کی جائے۔

(۴) سائیکس پی کاٹ معاہدہ۔

بقدر اعلان (Balfour Declaration) اور اُن تمام معاہدات کو منسوخ کیا جائے جنہیں

شام کی تقسیم اور فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کی تجویزیں ہیں۔ کانفرنس کی تمام تجاویز قومی جذبات کے مظاہروں کے ساتھ بلا کسی مخالفت کے پاس ہوئیں۔ ان تجاویز کی تائید تمام ملک نے کی اور ہر جگہ سرکوں پر اس کی حمایت میں مظاہر کئے گئے، ملک کے اخباروں میں جلی حروف میں ان تجاویز کو شائع کیا گیا۔

کننگ کریں رپورٹ (King Crane Report) صلح کانفرنس کی مجوزہ تحقیقاتی کمیشن کے سلسلہ میں برطانیہ اور فرانس نے پوری مخالفت کی، اٹالیہ کا چونکہ اس میں کوئی مفاد نہ تھا اس لئے اس نے لاپرواہی برقی صرف پریسیڈنٹ وکسن کی ایک ذات تھی جو اپنی تجویز پر قائم رہی اور جب اس نے فرانس و برطانیہ کی مخالفت کو محسوس کیا تو اسے یہی مناسب نظر آیا کہ امریکہ کم از کم اپنے نایبندوں کو تحقیقات کے لئے ضرور روانہ کرے چنانچہ امریکی نایبند سے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کی مرتبہ رپورٹ کننگ کریں رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن نے چھ ہفتے تک شام و فلسطین کے اندرونی علاقوں کا دورہ کیا۔ ۴۰ مقامات پر قیام کر کے مختلف لوگوں سے تبادلاً خیال کیا اور تفتیش حالات کئے۔ اپنا دورہ ختم کرنے کے بعد یہ لوگ قسطنطنیہ گئے اور وہیں رپورٹ مرتب کی۔ اگست کے آخری ہفتہ میں پیرس واپس آئے۔ اور ۴ اگست کو رپورٹ متحدہ امریکہ کے دفتر کے حوالہ کی۔ اس کے فوراً ہی بعد ڈاکٹر کننگ (Dr. King) امریکی لوٹے تاکہ جلد سے جلد رپورٹ کی نقل پریسیڈنٹ وکسن کے حوالہ کریں۔

اب کننگ کریں رپورٹ عوام کی ملکیت تھی، شہر و دیہات میں اس کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پریسیڈنٹ وکسن نے پوری رپورٹ پڑھی تھی یا نہیں مگر اس کے خلاصہ سے ان کو ضرور واقفیت تھی کیونکہ دونوں کشنوں نے بذریعہ تار اپنی تحقیقات کے خلاصہ سے ان کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ ستمبر میں جب رپورٹ کی اشاعت کی اجازت ان سے طلب کی تو وہ فوراً اس کے لئے طیارہ ہو گئے لیکن پوری رپورٹ صرف امریکی اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ ایک اہم ترین دستاویز ہے، خصوصاً موہنین کے لئے کیونکہ صرف اسی رپورٹ میں ایسا مواد دستیاب ہو سکتا ہے جو غیر جانبداروں کا فراہم کیا ہوا ہے اور جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ صلح کانفرنس کے بعد عربوں کے جو جذبات اور خیالات تھے ان کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس رپورٹ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

کمیشن نے شام، فلسطین اور عراق کے لئے انتداب کو فردری سمجھا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ انتداب ایک معین و محدود وقت کے لئے ہو اور مقصود صرف یہ ہو کہ ملک کے تمام حصے جلد از جلد آزاد یا مست کی شکل اختیار کر سکیں کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا کہ عراق کو ہرگز تقسیم نہ کیا جائے اور یورپ ملک کے لئے ایک انتداب ہو۔ شام (مع فلسطین) کے اتحاد کو بھی برقرار رکھا جائے اور عراق کی طرح سے شام کے لئے بھی ایک انتداب ہو جس میں فلسطین کا علاقہ بھی شامل رہے، دونوں علاقوں میں دستوری شہنشاہیت عمل میں لائی جائے۔ امیر فیصل کو شام کا بادشاہ اور کسی غریب حکمران کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ انتداب کے انتخاب کے باب میں کمیشن نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ملک کی رائے عامہ سب سے پہلے امریکہ کو ترجیح دیتی ہے اور پھر برطانیہ کو، فرانس کا انتداب تو قبول کرنے کے لئے وہ کسی حال میں بھی طیار نہیں چنانچہ تمام حالات پر بحث کرتے ہوئے کمیشن نے مشورہ دیا ہے کہ انتداب کے لئے متحدہ امریکہ سے استدعا کی جائے اگر وہ طیار نہ ہو تو پھر برطانیہ کے سپرد کیا جائے

لیکن اگر فرانس کے سپرد یہ علاقہ کیا گیا تو عربوں اور فرانسیسیوں میں یقیناً جنگ ہوگی۔

میکیش نے یہودیوں کے مسئلہ پر بھی کافی بحث کی اور بتلایا کہ تحقیقات شروع کرتے وقت وہ لوگ یہودیوں کی اسکیم کے موافق تھے مگر دوران تحقیقات میں یہودی نمائندوں نے جو بیانات دئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ مختلف چالاکوں سے عربوں کی جاننا دیں خرید رہے ہیں اور اس طرح سے اُن کی یہ کوشش ہے کہ فلسطین میں عربوں کا کوئی حصہ نہ رہے۔ یہودیوں کی اسکیم ملک کے باشندوں کے حقوق و مفاد کو بری طرح پامال کر رہی ہے نیز برطانیہ اور پریسیڈنٹ ولسن نے جو اصول مرتب کئے ہیں، یہ اسکیم اُن کے بالکل منافی ہے۔ جس برطانوی افسر سے میکیش نے گفتگو کی اُس نے بھی بتلایا کہ یہ اسکیم صرف تلوار کی طاقت سے کامیاب ہو سکتی ہے، چنانچہ میکیش نے یہ تجویز کیا کہ یہودیوں کا داخلہ بالکل محدود کر دیا جائے اور فلسطین کو یہودی ریاست کی شکل میں تبدیل کرنے کا خیال چھوڑ دیا جائے۔ یہ تجاویز ظاہر ہے کہ برطانیہ، فرانس اور یہودی تینوں کے لئے کس درجہ تلخ تھیں۔ چنانچہ اس رپورٹ کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی اور اُس کی اشاعت سے پہلے ہی دونوں طاقتوں میں آپس میں سمجھوتہ کر کے ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔

فیصل کا دوسرا سفر یورپ اور اُس کے نتائج اگست میں لائڈز جارج نے فیصل کو دوبارہ یورپ آنے کی دعوت دی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب برطانیہ و فرانس کے تعاقبات

عرب معاملات کی وجہ سے خطرناک حد تک کشیدہ ہو چکے تھے۔ فرانس کے تمام سیاستدان اور کل اخبارات برطانیہ کو بدبینی اور وعدہ خلافی کا مجرم گردان رہے تھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ انگریز عربوں کو شام میں فرانس کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فیصل کے لندن پہنچنے سے قبل لائڈز جارج نے ایک تجویز فرانس کے سامنے پیش کی اور فرانس نے اُس کو قبول کر لیا۔ جب فیصل کے لندن پہنچنے کے بعد وہ تجویز اُس کے سامنے پیش کی گئی، تو وہ سید براہ فرودختہ ہوا اور فوراً ایک احتجاجی بیان قلمبند کر کے وزیر اعظم کے حوالہ کیا۔ اس چیز نے برطانیہ کو سخت الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اب برطانیہ نے یہ سوچا کہ فرانس اور عرب کے مابین اگر کوئی معاہدہ ہو جائے تو اس سے برطانیہ کی پوزیشن بڑی حد تک صاف ہو جائے گی چنانچہ برطانوی وزراء نے فیصل پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ بالواسطہ فرانس سے گفت و شنید کرے۔ فیصل کو انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر فرانس کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔ ۷ نومبر کو فیصل نے فرانس کے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور پہلی ہی ملاقات میں معاملہ طے ہو گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ عرب حکومت لبنان اور شام کے ساحلی علاقہ کو جو شمال میں سنجاق تک ہے، فرانس کا مقبوضہ تسلیم کرے گی۔ نیز عرب حکومت کو جس قسم کی امداد درکار ہوگی، فرانس اُس کو فراہم کرے گا۔ فیصل نے کرنے کو تو یہ معاہدہ فرانس کے ساتھ کر لیا مگر اس قسم کا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کو کوئی حق نہ تھا اس کے باپ شریف حسین نے بھی جو ہدایات اُس کو دی تھیں یہ معاہدہ اُس کے بالکل منافی تھا۔ اور یہ معاہدہ شام کی رائے عامہ کے بھی بالکل خلاف تھا چنانچہ شام پر اس کا سید اثر پڑا۔

جب شام میں اس معاہدہ کی خبر پہنچی تو ہر طرف شدید پھینپی اور اضطراب کے آثار نظر آنے لگے۔ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ فیصل نے ملک کو فرانس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ فیصل کو جب ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً شام کا رخ کیا۔ یہاں ہر جگہ اُس کا سرد مہری سے استقبال کیا گیا۔ سڑکوں پر عام طور سے آزادی اور اتحاد کے مظاہرے کئے گئے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ عرب لیڈر اور عرب رائے عامہ اس معاہدہ سے کس قدر بغیر مطمئن ہے۔

دشمن میں ملک کے ہر حصہ سے لیڈر، طلبہ اور عرب افسر حوق در حوق چلے آ رہے تھے اور آزادی و اتحاد کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔

۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو جنرل سیرین کانگریس (General Syrian Congress) کا اجلاس ہوا۔ اُن تمام لیڈروں نے اس اجلاس میں شرکت کی جنہوں نے بغاوت میں پورا حصہ لیا تھا اور ملک میں جن کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی اجلاس میں شام (مع فلسطین) کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی امیر فیصل کو بادشاہ منتخب کیا گیا۔ اسی طرح عراقی لیڈروں نے بھی اپنے ایک جلسہ میں عراق کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا اور وہاں کا بادشاہ امیر عبداللہ کو منتخب کیا گیا۔ فرانس و برطانیہ کی حکومتوں نے اس کانفرنس کی تجویز اور اُس کے اعلان کو قبول کرنے کے بجائے "ناجائز" قرار دیا اور فوراً مجلس اعلیٰ (High Commission) کا اجلاس طلب کیا۔ فیصل کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ برطانیہ و فرانس کی حکومتوں نے سیرین کانگریس کے اعلان کو ٹھکرا کر صرف عہد شکنی ہی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ بہت بڑی سیاسی غلطی بھی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیصل کے لئے اب اس کانفرنس میں شرکت کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا۔

سین ریمو (San Remo) میں ۲۵ اپریل کو مجلس اعلیٰ (High Commission) کا اجلاس ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ تمام علاقہ جو بحیرہ روم سے لیکر خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے وہاں انتداب کا قیام طے پایا۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے اپنے مفاد کے مطابق شام کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ فرانس کے حصہ میں شام و لبنان کا علاقہ آیا، برطانیہ کو عراق و فلسطین کا علاقہ ملا۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ بالفور اعلان (Balfour Declaration) کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ یہ تجاویز ۵ مئی کو شائع ہوئیں اور اُس کی اشاعت کے ساتھ ہی عرب عوام میں مغربی طاقتوں کے خلاف غصہ و نفرت کی آگ مشتعل ہو گئی۔ کیونکہ عربوں کی تمام قربانیوں کو جن کی وجہ سے اتحادیوں کو کامیابی نصیب ہوئی تھی، پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

فرانس کا دمشق پر حملہ
سین ریمو (San Remo) کانفرنس کے اختتام کے ساتھ ہی عربوں اور فرانسیسیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ فرانس کو انتداب حاصل

ہو جانے کے بعد فیصل پر ہر طرح کا زور ڈالنے کا موقعہ ملا جس کی فرانس کو عرصہ سے تمنا تھی، دوسری طرف عرب فیصل کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے مجبور کر رہے تھے فیصل نے اس سے قطعاً انکار کیا۔ اس کی سبب بڑی وجہ یہ تھی کہ فیصل کو برطانیہ اور امریکہ سے انصاف کی امید تھی۔ چنانچہ فیصل نے اب پھر سفر یورپ کا قصد کیا۔ لیکن ابھی اس سفر کے انتظامات پایہ تکمیل کو نہیں پہنچے تھے کہ فرانس کا ایک الٹیمیم موصول ہوا، جس میں دمشق کی عرب حکومت کے خلاف ایک طویل فرد جرم پیش کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی ایک بیان بھی منسلک تھا جس میں مصالحت کی پانچ شرطیں درج تھیں :-

- (۱) ریاق علی پوریلو سے لائن (Rayyag Ali Poriolo Line) فرانس کے فوجی نظم و نسق کے سپرد کر دی جائے
- (۲) جبرہ فوجی بھرتی ختم کر دی جائے اور عرب کی فوجی طاقت بڑی حد تک کم کر دی جائے۔
- (۳) فرانسیسی حکومت کا (مستقل ملک) قبول کیا جائے۔
- (۴) فرانس کا انتداب غیر مشروط طریقہ پر تسلیم کیا جائے۔
- (۵) فرانس کے مخالفین کو سزا دی جائے۔

ان شرائط کی تکمیل کے لئے صرف چار دن کا موقعہ دیا گیا تھا ”اور اگر اس عرصہ میں یہ شرطیں پوری نہ کی گئیں تو حکومت فرانس ہر اس اقدام کے لئے آزاد ہوگی جس کو وہ مناسب سمجھے“

فیصل کے ساتھیوں کے غصہ و تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی جب ان کو معلوم ہوا کہ فیصل نے ان شرائط کو قبول کر لیا ہے۔ خود فیصل کو اس کا پورا احساس تھا کہ یہ اقدام ناممکن میں اس کو غیر ہر دلعزیز بنا دے گا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ فرانس آمادہ جنگ ہے اور اسوقت مصلحت یہی تھی کہ جنگ کو ٹال دیا جائے تاکہ اس کو ایک بار لندن جانے کا موقع ملے اور وہاں بالکل مختلف انداز میں وہ پورے مسئلہ کو از سر نو اٹھائے۔ برطانیہ کی خوش نیتی پر اعتماد اب بھی اس کی پالیسی کا ایک لاینفک جزو تھا۔ نیز فرانس کے الٹیمیم کے ساتھ ہی لارڈ کرزن کا ایک تار بھی موصول ہوا جس میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اسوقت ہر ممکن قیمت پر لڑائی سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ فیصل نے تمام شرطیں قبول کر لیں اور ان کی تکمیل کا انتظام بھی شروع کر دیا۔ مگر اس کے باوجود فرانس کی فوجیں دمشق کی سمت بڑھنے لگیں۔ اس خبر کو سنکر پورا شہر اہل قرب و جوار میں ایک ہلچل مچ گئی۔ فیصل نے صورت حال پر قابو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں تقریباً سو عرب خود اس کی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ مگر فیصل کو کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر مقامی فوج کے دوش بدوش دو ہزار محبان قوم بھی جا کھڑے ہوئے۔ فرانسیسی توپوں اور ہوائی جہازوں کے سامنے نیم مسلح اور غیر مسلح فوج کیا ٹھہرتی گران لوگوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا۔ حکومت شام کا وزیر جنگ یوسف الاظم بھی اسی لڑائی میں کام آیا۔ فرانسیسی فوج نے دمشق میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دمشق

خالی کرنے کا حکم دیا جس کی اُس نے فوراً تعمیل کی اور وہاں سے نکل کر اُس نے سیدھے اٹلی کا رخ کیا۔ کچھ دنوں تک لیک مگیور (Maggiore) میں قیام کیا۔ دسمبر میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا اور اُس کے جواب میں وہ لندن کے لئے روانہ ہوا۔

مسلم عرب بغاوت

عربوں کی تاریخ میں سترہ کو فحاکت اور بدعتی کا سال سمجھا جاتا ہے۔ سین برسوں کا فرانس کے بعد اسی سنہ میں فرانس نے شام پر قبضہ کیا۔ عراق پر انگریزوں کا تسلط ہوا اور فلسطین میں یہودی اسکیم کا اجراء شروع ہوا، دوران جنگ میں عربوں اور اتحادیوں کے مابین جو معاہدات ہوئے تھے ان کو بروئے کار لانے کے لئے اسی سال عربوں نے مسلح بغاوت کی، شام، فلسطین اور عراق میں ہر جگہ بلوے ہوئے، غرض اسوقت ملک کے گوشہ گوشہ میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ رہی تھی، اور ہر جگہ سے جارحانہ اقدامات کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ فساد کی آگ سب سے پہلے فلسطین میں ایسٹر (Easter) کے موقع پر مشتعل ہوئی۔ بیت المقدس کی عرب آبادی نے یہودی لیڈروں کی تقریریں سنیں جن میں فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام اور عربوں کو نکالنے کا ذکر تھا، عرب ان بیانات کو سنکر مستقبل کی طرف سے بے حد خائف ہوئے اور اسی گھبراہٹ میں انھوں نے یہودی آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس فساد کے اسباب پر سرکاری طور سے آج تک کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ برطانوی کمانڈر انچیف نے تحقیقات کے ایک کمیشن ضرور مقرر کیا۔ حکومت نے اس کی رپورٹ کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔ عوام کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ کمیشن کے خیال میں اس فساد کے اسباب قطعاً سیاسی تھے اور عرب آبادی نے جو کچھ کیا وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو کر کیا۔

شام پر فرانس کے قبضہ کے ساتھ ہی فسادات بھی شروع ہوئے۔ سب سے زیادہ خونیں فسادات عراق میں رونما ہوئے۔ یہ فسادات دراصل اشتباہ کے خلاف صرف مظاہرے تھے۔ اہل عراق برسوں سے آزادی اور اتحاد کی خاطر اپنا خون بہا رہے تھے لیکن جب آزاد ہونے کا وقت آیا تو ان کے سرانشتاد تھوپا جا رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ برطانیہ کا طوق غلامی ان کی گردن میں ڈالا جا رہا ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے ان لوگوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کیا، لیکن حکومت نے ان مظاہروں کے سدباب کے لئے قوت کا استعمال ضروری سمجھا۔ ملک کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے مقدمات کی سرسری سماعت کر کے سب کو سزائیں دیدی گئیں۔ اس چیز نے عربوں کے غم و غصہ کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ جون کے آخری ہفتہ میں ایک فساد وادی فراط میں رونما ہوا۔ یہ فساد اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ خونیں فساد تھا۔ اس کا سلسلہ جون سے شروع ہو کر اگست تک جاری رہا۔ عرب مقتولین کی صحیح تعداد کا تو کوئی علم نہیں مگر لوگوں کا اندازہ ہے کہ کم از کم ۴۰ ہزار عرب جانیں اس فساد میں ضائع ہوئیں۔ اس فساد کا مقابلہ کرنے اور شورش کا سرکچنے کے سلسلہ میں برطانیہ کے خزانہ پر کم کردہ پونڈ (قریباً ۶ کروڑ روپے)

کا بار پڑا۔ خود اہل عراق کا کتنا مالی نقصان ہوا اس کا کوئی تخمینہ موجود نہیں ہے۔

برطانیہ نے مجبوراً عرب نمائندہ برطانوی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی عرب وزراء کا تقریبی عمل میں آیا، ہر وزیر کے ساتھ ایک برطانوی مشیر بھی تھا اور انتظامات کی باگ ڈور خود سول کمشنر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو عرب حکومت، تو کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ عرب و برطانیہ کے درمیان جو اختلافات کی خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ بڑی حد تک پُر ضرور ہو گئی۔ آگے چلکر عراق کو سیاسی آزادی دیدی گئی اور انتخاب کو منسوخ کر دیا گیا۔

مسٹر چرچل وزیر نوآبادیات کی تجویز پر عرب کے برطانوی عامل کی ایک کانفرنس قاہرہ میں طلب کی گئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل فیصل نے لندن میں برطانوی عامل سے طویل ملاقاتیں کیں، ان میں چرچل اور کرنل لارنس کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ فیصل اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ برطانیہ عراق کا تمام نظم و نسق عرب حکومت کے حوالہ کر دے۔ نیز فیصل کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی پوری کوشش کرے۔

قاہرہ کانفرنس ۱۲ مارچ کو منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ فیصل اور چرچل کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ علاوہ اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کانفرنس نے بڑی حد تک وہ وعدے پورے کر دیے جو برطانیہ نے انگریزوں سے کئے تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس کانفرنس میں عراق کو یقیناً سیاسی آزادی ملی مگر عرب کے مغربی حصوں کا جہاں تک تعلق ہے برطانیہ پر بدعہدی کا الزام بدستور قائم رہتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی

”نگار“ کے پرانے پرچے

”نگار“ کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دہائی تین کا پیاں دفاتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۹۳۷ء) جنوری ۵ء۔ (۱۹۳۷ء) مئی ۴ء۔ (۱۹۳۷ء) جولائی تا دسمبر ۴ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۱۲ء۔
فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ء۔ (۱۹۳۷ء) فروری تا جولائی ۴ء۔ (۱۹۳۷ء) اکتوبر ۷ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۸ء۔
فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۵ء۔ (۱۹۳۷ء) اگست ۶ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۸ء۔
فروری تا دسمبر (علاوہ جون تا دسمبر) ۶ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۸ء۔ (۱۹۳۷ء) اگست ۸ء۔ (۱۹۳۷ء) فروری ۸ء۔
فروری تا دسمبر (علاوہ جون تا دسمبر) ۶ء۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۸ء۔ (۱۹۳۷ء) اگست ۸ء۔ (۱۹۳۷ء) فروری ۸ء۔

شیخ نگار لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال

میرے نزدیک سب سے دلچسپ اور مستند خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کردئے جائیں یا منظر عام پر نہ آئیں۔ اس لئے بڑا تہ میں ایسے خطوط کا قایل نہیں ہوں جو شائع کئے جائیں چہ جائیکہ ان پر مقدمہ لکھا جائے اور ان کی تشریح و تحلیل کی جائے۔ اس اعتبار سے نیاز صاحب اور میں دونوں قصور وار ہیں، لیکن اکثر یہی چیز سبک کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ گو میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب یا میں خود کشتی گروں یا انہیں سے کوئی سنگسار کیا جائے تو سبک کی دلچسپی کئی گونہ بڑھ جائیگی! خطوط بالعموم ایسے لوگوں کے محفوظ رکھے جاتے ہیں یا ان کو شائع کیا جاتا ہے جو سبک کی نظروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے اہم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ایسے لوگ جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی حیثیت سے اہم سمجھتے ہیں، کبھی بے تکلف اپنے خیال یا بے جھجک ہونا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے ایسے لوگ بھی ہوں جو اپنی اہمیت کو اکثر بھول جایا کرتے ہوں لیکن وہ کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ لوگ بھی انہیں بھول جایا کریں۔ چنانچہ ایسے لوگ جب کبھی اپنے خیالات پر قلم کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ غیر شعوری طور پر بھی اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی چیز قلم سے ایسی نہ برآمد ہونی چاہئے جس پر ادبی، اخلاقی یا کسی اور نوعیت سے حرفِ فکری کیجائے اور یہی وہ احتیاط ہے جو خطوط کی ساری دلکشی یا اہمیت غارت کر دیتی ہے۔

خطوط نویسی ہی ایسا فن ہے جس کی تعمیر میں اہل معنوں میں ”مضمحلہ“ اک صورتِ خوابی کی“ خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

خط اور دوسرے قسم کے مضامین لکھنے والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے اس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے اور براہِ راست نوکِ قلم سے برآمد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی تحریر منظر عام پر آئے گی اس کے حسن و قبح یا عواقب پر ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑیں گے اس لئے وہ دلی دلولوں کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا اور جو کچھ لکھتا ہے اس کو دماغ کے خزانے سے نکالتا ہے اور دل کو ”پاسانِ عقل“ کی معیت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ دنیا کی مستقل تصانیف کا یہی حال ہے اس لئے میرزا قادی خیال ہے کہ دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش مرثیہ منافقت یا

لکھا گھیت سے لبریز ہوتی ہیں یعنی جھوٹے سچ اور سچے جھوٹ کا ایک منظم پشتارہ !

خطوط کا میں احترام کرتا ہوں اس لئے کہ اصلی خطوط اس قسم کی بے عنوانیوں سے مبرہ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بالعموم لوگ اپنی تصانیف کو شائع کرنا اور خطوط کا پرائیوٹ رکھنا یا چاک کر ڈالنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تصانیف ہمیشہ کی اور خطوط شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں سو دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی اصلی سیرت یا شخصیت کو منظر عام پر لانے کی جرات ہو۔

داعی اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیوٹ زندگی کی تمام جزئیات منظر عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالتاب کا ضبط نظر دیکھنے کے مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازدواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے ! اس محک آتشیں پر آزمائے جانے پر کون آمادہ ہے ؟

خطوط، لکھنے والے کی سیرت کے اصلی خط و خال ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ بے لاگ لکھے گئے ہوں اور اگر بے لاگ نہیں لکھے گئے ہیں تو ان سے زیادہ بے کار محض کوئی اور چیز نہیں کیونکہ ان پر خط کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ چیز محض مضمون آفرینی یا مضمون نویسی ہوتی ہے جس کا کسی حد تک قابل برداشت نمونہ شعر و شاعری ہے۔ انسان کی اصلی سیرت کی غامضی اکثر دو چیزیں کرتی ہیں یعنی وہ موجود ہو تو اس کے ساتھ کھیلے وہ کھل جائیگا، اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط دیکھئے وہ پکڑا جائے گا۔

میں اکثر اپنے طلباء سے کہا کرتا ہوں کہ زندگی کی جنگ میں ممکن ہے مخلص نہ ہونا فائدہ بخش بھی ہو لیکن انشاپردازی میں مخلص نہ ہونا ہلک ہے، لکھو تم محسوس کرتے ہو نہ یہ کہ دوسروں نے کیا محسوس کیا ہے یا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اگر ہر انسان اپنے خلیہ سیرت اور شخصیات کے اعتبار سے منفرد ہے تو بحیثیت انشاپرداز کیوں نہ منفرد ہو۔ تم اپنے والدین کو خط لکھتے ہو تو وہ فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ انشا اور املا سب کچھ تمہارا ہے اور صرت تمہارا ہے اور مضمون لکھتے ہو تو والدین تو کیا تم بھی نہیں بتا سکتے کہ تمہارا ہی لکھا ہوا ہے !

زمانہ کے تغیرات نے خطوط نویسی کے بھی اسلوب بدلے ہیں۔ پہلے مدتوں بعد خطوط کے بھیجے کا سامان ہوتا تھا، عرصہ تک لکھے جاتے تھے اور ایک طویل زمانہ کے بعد پہنچتے تھے، خطوط اطمینان سے لکھے جاتے تھے اور شوق سے لکھے جاتے تھے اس لئے ان میں دلکشی ہوتی تھی، موثر ہوتے تھے اور یادگار کے طور پر محفوظ کر لئے جاتے تھے۔ اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ پہلے ضرورت ایجاد کی محرک ہوتی تھی، اب ایجاد ضرورتوں کی محرک ہوتی ہے۔ ایجادات نے زندگی کے اسلوب بدلے، بعضوں کا خیال ہے کہ اگر انسان کی مشغولیت اور بدحواسی کا یہی عالم رہا تو آئندہ خطوط صرف

زبان کھیل رہ جائے گی، لیکن مایوس ہونے کی وجہ نہیں ہے۔ جس طرح اور جن اسباب کے تحت طویل قصص یا ناولوں کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی، مجھے یقین ہے خطوط کی نوعیت بھی بدل جائے گی، فرصت کم ہونے کی سبب سے ممکن ہے آئندہ لوگ اپنے تمام خیالات خطوط ہی میں ادا کرنے لگیں۔ اب تک مکتوب کو نصف ملاقات کہتے آئے ہیں، ٹیلی وژن کی ترقی سے ممکن ہے نصف ملاقات ”نصف بہتر“ قسم کی ملاقات پر ختم ہوا کرے اور تماشائی کا میانی تمنا کی بھرپوری کو بہت کچھ کم کر دیا کرے۔

خط نویسی کی تاریخ نہایت طول طویل اور دلچسپ ہے۔ یونانی ادب میں خط کا تذکرہ ہومر کی ایلیڈ میں آیا ہے۔ اسکی ابتدا یقیناً بعض مخصوص نشانات سے ہوئی ہوگی، اور اس زمانہ میں عوام اس سے اسی طور پر تحیر یا سراسیمہ ہوتے ہوئے جیسے آجکل کے بعض وحشی قبائل گراموفون وغیرہ قسم کی چیزوں سے ہو سکتے ہیں سلا بان روم میں یہ چیز زیادہ منظم اور مقبول ہوئی، یہاں تک کہ صدی قبل مسیح میں سسرو نے خط نویسی میں جو شہرت حاصل کی اس کے سامنے اب بھی لوگ سر عقیدت خم کرتے ہیں۔ سسرو کے خطوط کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ تمدن طبقوں اور مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں صدیوں لاطینی کا دور دورہ رہا۔ اور لاطینی میں سسرو کے خطوط اسلوب خط نویسی کے بہترین نمونہ ہیں۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک انگریزوں کی آپس میں لاطینی ہی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ ملٹن اور کرامیل کے عہد تک سائنس اور علم سیاست کی زبان بھی لاطینی رہی، چودھویں صدی تک تو انگریزوں کو متحدہ قومیت کا احساس ہوا اور نہ مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی دربار پر فرانسیسی زبان کا تسلط رہا یہی نہیں بلکہ بچوں کو ابتدا ہی سے فرنگ بولنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور فرانسیسی جاننا عالمی منہی کی دلیل سمجھی جاتی تھی جنگ صد سالہ کے بعد انگریزوں میں روح ملت بیدار ہوئی اور انھوں نے اپنی مادری زبان کو قوم کی زبان قرار دیا۔ انگریزی زبان میں واپل، چمبر قیلڈ کاؤپر، فٹز جیرلڈ، اسٹونسن، کیٹس اور کارلائل خطوط نویسی کے امام مانے جاتے ہیں۔

اُردو میں بھی خط نویسی کی تاریخ انھیں حالات سے ملتی جلتی ہے، ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی رہی اور گومفلوں کے آخر دور حکومت میں اُردو رفتہ رفتہ برسرِ عروج آنے لگی تھی، لوگ عام طور پر اُردو بولنے لگے تھے، شعر و شاعری بھی کافی ترقی کر چکی تھی لیکن فارسی کا تسلط ایک گونہ برقرار ہی رہا۔ دور حاضر میں ابھی کافی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے عہد طفولیت میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور فارسی اور عربی کا جانشا شرافت اور

لے ٹیلی فون میں آواز سنائی دیتی ہو شکل نہیں دکھائی دیتی۔ ٹیلی وژن میں آواز کے ساتھ ساتھ شکل بھی دکھائی دیتی ہو چلو آواز صوت و رساں و شکل نا بھی کر سکتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: ”ویدارشد میروہوس وکنارہم“۔ ٹیلی وژن کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔

خوشخوئی کی دلیل تھی۔

غالب کو جہاں اور بہت سی باتوں میں نمایاں خصوصیات حاصل ہیں ایک یہ بھی ہے اور کسی سے کم نہیں ہے کہ جس چیز کو انھوں نے اپنے لئے ”ننگ“ قرار دیا تھا اس میں ایسے ”نقشہ ہائے رنگ رنگ“ پیدا کئے جو آج بھی بے مثل ہیں اور خطوط نویسی کے جدید ترین اصول تنقید پر صحیح اترتے ہیں۔ غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے خط نویسی کا اولین اور شاید بہترین معیار یہی ہے۔ غالب کے خطوط کا سب سے زبردست راز یہ ہے کہ انھوں نے رقعات میں اپنی سیرت اور اپنے ماحول کی ادنیٰ جزئیات کو بھی اصلی رنگ میں بغیر کسی تصنع یا آمیزش کے پیش کیا ہے اور اس امر کی کہیں کوشش نہیں کی کہ وہ بہترین شاعر، منظر نگار یا معلم کے رنگ میں نظر آئیں۔ ان کی ظرافت، بذلہ سنجی، تکلفی وسیع المشرقی، شاگردوں سے اُلقت، بڑوں اور بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں پر شفقت ہر جگہ نمایاں ہے، زمانہ سے لگے ساتھ کیا سلوک کیا اور انھوں نے زمانہ کو کس طور پر برتنا اس کے بعض نہایت دلنشین نمونے ملتے ہیں اور بحیثیت مجموعی جس چیز نے ان رقعات کو لازوال بنا دیا۔ یہ وہ یہ ہے کہ ان کا لکھنے والا غالب اور صرف غالب ہو سکتا تھا!

غالب کے علاوہ اردو کے مکاتیب بھی شایع ہوئے ہیں، مثلاً سر سید، محسن الملک، امیر، نذیر احمد، شبلی، اکبر وغیرہ وغیرہ ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ شبلی کے خطوط ہیں۔ جس چیز کو شبلی نے عطیفی کے نام کے خطوط میں چھپا کر کی کوشش کی ہے اس کو بے نقاب کرنا یوں ضروری نہیں ہے، کہ خود نقاب نے جلوؤں کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے ہماری افتاد طبع کچھ ایسی ہے، جس کے حسن یا قبح سے یہاں بحث نہیں ہے، کہ ہم ہر چیز کو اکثر کھینچ تان کر اس معیار اخلاق سے پرکھنا چاہتے ہیں جو اکثر نفس اخلاق سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا مخصوص تمدن اور ماحول سے، شبلی کے ان خطوط سے شبلی کے پرستاروں کو نگاہ نیچی کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ خطوط میرے نزدیک یوں قابل احترام ہیں کہ ان میں انسانی جبلت اور شاعرانہ شرافت کو ایک دوسرے سے متوازن رکھا گیا ہے ان خطوط میں تصنع اور تکلف کم اور صداقت شعری پورے طور پر نمایاں ہے۔ ہر حقیقت حسین ہوتی ہے لیکن اکثر حسین نظر نہیں آتی اصلی شاعر صرف وہ ہے جو حقیقت کو حسن کا جامہ نبھاسکے، حسن حقیقت، حقیقت حسن سے زیادہ دلکش چیز ہے ایک کا بے نقاب کرنا شاعر کا کام ہے اور دوسرے کی تحلیل و تجزیہ فلسفیوں کی بر توفیقی ہے!

سر سید، محسن الملک، نذیر احمد کے خطوط کو پرائیوٹ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے ان خطوط کو اپنی نجی زندگی کا آئینہ دار نہیں بننے دیا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کے خطوط کو یہاں ہم وہ حیثیت نہیں دینا چاہتے، جس کو ہم نے شروع سے مدنظر رکھا ہے، اکبر کے خطوط میں یہ صفت ضرور ہے کہ ان میں وہ اکثر اپنے خاص رنگ اور مخصوص حال میں نظر آئے ہیں۔ لیکن یہ خطوط بالعموم اس زمانے کے ہیں جب

گئے غمزدہ اوچ تیغ اسیلے

کے بجائے۔ گئے گروہ اوچ اور بہارے — زیادہ صادق آتا ہے۔

اب نیاز صاحب کے مکتوبات کی باری آتی ہے۔ نیاز صاحب بڑے گھاگھ ہیں۔ پہلے ہی پیرے میں انھوں نے میرے ان تمام خطرات کا سد باب کرنا چاہا ہے جن کا اظہار میں نے ان اوراق کے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔ نیاز صاحب سے میرے بڑے پڑانے ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں۔ بہت زمانہ ہوا اسٹریچی ہال کے سامنے ملاقات ہوئی، میں ہال کے اندر تھا چیرا سی نے کہا ایک صاحب بلاتے ہیں، میں نکلا تو نیاز صاحب نظر آئے۔ اس سے پہلے صرف غائبانہ تعارف تھا، اور معلوم ہوتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے مرعوب تھے لیکن ملاقات کا فوری انجام یہ ہوا کہ دونوں کا ایک دوسرے پر سے رعب زائل ہو گیا جس کا دونوں کو اب تک افسوس ہے۔

دو تین سال بعد ایک شام کو جو باوجود اس کے کہ عورتوں کا مجمع تھا اور موسم اعتدال پر تھا، قطعاً قاتل نہ تھی، نور الرحمن صاحب کی معیت میں نیاز صاحب سے دوسری ملاقات نمائش میں ہوئی اسطے پایا کہ تھیر دیکھا جائے چنانچہ ہم تینوں تماشا گاہ پہنچے۔ جگہ کچھ ایسی ملی تھی کہ جہاں سوا مونگ پھلی کھانے کے اور کوئی موقع ہی نہ تھا، نیاز صاحب نے ارٹ کی کچھ فضا بھی پیدا کرنی چاہی لیکن فوراً پردہ اٹھنے کا اعلان ہوا، اور بادشاہ صاحب گاتے ہوئے نظر آئے ہاتھ میں البرک کا ایک رنگین گلاس پاؤں میں روپ سول کا میلا سا جوتا ابھی ہم سب سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بادشاہ صاحب نے ایک لمبے، بلند اور بھرپور سر کے عین وسط میں اس زور سے گلا صاف کیا کہ ہم تینوں دہل گئے اور قریب تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کی زبان سے کوئی اضطرابی فقرہ برآمد ہوتا کہ مردود نے سہیلیوں کے ساتھ چٹکی بجانے شروع کر دی بعد ہم تینوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے!

یہ وہ زمانہ تھا جب نگار جموں پال سے نکلتا تھا اور نیاز صاحب کے ذہن و دماغ میں نگارستان کی کارفرمائی تھی خوب خوب چیزیں نکل رہی تھیں اور مجھے بڑی مسرت تھی کہ اُن دو میں ایک خوشگوار اسلوب کی طرح پڑ رہی تھی۔ یلدرم نے جس چیز کو حسین اور دلکش بنا دیا تھا، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ بعض بعض چیزیں دماغ کے رنگ سے گزر کر داغ کے ”دھبوں“ سے ضرور جا ملی تھیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی فضا میں رنگ یا آہنگ کا کہیں اختلال نہ تھا۔ اسی دوران میں آگرہ سے تھا د نکلا اور مجھے محسوس ہوا کہ تیرکمان سے نکل چکا ہے اور وہ دن دھن نہیں جب ادب لطیف ادبی اوباشی کا مبرا دن بن جائے گا، ایسا ہی ہوا۔ شایات اور ٹیگوریت نے اُدھ کی فضا ایسی مسموم اور متعفن کر دی کہ مجھے رہ رہ کر اُردو کا وہ زمانہ یاد آنے لگا جس کو متعین کرنا آسان ہے لیکن جس کے اظہار میں سراسر نیاں ہیں۔ نیاز صاحب کی ہمت ہو تو فٹ نوٹ میں میری ذمہ داری پر اس کا اظہار کر سکتے ہیں!

ادب لطیف جس کے امام یلدرم اور نیاز صاحب تھے بازاری لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہوا جو یقیناً کم مایہ ناخوشگوار

اور نامعقول تھے اور جلد سے جلد کسی قیمت پر سستی سے سستی شہرت حاصل کرنے کے بھوکے نتیجہ یہ ہوا کہ انتہائی رسالے لکھنے لگے اور ان میں خرافات کو وہ فروغ دیا گیا کہ شہریوں پر دُنیا تنگ ہو گئی۔

یہ درم اپنی جگہ پر قائم رہے ان کو اپنی شاعرانہ پرواز کے لئے ترکی ادب کی وسیع اور صلح فضا پہلے سے میسر تھی، نیاز رقاصہ کی بزم تک پہنچ چکے تھے کہ ناگزیر کمین

”عالم آشوب لگا ہے سر راہم بگرفت“

نیاز صاحب لکھنؤ پہنچے اور لکھنؤ والوں سے ٹکری ہوئی۔ ایک طرف نیاز صاحب تھے دوسری طرف لکھنؤ کا تمدن وہاں کی معاشرت، وہاں کے لوگ، وہاں کی روایات، اور وہاں کی شعر و شاعری۔ یہ حالات و حوادث بجائے خود کیا کم تھے اور نیاز صاحب میں کیا کچھ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے تھے کہ مولانا مآجد صاحب نے اسلام کو خطرہ میں پا کر مسلمانوں کو صاف جہاد میں آجانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ مولانا مآجد صاحب قہقیاب رہے، نیاز صاحب کو زک ہوئی اور اسلام جہاں کا تھاں رہا!

ان واقعات سے نیاز صاحب کا ذہن و دماغ غیر شعوری طور پر متاثر ہوا۔ اب ان کی تحریروں میں وہ تشنگی، رنجینی اور ”جذبہ اشتیاق“ نہیں پایا جاتا جو نگارستان کی جان ہے۔ اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور سوسائٹی سے بیزار ہیں۔ ان کی تحریروں میں بیزاری، زہرناکی اور انتقام کی لہریں ملتی ہیں اور یہ حقیقت حال بجائے خود اس درجہ روح فرسا ہے کہ اس سے پناہ لینے کی خاطر اُن کو شراب و شادی جیسی سستی اور گریز پالذتوں میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ پناہ لینے کے معنی یہاں کام و دہن کی لذت یا بی نہیں بلکہ وہ ذہن کی زہرناکی کو کبھی شاد و شراب کی حکایت لطیف سے تسکین دینا چاہتے ہیں اور کبھی زندگی کے بعض نازک، عمیق یا پیچیدہ مسائل سے تنگ و تڑپ ہو کر نظام حیات و معاشرت کو کیسے اس مشتبہ اخلاقیات کے درط میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں جس کو عرف عام میں لاندہی، التذاذیت یا اشتراکیت وغیرہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ذہنی میلان موجودہ دنیا کا سب سے بڑا اکتشاف یا سرمایہ ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مذہب اخلاق یا سوسائٹی کے دیرینہ تصور سے کیسے بغاوت کر دیا جائے اور ہر کس (و ناکس) سوچنے ہی پر آزاد ہو بلکہ اپنی سوچا ہوئی چیز کو قطعاً صحیح یا حق بجانب سمجھنے اور آزادی سے برتنے میں بھی آزاد ہو۔ ہر شخص کو ہمیشہ سوچنے اور سمجھنے کی آزادی رہی ہے یہ نعمت کچھ آج ہی کی دریافت کی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ جو چیز آج کی ہے وہ یہ کہ ہر شخص جو کچھ سوچتا ہے وہ صحیح اور صالح بھی ہے اور دوسری چیزیں صحیح اور صالح اس لئے نہیں ہیں کہ وہ دوسرے کی سوچا اور برتی ہوئی ہیں!

اصل یہ ہے کہ مادی ذرائع اور وسائل کی ترقی سے آجکل زندگی اس درجہ تیز و تند ہو گئی ہے کہ ہم اس کا مداوا صرف مفرحات یا محرکات سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں بلکہ کبھی کبھار قاعدہ علاج کی فرصت ہی باقی نہ رہی۔ اب

زندگی عزیز نہیں رہی بلکہ زندگی کے لڑائو عزیز رہ گئے ہیں۔ استحقاقات کا احترام نہیں ڈگریاں مقصود بالذات ہو گئیں! نیاز صاحب میری اس فرسودہ منشی پر کیا کچھ ہیں مجھ سے نہ ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کجا مطربی و سحر کی اور کجا یہ قل اعوذت لیکن کیا کیا جائے جب معلم و مصلح مطربی و سحر کی اختیار کر لے تو بیچارہ مطرب و سفرہ کیا کرے۔

نیاز صاحب سے میں یہ کہوں گا کہ بوڑھوں کو درگور سمجھئے لیکن مذم حیات میں نوجوانوں کو صرف صفت آرا اور سینہ سپر ہونے کی دعوت دیجئے۔ نوجوانوں کے سامنے بڑی بڑی گھٹیاں ہیں جو ہمارے آپ کے آباد اجداد کے سامنے بھی غالباً نہیں آئی تھیں۔ ان کو غیر ذمہ دارانہ فقرے یا شعر، شراب و شباب کی سرستیوں کی طرف اشارہ کر کے اپنی ذمہ داری نہ بھولئے اور نہ ان نوجوانوں کو بوالہوسی یا سہل انگاری پر آمادہ ہونے دیجئے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی مسئلہ یا معاملہ پر خود متیقن نہیں ہو۔ تو اس کا صحیح محل سمجھنے سے معذور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں طالب یا تثنہ کو غیر ذمہ دارانہ بشارتوں یا غفلت نہ اطرب انگیزیوں کی طرف متوجہ یا مائل کر دینا قطعاً غیر صالح فعل ہوتا ہے۔ اسی کو ”عطایت“ کہتے ہیں۔ نوجوانوں کو امتحان سے عہدہ برآمد ہونے کی دعوت دینی چاہئے، نتايج کی مشکلات یا سکرات سے کیوں دھمکایا یا پرچایا جائے! نیاز صاحب امید ہے میرے ان خیالات سے آزرہ نہ ہوں گے۔ میں مجبور ہوں لیکن کیا کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جن سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں، مصیبت کا علاج سکرات سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی بھی قاضی عبدالغفار صاحب (صاحب نقش فرنگ) کی دو تصانیف نظر سے گزریں۔ لیلی کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری نقش فرنگ کے مطالعہ کے بعد میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ادب طرازی دونوں کا معترف ہو گیا تھا۔ لیلی کے خطوط دیکھ کر ادب طرازی کا اب بھی قائل ہوں، لیکن مجنوں کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے اختیار آؤ نکلی کہ

از قبیلہ مجنوں کے ناند !

قاضی صاحب نے بھی نوجوانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہے جس کی ان کی سیرت و شخصیت سے توقع تھی۔

ہاں اہل طلب کون سے طعنہ نیاافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو کوئی ذمہ دارانہ طریق کار نہیں ہے۔ نوجوانوں کو ”جوانی دیوانی“ کا سبق پڑھانا سہل فرور ہے لیکن قطعاً ”نافرجام“

ہے۔ یہی چیز عبرت خیز اور مضحکہ انگیز بھی ہو جاتی ہے جب یہ سبق ہم بوڑھے پڑھانے لگتے ہیں

میرا ذاتی خیال ہے کہ ہماری اس حرکت پر نوجوان لعنت تو خیر نہیں بھیجیں گے، کیونکہ نوجوان نہ باپوس ہوتا ہو اور نہ مریض، لیکن وہ ہنسنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔

مکتوبات نیاز میں ہر نوع کے خطوط ملتے ہیں جن میں نیاز صاحب نے اپنے مخصوص طرز انشا میں زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً عشق و عاشقی، رندی و ہوساکی، شعر، شاعری یا افسانہ، مذہب، اشعار، اشعار

ضامین، ماتم پرسی، بیوی اور شوہر کے مناقشات، شادی سے اجتناب، بچوں کے ہوتے ہوئے باپ کو دوسری شادی کر کے کی ترغیب، سانحہ کی اطلاع، مشرقی علم و ادب، غرض ایک پڑھے لکھے خوش مزاج انسان کو بالعموم جو امور زندگی میں پیش آتے ہیں، ان سب پر تنقید کی گئی ہے۔

ان خطوط میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نیاز صاحب نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے خطوط لکھے ہیں وہ نیاز صاحب ہی کے برابر لکھے پڑھے یا صاحب ذوق ہیں۔ دوسرے یہ کہ نیاز صاحب نے مکتوب الیہ کے انتخاب میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس زمرہ میں وہ لوگ نہ آئے ہائیں جن کو نیاز صاحب سے سب سے قریب ہونا چاہئے تھا، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹی، بیٹا، بیوی، ملازمین یا سلیمن تعجب ہے کہ ان کا سابقہ دوسروں کے رشتہ داروں سے ایسا پڑا کہ وہ اپنے رشتہ و ہروں کو فراموش کر گئے! بعض خطوط میں یہ دریافت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے اور نیاز صاحب سے ان کے تعلقات کیسے ہیں خطوط کا لب و لہجہ یا اسلوب نگارش بالعموم عاشقانہ، شاعرانہ یا زندانہ ہے، طعن و طنز کا عنصر بھی کچھ کم نہیں ہے، لیکن ان سب پر فوق، وہ پندار تفوق ہے جس کو نیاز صاحب کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔

نیاز صاحب کے موجودہ اسلوب انشا کی مثال ایک طور پر انگریزی کے مشہور طنزی شاعر جو ناٹھن سوئفٹ کے ہاں ملتی ہے۔ سوئفٹ بھی دنیا اور انسانوں سے بیزار تھا، نظام حیات میں اس کو بھی کہیں شگفتگی نظر نہیں آتی تھی، تلخی اور ذہن بازی اس کے رگ کے دلے میں سرایت کئے ہوئے تھے، تاہم اس نے اپنی محبوبہ اسٹیلا کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سادگی الفاظ اور سادگی خیال کے بہترین نمونے خیال کئے جاتے ہیں۔ اسٹیلا ایک غریب خاندان کی بہت کم پڑھی لکھی لڑکی تھی سوئفٹ نے اس کو وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں (جنرل ٹوا اسٹیلا) ان میں اپنے جذبات، شیفتگی کو سہل سے سہل الفاظ اور چھوٹے سے چھوٹے فقروں میں ادا کئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی 'سخت و سنگین' یا زہریلا بھی ہو کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی نرم و نازک جذبات کا اسیر نظر آئے گا اور پرائیوٹ لایف یا پرائیوٹ خطوط اسکے بہترین ترجمان ہیں۔ اس بنا پر نیاز صاحب کے خطوط یا تو پرائیوٹ نہیں ہیں یا نرم و نازک جذبات کی ان پر کار فرمائی نہیں ہے یا پھر جو مال اچھا تھا، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے۔

اب میں بعض خطوط کا سرسری جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف ایسے خطوط کا انتخاب کیا ہے جن سے صاحب کتوبات کے طبعی میلان یا مخصوص طرز انشا پر روشنی پڑتی ہے مثلاً:-

مکتوب نمبر ۵۳ یہ خط نواب صاحب کو لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب عازم حج ہیں۔ برسبیل تذکرہ انھوں نے فرمایا کیا نیاز کا ساتھ ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس پر نیاز صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جسکے جستہ جستہ اقتباسات حسبِ قیاس

لے آئیر کی ذمہ داری پر نیاز صاحب پورا سفر نقل فرما سکتے ہیں!!

(۱) آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا "نظارہ زنجبیدینِ مرگاں گلہ دارد"

(۲) آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح و حائل ہوگی اور یہاں جام دینا۔

(۳) ممکن ہے کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکلے اور آپ تسبیح یا استغفر اللہ سے رجوع کریں۔
(۴) میرے لئے آپ جا رہیا کی کوئی حسین کینز لیتے آئیے گا اور یہ نہ ممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی لیکن خاکِ شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علیحدہ ہی رکھئے گا، ورنہ ممکن ہے خواب ہو جائے۔

اس خط کے مطالعو سے بڑا تپ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نیا صاحب نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہی اس لئے کہ اس کو ہدفِ ملامت بنائیں۔ اول تو نیا صاحب کے خیالات معلوم ہوتے ہوئے نواب صاحب کی یہ خواہش کہ نیا صاحب حج میں ساتھ چلیں، کچھ بے کی سی معلوم ہوتی ہے، بالفرض نواب صاحب نے ازراہ لطف و محبت یہ خواہش ظاہر بھی کی تو نیا صاحب زیادہ سے زیادہ ان کو معذور قرار دے سکتے تھے نہ یہ کہ بعض ایسے خیالات کا اظہار کرتے جن سے ان کے دوست یا مخدوم کی دشمنی تسبیح تھی پھر یہ بھی ہے کہ اب تک حج وغیرہ کے سلسلہ میں شعرا یا زندوں نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں زہرِ ریائی، تنگ نظری، استعارۃً شراب وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے لیکن ایک پراسٹیوٹ خط میں کسی شخص نے آج کل کسی عازم حج سے جا رہیا کی کینز کی فرمائش نہیں کی۔ علاوہ بریں اگر لطفِ داستان کے سلسلہ میں ان خیالات کا اظہار ناگزیر تھا تو بھی اس خط کے مکتوب الیہ نواب صاحب براہِ راست نہیں ہو سکتے تھے اس کے جواز کی صورت صرف یہ ہو سکتی تھی کہ نیا صاحب کسی دوسرے دوست کو خط لکھتے اور ضمناً نواب صاحب کے حج اور جا رہیا کی کینز کا تذکرہ کر دیتے۔

مکتوب نمبر ۷۷۔ یہ خط ایک حادثہ کا مظہر ہے۔ مجھے ایک مکرّم نے بتایا کہ غالباً نیا صاحب نے یہ خط اپنے جگر گوشہ کی دفتار پر لکھا ہے لیکن کسی کو اس دردناک حادثہ کی خبر نہ ہو تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خط کس سے متعلق ہے اور نیا صاحب کے اُس سے کیسے تعلقات ہیں۔ الفاظ میں جوش و خروش، زور و استواری سب کچھ ہے، نفرت اور ترکِ بیں باہر گر حُصیت اور پیوست ہیں۔ انشاء و عبارت ادیبانہ ہے لیکن یہ چیزیں اس قدر نمایاں ہیں کہ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی خیرینِ قصورِ اَلانہ ہیں مکتوب نمبر ۹۰۔ یہ خط نیا صاحب ہی کے پیش کردہ ایک شعر کی تفسیر ہے،

بیا کہ رونق یک کارخانہ کم نہ شود

ز زہرِ ہم چو تویی یا ز فسقِ ہم چو منی

اور نیا صاحب کے عین اُس رنگ میں جس کے خلات میں نے انھیں اوراق میں احتجاج کیا ہو۔ اسلئے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے مکتوب نمبر ۶۵۔ سب سے نرالا اور سب سے دلچسپ خط نہیں ایک مختصر افسانہ ہے۔ دلنشین ظرافت کا نہایت سنجیدہ رنگین اور شگفتہ نمونہ۔ نیا صاحب اس خط پر غور کر سکتے ہیں۔ مجھے رشک ہے کہ یہ چیز مجھے کیوں نہ سوجھی۔ نیا صاحب میں درخواست کروں گا کہ اس قسم کا کوئی اور واقعہ کبھی پیش آئے تو مجھے ضرور "یاد و شاد فرماتے رہیں گے"

مکتوب نمبر ۱۲۵۔ اس خط کی جان کرنا کا تبین کی شادی ہے۔ میں اس خط کو بھی نیاز صاحب کا کارنامہ سمجھتا ہوں
گو آخر میں تھوڑے سے بدخط ہو گئے ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، کرنا کا تبین معاف فرمائیں گے۔
مکتوب نمبر ۱۲۴۔ اس خط کا پہلا شعر ان تمام اشعار پر بھاری ہے جو نیاز صاحب نے مولانا ابوالکلام کی مانند اپنی مکتوبات
میں ہر طنز بکھیر رکھے ہیں۔ کیا کہنے ہیں۔

بے دیکھے کہہ دیا کہ چنے ہم نہ کھائیں گے
کچے کہاں ہیں یار، ابا لے ہوئے تو ہیں

مجھے خود اپنا بچپن یاد آگیا۔ میرے معلم اول ایک "نشئی جی" تھے۔ دوالی کے موقع پر (بہ مناسبت عیدی) ایک
"دوالی" کہہ کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ اپنے قبلہ کا ہی صاحب کو دینا، شعر تھا:-

دوالی آمدہ ایام اسے

چراغاں جل رہے ہیں زیر و بالا

اس خط میں نیاز صاحب نے اپنی طفولیت کا زمانہ یاد کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن عہد طفلی کی جن جن چیزوں کا
ذکر کیا ہے وہ اپنے ہم عمر ساتھی (یا بقول میرے نشئی جی کے، طفل سے) نہیں وابستہ کی باتیں۔ قصہ سننے کے بچے بڑے آرزو مند
ہوتے ہیں لیکن چاند میں بڑھیا کا چرخہ کا تنا یا دیو، پری، طلسمات، توہمات یا شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں بچے ایک دم سے
سے نہیں کہا کرتے بلکہ گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی ہیں۔ شام کو دریا کے کنارے لایعنی طور پر بیٹھے رہنا بھی بچوں کا
کوئی محبوب مشغلہ نہیں ہے، البتہ چوری چھپے امر و توڑ کر کھانا اور آنکھ مچولا کھیلنا طفلانہ مشغلوں میں آتا ہے جس کا تذکرہ نیاز
صاحب نے کیا ہے۔ لیکن یہ باتیں بچوں کے ساتھ اس درجہ مخصوص کر دی گئی ہیں کہ ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی۔ یہ بچہ
مولانا اشفاق خیر کی ناولوں کا پلاٹ ہے یعنی وہی سید، سوکن، یتیم، نمونیہ، دق اور رات کے وقت جب کڑا کے کی سردی
پڑتی ہو صحن میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا وغیرہ شہر شخص کا بچپن اور بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ لطایف و ظرائف مختلف
اور مخصوص ہوتے ہیں۔ پرائیوٹ خط میں ان کا تذکرہ یقیناً بہ لطف ہوتا۔

ناظرین - میں نے غلطی کی کہ یہ مضمون لکھ مارا، دوسری غلطی نیاز صاحب کریں گے اگر اسے شائع کر دیں گے
اور تیسری اور یقیناً سب سے بڑی غلطی آپ کریں گے اگر اسے شروع سے آخر تک پڑھ لائیں گے۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت
ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ مکتوبات نمبر ۱۸ - ۷۹ - ۱۰۱ - ۱۱۹ - اور ۱۲۴ کا مطالعہ کریں اور مجھے امد نیاز صاحب دونوں
کو بخش دیں۔
- آپ بخشہ خدا سے بخشندہ !

رشید احمد صدیقی

روسی نظام حکومت پر ایک تاریخی و اقتصادی تبصرہ

(۱)

مسٹر اسپنسر نے حال ہی میں بمبئی سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بنایا ہے کہ روس اور اس کی حکومت پر تاریخی تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ مضامین اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ مسٹر اسپنسر کا مقصد اس کتاب کی اشاعت سے جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے یہ نہیں ہے کہ روس کا نظام حکومت ہر ملک کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے کیونکہ ہر ملک کے حالات کا اقتضا مختلف ہوا کرتا ہے، بلکہ مدعا صرف تاریخی و اقتصادی مطالعہ سے سرمایہ داری اور محنت و عمل کی جنگ بہت قدیم ہے اور اسی لئے سرمایہ داری نے ہمیشہ اشتراکیت کو مطعون کیا ہے۔ ہر تائیس، کارخانوں کا تعطل، لامتناہی غصہ و انتشار، عام بیروزگاری، افلاس، فاقے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ سرمایہ داری نوع انسانی کے دکھ درد کا علاج نہیں کر سکی بلکہ اس میں اور اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دامن قدرت میں اس قدر دولت موجود ہے کہ دنیا کے ہر فرد کی ضرورت اُس سے پوری ہو سکتی ہے۔ مگر سرمایہ داری نے شبانہ روز محنت کرنے والے مزدور کی زندگی میں کسی ایک مسرت کا بھی اضافہ نہیں کیا اور قدرت کی تمام دروازے اس پر بند کر دیئے۔

سوشلزم کیا ہے | جی، ڈی، آج، کول (J. D. H. Cole) نے اپنی کتاب (The Principles of Socialism) میں اشتراکیت کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے چار باتوں کا ذکر کیا ہے

جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا:-

- (۱) انسان دوستی (Human fellowship)
- (۲) ایسا سماجی نظام جس میں امیر و غریب کی تفریق کا کوئی وجود نہ ہو۔
- (۳) پیداوار کے تمام ذرائع پر سب کو یکساں حق ملکیت و تصرف حاصل ہو۔
- (۴) ہر انسان اپنی الہیت کے مطابق مشترکہ خیر و بہبود کے لئے کام کرنے پر مجبور ہو۔

سوشلسٹ کہتے ہیں کہ تمام دولت مزدور کی پیدا کی ہوئی ہے۔ تبادلہ اشیاء سے کوئی قدر (Useless)

ظہور میں نہیں آتی۔ زمین کی صرف اسی وقت تک قدر ہے جب اُس کا رشتہ انسان کی تخلیقی قوتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر انسان کے لئے محنت کرنا ضروری ہے اور قدرت کے ذرائع بھی سیدھے ہیں۔ اگر شخصی حیثیت کا فائدہ کر دیا جا

اور (*State Socialism*) کا سد باب ہو جائے تو انسان کی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں یعنی اگر انسانی مفاد کے پیش نظر پیداوار، اُس کی تقسیم اور مبادلہ کو اشتراکی اصول کے مطابق چلایا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس طرح کا اجتماعی نظام افلاس کا خاتمہ کر دے گا اور بلا تفریق نسل و قوم اس سے تمام انسانوں کی تمدنی ترقی ظہور میں آئے گی۔

روس کا تجربہ | روس دنیا کا سب سے پہلا ملک ہے جہاں اس خیال کا عملی تجربہ کیا گیا۔ روس کی گزشتہ

تواٹھت الملوکی اور مصائب کی ہولناک تصویریں پیش کی گئیں۔ دنیا کی ہر سیاہ کاری اور بد نظمی اُس سے منسوب کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ دوران انقلاب میں نینن نے دہشت انگیزی سے کام لیا لیکن اُس کی وجہ یہ تھی کہ بالشو کوں کو صرف تشدد ہی کا ایک طریقہ معلوم تھا۔ چنانچہ جو بھی اشتراکیت کی مخالفت کرتا اُس کے لئے وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہوئے روس کے دستور کا اصل مقصد سوویٹ یونین کے بننے والوں

روس میں انسان کی مدنی حیثیت | کی اقتصادی زندگی کی تشکیل و تعمیر ہے تاکہ ملک کی دولت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو، مزدوروں کی معاشرت کا معیار بلند ہو اور یونین کی آزادی و دفاع کو تقویت پہنچے۔

بنیادی حقوق اور فرائض مدنیّت | (۱) شہریوں پر بہت فرائض عاید ہیں، لیکن ان فرائض سے کہیں زیادہ اُن کو حقوق حاصل ہیں۔ جو پابندیاں اُن پر عاید ہیں انہیں سب سے بڑا درجہ "کام" کو حاصل ہے۔ ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے۔ ریاست اُس کی اہلیت کے مطابق کام فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ جو کام نہ کرے گا وہ کھانا بھی نہ کھائے گا، کے اُصول کی دہاں سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔

(۲) سوویٹ حکومت نے آرام و سکون کی ضرورت کو پوری طور پر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہاں کے دستور میں ملک کے بننے والوں کے اس حق کی پوری حفاظت کی گئی ہے۔ عام طور سے کام سات گھنٹہ لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی ایسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں جان کا خطرہ ہو وہاں صحت چھ گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے۔ سال میں چھٹیاں بھی پوری تنخواہ کے ساتھ ملتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے مزدوروں کے لئے آرام خانوں (*Rest Houses*) صحت گاہیں، اور کلبوں وغیرہ کے پورے انتظامات ہیں اور ملک بھر میں اُن کا جال بچھا ہوا ہے۔

(۳) ملک کے بننے والوں کو بڑھاپے میں کفالت کی جاتی ہے۔ اسی طرح بیماری کی حالت میں یا کام کرنے کی اہلیت نہ رہنے کی صورت میں حکومت تمام ضروریات کی کفیل ہوتی ہے۔

(۴) تعلیمی مصارف کی ذمہ دار تمام تر حکومت ہے۔ یعنی روس کے بننے والوں کو تعلیم پر ایک جیسا حصہ ملتا ہے۔

(۵) سوویٹ دستور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں عورتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ سماجی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی غرض تمام مسائل میں عورت کا درجہ مردوں کے برابر ہے۔

(۶) بلحاظ نسل و قوم سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ نسلی یا قومی امتیاز یا تعصب تعزیری جرم ہے۔ ریاست کے تخیل سے قومیت کو بالکل جدا کر دیا گیا ہے اور سوویٹ حکومت کی کامیابی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ یہی چیز ہے جس نے آج بہت سی پامال اقوام کو ترقی دیکر اگلی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ روشن ترین مثال اس سلسلہ میں تاتاریوں کی ہے۔ انقلاب سے پہلے ان میں بمشکل ۵ فیصدی تعلیم پائی جاتی تھی لیکن آج کل اس میں یہ اوسط ۹۰ فیصدی ہو گیا۔ تاتار پبلک میں صرف تعلیم ہی مفت نہیں ہے بلکہ تمدنی اصلاح کے دروازے بھی وہاں کھول دیے گئے ہیں۔ عورتوں نے اپنے برقعہ اتار پھینکے ہیں اور ان کو مردوں کے ساتھ مساویہ حقوق حاصل ہیں۔ دارالسلطنت قازان (Cazan) میں متعدد شفا خانے طبی درسگاہیں اور تمام مدارس اور کالج پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں کثیر تعداد عورتوں کی ہے اور حکومت کے دارالاشاعت سے لاتعداد کتابیں اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔

(۷) سرمایہ کو بلحاظ نسل و جنس دوٹو دینے کا حق ہے۔ ہر شخص کو تقریر، تحریر، اجتماع و مظاہرہ کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن ایک مختصر جماعت ایسی بھی ہے جو نہ دوٹو دینے کی مجاز ہے اور نہ ان حقوق سے متمتع ہو سکتی ہے جو یونین کے شہریوں کو حاصل ہیں اور یہ جماعت مذہبی پیشواؤں، تاجروں، کارخانہ داروں اور قدیم زار کے حامیوں کی ہے جو اشتراکیت کی کھلی ہوئی مخالفت کرتے ہیں۔

ذاتی کاموں کے لئے مزدوروں کو لگانا تعزیری جرم ہے۔ ایک امریکی سیاح نے دوران گفتگو میں اپنی رہبر بولی سے کہا کہ امریکہ میں بہت سے کارخانے ایسے پائے جاتے ہیں جہاں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ یہ سن کر بولی کے استعجاب کی انتہا نہ رہی اور بولی کہ ”یہاں تو اس جرم میں دس سال کی سزا ہو جاتی ہے“

(۸) ملک کے تمام بٹنے والوں کو آزادی ضمیر حاصل ہے۔ ریاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اسی طرح سے تعلیم کو بھی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر آدمی کو اپنے خیال کے مطابق عبادت کا پورا پورا اختیار ہے۔ لیکن بالکل اسی طرح ہر شخص کو مذہب کے خلاف بھی پروا گندہ کا یہی حق ہے۔

یونین کا دستور (The Union of Soviet Republics) کا خلاصہ (کے) لیا رہ مختلف سوویٹ جمہوریتوں

کی ایک دفاق ہے۔ ہر جمہوریت خود اپنا دستور مرتب کرتی ہے جو یونین کے بنیادی تخیل کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر یونین کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے مرکزی دفاق سے علیحدگی اختیار کر لے۔ یو، اس، اس آر سے متعلق قانون سازی کے جملہ اختیارات سوویٹ اعلیٰ (Supreme Soviet) کو حاصل ہیں جو دو ایوانوں پر

مشتمل ہے۔ پہلا ایوان سوویت ات دی یونین (Soviet of the Union) ہے اور دوسرا سوویت ات دی نیشنلٹیز (Soviet of the nationalities) ہے پہلے ایوان کا انتخاب اس اصول کے ماتحت عمل میں آتا ہے کہ ہر علاقہ سے تین لاکھ کی آبادی پر ایک ڈپٹی (ممبر) لیا جائے دوسرے ایوان کا انتخاب یو، ایس، ایس آر کی تمام یونینیں (Unions) اور جمہوریتیں کرتی ہیں۔ دونوں ایوانوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور یہ انتخاب چار سال کے لئے عمل میں آتا ہے۔

پنچايتی طریقہ | ہندوستان کی طرح روس بھی ایک زراعتی ملک ہے۔ پورا ملک ستر لاکھ قریوں پر مشتمل ہے اور برقیہ کی ایک پنچایت (مجلس) ہے۔ یہی پنچایتیں حکومت کا اہم ترین جزو ہیں جن کا دائرہ عمل صرف گاؤں ہی کی خیر و بہبود تک محدود نہیں بلکہ سوویت اعلیٰ (Supreme Soviet) کے انتخابات بھی اسی کے سپرد ہوتے ہیں۔ ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے۔ ووٹ دینے کے وقت لوگوں کو کسی خاص گاؤں کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے طلب نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو کسی مخصوص کارخانے یا مخصوص فارم (Farm) پر کام کرنے والے کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام جمہوریتوں میں نائیندی جغرافی حدود سے وابستہ ہوتی ہے لیکن یہاں امداد باہمی کی انجمنیں (Trade Unions) اور دوسرے سماجی ادارے حلقوں کا کام دیتے ہیں۔

عسکری خدمات | یورپ کے تمام ممالک کی طرح روس میں بھی جبرہ فوجی بھرتی ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بین فرق ہے۔ سرخ فوج (Red Army) میں صرف مزدوروں اور کسانوں کے لڑکے شرکت کا اعزاز حاصل کرتے ہیں۔ ملک میں عسکری خدمت کو بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ یو، ایس، ایس آر کا عسکری نظام صرف دفاع کی غرض سے قائم ہے۔ وہاں کے عسکری کیمپ کو دراصل اس وجہ سے اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ صرف عسکری تعلیم ہی کا مرکز نہیں ہوتے بلکہ مدنیت و تمدن کا بھی وہاں سبق دیا جاتا ہے، اور اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ عسکری اداروں سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ اپنے فرائض مدنیت بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔ یورپ میں عموماً اور جرمنی میں خصوصاً فوج میں کام کرنے والوں کی حیثیت قوم کے دوسرے افراد سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ روس میں حالات بالکل برعکس ہیں۔ سرخ فوج کے ممبر انتخابات میں بھی شہری ہونے کی حیثیت سے حصہ لیتے ہیں۔ عسکری قواعد کے وقت تو حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد افسروں اور ادنیٰ سپاہیوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

آگپو (مجلس) | یونین میں خفیہ پولیس کو آگپو (کوتے ہیں)۔ یہ حکومت کا تیداہم محکمہ ہے۔ یونین کے دستور کا اصل مقصد مظالم اور لوٹ کھسوٹ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینا ہے۔ وہ لوگ جو اشتراکیت کی

مخالفت کرتے ہیں اُن کو ریاست کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ نفع کمانے کے لئے مزدوروں کو لگانا یا اس خیال سے خرید و فروخت کرنا سخت جرم ہے۔ کسی ایسے نظام کی تعریف یا پروا لگنا اگر ناجوا اشتراکیت کے منافی ہو غدار ہی کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ متذکرہ بالا معاملات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں ایگور (Ogor) خاص خدمات انجام دیتی ہے یہ محکمہ انقلاب کے بالکل ابتدائی دور میں "انقلاب کو برقرار رکھنے" یعنی رد انقلاب کو روکنے کے لئے ظہور میں آیا تھا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ رد انقلاب کی تمام سرگرمیوں کو ختم کیا۔ گمراہ اس کی حیثیت بالکل بدل چکی ہے۔ روس میں جرایم کا ارتکاب تقریباً مفقود ہے۔ جیل خانوں کو اصلاحی اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں قیدیوں کو سزا نہیں بلکہ تعلیم دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کے بعد ہر قیدی ایک باعزت شہری بن جاتا ہے۔ ملک میں اس سربے سے لیکر اُس سربے تک اداروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ٹریڈ یونین

مختلف ادارے

صنعت گاہوں کے مزدور متحد ہو کر اشتراکیت کی توسیع کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسرا نمبر اُن اداروں کا ہے جن کی بنیاد (مختلف صوبہ) کہتے ہیں۔ یہ دیہات اور قصبات میں کام کرنے والے مزدوروں کی انجمن ہوتی ہے۔ سربے نمبر میں امداد باہمی کی انجمنیں ہیں اور چوتھا نمبر کمیونسٹ پارٹی (Communist Party) کا ہے اس کا مقصد مختلف اداروں میں کام کرنے والے مزدوروں کو متحد کرنا اور اُن کی سرگرمیوں کو صحیح راستہ پر لگانا ہے تاکہ وہ اپنے اصلی مقصد یعنی طبقہٴ عمال (Proletariat) کی گلو خلاسی کی منزل کی سمت قیدی کے ساتھ بڑھ سکیں۔

(۱) ٹریڈ یونین | سوویٹ یونین کے دستور کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں ٹریڈ یونین (Trade Union) بیکر محمد و معاون ہوتی ہے۔ لاتعداد مزدور اُس کے ممبر ہیں، چنانچہ سوویٹ حکومت میں ٹریڈ یونین (Trade Union) کے ممبروں کی تعداد تمام دنیا کی ٹریڈ یونینوں (Trade Union) کے ممبروں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔

سرمایہ دار ملکوں میں ٹریڈ یونین سرمایہ داروں کی حریف مقابل کی حیثیت سے کام کرتی ہے کیونکہ وہاں سرمایہ دار اور مزدور کے مفاد ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے وہاں کی ٹریڈ یونین کے پیش نظر یہ رہتا ہے کہ محنت کے متعینہ اوقات میں کمی کرائی جائے، مزدوری میں اضافہ جانا جائے اور مزدوروں کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے صنعت متعلقہ کی خیر و بہبود سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ روس کی ٹریڈ یونین کے فرایض اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کو ریاست کے کسی ادارے سے کوئی مخالفت نہیں ہوتی بلکہ اُن کا اصل کام ریاستی اداروں کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ چنانچہ پیداوار بڑھانے کے ذرائع اور تدابیر سوچنے کے لئے ٹریڈ یونین ریاستی اداروں کے ساتھ

پورا تعاون کرتی ہیں۔ یہی ٹریڈ یونین اس کا بھی فیصلہ کرتی ہیں کہ ریاست کے انتظامات، دفاع اور دیگر اخراجات کے لئے مزدور اپنی آمدنی سے کس قدر رقم بطور ٹیکس کے ادا کریں۔ مزدور جمع ہو کر خود اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ کارخانوں کی آمدنی اور ان کا خرچ اور ریاست کے اخراجات سب پر غور کرنے کے بعد مزدور اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی آمدنی کا اس قدر حصہ بطور ٹیکس کے ادا کریں گے۔ اس طرح سے ٹیکس کی رقم جبریہ نہیں ہوتی بلکہ بہ طیب خاطر وہ اس کو ادا کرتے ہیں۔

مزدوروں کی زندگی میں کارخانوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں سے مزدوروں کو کمزور کھانا ہی نہیں ملتا بلکہ رہنے کی جگہ اور ان کے خاندان کی پوری ضروریات بھی وہیں سے پوری کی جاتی ہیں۔ ایک طرف اگر مزدور سے پوری محنت لی جاتی ہے تو دوسری طرف ان کے آرام کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ٹریڈ یونین کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں جس قدر آزادیاں حاصل ہیں ان کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مزدور کے کام اور اس کی زندگی سے متعلق جتنی چیزیں ہیں ان کا تمام تر انتظام ٹریڈ یونین کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں کی پرورش گاہیں، زچہ خانے، بچوں کے تعلیمی ادارے، تفریح گاہیں، پارک، کتب خانے، اسکول، کالج، وندش خانہ کھیل کود، غرض کوئی چیز مزدور کی ایسی نہیں جس کا انتظام ٹریڈ یونین نہ کرتی ہو۔

(۲) ریاستی فارم | روس ایک زرعی ملک ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو جس طرح حکومت کے معاملات میں نمایندگی حاصل ہے بالکل اُسی طرح کاشتکاروں کو بھی حاصل ہے خواہ سرکاری

فارم (State Farms) میں کام کرتے ہوں یا "امداد باہمی" کے فارموں میں کام کرتے ہوں حکومت میں ان کو بھی پوری پوری نمایندگی حاصل ہے۔ انقلاب سے پہلے وہاں کا کسان جسکو "موجبک" (Muzhik) کہتے تھے اُس کی حالت بہت ابتر تھی۔ زمیندار اور حکومت کے مطالبات ادا کرنے کے بعد اُس کے پاس بمشکل اتنا بچتا تھا کہ وہ اپنا پیٹ پال سکے اور تن ڈھانک لے۔ لیکن اب وہاں کی دنیا بدل چکی ہے۔ لکڑی کے فرسودہ ہلوں کی جگہ اب وہاں بڑے بڑے ٹریکٹر (Tractors) استعمال کئے جاتے ہیں۔ آج روس نے دنیا کے سامنے کامیاب ترین سائنٹفک زراعت کی جو مثال پیش کی ہے وہ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہیں نظر آتی۔

مختلف اجتماعی فارم | سوویت روس میں مختلف اندازہ کے اجتماعی فارم (Collective farms) پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کاشتکار اجتماعی

طور پر صرف فصل کاٹتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کاشتکار الگ الگ مکانوں میں رہتے ہیں لیکن فارم کی ضروریات کی تمام چیزیں اجتماعی ہوتی ہیں۔ اور تیسری صورت جو بہت کامیاب ہے، یہ ہے کہ وہ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی طرح کا لباس بھی استعمال کرتے ہیں۔ غرض پورے

فارم کی آبادی میں ایک کل جم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس منزل پر پہنچنے کے بعد پورا فارم ایک خاندان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اجتماعی فارم میں کسان کی آمدنی تقریباً ۲۴ روپل ماہوار ہوتی ہے۔ نورویل ماہوار رہنے اور کھانے کے اخراجات کے لئے دینے پڑتے ہیں اور پندرہ روپل دوسرے مصارف کے لئے بچتے ہیں۔ شہر کا مزدور تقریباً ۸۰ روپل پیدا کرتا ہے مگر اس کو ۶۵ روپل کے قریب اپنے اخراجات کے لئے ادا کرنے پڑتے ہیں اور اس طرح سے اس کے پاس ۱۵ روپل ماہوار دوسرے اخراجات کے لئے بچتے ہیں۔

کیون سوویت حکومت کی اجتماعی زندگی کا مکمل ترین نمونہ کمیون (Commonwealth) میں نظر آتا ہے۔ پورے روس میں تقریباً دو ہزار کمیون ہیں۔ ہر کمیون میں آلات کاشتکاری مشترک ہوتے ہیں۔ کل ضروریات کے انتظامات بھی اجتماعی طور پر کئے جاتے ہیں۔ اس طریق کار کی کامیابی کا بین ثبوت شمالی قاف کی آبادی ہے جو فلینڈ کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ روسی کاشتکاروں کی خوشحالی دیکھ کر یہ لوگ فلینڈ سے بھاگ کر روس آئے۔ لینن نے ان کا پر خلوص استقبال کیا اور ریاست نے ان کو ۲۱ ہزار ایکڑ زمین دی۔ آج ان لوگوں کی حالت تمام دنیا کے لئے قابل رشک ہے۔

(باقی)

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ عظیمہ عظیمہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نور روپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان گل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی عین ادا کریں گے۔
منیجر نگار لکھنؤ

مشین کا اثر ہماری معاشرت پر

یورپ اور امریکہ میں جو معاشی دور آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے، دنیائی قوت کے استعمال سے شروع ہوا، اور جو ”ترقی“، ”خوش حالی“ اور ”آزادی“ کا دور کہلاتا ہے اس کے خلاف ہرزمانے میں احتجاج ہوتا رہا ہے، چنانچہ حال ہی میں پروفیسر ورنر زمبرگ نے بھی ”جدید فلسفہ اجتماعیات“ میں اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں یورپ اور امریکہ میں جو کچھ ہوا ہے اسے کچھ دہی شخص سمجھ سکتا ہے جو شیطان اور اس کی ترغیبات پر یقین رکھتا ہو، کیونکہ جو کچھ پیش آیا ہے اسے صرف شیطان ہی کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔

اس نے خود پسند انسان کو باور کرا دیا کہ ہر شخص اپنی عقل کے زور سے ساری بنی نوع آدم کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے اور اس نے انسانوں کے تمام ادنیٰ جذبات حرص و آز کو خوب ابھارا اور ایک نئے معاشی نظام یعنی سرمایہ داری کی بنیاد رکھ دی۔ اس نے انسان کو صنعت کے نئے نئے گر سکھائے، پہاڑ اس کے سامنے رائی ہو گئے اور زمین کی طنائیں اس کے ہاتھ میں دیدیں۔ وہ انسان کو ایک بلند پہاڑ پر لے گیا اور کہا کہ ”آؤ ہم تم مل کر ایک ایسا منارہ بنائیں جس کی چوٹی آسمان سے جلتے تاکہ ہمارا نام ہمیشہ باقی رہے۔“

آئیے اب یہ دیکھیں کہ انسان نے یہ منارہ کیونکر بنایا، اور اس تعمیر میں کیا کھویا؟

چنانچہ سب سے پہلے آبادی بڑھنی شروع ہوئی، اور صرف ایک انیسویں صدی میں یورپ میں ۲۰ کروڑ نفوس بڑھ گئے اور طرفہ ماجرایہ ہوا کہ انسان کی عمر بھی بڑھ گئی، یعنی جوشی میں عمر کا اوسط ۳۵ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال ہو گیا، فرانس میں ۴۰ سے ۵۵ سال ہو گیا اور انگلستان میں ۳۴ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال اور اس زمین پر انسان کی زندگی کے دن طویل ہو گئے، لیکن یہ کسی خدا کے بندے نے نہ سوچا کہ یہ دن کس طرح کٹیں گے، اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کرشمہ یہ ہوا کہ انسانوں کی زندگی نہ صرف بڑھ گئی، بلکہ بہتر بھی ہو گئی اور ہر ملک میں ریلوں کا جال بچھ گیا، سمندروں پر

جہاز چلنے لگے، گھر گھر ٹیلیفون کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ موٹروں کی افراط، مشینوں کی روز افزوں کثرت، لانا ہٹا خرید و فروخت، وہ جادو کی چھڑی جس نے یہ انقلاب پیدا کیا، مشین کا نظام تھا، جس کی وجہ سے بے حد شمار ”اسی طاقت“ انسان کی مٹھی میں آگئی۔ اس ”طاقت“ کے کرتے ہر طرف نظر آنے لگے۔ ۱۸۷۷ء میں دنیا نے ہکٹور ڈیوڈ کی فصل کاٹی تھی، ۲۰ سال بعد ۱۹۰۳ء میں یہ فصل ۳۰ اکڑ درٹن ہو گئی؛ قابل صرف چیزوں کی تعداد دن دوئی، رات چوگنی ہونے لگی، موٹر سائیکلیں، اشتہار بازی، بجلی کی روشنی، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، زہریلی گیسیں، نقلی گھی، مصنوعی تہہ، نقلی سونا، مصنوعی چمچا، مصنوعی تعلیم، یہ سب کچھ مہیا ہو گیا۔ لانا ہٹا خوشحالی! بے پایاں فراغت!!

اس جگہ ہمیں سیاسیات سے بحث نہیں، لیکن برہنہ کیلئے تذکرہ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ دولت آفرینی اور تجارت کی اس گرم بازاری نے متعدد سیاسی، معاشی نظام پیدا کر دیے۔ سارا صنعتی یورپ، اپنے گوروں باشندوں کے ساتھ ایک عظیم الشان شہر بن گیا، شہر والوں نے گاؤں والوں کو مہذب بنانے کا بیڑا اٹھایا، نوآبادیاں بنیں تجارت پھیلی، خوش حالوں نے بد حالوں کو قرضے دیے اور اتنے قرضے دیے کہ دنیا قرض خواہ اور قرضدار قوموں میں بٹ گئی، اور ”بین الاقوامی“ مالیاتی سرمایہ جس کی باگ ڈور گنتی کے چند بنکوں کے ہاتھ میں تھی، ہوا کے پروں اور بجلی کی لہروں پر اڑ کر مخلوق کی دستگیری کے لئے پہونچنے لگا۔ اور شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے والے، حریت کے علم برداروں نے ایک نئی شہنشاہیت قائم کی، جس کا نام ہے اصل شاہی!

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، یہ مضمون سیاسیات سے متعلق نہیں ہے، بلکہ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ”مشینی نظام“ کی ان کرشمہ آفرینیوں نے معاشرہ کا جو کس طرح بدلا، پرانی ہیئت اجتماعی میں کیا کاٹ چھانٹ کی، ذہنوں میں کیا انقلابات پیدا کئے، اور انسانیت کو ”ترقی“ کا یہ سودا گراں پڑایا ارزاں۔

پچھلی صدی میں، بغیر کسی سیاسی شور و شغب کے، صدیوں کا پرانا، آزمایا ہوا، معاشرتی ڈھچر زمین پر آ رہا اور جن گھروں میں انسان نے آرام و سکون کی زندگی بسر کی تھی، انھیں چھوڑ کر اب اُس نے میدانوں کا رخ کیا یا گاؤں کے کھلے ہوئے دروازوں نے اسے نکل لیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک یورپی انسان کی زندگی چند با فراغت حلقوں میں عورت کے ساتھ بسر ہوتی تھی ان میں سب سے زیادہ اہم حلقہ قصبہ تھا، اور دیہی محنت یا گھریلو اجتماعات مشین نے اپنی پوری ”اسی طاقت“ کے ساتھ ان بنیادوں پر ضرب لگائی، گھریلو صنعتوں کی بربادی نے وجہ معاش کو کم کر دیا۔ زراعت پیشہ طبقہ اپنا پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ شہروں میں پنچایتوں کی حمایت میں رہ کر دستکار ایک حد تک اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ پنچایتیں، زبردست سرمایہ دار نظامات کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں اور پیشہ ور دستکار بے یار و مددگار

رہ گئے۔ سیکڑوں کام جو اطمینان کے ساتھ گھر کی چار دیواریوں میں ہوتے تھے، جیسے سلائی، کشیدہ کاری، کفشی سازی اور پارچہ بانی اور جن میں گھر والیاں بھی برابر کی حصہ دار ہوتی تھیں اور سارا خاندان محنت مشقت کر کے زندگی بسر کرتا تھا، رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ گھر کے کرنے کے کام ”بازاروں“ میں ہونے لگے، اور گھر والیوں کے لئے صرف یہی صورت رہ گئی کہ یا تو وہ بھی بازار میں جا کر زندگی کی تنگ دود میں مصروف ہوں، یا گھروں میں بیکار رہیں۔ معاشرہ کی جو طبقہ بندی صدیوں سے چلی آ رہی تھی وہ متزلزل ہو گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آبادی کنبوں اور طبقوں کی بجائے افراد پر مشتمل ہو گئی، جو پرکاش کی طرح انقلاب کی آندھی میں ادھر ادھر منتشر ہو کر بڑے شہروں اور صنعتی علاقوں میں بغیر کسی ربط باہمی اور شیرازہ بندی کے ڈھیر ہو گئے۔ قصباتی آبادی کا اس طرح شہری بنایا جانا ہمارے زمانہ کی خاص خصوصیت ہے۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ لاتعداد مخلوق شہروں میں کیا کرتی ہے تو آپ کو چاہئے کہ بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی و اقتصادی مرکوزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ وہاں آپ کو یہ لوگ کام کرتے نظر آئیں گے اور اب ان کا نام ”پروتلار“ یا ”مزدور پیشہ طبقہ“ یا صرف ”مزدور“ ہے اور آج کل ہمارے اکثر معاشری مسائل میں ان سے بحث کی جاتی ہے۔

اگر آپ موجودہ حیات اجتماعی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس معاشی دور نے افراد کی اس ابتری میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کا معیار آج کل ایک اور صرف ایک ہو گیا ہے یعنی دولت، بشکل زر اور اب عزت، زریہ آمدنی سے ناپی جاتی ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی دولت سے عزت حاصل ہوتی تھی، لیکن ساتھ ہی کچھ اور صفات بھی شمار کے قابل سمجھی جاتی تھیں۔ اب حسن، قوت، نیکی، عقلمندی، ہنر، خاندانی شرافت ان سب کی ایک ہی کوٹی ہے، اور وہ یہ کہ کیا ان سے دولت ہاتھ آ سکتی ہے؟ اب ایک بالکمال شاعر، مصور، گٹر اش، اور طبیب کو اپنا کمال ثابت کرنے کے لئے انکم ٹیکس کا تختہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس دور میں دولت کی دوسری خصوصیت اس کا ”ماخذ“ ہے۔ پرانے زمانے میں ہر قسم کی دولت کا ماخذ سیاسی ہوتا تھا۔ قوت سے دولت حاصل ہوتی تھی اب دولت سے قوت حاصل ہوتی ہے اور دولت کا ماخذ معاشی ہو گیا ہے۔ اب معاشرہ کا طبقہ ”اعلیٰ طبقہ“ شرفاء محض معاشی قابلیت کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ اب معاشیات کے نمائندے، یعنی کاروباری طبقے، انتظام مملکت میں پیش پیش ہیں۔

جدید معاشرہ میں، کاروباری طبقہ کے مخالف اگر کچھ ہیں تو وہ صرف بڑے شہروں کے عوام الناس جن کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں لیکن ہر چیز کی ملکیت کے دعویدار ہیں اور وہ خود بھی اسی معاشی دور کی پیداوار ہیں۔ دولت کے اضافے اور ”تعلیم“ کی ترقی نے ان کو اب اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے ”جائز حقوق“ کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ سیاسیات میں ان کا دخل روز افزوں ہے۔ ان کی بلند آہنگیوں

نے ”پارلیمانی نظام“ پیدا کر دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب مملکت کی قوت مختلف معاشی اغراض کا گیندھن کا بن گئی ہے۔ اس معاشی دور میں جمہوریت کے معنی ”ملی بھگت“ کے ہیں۔

معاشرہ پر مشینی نظام کا اہم ترین اثر انسانوں کی ذہنی زندگی پر ہوا ہے۔ انسان فخر کے ساتھ اپنے کرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے، اسے ہر طرف تہذیب ذہنی کے لاتعداد آثار نظر آتے ہیں، کاغذ کی پیداوار پچھلی صدی میں ۱۷۰۰ گنا زیادہ ہو گئی ہے، روزانہ ہزاروں کتابیں شایع ہوتی ہیں جس طرح پانی بجلی اور گیس کی تقسیم کے نئے نئے طریقے پیدا کئے ہیں، اسی طرح سے اشاعت تہذیب کے ذرائع بھی بڑھ گئے ہیں۔ سرکاری مدارس، سرکاری کتب خانے سرکاری نمائشیں، سینما، تھیٹر، ریڈیو سب انسان کو تہذیب بنانے میں مصروف ہیں۔ کیا یہ سب ترقی کی علامتیں نہیں ہیں؟ کیا بنی نوع انسان اس ثقافتی ترقی پر اپنے آپ کو مبارکباد بھی نہ دے!

لیکن تحقیق کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس حیرت آفریں اور وسیع ذہنی ثقافت کی بنیاد ایک خاص قسم کی مادی تہذیب پر قائم ہے اور وہ بھی اس معنی میں ایک معاشی پیداوار ہے جس معنی میں تجارت، قدیم زمانہ میں بڑے بڑے علماء و فلاسفہ کو بھی اپنی بسر اوقات کے لئے کچھ نہ کچھ دھندلانا پڑتا تھا، اور اس طرح غلیظی ذہانت پر ایک طرح کی بندش عاید تھی، لیکن اب اضافہ دولت کی وجہ سے اشاعت تہذیب کی مقدار و رفتار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب دن رات کے ہر گھنٹہ میں ناشرین، طابعین، سینما اور تھیٹر کے مالک ذرائع تہذیب کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ لیکن کیا کتابوں کی بہت بڑی تعداد صرف اس لئے تیار نہیں کی جاتی کہ بڑے بڑے چھاپے خانے بیکار نہ رہیں؟

جس ثقافت کی بنیاد کاروباری ہو، اس پر موجودہ مشینی دور کا اثر انداز ہونا یقینی ہے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ثقافت میں فرد کی حیثیت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ثقافتی پیداوار کے بوجھ کے نیچے دب گیا ہے، اور یہ دولت پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں دونوں پر صادق آتا ہے۔ مثلاً علم کے پیدا کرنے والے (یعنی عالم) کی کمر آج کل علم کے بوجھ سے بھکی جا رہی ہے۔ اب وہ پناہ لینے کے لئے تنگ سے تنگ تر کرنے والے ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اپنے لئے خصوصی میدان تلاش کرتا ہے اس لئے کہ اب وہ کائناتی نقطہ نظر کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ غیر مصروف کامیون فن کی جو کثرت آج ہے وہ شاید ہی پہلے کبھی ہوئی ہو اور یہ سب ناقدری زمانہ کے شکی ہیں۔ سب کو اپنی اپنی جگہ جدت و ندرت کا دعویٰ ہے، لیکن دراصل وہ ایک دوسرے کے نقال ہیں۔

پھر ثقافتی پیداوار کی اس کثرت نے علم کے معیار کو پست کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد کی بہت بڑی تعداد اپنے اپنے الگ کوٹے میں کام کرے گی تو معیار ضرور پست ہو گا، لیکن دوسری طرف اوسط دماغوں کی خاطر سے بھی یہ معیار پست کر دیا گیا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب امریکہ میں ۴۰۰ پروڈیوسر عزائمات پر کتابیں لکھتے ہوں تو عزائمات سوائے مواد اور معلومات جمع کرنے کے اور کیا رہ جاتی ہے؟

مقدار و معیار کے علاوہ اس معاشی دور نے ذہنی ثقافت کے موضوعوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اب تہذیب کی شکلیں ہی دوسری ہیں، اور ان کے متعلق نقطہ نظر بھی بدل گیا ہے۔ فلسفہ کی ہمہ گیر حیثیت ختم کر دی گئی ہے اور اس کی جگہ علیحدہ علیحدہ علوم نے لے لی ہے۔ سائنس کی بھی صرف وہی قسم ترقی کے قابل سمجھی جاتی ہے جو علوم طبیعی کی مدد سے مادی ثقافت کے نشوونما میں مدد دے۔ اب انسان ”زمانہ حال“ کا اسیر ہے۔ اسے اتنی مہلت نہیں کہ نظم و ضبط کا نکتہ پر غور کرے۔ وہ اب صرف فطرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر تصرف کیونکر حاصل کیا جائے۔ اسکی فکر و نظر کی بلندی اب صرف یہ ہے کہ ہوا سے نائٹروجن کیونکر نکالا جائے اور ہوائی جہاز کس طرح بنائے جائیں! کاروباری تقسیم عمل کا اصول اب علم کی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح صنعت میں اس اصول نے دستکار کو صرف مشین کا دست گھمانے والا بنا دیا، اسی طرح مادی وسائل و آلات کی کثرت سے اب عالم بھی علمی فیکٹری کا مزدور بن چکا ہے۔

اور ستم بالائے ستم یہ کہ علوم طبیعی کے مقاصد اور طریقے علوم ذہنی میں بھی استعمال ہونے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادی قدر (Value) روحانی قدر پر غالب آگئی۔ مثلاً آج کل کسی نفسیاتی نادل کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے گویا آپ طلباء کی نفسیاتی مشقوں کو پڑھ رہے ہیں اور تھیرپسٹ میں مادی ساز و سامان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بیسے فن لطیف کے کارگیری، بن کر رہ گیا ہے اب غور کیجئے کہ اس تمام انقلاب میں افراد انسانی پر کیا گزری؟ گزشتہ صدی نے ان سے کیا چھینا، اور اس کی بجائے کیا دیا؟

سب سے کاری ضرب جو مشین نے انسانیت پر لگائی یہ ہے کہ اس کی دنیاوی زندگی کا رشتہ ہر قسم کے مادیاتی تعلقات سے منقطع کر دیا۔ وہ فطرت سے بیگانہ ہو گیا اور ایک ایسی نسل انسانی وجود میں آگئی جس کی زندگی مظاہر فطرت کی موسیقیت سے خالی ہے۔ سلسلہ روز و شب اور موسموں کا تو اثر اب اس کی زندگی کے اجزاء نہیں رہے بلکہ مدرسہ کے سبق ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس نسل انسانی کی زندگی اب فطری وجود کا جزو نہیں، بلکہ اسباق مدرسہ، طبیی گھڑیوں، اخبارات، کتابوں، سیاسیات اور بجلی کی روشنی کا مجموعہ مرکب ہے۔

انحراف ایک طرف شہری زندگی کی رست و خیز نے انسان و فطرت کی ہم آہنگی ختم کر دی، تو دوسری طرف قدیم اجتماعات کی پراگندگی کی وجہ سے خود انسانوں کے باہمی تعلقات بھی متزلزل ہو گئے، ہمارے قدیم دیہی تعلقات برادریوں اور پیشوں کی پچاسوں کی شکل میں صرف انسان کے لئے آسودگی کا باعث تھے بلکہ اس کا اخلاقی سہارا بھی تھے اگر ایک طرف یہ بندشیں عاید کرتے تھے، تو دوسری طرف اتفاق باہمی کے بھی ذمہ دار تھے۔ مشینی اثرات نے آج یہ پیمانے بندھن ٹھیسے کر دیے ہیں اور افراد کو زندگی کی دار و گیر میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ انسان آج جس قدر تنہا؟ شاید ہی تاریخ میں پہلے ہوا ہو۔

آجکل کے اجتماعات میں رہ کر بھی ہر فرد دوسرے کو اپنا مخالف سمجھتا ہے اور اگر کوئی قدر مشترک ہے تو یہی کہ انسانوں کے اس جنگل میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ تنہا ہے! اب انسان محروم انسانیت ہے، وہ نہ خدا پر اعتقاد رکھتا ہے، نہ انسان پر بھروسہ۔

اضافہ دولت نے آج زندگی کو زیادہ ”غوش حال“ بنا دیا ہے، لیکن خوشحالی کے معنی اب بن آسانی کے ہیں۔ اب غریب سے غریب شخص بھی سمٹت کی سڑکوں، بجلی کی روشنی، آراستہ چار قافوں، اور پادکوں کے ”آرام و آرائش“ سے بہرہ مند ہے۔ اس کی زندگی ہمارے ہی کی زندگی ہے۔ کھیل میں، تہوار میں، سیاسی جلسے میں، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کا سیلاب ہے۔ غرض کہ زندگی کی نبض پوری سرعت کے ساتھ چل رہی ہے، اور ایک علمی قسم کی مادیت روح کی جڑوں تک سرایت کر چکی ہے۔

ہم آج بے شک زیادہ دو لگند ہیں، اتنے دو لگند کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ تھے، لیکن اسی دولت نے ہمیں بندہ ضروریات بنا دیا ہے اور ضروریات کا یہ سلسلہ طعنا ہی جا رہا ہے اور انسان کی روح میں جو فلا پیرا ہو گیا ہے اسے ہر کرنے کے لئے انسان نت نئی تفریحیں تلاش کر رہا ہے۔

انفرادی بے اطمینانی اور نئی سرقتوں کی تلاش کا لازمی نتیجہ آپس کی رقابت کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ دنیا میں کبھی پہلے اتنی دشمنی و رقابت نہ تھی جتنی آج ہے۔ ساری انسانیت آپس میں برسر پیکار ہے۔ انسانی روح اب دیران مضطرب، خالی اور سخت ہو گئی ہے۔ قلب انسانی کے لطیف جذبات محو ہو چکے ہیں۔ قلبی اعمال کی جگہ اب ارادی اعمال نے لے لی ہے۔

قلب و روح کی اس متاع کوٹا دینے کے بعد کاشے ہم زیادہ عقلمند ہی بن جاتے، لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔ آج انسانی نسل پہلے سے زیادہ غنی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا تعلیم یافتہ انسان افسوس اور بیسویں صدی کے پڑھے لکھے انسان سے زیادہ زیرک تھا۔ اُس زمانہ کا گڑبہ آج کے کارخانے کے مزدور سے زیادہ عقلمند تھا۔ پرانے زمانہ کی گھردائی، آج کی شوائی ماراں کی پیداوار سے زیادہ سمجھدار تھی۔ جب کہ نسل انسانی کی عام ذہنی صلاحیت کمزور نہیں ہوئی ہے تو پھر تعلیم کا جدید مواد دماغوں کو بہتر کیوں نہیں بناتا؟ علوم جدیدہ نے کتابوں، رسالوں، اخبارات، سینما، ریڈیو اور تقریروں کے ذریعہ سے جو اثرات انسانی روح و دماغ اور روح انسانی پر ڈالے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ انسان اب ”علمیت پرست“ ہو گیا ہے، یعنی کتابوں کے ذریعہ حاصل کی ہوئی ”واقفیت“ اب اس کا تنہائی مقصود ہے۔ اشیاء کے تصور کی بجائے اب وہ ”علمی واقفیت“ کا پیاسا ہے، اور پیچ در پیچ خیالات میں گم ہو گیا۔ اور انسان پر غور کرنے کی بجائے اب اسے ”نظرِ آفرینش عالم“ اور ”نظرِ تخلیق آدم“ میں زیادہ مگن آتا ہے۔ وہ

ہولوں سے زیادہ نباتیات کا دلدادہ ہے، جانوروں سے اسے گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ حیوانیات سے ہے۔ انسانی روح کی رنگینوں کی بجائے وہ اب نفسیات کا زیادہ شوقین ہے۔

۲۔ ذہنی معلومات کی افراط نے انسان کو سطحی بنا دیا ہے۔ وہ اس غذائے مغرط کو جذب و ہضم نہیں کر سکتا۔ اسلئے ب یہ اس کو پہلے ہی سے ہضم شدہ صورت میں دی جانے لگی ہے۔ چنانچہ آج کل اکثر آدمیوں کی ذہنی غلائی پہلی گویا ہیں جو چند چلتے ہوئے الفاظ یا جملوں کی صورت میں انھیں دی جاتی ہیں۔

۳۔ علم کی اس افراط کا تیسرا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود علم میں ایک طرح کا طفلانہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ انسان کے قلب میں دنیا کے بے شمار موجودات کی عظمت پیدا ہو، وہ ان کی طرف سے بے پروا سا ہو گیا ہے مثلاً آج کل تعلیمی فلموں کا بڑا چاہ ہے، اور کوئی شک نہیں کہ وہ اشاعتِ علم کے اچھے ذریعے ہیں، لیکن اگر آپ کسی ایسے مدرسہ یا سینما میں جائیں جہاں یہ فلم دکھائے جا رہے ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ حاضرین بجائے اس کے کہ تعجب و عظمت کے احساسات کے ساتھ، دنیائے حیوانات یا نباتات کے عجائب کو دیکھیں، لاپرواہ اور بے حس بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے چہرے سے بھی احترام کا احساس ظاہر نہیں ہوتا۔ پہلے جب انسان اپنی سیر و سیاحت میں اس قسم کے حقائق دریافت کرتا تھا تو محو حیرت ہو جاتا تھا اور اسے دنیائے عجائبات سے ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی تھی، لیکن اب یہ تجربے عامۃ الناس کے لئے خالی از معنویت ہیں، اس لئے کہ صرف چند آنے خرچ کر کے ہر شخص انھیں حاصل کر سکتا ہے، ماحول کلام یہ کہ آج انسان نے اپنے ماحول کے اثر سے کائنات کا ایک دوسرا ہی نظریہ قائم کر لیا ہے، جو بچوں کی فہم کائنات سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچے کی کائنات اس کے تخیل سے بنی ہے اور آج کل کے بالغوں کی دنیا اعداد و شمار پر قائم ہے۔ جن معیاروں پر ہم حاضر کے انسان نے دنیا کا یہ تصور قائم کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں: جسامت پرستی، سرعت پسندی اور جدت۔۔

آج کل ہر جسامت کو عظمت سمجھا جاتا ہے، خواہ یہ ”جسامت“ شہروں کی آبادی کی ہو، یا ستاروں کے فاصلے کی، یا دارالحیات خود کشی کی تعداد کی یا کسی اخبار کے اڈیشنوں کی۔

سرعت پسندی کی مثالیں آپ کو ہر طرف نظر آئیں گی۔ اب آج کل کسی ہوائی جہاز کا ایک گھنٹہ قبل پہنچ جانا، کسی سرفروش موٹر باز کا تین سو میل کی رفتار سے موٹر چلانا، اخباروں میں کسی واقعہ کی اطلاع کا چند گھنٹہ پہلے چھپ جانا، یہ دنیا کے دلچسپ ترین واقعات سمجھے جاتے ہیں۔ ریکارڈ قائم کرنے کا سودا ہر سر میں سلایا ہوا ہے، ریکارڈ کے اس خط نے کھیل اور ورزش جسمانی کی سی اہم چیزوں کو بھی آج کل بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔

آج ہم ہر نئی چیز کو محض اس وجہ سے پسند کرتے ہیں کہ وہ نئی ہے۔ بیجان خیز باتوں کا شوق حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔ ان تینوں خصوصیتوں کے اعتبار سے آج ہم بچوں کی ذہنی سطح پر آگے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج انسان کی زندگی مصنوعیت سے معمور ہے۔ ہر قسم کے مادی تعلقات سے بیگانہ ہو کر انسان ہر سمت ٹکراتا اور خود اپنے اوپر گرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کی تکمیل اپنے اندر چاہتا ہے، لیکن پاتا نہیں۔ معاشرہ پریشانی نظام کے اثرات کا یہ خاکہ بعض طبایع کو بہت شاق ہو گا۔ کوئی کہے گا کہ یہ مبالغہ آمیز ہے، کوئی اسے ایک طرف قرار دے گا اور کوئی اسے سرے ہی سے غلط بتا۔ نہ گا۔

بے شک یہ خاکہ مبالغہ آمیز ہے، لیکن صرف اس معنی میں کہ اس میں ہر بیہیات کو واضح کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف بھی ہے، اس لئے کہ اس میں اس معاشی دور کی ثقافت کے ہر پہلو پر نظر نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف انہی پہلوؤں کو دیکھا گیا ہے جو اہم ترین ہیں۔ باقی رہا اس کا غلط ہونا تو اگر کوئی چیز اعداد و شمار اور واقعات سے ثابت ہو جانے کے بعد بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آج امریکہ میں ہر پانچویں شخص کے پاس موٹر ہے، اور برمنی میں پچھلے دس سال میں اخبارات کی تعداد دو گنی ہو گئی ہے۔ ان واقعات کو کون بدل سکتا ہے۔

انسانوں کی بہت بڑی تعداد اب تک یہ نہیں جانتی کہ مشینی نظام کا یہ تماشہ جو آج ہو رہا ہے، ہے کیا؟ اس فطرت سے اگر صرف یہی مطلب حاصل ہو جائے کہ لوگ اپنی ثقافت کے احیاء کے لئے اس معاشی دور کی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں تو ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ مشین ایک شیطان ہے جسے منتر پڑھ کر ہم نے اپنا تابع کیا، اب یہ ہمارے سروں پر سوار ہے، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت وہ منتر بھول گئی ہے جس سے اسے واپس کیا جاسکے۔

(راخو و قیاس از سیاست)

سید ولیچ الدین احمد بی۔ اے (علیگ)

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب ترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت مفوری ہے۔ قیمت ۲ روپے چھپس :- وہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کمار پالما صاحب۔ قیمت ۲

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴

نیچر ٹیگار لکھنؤ

تیاگ

(۱)

مضافات کٹواہ ضلع مرشد آباد میں ایک گاؤں ہے۔ کاتھن۔ اب تو خیر یہ بالکل ویران و تباہ ہے، لیکن ہم جس زمانہ کا حال بیان کر رہے ہیں، اُس وقت یہ گاؤں بہت آباد تھا۔ یہاں کے لوگ پیر فقیر، سادھو سنت کے بڑے معتقد تھے۔ اسی اعتقاد کی برکت تھی کہ اکثر سادھو اور فقیر یہاں آتے رہتے تھے اور ان کی نصیحتیں سننے کا موقع گاؤں والوں کو اکثر ملتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سادھو آیا تو پورے ایک مہینہ تک اُپدیش دیتا رہا، اُس کا اُپدیش یہ تھا کہ اگر ”نروان“ چاہتے ہو تو مایا کے جنجال کو تیاگ دو۔۔۔۔۔ اس سے دور بھاگو۔۔۔۔۔ بیوی، بال بچوں کے چندرے میں پڑ کر مکتی ملنا ناممکن ہے۔۔۔۔۔

لیکن اُپدیش اور وعظ سننے کے لئے ہوتے ہیں۔ عمل کرنے کے لئے تو ہوتے نہیں ہیں اس لئے سادھو جی اپنا اُپدیش دے کر چلے گئے اور گاؤں والے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ مگر نروان بڑھن پر سادھو کی تعلیمات نے اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ رات دن اسی خیال میں ڈوبا رہتا تھا۔ اُس میں صفائی کا خیال زیادہ آگیا تھا۔ رات دن کے غور و فکر سے اُس کا جسم لاغر ہو گیا تھا اور اُس کا چہرہ اُترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیوی، روتیا سے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ ماں سے بھی گڑا کر نکال جاتا تھا۔ ماں اس بات کا کوئی خیال نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی جو ان بیٹا اور بہو گھر میں ہیں۔ اُن کے ہنسی خوشی کے دن ہیں دونوں رات دن ہنستے بولتے رہتے ہوں گے۔ مگر روتیا اس اچانک تبدیلی سے خوفزدہ ہو گئی اس کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن آخر کار ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے دھڑکتے ہوئے کلیجہ کے ساتھ پوچھا ”آخر یہ تم رات دن کیا سوچتے رہتے ہو۔ نہ کھانے کی پروا ہے، نہ سونے کی فکر ان دنوں چہرہ بھی بہت اُترا ہوا ہے۔“

”بڑھن نے روتیا کی طرف پیار سے دیکھا۔ اُس کی نظریں روتیا کے معصوم چہرہ پر پڑیں اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بولا۔۔۔“ یہ گیان دھیان کی باتیں ہیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

”تو گیان دھیان میں آدمی بے سدھ ہو جاتا ہے۔ تمھارے بابو جی بھی تو برہمن ہیں اور صبح شام روز

بوجایا کرتے ہیں مگر میں نے تو ان کو کبھی بھی اتنی چیتا کرتے نہیں دیکھا، روپا نے کہا۔
 ”نہیں روپا! اس کو گیان دھیان نہیں کہتے ہیں۔ یہ بھگوان کی بھگتی نہیں ہے۔ یہ رسم و رواج کی پوجا ہے۔
 جب تک آدمی مایا کے جہال کو تیاگ نہ دے اُس وقت تک وہ بھگوان کا سچا بھگت نہیں ہو سکتا“ بدھن نے کہا۔
 روپا ایک بھولی بھالی لڑکی تھی وہ اس فلسفہ کو بالکل سمجھ نہ سکی اُس نے دل میں کہا ”نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے“ اور کچھ جواب نہ دے سکی۔

(۲)

چیت کا ہمینہ تھا اور چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ سفید چاندنی چاروں طرف چمٹکی ہوئی تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور چیت کی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سارے گاؤں میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہر شخص سو رہا ہے مگر بدھن اب تک جاگ رہا ہے۔ اُس کے پاس روپا اپنے بچے کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے سو رہی ہے۔

”تو کیا بیوی اور بچوں کی محبت اور ماں باپ کا خیال مجھے نردوان کے راستے سے بھٹکا دینگا؟۔ یہ دنیا مایا ہے اور نردوان کا حصول بغیر تیاگ کے ناممکن ہے۔ بیوی بچوں کی محبت، ماں باپ کا خیال، دھن دولت، جھوٹی خوشی کی خواہش، سب مایا ہے۔ ان میں حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب دلکش جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت فریب ہے۔
 ہے ایشور! میری سہا تیا کر دو کہ میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں۔ ہے پر بھو! میرے ہر دے کے مندر میں سما جاؤ تاکہ سوائے تیرے اُجائے اور تیری بھگتی کے میرے دل میں کسی اور کی جگہ باقی نہ رہے۔“

بدھن اُٹھ بیٹھا۔ اب وہ مایا کی زنجیروں کو توڑ چکا تھا، اب وہ آزاد تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار کمرے باہر نکل گیا لیکن ایک لامعلوم شش نے اُس کے پاؤں تھام لئے۔ وہ لوٹ گیا اور اُس نے روپا اور اپنے پیارے بچے کی طرف دیکھا۔ اُس کے دل میں ایک ٹپس اُٹھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی وہ کیفیت زائل ہو چکی ہے۔ وہ پانچ منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر یک بیک خود بخود آہستہ آہستہ کہنے لگا ”نہیں! نہیں! میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اب یہ دلکش فریب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ کہتے ہوئے وہ دیوانوں کی طرح باہر نکل گیا۔

(۳)

وہ کہاں کہاں نہ پھرا۔۔۔ جنگل، پہاڑ، سبھی چھان ڈالے۔۔۔ مگر حقیقی امن و سکون کی روشنی نہ ملی۔ وہ تین سال تک اسی طرح پھرتا رہا یہاں تک کہ وہ گیا بیوپنجا۔ جہاں مہاتما بودھ کو ”نردوان“ کی روشنی ملی تھی۔ یہاں پہاڑ کی کھوہ میں ایک سادھو کے درشن ہوئے۔ سادھو کی جٹائیں لمبی لمبی تھیں، ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ داڑھی اور بھوں کے بال بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ سادھو نے بدھن کی داستان سنی اور ایک ٹھنڈی سانس

لیکھو کہا ”میرے بچے میں تیس سال۔ سے اسی کھوہ میں نردان کی تلاش میں پڑا ہوا ہوں مگر بیکار۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ساری زندگی یوں ہی رائیگاں چلی گئی۔ میں تم کو کیا راستہ بتلا سکتا ہوں۔ ہاں! آجکل بابا کبیر داس کا بہت چرچا ہے، بنارس چلے جاؤ اور اُن کے درشن بھی کرلو۔ شاید وہ تمہیں راستہ بتلا سکیں“

(۴)

بڑھن جب بنارس پہونچا تو رات ہو چکی تھی۔ نئی جگہ نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ کیا کرتا۔ کہاں جاتا۔ مجبوراً گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو رہا۔ چونکہ سفر کی تھکان سے چور ہو رہا تھا اس لئے اُس پر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ نہ معلوم وہ کب تک سو رہا تھا۔ مگر بچاریوں کے میٹھے بھجن اور اُشان کرنے والیوں کی چیل پہیل نے اُسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کنارے بیٹھ کر تاشا دیکھتا رہا۔

بنارس کی دلفریب صبح، ہوا کے سرد جھونکے، مقدس گنگا کی روانی، اُس کا صاف شفاف پانی، چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر پرستار ان فطرت کا ادھر ادھر بھرنا اُن کی دلکش تانیں، تلاحوں کے ترانے، بچاریوں کا بھجن گاتے ہوئے نکلنا۔۔۔ اور ایسے پر کیف وقت میں حسین و جمیل نازک بدن عورتوں کا سفید ساری پہن کر نہانا۔۔۔ اُن کی جادو بھری آنکھیں، اُن کی سیاہ عنبر افشاں زلفیں، اُن کے ماتھے پر سیندر کا دلکش سرخ ٹیکا۔۔۔ اُن کا نہانہ کرنا۔۔۔ نکلنا، اور شرما شرما کر ساریاں بدلنا۔ ایسا منظر تھا کہ ممکن نہیں کہ ایک انسان عقل و ہوش نہ کھو بیٹھے۔ پھر تین دن سینہ میں بھی دل تھا۔ بھلا وہ کیونکر اس ہوشیار منظر کی تاب لا سکتا تھا۔ ایک گھنٹہ تک اُس پر بے خودی کا عالم طاری رہا۔ اُس نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک فرحت بخش اطمینان اور سکون محسوس کیا۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر تک اسی عالم میں رہتا کہ یکایک اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کو کوئی پکار رہا ہو ”بڑھن! بڑھن! یہ سب لایا کی زنجیریں ہیں ان سے بچ ورنہ نردان کی روشنی کا دروازہ تجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا“

(۵)

صبح کے تقریباً سات بجے ہوں گے اور حسب معمول بابا کبیر داس مریدوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ بڑھن بھٹکتا بھٹکتا پہونچا۔

”میں بابا کبیر داس کے درشن کے لئے بڑے دور کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ بڑھن یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بابا کبیر داس دونوں ہاتھ جوڑ کر بوسے ”آپ کا سیوک کبیر داس آپ کے سامنے ہے“

بڑھن کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ بابا کبیر داس کی جو تصویر اُس کے ذہن میں تھی اُس سے وہ بالکل مختلف تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ بابا کبیر داس کوئی سادھو ہوں گے، لمبی لمبی جٹائیں ہوں گی، بڑے بڑے ناخن ہوں گے

اور لنگوٹ کسے، آسن جمائے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ بابا کبیر داس معمولی انسانوں کے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

اس اثناء میں بابا کبیر داس کی نظر برابر بدھن کے چہرہ پر جمی رہی۔
”بیٹھو بابا! کہاں سے آئے ہو؟“

”بنگالہ سے“

”کیوں“

”برہما کی تلاش میں“

”افسوس! تم نے ناحق اتنی تکلیف کی برہما تو وہیں تھا۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ چشمہ تمہارے بطن میں ہے۔ رہا تھا۔ اُس چشمہ کو چھوڑ کر پیاس بجھانے کے لئے اتنا دور دراز سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”لیکن بغیر مایا کے جنجال کو تیاگ کئے ہوئے برہما کیونکر مل سکتا ہے؟“

”میرے بچے! کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما جنگلوں، پہاڑوں، اور ریگستانوں میں رہتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما

کاکا لکاسے والے برہمن اور داڑھی والے مولویوں کی باگیر ہے؟ نادان نہ بنو۔ اپنے گھر کو واپس جاؤ۔ برہما تمہارے

گھر ہی میں ہے۔ تم اُس سے وہیں مل سکتے ہو۔ گھر بڑی زندگی میں دونوں جہاں کا امن و سکون ہے۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں

میں مارے پھرنے سے کیا فائدہ؟ اگر اُس کو کہہ ہو گا تو گھر ہی میں شہیقہ کے خوبصورت چہرے سے نقاب

اٹھ جائے گی۔ گھر پر رہو۔ گھر رہنے کی جگہ ہے کیونکہ برہما کی سچی روشنی اُس کے گوشہ گوشہ میں جلوہ گر ہے۔ انسان

کی چڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ پہاڑوں، جنگلوں، ریگستانوں میں پھریا پھرے کیونکہ ان میں طرح طرح کے

دشمنوں، پرندوں، کبوتر، کھوڑے، اٹکھوں سال سے بٹے ہیں مگر ان میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔ — اور

انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ اپنی صورت بگاڑے کیونکہ ہنر، ریجھ، کپڑے، آؤ، گدھ، بڑے، بد صورت

ہیں مگر ان میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔ — اور انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ہوا میں اُڑے یا

عمتد اور دریاؤں کے سینوں کو چیرتا ہوا عبور کر جائے کیونکہ رنگ پرنگ کی چڑیاں ہوا میں سا لہا سال سے

چکر لگا رہی ہیں۔ — اور قسم قسم کی مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور ان میں رات دن غوطے لگاتے رہتے ہیں

اور اس پار سے اُس پار آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اس لئے انسان بنو، اپنے ہنسنسول

سے، نو، اُن سے خوشدلی کے ساتھ معاملہ کرو، دوست احباب کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ، دشمنوں کی بددلت کرد،

اپنی رونی قوت بازو سے کماؤ، کھاؤ پیو، خوش رہو۔ — اور اسراف مت کرو، کسی کا دل مت دکھاؤ کیونکہ اس سے

بڑا کوئی باپ نہیں ہے۔ — ماں باپ کی اطاعت کرو، بیوی، بال بچوں سے محبت کرو، یتیموں، غریبوں اور

مرزا ابوالحسن آصف خاں

نام و نسب ابوالحسن نام، یحییٰ الدولہ اور آصف خاں خطاب تھا، باپ کا نام مرزا غیاث بیگ تھا، یہ نیک نام اور خوش قسمت امیر جس نے عہدِ جہانگیری اور دورِ شاہجہانی میں ممتاز اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر حکومتِ خلیفہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا ہے، جہانگیری جہیتی اور مدبر و ہوشمند بیوی نورجہاں کا بڑا بھائی تھا۔

ابوالحسن کا باپ، غیاث بیگ جس نے ہندوستان آکر وزارتِ عثمانی کا منصبِ جلیل اور اعتماد الدولہ کا خطاب حاصل کیا خواجہ محمد شریف طہرانی کا بیٹا تھا خواجہ شمس الدین میں محمد خاں نکلوا حکم خراسان کا وزیر تھا جب محمد خاں نکلوا کا انتقال ہو گیا تو خواجہ محمد شریف نے شاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے تعلق پیدا کر لیا شاہ طہماسپ نے اس کو مرو کی وزارت پر فائز کر دیا۔ شہنشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے مغلوب ہو کر ہندوستان سے بھاگا اور مصیبت و ادبار کا مارا ہوا ایران پہنچا تو شاہ ایران نے اسی امیر کے نام اس کی مہمزداری اور تواضع کے احکام صادر کئے تھے۔

صاحب سیرالتاخرین نے محمد خاں کے نام ان احکام کا جاری ہونا بیان کیا ہے یہ حکم اکبر نامہ میں موجود ہے۔

خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے (۱) آقا طاہر (۲) مرزا غیاث بیگ جس کی شادی علاء الدولہ سیر آقا طاک کی بیٹی سے ہوئی تھی جو ایران کا بہت بڑا امیر تھا۔

باپ کے مرنے پر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرزا غیاث بیگ اور اس کے بھائی کو اپنے وطنِ اوف سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اس سفر میں غیاث بیگ کے ساتھ اس کی بیوی دولہ کے اور ایک لڑکی بھی تھی، اثنائے راہ میں بمقام قندھار ایک اور لڑکی پیدا ہوئی جس نے بعد میں نورجہاں کے نام سے نہ صرف جہانگیری کے قلعہ میں بلکہ تمام مملکت ہند پر فرمانروائی کی۔ راستہ میں مرزا پر بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں، بہ ہزار دقت و دشواری اس نے فوج و سیکری میں پہنچ کر شہنشاہ اکبر کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کیا۔ غیاث بیگ، حقیقت میں ایک جوہر قابل تھا، انشاء، خوشنویسی، شاعری اور دوسرے علوم میں کافی دستگاہ رکھتا تھا، شہنشاہ کی نگاہِ انتخاب کا اس پر بڑا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی دیوانِ بیانات ہو گیا اور وقتاً فوقتاً ترقی کے مدارج طے کرتا رہا حتیٰ کہ جہانگیری کے عہدِ حکومت میں اعتماد الدولہ کا خطاب اور وزارت کا منصب ملا۔

علمی استعداد آصف خاں تمام علوم میں بہت اچھی استعداد رکھتا تھا، مگر معنولات سے زیادہ دلچسپی تھی، اسی لئے مراسلات میں جو القاب اس کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا اس میں یہ فقرہ ضرور ہوتا تھا:-

شعلہ افروز فطرت اشراقیاں، دانش آموز طبیعت مشائیاں^۱

خوش نویس، اور زباں داں تھا حساب دانی اور معاملہ فہمی میں جواب نہ رکھتا تھا عمال خالصہ اور دوسرے امراء کے حساب و کتاب کی جانچ نہ دیکھ کر کسی اہلکار اور پیشہ کار کی ادا دے کے کیا کرتا تھا، مسئلہ کا فیصلہ بھی آپ ہی کرتا تھا ان امور میں اسے کسی امانت کی غور بہت نہ ہوتی تھی۔

زمانہ سابق میں جب کوئی امیر بڑے مرتبہ پر پہنچ جایا کرتا تھا تو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنا کام دوسروں پر چھوڑ دیا کرتا تھا، جس سے اہل معاملہ کی سخت حق تلفی ہوتی تھی اور چونکہ غیر ذمہ دار اہلکار دیانت دامت لے جو ہر سے عام طور پر محروم ہوا کرتے تھے اس لئے رشوت کی گرم بازاری ہو جاتی تھی، حقیقت میں یہ بہت بڑی کمزوری تھی، چنانچہ افضل خاں غلامی پر بھی موزنین نے یہی الزام لگایا ہے کہ باوجود قابلیت اور حساب دانی کے وہ کاغذات پر خود احکام نہیں لکھتا تھا، لیکن آصف خاں کی یہ خصوصیت کہ وہ مسئلہ اور حسابی کاغذات کی دیکھ بھال خود کرتا تھا بے انتہا قابل تعریف ہے۔

عادات و اخلاق آصف خاں نہایت سخی، متواضع اور نرم گفتار تھا، گشتگو باپ کی طرح بڑی نرمی سے کیا کرتا تھا، لہٰذا میں سختی اور قہقی نام کو نہ تھی، آرائش اور شکستہ کتبت کو بہت پسند کرتا تھا، بہت ہی

خوش خوراک اور پُر خور تھا، دن رات میں ایک من شاہ بہانی غذا کھاتا تھا لیکن بیماری کے دوران میں عرصہ کی علالت نے خوراک اتنی گھٹادی تھی کہ صرف ایک پیالہ خود آب پیتا تھا۔ اس کے بعد مدت بہت زیادہ رہی، موجودہ زمانہ میں وہ قتل میں بھی نہیں آسکتے، مگر اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان سے بہت گنہگار تھا، عام طور پر خوش حالی اور فراغ مالی کا دور دورہ تھا، رعایا فلس اور ناقد کی تکالیف سے راقع نہ تھی، ہندوستان کی آمد نے ہندوستان ہی میں رہتی تھی، اس لئے اہل ہند کی خوشحالی کو تعجب خیز بھی نہ تھی جب عوام کی یہ کیفیت تھی تو امراء کا کیا ذکر ہے امراء تو آج بھی عیش و عشرت میں اتنا رو بہ صرف کر دیتے ہیں کہ ایک غریب اور فاقہ کش انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا، لیکن آصف خاں اس عہد زریں کے امراء میں بھی امتیاز رکھتا تھا، اس زمانہ میں خوش غوری میں آصف خاں دنیا بھر میں شہرت رکھتا تھا۔

گویند در اں وقت یمن الدولہ و مرزا ابوسعید و ہاتر خاں نجم ثانی بخوش نامی شہرہ آفاق بودند

باوجود اس کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی آمدنی میں غریب کا حصہ نہ تھا، آج سے سو دو سو سال پہلے جہاں آدمی کے لئے علم و شجاعت ضروری تھی وہاں سخاوت بھی لازمی تھی جس طرح آج ہم چوری، زنا اور اسی قسم کی دوسری بد اخلاقیوں کو اپنے لئے باعث شرم و ندامت خیال کرتے ہیں اُسی طرح بخل و امساک کو اس وقت سخت ترین عیب خیال کیا جاتا تھا شعراء خاص طور پر ایسے سرمایہ داروں کی سچو کیا کرتے تھے جن کے دامن پر کجوسی کے داغ نظر آتے تھے، اگرچہ عہدِ حاضر میں بھی اس عادت و ذیل کی تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن ماحول ایسا ہے کہ اسے برا بھی نہیں کہا جاسکتا، آج کسی کو سخی یا بخیل کہنا خود اپنی طامعی اور کدِ طبعی کا ثبوت ہم پر بخانا ہے، بلکہ حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ سرمایہ داری نے تمام اچھے اوصاف کو شکست دیکر شرافت و شجاعت کی مسند پر قبضہ کر لیا ہے اور عزت و شرافت کا معیار اب علم و شجاعت یا دوسرے انسانی اوصاف پر قائم نہیں رہا بلکہ دولت و ثروت یا حکومت پر لگیا ہے، اگرچہ مسلمانوں کی عالم گیر اخوت اور ان کے نظامِ مذہب کا تقاضہ آج بھی وہی ہے جو دو سو سال پیشتر تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ سخاوت کی صفت سے یہ قوم تباہی محمد و م نہیں ہوتی، لیکن زمانہ بڑی تیزی سے اسلاف کی امانتیں چھین رہا ہے، غوث ہے کہیں آگے چل کر یہ چیز بھی اس کی دست درازوں کی زد نہ ہو جائے بہر حال آصف خاں سخی تھا، غریب اور مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتا تھا، سنگلے پیسے بالاکھاٹ اور اس کے نواحی علاقہ میں امساک باریاں کی وجہ سے سخت قحط پڑا بڑے بڑے غنی محتاج ہو گئے، حتیٰ کہ مدت تک کتے کا گوشت بکری کے گوشت کی جگہ فروخت ہوتا رہا، نان باقی رات کو گلی ہوئی ہڈیاں اٹھا لاتے اور ان کو پیکر یا ٹاشا مل کر کے روٹیاں پکالتے اور دو ہتھندوں سے قیمت وصول کرتے، ایک دن ایک عورت نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ کیا کہ میں نے اپنے بے سایہ کو اس شرط پر اپنا بچہ دیدیا تھا کہ اس کو کاٹ کر پکائے اور مجھے بھی کھلائے مگر اس نے خود ہی کھا لیا مجھے کچھ نہیں دیا، غرض جب آفت اور قیامت تھی، آدمی آدمی کو کھائے جاتا تھا ہزاروں بھوکے مر گئے اور شہر کے شہر ویران ہو گئے چنانچہ اس غمناک سال کی تاریخ ہی کسی نے ”غم“ سے نکالی، بادشاہ برہان پور میں تھا اس نے بڑے بڑے اور مشہور شہروں میں لنگر جاری کئے بادشاہ کے ساتھ یمن الدولہ آصف خاں نے بھی لنگر جاری کئے جن میں روٹی اور دلیا اس کثرت سے پکایا جاتا تھا کہ ادھر ادھر سے جو لوگ بھوک کے ستائے ہوئے آتے تھے وہ خوب شکم سیر ہو کر کھا لیا کرتے تھے۔

بادشاہ، بیگمات اور شاہزادوں کی دعوت کے موقع پر آصف خاں نہایت تکلف اور اہتمام سے کام لیا کرتا تھا بڑی بڑی نذریں پیش کرتا اور مکان کو اندر باہر سے خوب سجاتا تھا، نوکر بھی نہایت عمدہ پوشاک پہنتے اور اپنی اپنی خدمات ادب اور قربانہ سے انجام دیتے تھے، چونکہ جہانگیر اور شاہجہاں سے آصف خاں کی قریبی رشتہ داری تھی اس لئے اکثر دعوت کا اتفاق ہوتا تھا اور ہر مرتبہ انھیں تکلفات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۸ء میں آصف خاں نے اپنے مکان پر جہانگیر کی دعوت کی اور سو لاکھ روپیہ کا ایک لعل پیش کیا، جہانگیر نے اپنی توڑک میں اپنے قلم سے اس ضیافت کی کیفیت لکھی ہے۔

روز مبارک شنبہ پانزدہم آصف خاں در منزل خود کہ بغایت جائے بصفاء و دلنشیں بود مجلس عالی و جشن بادشاہان آراستہ التماس ضیافت نمود متوسل اوراپای قبول بخشیدہ باہل محل تشریف بردہ شد، و آن رکن اسطنت امین عطیہ را از سواہب غیبی شمرده و رافردنی پیشکش و ترتیب مجلس غایت اغراق بکار بردہ بود از جہانگیر گراں بہا و زلفبت ہائے نفیس و اقسام تعفن انچہ پسند افتادہ برگزیدہ تتمہ بشار الیہ عنایت نمود از جلد پیشکشہائے اولعے است بوزن دو از دہ نیم ہانگ کہ یکہ لک بیست و پنج ہزار روپیہ خریدہ بود قیمت مجموع پیشکش او انچہ مقبول افتاد یک لک و شصت و ہفت ہزار روپیہ شدہ۔

۶ اشعبان ۱۰۴۰ھ کے جشن نوروز میں شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو آصف خاں نے دس لاکھ روپے نذر کئے۔
۶ رجب ۱۰۴۱ھ کو شاہجہاں کی حویلی میں جو اس نے لامبور میں کافی روپیہ صرف کر کے تعمیر کی تھی گیا تو اس نے ۶ لاکھ کی پیشکش کی۔

اگرچہ ہماری رائے میں ان واقعات کو "سخاوت" سے زیادہ فضول خرچی سے تعلق ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ سلطنت مغلیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر مرجا تھا تو اس کی تمام جائیداد اور املاک ضبط کر لی جاتی تھی، تاہم وہ بادشاہ پرتی کا دور تھا اور بادشاہ کے ساتھ محبت کرنا ایک مدہم جزو ایمان ہو چکا تھا اس لئے یہ اغراق قابلِ مذمت بھی نہیں کم سے کم ان واقعات سے آصف خاں کے مصارف کا تو اندازہ کیا ہی جاسکتا ہے۔

خطابات و مناصب | آصف خاں بڑی جاہ و شہرت اور شان و شوکت کا امیر تھا، جہانگیر اور شاہجہاں کے فیض التفات سے اس کو جو مراتب حاصل ہوئے وہ شاہان مغلیہ کے عہد میں اور کسی امیر کو نصیب نہیں ہوئے، بلکہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی بادشاہ کے عہد میں کسی نے یہ عزت نہیں پائی جو آصف خاں کو ان دو بادشاہوں کے دورِ فرمانروائی میں حاصل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ آصف خاں اپنی قابلیت اور کاروائی کے لحاظ سے اس کا مستحق ضرور تھا کہ اس پر وہ فائز شہادت ہوئی چاہئے تھی جو پوری لیکن خوش قسمتی سے اس کو نورجہاں ایسی بہن بھی ملی تھی اسی کے ساتھ قدرت نے اُسے ارجمندہ بانو ایسی بیٹی بھی مرحمت کی تھی، ان دونوں بیگمات سے ان کے شوہروں کو جو عشق اور شفقت کی تھی وہ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان کے عزیزوں اور ختمہ داروں کو عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔

ان کے اعزاز و وقار میں اضافہ ہوتا چنانچہ یہی ہوا، جب آصف خاں کی چھوٹی بہن مہر النساء (نور جہاں) جہانگیر کے نقد میں آئی تو اس کے خاندان کی عزت و وقعت میں چار چاند لگ گئے نور جہاں کے تمام رشتہ داروں بلکہ ملازموں اور ملاموں تک کو عمدہ عمدہ خطابات اور عہدے ملے، باپ اعتماد الدولہ اور وزیر ہوا، بڑے بھائی یعنی ابوالحسن کو عتقا و خاں کا خطاب اور میر سامانی کا عہدہ ملا، جتنی کہ جس عورت ”دل آرام“ نے نور جہاں کو دودھ پلایا تھا وہ بھی صدر انات ہوئی۔ عورتوں کو جو اداویں اور وظائف دے جاتے تھے ان میں ”صدر الصدور“ دل آرام کی مہر پر احکام جاری کر دیا کرتا تھا۔

۱۰۲ھ کے واقعات میں جہانگیر اعتماد الدولہ کی ضیانت اور پیشکش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اکبر کے زمانہ سے آج تک کسی امیر نے ایسی پیشکش نہیں کی، یہ لکھتے لکھتے اس کے قلم میں محبت اور خصوصیت کا جوش پیدا ہوتا ہے اور آخر میں یہ جملہ بے اختیار ادا ہو جاتا ہے۔ ”الحق اور بدگیراں چہ نسبت!“ واقعی اعتماد الدولہ کو دوسرے امراء سے کوئی نسبت نہ تھی، وہ نور جہاں ایسی مدبر اور ہوشمند عورت کا باپ تھا، جو جہانگیر کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب نور جہاں اور جہانگیر کے ازدواج ہی کی بدولت ہوا اور جن لوگوں کو مناصب و مراتب عطا کئے گئے ان کی اہلیت و قابلیت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا اس میں شک نہیں کہ اس ازدواج نے نور جہاں کے خاندان کو بادشاہ کی عنایات شاہانہ کا زیادہ مستحق بنا دیا تھا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی ندرت ہو ہر بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں اپنے اعزہ اور جاں نثاروں پر ہی نوازشیں کی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خاندان اپنی قابلیت و اہلیت کے باعث اسی رعایت و توجہ کا استحقاق لکھتا تھا اور وزارت و امارت اس کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی خواجہ محمد شریف ایران میں وزیر رہ چکا تھا مزاحیات بیگ ایران کے ایک صوبہ کی حکومت پر فائز تھا۔ پھر کوئی تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہی عزت جو اس کے وطن میں اُس سے بھین لی گئی تھی ہندوستان آکر حاصل ہو گئی اور شاہجہانی عہد میں تو آصف خاں کو جو کچھ ملا وہ اُسی کی کوششوں پر سر فرشتیوں کا صلہ تھا اور یہ کہنا قطعاً صحیح ہے کہ شاہجہاں کو محض بیوی کی وجہ سے ہندوستان کی سلطنت نصیب دی، ظاہر ہے کہ جہانگیر اول سے آخر تک اپنی محبوبہ نور جہاں کے ہاتھ میں تھا، اس کی خلافت منشا، وہ کوئی کام کر سکتا تھا اور نور جہاں کی کیفیت یہ تھی کہ شاہجہاں سے اس کو سخت خصومت تھی، شاہجہاں سے اس نے باپ کو لیا۔ شاہجہاں پر بغاوت کا الزام لگایا اور اُسے بغاوت پر آمادہ بھی کیا، پھر اسی کے ساتھ شرفِ حضور سے

محروم کیا، اس کی دولت و ثروت برباد کی، اور اُسے مجبور کیا کہ دشتِ غربت میں ادھر ادھر مارا مارا پھرے اسکے پریشان
اس نے اپنے داماد شہریار کو فروغ دیا ہر وقت اپنے پاس رکھا، امراء کو اس کی اطاعت پر مائل کیا اور ہر طرح اُسے
تقویت پہنچائی، ان حالات میں کوئی قوت نہ تھی جو سلطنت کا تاج شہریار کے سر سے اتار کر شاہجہاں کے سر پہ بٹھاتی
جس کے پاس نہ خزانہ تھا، نہ فرج تھی، نہ لشکر تھا نہ امراء تھے، اگر آصف خاں کو اپنی بیٹی ارجمند بانو (ممتاز خاں)
کے پاس خاطر سے شاہجہاں کی رعایت منظور نہ ہوتی تو وہ بھی اپنی بہن کی ہمنوائی کرتا جس کو سلطنت کا تمام ساز و سامان
میسر تھا، اگر ایسا ہی ہوتا تو یقیناً تاریخ میں شاہجہاں کا نام بحیثیت شاہجہاں کے محفوظ ہوتا، یہ سب آصف خاں ہی
کی حسن تدبیر اور شجاعت و سرفروشی کا کرم تھا کہ شاہجہاں دکن میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا اور تعلقہ لاہور کی فضا میں
نام کے خطبہ اور سکے سے گونج رہی تھیں۔ — ایسا کیوں تھا ایک بھائی، اپنی بہن سے کیوں لڑ رہا تھا کیوں اس
اور بیوہ بہن کو نظر بند کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا، اس کا جواب صرف ایک ہی ہے یعنی بھائی کی محبت پر شفقت و مہربانی
آگئی تھی، آصف خاں اگر صرف نورجہاں کا بھائی ہوتا اور ارجمند بانو کا باپ نہ ہوتا تو یقیناً صورت حال وہی ہوتی جو
نورجہاں پیدا کرنا چاہتی تھی مگر تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور صرف اس لئے نہیں ہوا کہ شہریار نورجہاں کا داماد
تھا اور شاہجہاں آصف خاں کا، پھر کیونکر ممکن تھا آصف خاں بھانجی کے سہاگ پر بیٹی کے سہاگ کو تیار کر دیتا
اور شہریار کی جگہ شاہجہاں کو کھول دیتا کرتا۔

مگر جہانگیر کی خوش نصیبی اور اقبال مندی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حسین و جمیل، عاقل و دانشمند بیوی کے
ساتھ ہی اُسے وہ ایسے جوان مرد، عاقل اور فرزندانہ مشیر بھی مل گئے (اعتماد الدولہ اور آصف خاں) جنکے فیضِ صحبت
سے جہانگیر کے بہت سے عیوب دور ہوئے اس کی ذہنی و جسمانی اور عود پرستی، خدا پرستی میں تبدیل ہو گئی شربِ جو رام لگی
کے نام سے غلو و دہلوت میں شریک و سہم رنجی تھی، بات کی عدم رہ گئی، رات کو پیتا اور دن کو بڑی مستعدی اور
دانائی سے عدالت کے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔

جہانگیر کے چھٹے سن جلوس میں ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب ملا، جہانگیر نے مختصر طور پر اپنی توڑک میں
اس کا ذکر کیا ہے :-

»ابوالحسن سپہر اعتماد الدولہ کا خطاب اعتقاد خانی سر فرادی بخشیدم و پسر آں معظم خاں را بنما صلب لایق
سر فراد سازم بہ بنگالہ پیش اسلام خاں فرستادم۔«

یہ سب سے پہلا خطاب تھا، جو ابوالحسن کو دیا گیا اس کے بعد سرفہر جلوس (۱۳۳۵ھ) میں آصف خاں کا خطاب
اور سر ہزاری منصب عنایت ہوا یہ خطاب ابوالحسن کے لئے تنہا نہ تھا بلکہ اس کے خاندان میں دو آدمیوں کو اس

پہلے بھی مل چکا تھا چنانچہ جہانگیر خود لکھتا ہے :-

” در تاریخ سوم منصب اعتقاد خاں را کہ دو ہزاری ذات و پانصد سوار بود سہ ہزاری ذات و سوار مقرر فرمودم و ب خطاب آصف خانی کہ دو کس ہم از سلسلہ آئنا بدین خطاب سرفرازی یافتہ اند سر بلند ساختم“

مرزا غیاث الدین کو جو ممتاز محل کا نانا یعنی ابوالحسن کا خسر تھا یہی خطاب حاصل تھا اور غیاث الدین کے بھتیجے مرزا قوام الدین کو جو ۹۸ھ میں عین عالم جوانی میں اسوقت دار و ہند ہوا تھا جب یہاں کے اورنگ حکومت پر اکبر ممکن تھا، آصف خاں کا خطاب ملا تھا اس کے بعد مسلسل اور متواتر اضافوں کے بعد آصف خاں چھ ہزاری (چھ ہزار سوار) کے منصب پر پہنچ گیا۔ یہاں پر پہونچکر بھی اس کی ترقی کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رکا اور بڑھتے بڑھتے وزارت سپہ سالاری کے عہدے پر پہونچکر نو ہزاری ہوا، ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ حسب موقع آگے بیان کیا جائے گا۔

آصف خاں اولاد کے معاملہ میں بھی بہت خوش قسمت تھا اس کے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں، پھر اولاد شادی بیاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر وسیع ہوتا گیا اور بہت سے پوتے، پوتیاں، اور نواسے نواسیاں ہوئیں۔ آصف خاں کا سب سے بڑا بیٹا شائستہ خاں تھا جو باپ کی زندگی ہی میں بڑے کار نمایاں کر چکا تھا اور بیمار کا ناظم تھا شاہنواز خاں ولد عبدالرحیم خاں خاناں کی بیٹی اس کے عقد میں تھی، معلوم ہوتا ہے کہ شاہنواز خاں کی یہ لڑکی بھی ہمت مراد کی مالک تھی، مہابت خاں نے جب جہانگیر کو قید کر لیا اور ساتھ ہی آصف خاں بھی لے کر لایا تو شائستہ خاں کی بیوی خاتون اپنے شوہر کی بھوپتی نو جہاں کے پاس تھی، جہانگیر مہابت خاں کی دلاری کے لئے اس سے عجیب عجیب قسم کی گفتگو کرتا تھا یہ بھی کہا کرتا تھا کہ شاہنواز کی بیٹی سے ہوشیار رہنا وہ کہتی ہے میں مہابت خاں کو گولی سے اڑا دوں گی۔

تاریخ میں ابوطالب اور معظم خاں کے نام سے دو اور بیٹے آصف خاں کے ملتے ہیں، لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم خاں کو ہی شائستہ خاں کا خطاب ملا ہے میرے پاس اسوقت آثار الامراء کی پہلی جلد موجود ہے۔ دوسری اور تیسری جلد بھی ہوتی تو میں اس امر کی زیادہ تحقیق کر سکتا، بہر حال آصف خاں کا دوسرا بیٹا ابوطالب کو سمجھنا چاہئے۔

تیسرے بیٹے کا نام مرزا بہمن یار تھا، بہت آزاد لڑا بالی، عیش پسند اور بے پروا تھا، اس کا موروثی خطاب اعتقاد خاں اس کو حاصل تھا، چار ہزاری منصب تھا، دارا شکوہ کی لڑائی کے بعد عبدالملکیری میں

پانچ ہزار دی ہو گیا تھا اس وقت اس کا بڑا بھائی شائستہ خاں ناظم ہنگالہ تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں اس نے انتقال کیا، نہایت سیدھا، سچا، آزاد اور فقیر دوست تھا، ایک دن ایک کوچہ گرد مجذوب سے ملنے گیا بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا چونکہ یہ بات اس کے درجہ امارت سے گری ہوئی تھی بادشاہ نے اعتراضاً پوچھا بندہ بڑے بادشاہی میں سے وہاں کوئی اور بھی تھا، اس نے بے تکلف اور برجستہ جواب دیا، صرف یہی روسیہ تھا باقی سب خدا کے بندے تھے، اسکا ایک لڑکا محمد یار خاں بہت مشہور تھا، ایک بیٹی فاطمہ بیگم مفتخر خاں کی بیوی اور نگ زیب کی نہایت معتمدہ و صد انصاف تھی۔ منجملہ پانچ بیٹیوں کے ایک یعنی ارجمند بانو شاہ جہاں سے منسوب تھی، جو ممتاز محل کے نام سے آج تک مشہور عالم ہے اور اس کا مقبرہ ”تاج محل“ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اس نے باپ کی زندگی میں بمقام برہان پور محل زچگی میں انتقال کیا اس کے بطن سے شاہ جہاں کے بہت اولاد ہوئی، شاہ جہاں کو اس سے بڑا انس تھا اس کے بعد اس نے پھر شادی نہیں کی۔ ارجمند بانو کی حقیقی بہن جو ایک ہی تھی سیف خاں کے عقد میں تھی، سیف خاں جہانگیر کے عہد حکومت میں احمد آباد کا صوبہ دار تھا اس نے شاہ جہاں کے دکن سے آکر رہ جاتے وقت بغاوت کا ارادہ کیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی جگہ شیر خاں کو تعینات کیا اور اس کو نظر بند کرنے کا حکم دیا، لیکن ممتاز الزمانی بیگم نے اپنے بہنوئی کی سفارش کی، اور بادشاہ نے اس کو خدمت پرست خاں کو بھیجا کہ اپنے پاس بلا لیا۔

آصف خاں کی ایک بیٹی آصف الدولہ، جملۃ الملک اسد خاں محمد ابراہیم سے منسوب تھی۔ ایک لڑکی جعفر خاں عمدة الملک کو بیاہی گئی تھی جو آصف خاں کا بھانجا بھی تھا، اس لڑکی کا نام فرزانہ بیگم اور عرفیت ”بی بی جیو“ تھی۔ ایک لڑکی میر خلیل الخطاب بہ ”خان زماں“ پسر اعظم خاں جہانگیر کے عقد میں تھی۔

آصف خاں نے آگرہ، دہلی، کشمیر اور لاہور میں بہت سے مکانات بنائے اور باغات لگائے تھے۔

عمارات لاہور میں ایک حویلی بیس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی تھی، ۶ رجب ۱۰۳۰ھ کو شاہ جہاں لاہور میں وارد ہوا تو اس حویلی کو دیکھنے گیا آصف خاں نے اس موقع پر ۶ لاکھ کی پیشکش کی، آصف خاں کے مرنے پر یہ حویلی اس کے نواسے داراشکوہ کو ملی۔

آصف خاں جہانگیر کا سالار تھا اور یہی سب سے پہلا رشتہ ہے جو خاندان شاہی سے تعلقات شاہی سے قائم ہوا۔

۱۰۳۰ھ میں ابوالحسن آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو سے جو بعد میں ”ممتاز محل“ سے موسوم ہوئی شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں کا عقد ہوا۔

اس سے پہلے ۱۸۷۷ء میں دونوں کی منگنی ہو چکی تھی اور جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے دہن کو انگوٹھی پہنائی تھی، ربیع الاول ۱۲۹۷ھ میں منگنی کے پانچ سال پانچ دن بعد جب شاہزادہ کی عمر ۲۳ سال اور سلیم کی ۱۹ سال تھی شادی ہوئی، صاحب آثار الامراء نے ۱۲۹۷ھ میں شادی کا ہونا بیان کیا ہے حالانکہ جہانگیر نے اپنی توزک میں ۱۲۹۷ھ کے حالات میں شادی کا تذکرہ کیا ہے، جہانگیر خود اپنے سمدھی کے گھر گیا اور نذر قبول کی، توزک میں لکھا ہے:-

”چوں صبیہ اعتقاد خاں ولد اعتماد الدولہ را بہت خرم خواستگاری نمودہ بودم و مجلس کہ خدائی اور میان

بود روز پنجشنبہ سید ہم غور داد بنزل اور رفتہ یک روز و یک شب آنجا بودم و پیشکشہا گزرا نیند“

یہ شادی اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت کامیاب ثابت ہوئی، زوجین میں اتنی محبت تھی جسے بے تکلف عشق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

امراء کے لڑکوں اور بیویوں کی شادیاں شاہان مغلیہ کے آئین کی رو سے بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ ہو سکتی تھیں آج بھی دہلی ریاستوں میں انھوں نے ریاست اور جاگیر داروں کے لئے ایسی پابندیاں موجود ہیں، اگرچہ بظاہر یہ رسم اچھی نہیں، لیکن سیاست اور امور سلطنت سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے، بادشاہ اکثر شادیاں سیاسی مقاصد کے پیش نظر کیا کرتے تھے اور منشاء یہ ہوتا تھا کہ اس تعلق سے امراء میں خلوص اور یکجہتی پیدا ہو، عداوت و خصومت کے جذبات کم ہو جائیں چنانچہ اکبر نے اکثر شادیاں ایسی ہی کی ہیں عبدالرحیم کی شادی، مرزا عزیز کوکر کی بہن سے اسی مصلحت کی بنا پر ہوئی تھی، مرزا عزیز کا تام خاندان بیرم خاں کا جانی دشمن تھا ایسی صورت میں اندیشہ تھا کہ اس کا بیٹا عبدالرحیم بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکیگا، اس لئے بادشاہ نے مرزا عزیز کی بہن سے اس کا عقد کر دیا تاکہ اس کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے، اور شادیاں بھی اس قسم کی ہوئی ہیں، بیرم خاں اور سلمہ سلطان کا ازدواج بھی قطعاً سیاسی مصالح پر مبنی تھا، جہانگیر بھی اس سیاسی ضرورت سے باخبر تھا، اس نے نورجہاں کی بیٹی کو جو شیر افغن خاں سے تھی، اپنے بیٹے شہریار سے منسوب کیا، اسی طرح شاہجہاں کا عقد آصف خاں کی بیٹی سے کیا، منشاء صرف یہ تھا کہ خانوان کا سیرازہ مجتمع رہے، ایک دوسرے کا ہمدرد اور شریک غم ہو، آپس کی خاد جنگی اور قتل و غارت سے سلطنت کے ٹکڑے نہ ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ شاہجہاں اور ارجمند بانو کی شادی محض شرافت اور نجابت ہی کی بنا پر ہوئی ہو جس کا جہانگیر کو بہت خیال تھا، اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کی یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہوئی اور یہ رشتہ آگے چل کر بہت سی خرابیوں اور خاد جنگیوں کا باعث ہوا، خود بھی بھائی یعنی آصف خاں اور نورجہاں میں اتحاد قائم نہ رہ سکا آخر میں آصف خاں نے اپنی بہن کو نظر بند بھی کیا وہ بھی آصف خاں کی گرفتاری کے خیال میں رہی ایک طرف شاہجہاں مدعی سلطنت تھیں اور

آصت خاں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے اس کی حمایت کر رہا تھا۔ دوسری طرف شہر یار جہانگیر کا چھوٹا بیٹا اور نور جہاں کا داماد بادشاہت کے چھوٹے خواب دیکھ رہا تھا اور نور جہاں کی تائید جہانگیر کی زندگی ہی سے اس کے شامل حال تھی، اگرچہ انجام بخیر ہوا اور حق بحقدار رسید کی ضرب اسل صدق آئی، مگر اس حسن انجام میں جہانگیر کی اصابت رائے کو کیا دخل ہے، جبکہ وہ شاہ جہاں کو ”بے دولت“ کا خطاب دے چکا تھا اور بیوی کے اغوا سے اس پر لشکر کشی بھی کر چکا تھا، پھر نور جہاں کی ان سیاسی غلطیوں کو تو کسی طرح نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا جو صرف اسی رشتہ کی وجہ سے سرزد ہوئی اس نے جہانگیر کو شاہ جہاں کے نکاح کیا، اور شاہ جہاں کو مجبور کیا کہ وہ باپ کے مقابلہ میں تلوار کھینچ کر میدان میں آئے، مہابت خاں کی بغاوت اور جہانگیر کی اشارت بلکہ خود نور جہاں کی نظر بندی کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے ذیل کے اکثر واقعات میں ان خانہ جنگیوں کی جھلک نظر آئے گی جو محض اس رشتہ کی وجہ سے برپا ہوئیں۔

کوثر چاند پوری

(باقی)

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی ۱۔ مرتبہ محمد رفیع صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تنہا مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد چار
میدانِ عمل ۲۔ ملک کے مشہور و معروف ادیب نمشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد چار
بیوہ ۳۔ نمشی پریم چند آنجنابی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضخمتاً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا پڑے۔ قیمت مجلد چار
شہری آزادی ۴۔ اس کتاب میں بیرونی ممالک کے آنجنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعزاد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ہر

بینچر نگار لکھنؤ

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

پچھلے مہینے، ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے، میں نے ظاہر کیا تھا کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے، خدا کا کلام نہیں۔ اس پر مذہبی حلقوں میں کافی یحیینی پیدا ہو گئی اور باوجود اس کے کہ میرا کفر والی داد ان کے نزدیک دیرینہ مرض کی حیثیت رکھتا ہے، ان کو میری یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ (حالانکہ مجھے بالکل ناگوار نہیں ہوتا اگر کوئی شخص قرآن کو کلام خداوندی کہتا ہے) اور منجملہ دیگر الزامات کے ایک الزام مجھ پر یہ بھی عاید کیا گیا کہ میں خدا اور رسول کی توہین کرتا ہوں۔ میں یقیناً اہل مذہب کے فتوائے کفر والی ادکی پرواہ نہیں کرتا، لیکن مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں خدا و رسول کی توہین کرتا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ خدا کی عظمت اور رسول کی رسالت ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہوں اور میرے نزدیک اہل مذہب ہی کی طرف سے خدا و رسول کی زیادہ اہانت ہوتی ہے۔

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو خدا کا کلام کہنا نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے نشاء کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصور و عدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے۔ میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا، نہ اقوال سلف سے کیونکہ یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں۔ بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں۔

۱۔ چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہونچایا گیا تھا اس لئے نامناسب ہوگا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی ”اشارہ سریع“ یا ”الہام بالسرۃ“ کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم ”بر محل سوچھ بوجھ کے فقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری و ولایت ہوا سیلے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی ”خدا کی دین“ اور نتیجہ ہے اس فطری قوت کا جو فطرتاً انسان میں ولایت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لئے ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا نام درست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اسی اشارہ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔

وحی کا جو مفہوم میں نے متعین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجی جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ سورہ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:-

واوحینا الی ام موسیٰ الن ارضعیم

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں
ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اسلئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔
خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورہ نحل کی آیت ہے:-

واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون

ہم نے شہید کی ٹھنی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔
اس جگہ وحی کے معنی اس فطری ذکاوت کے ہوئے جس سے کام نیکر شہید کی ٹھنی اپنا خوبصورت چھتا طیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورہ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:-

یومئذ یخبرک انھن ربک انھن یوحی لہا

اُس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرے گی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو۔
ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کو یہ بیان بہ زبان مال ہو گا اور اس جگہ وحی کا مفہوم ”ماحول واقضا و ماحول“ قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورہ ”نحم“ میں ارشاد ہوتا ہے:-

فققضا من سبع سموات فی یومین و اوحی فی کل سماء امر

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دیدیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی وہی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق پڑی حد تک

س فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے۔ لیکن آپ شکر تعجب کریں گے کہ الہامِ وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔
سورہ شمس میں نفسِ انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:
”فالمہبطون لہم یحجروا ولتقواہا“

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی۔ یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظِ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ انعام کی یہ آیت:-

وَلَا تَجْعَلُوا لِلْأَعْدَاءِ حِجَابًا بَيْنَکُمْ وَبَيْنَ الَّذِینَ دُفِعُوا بِالْحَقِّ
اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن ساتھ لگا دئے ہیں اور یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لٹو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی ”بُری بات بگھانے“ کے ہوئے۔ یہ بات شکی تو لفظِ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:-

سورہ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُّوحِیْ عَلَیْہِ سَدِیْدُ الْقُوٰی

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے۔

سورہ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ الفاظ کہلائے جاتے ہیں:

وَ اَوْحِیْ اِلَیْ ہٰذَا الْقُرْآنَ لِاَنَّہٗ رَکْمٌ بَیْنَ

مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمہیں بُری باتوں کی طرف سے ڈراؤں۔

سورہ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے:

ذٰلَکَ مِمَّا وُحِیَ اِلَیْکَ رَکْبَ مِنَ الْحِکْمَۃِ

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدَیْ خَزَآئِنَ اللّٰہِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبِ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلٰکٌ

ان اتبع الا ما یوحی الی - (اے رسول کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے خزانے میں نہیں غیب کا

حال جانتا ہوں اور میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے۔
ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے، لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ نظام نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتا، نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحی کے ذریعہ سے چنانچہ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:
وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَكْلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ -

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ، خدا سے باتیں کیا کرتے تھے۔
مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا۔ اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے، لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش گجاتی ہیں پہلے انھیں سن لیجئے

سورہ زخرف کی آیت ہے:
ان جعلناہ قرآنًا عربیًا لعلکم تتقون، وَاِنْ فِي اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلٰی حَکِیْمٌ۔
اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اُس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔
یہ اُم الکتاب ہے اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے۔
لیکن جس وقت ہم سورہ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو ”لوح دام الکتاب“ دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ہو اللہ ذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہذہ ام الکتاب وَاٰخِرُ مِثَابَاتٍ
اس آیت میں ”ام الکتاب“ کو ”آیات محکمات“ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ”مضبوط و مستحکم نشانیاں“ یا
بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں
مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو۔
غرض اعظم سے نیچے اُس نے ایک دائرہ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی۔ اس

لوح کا طول ۷۰ سال کی راہ اور عرض تین سو برس کی راہ تھا۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی بہت کاری کی تھی بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ ”لکھ اسے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تاقیامت ہو گا اس کے متعلق میرے علم کا حال“۔

قلم نے پہلے لوح محفوظ پر ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا یہاں تک کہ درخت کا پتہ پہلنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں لککاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت و انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی، ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی خیال توریت میں منقل ہوا جیسا کہ کتاب استثنایا باب ۱۰ آیتہ الغایت ۵ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی ہی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے تودی تختیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے۔ اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منقل ہوا، چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کیلئے استعمال ہوا وہ یہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوح محفوظ میں درج ہونا چاہئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے۔

لے معلوم نہیں ماہ کس کی مراد ہے، انسان کی، میوہ کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی۔

اب درایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے اُس تصور وحدانیت کے منافی ہے جو مادیت کے بعید ترین خیال سے بھی پاک و منزہ ہے۔

’تفکرو، نطق، الفاظ‘۔ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چلاتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اُس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتے کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے۔ بلکہ سچ پوچھتے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا، جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکہ کی سی حیثیت دیدینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔ ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو۔ فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیکر فوج کو نہ لڑائے۔ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہئے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہو

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا ترسم ہونا یقین کرنا، صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔ قرآن میں جہاں جہاں ”کلام اللہ اور کلمات اللہ“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اُن سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضائ یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس کے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

”نگار“ کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۳۲ء (غالب نمبر) - غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ معد تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ - علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۳۵ء (اردو شاعری نمبر) - اردو شاعری کی تاریخ (دو ہزارانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۳۶ معد بعض صواب قلم کی تصاویر کے ساتھ سین میں ڈیڑھ انچ نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) - ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحہ ۱۴۱ قیمت ۲ روپیہ

جنوری ۱۹۳۷ء (ڈرامہ اصحاب کبف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت - امامت پر پانچ سوال مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے - صفحات ۱۴۴ - قیمت ۲ روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۸ء - تاریخ اسلامی ہند - یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا - صفحات ۱۵۲ قیمت ۲ روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۳۹ء (مصنفی نمبر) - بعض عنوانات ہیں حیات مصنفی - اردو غزل گوئی میں مصنفی کا مرتبہ - مصنفی کی غیر مطبوعہ شہنواں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۴ - قیمت ۲ روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۴۰ء (نظریہ نمبر) - بعض عنوانات - نظریہ کاسملک - شاعری پر تبصرہ - نظریہ ادعوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۲۸ - قیمت ۲ روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

بعض حیرتناک سیاسی اکتشافات

ایک مغربی ماہر سیاسیات کا تفصیلی تبصرہ

دو جنگوں کے درمیان کا زمانہ

سٹر کے ذلیاکس (K. Zilliacus) کی ایک کتاب ہے "Between Two Wars" سرنامن انجل (Sir Norman Angell) - مسننٹ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ موصوفت یورپ کی آٹھ زبانوں کے ماہر ہیں، جنگ عظیم کے دنوں میں انھوں نے نہایت اہم فوجی خدمات انجام دی ہیں، اتحادیوں نے سائیریا (Syria) پر حملہ کیا تھا اس میں بھی شریک تھے مجلس اقوام کے قیام کے وقت سے مجلس کے اہم عہدوں پر فائز رہے، یورپ کی وہ بڑی شخصیتیں جن کو مجلس قوم سے تعلق ہے ان سے ان کی شناسائی ہے اور یورپ کے بڑے بڑے سیاستدانوں سے ان کی دوستی ہے۔ گزشتہ بیس سال میں یورپی سیاست کے مدوجزر کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا ہے۔ یہ سب چیزیں اور ان کا طویل تجربہ اس کا ضامن ہے کہ ان کا بیان یورپی مسائل کے باب میں یقیناً بہت اہم ہوگا۔

یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے 'ماضی' اور 'حال'۔ پہلے میں سکھانے سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں حکومت کے سیاسی رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے بہت سے ایسے واقعات اور رجحانات کا مصنف نے اظہار کیا ہے جو اب تک عوام کی نظروں سے پنہاں تھے۔ دوسرے باب میں ان حالات اور واقعات پر تبصرہ ہے جو جنگ کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ان واقعات و حالات کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور مستقبل سے تعلق پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مئی ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی اور آج مصنف کی پیشین گوئی بڑی حد تک درست اور صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ مقالہ اسی کتاب کی تلخیص ہے۔ (اڈیٹر)

ماضی | جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی سیاست میں جمہوریت کا یہ حال تھا کہ سول سروس کے لئے مقابلہ کا

امتحان تو ہوتا تھا مگر دفتر خارجہ کی تمام اسامیوں کو پُر کرنے کے اختیارات ایک انتخابی بورڈ کے سپرد تھے جو اس کا خیال رکھتا کہ اس محکمہ میں صرف اعلیٰ طبقہ کے افراد منتخب ہوں۔ طبقہ عوام پارلیمنٹ کی وساطت سے داخلی معاملات میں تو اپنے اختیارات ایک حد تک استعمال کر سکتا تھا، مگر جہاں تک خارجی معاملات کا تعلق ہے ان کو سختی کے ساتھ صیغہ راز میں رکھا جاتا تھا چنانچہ سلسلہ سے لیکر سلسلہ تک سیاست خارجہ سے متعلق صرف تین مہائے اور ایک درجن سوالات ایوان میں ہوسنے اور ہر موقع پر حکومت نے اراداً صحیح حالات ظاہر کرنے سے احتراز کیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ عوام کو ان معاملات کے سمجھنے کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خارجی پالیسی صرف حکمران طبقہ کے مفاد سے متعلق سمجھی جاتی ہے اور ایسی حالت میں اگر جمہور کو خارجی سیاست میں درخور حاصل ہو جائے تو ہر وہ طبقوں میں باہم تصادم کا اندیشہ ہے۔ اُنیسویں صدی میں جمہوریت نے حکمران طبقہ کی حکومت کو پے پے شکستیں دیں البتہ خارجی معاملات اور مسئلہ دفاع یہ دو باتیں ایسی تھیں جن پر انقلاب کا اثر سب سے بعد میں ہوا، جب اعلیٰ طبقہ کے مفاد مستدام نہ ہوتے تھے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گزشتہ جنگ عظیم کی گھٹا سر پر آگئی تو عوام ان س اور حکمران طبقہ کے مقاصد جنگ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عوام کو اس کا یقین تھا کہ یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے چھوٹی ریاستوں کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے، عسکریت کے مقابلہ میں جمہوریت کو باقی رکھنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ معاہدات کی حیثیت صرف ردی کاغذ کے پرزوں کی نہیں ہے لیکن درپردہ حقیقت یہ تھی کہ ہمارے حکمران صرف اپنے شہنشاہی مفاد کے لئے تو ان تو (Balance of Power) کو برقرار رکھنے کے لئے لڑ رہے تھے۔ برطانیہ نے اعلان جنگ صرف اس لئے کیا تھا کہ اگر جرمنی نے روس کو شکست دیدی تو یورپ میں اُس کی طاقت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور ہمارے مقابلے میں وہ خم ٹھوکر کر آجائے گا۔

شہنشاہی مفاد کے پیش نظر اتحادی حکومتوں نے ایک طرف عثمانی سلطنت اور جرمنی کی نوآبادیات کو آپس میں تقسیم کر لینے کا سمجھوتا کر لیا تھا اور دوسری طرف عوام کو یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ ہرگز اپنی حکومت میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتحادیوں کی امیدوں کے خلاف جنگ نے بالکل مختلف صورت اختیار کر لی۔ ایک طرف ٹو سلسلہ کے آغاز ہی میں عوام جنگ کی حکمان محسوس کرنے لگے، دوسری طرف امریکہ کی شرکت جنگ و انقلاب روس نے صورت حال بالکل بدل دی اور ہر طرف عالمگیر انقلاب کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ اتحادیوں نے اس موقع پر بڑی ذہانت اور دلیری سے کام لیا۔ ایک طرف انھوں نے امریکہ کے پریسیڈنٹ ولسن (Wilson) کی بیٹھ ٹھونکنا شروع کی اور دوسری طرف مزدوروں کے سر پر ہاتھ رکھ کر ان کو اپنے قابو میں لے آئے۔ ہر چند انقلاب جس کا مقابلہ کرنے میں انھیں ناکامی ہوئی پھر بھی جنگ کو طوالت دینے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

وٹسن سے کس طرح فائدہ اٹھایا گیا
مسٹر وٹسن (جو جمہوریہ امریکہ) مزدور اور معتدل دونوں پارٹیوں میں
حزب کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے عوام
اُن کو اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ چنانچہ وٹسن کی تجاویز کی عمدہ اور آگے چڑھ نکات کی خصوصاً ان لوگوں نے پرزور تائید کی
فرانس، اٹلی اور برطانیہ یوں ہی ان تجاویز سے خائف تھے، عوام ان اس کی تائید نے اور بھی ان کے حواس خراب کر دیے
کیونکہ ان تجاویز سے اتحادیوں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔

چنانچہ ہمارے ارباب حکومت عوام کے سامنے تو اپنی تقریروں میں وٹسن کے نکات کی پرزور تائید کرتے تھے مگر
دہ پردہ انھوں نے وٹسن کی ناکامی کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور وٹسن کی انتھک کوششوں کے باوجود
اتحادی طاقتیں اپنے خفیہ معاہدوں سے دستبردار ہونے کے لئے طیارہ ہوئیں۔ وٹسن کی دلی خواہش یہ تھی کہ حکومتیں
ایمانداری کے ساتھ صلح و امن کی راہ اختیار کریں اور ایک ایسا متفقہ بیان شائع کریں جو اعتدال پسند طبقہ اور مزدوروں
کے لئے بھی قابل قبول ہو۔ سب سے پہلی کوشش اُس نے روس کے ”مارچ واپس“ انقلاب کے بعد کی لیکن وہ
ناکام رہا۔ اُس کو یقین تھا کہ اتحادی اگر اپنے مقاصد جنگ میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیں تو انقلابی روس، علیحدہ معاہدہ
صلح سے باز رہے گا۔ (آگے نہیں کہ وٹسن کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا)۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ہر چند
وٹسن نے صلح کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے چند ماہرین کا تقرر کیا۔ لیکن اتحادی اس اعلان کے لئے بھی تیار نہ ہوئے
کہ ”یہ لڑائی صرف قیام امن کے لئے لڑی جا رہی ہے نہ کہ نوآبادیاتی اضافہ کے لئے۔“ جب ”امریکی صلح کا پروگرام“
طیار ہو گیا تو وٹسن نے کرنل ہاؤس (Colonel House) کو یورپ روانہ کیا تاکہ وہ ”اتحادیوں کو
سمجھائے اور جرمن پروپگنڈا کو کمزور کرنے اور روس کے ساتھ (اتحادیوں کے) تعلقات برقرار رکھنے کے لئے مقاصد
جنگ کا ایک متفقہ بیان شائع کرنے پر مایل کرے۔“

مگر جب کرنل ہاؤس یورپ پہنچے تو اُن کو صورت حال بالکل برعکس نظر آئی ایک طرف پیرس میں وٹسن کی
تجاویز کے ساتھ ہمدردی مفقود تھی اور دوسری طرف لائڈ جارج (وزیر اعظم برطانیہ) نے برطانوی قدامت پسندوں
کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے اُن سے بڑے بڑے وعدے کر لئے تھے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیرس میں اتحادیوں کی
ایک کانفرنس ہوئی، کرنل ہاؤس نے اس موقع پر سخت کوشش کی کہ حسب ذیل تجویز پر سب متفق ہو جائیں:-

”اتحادی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ لوگ یہ لڑائی ظلم اور تادان جنگ کی
فاطر نہیں لڑ رہے ہیں۔ اُن کی تمام قربانیوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کے سر سے ”مکرمیت کا سایہ“ اٹھ جائے اور
اور تمام قوموں کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ جس طرح بہتر سمجھیں اپنی زندگی گزاریں اور اپنی فلاح و بہبود کے
لئے جو مناسب تدابیر چاہیں اختیار کریں۔“

مگر اتحادی اس بات کے سننے پر بھی آمادہ نہ تھے اور کسی طرح بھی انھوں نے حصول نوآبادیات کے خیال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ کرنل ہاؤس اپنی اس ناکامی سے حد درجہ بد دل ہوا اور اُس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء) میں لکھا:-

”مجھ کو اتحادی اقوام کے سپاہیوں اور جہازرانوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، جن کی آنکھیں ہم سب لوگوں پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جسوقت کانفرنس کے لئے ہم سب یہاں یکجا ہوتے ہیں تو مجھ کو اس کا پورا احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنا فرض نہیں ادا کر رہے ہیں۔“

اس موقع پر صدر وٹسن نے اپنے مشہور عالم چودہ حکمت شایع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ اتحادی مالک کے معتدلیں اور مزدور یہ سمجھنے لگے کہ اتحادی حکومتیں یہ لڑائی حصول امن کی خاطر لڑ رہی ہیں مگر خود اتحادی طاقتیں اپنے شہنشاہی مفاد سے دستبردار نہ ہوئیں۔ ہر چند ان لوگوں نے بعد از خرابی بسیار وٹسن کی تجاویز کو قبول تو کر لیا مگر اس بھی ان لوگوں کی ایک گہری چال تھی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ کی پوزیشن سے اتحادی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہاؤس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء) میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ:-

”صلح اُس قسم کی ہوگی جس کی بھلکوتی تھی۔“

امریکہ کی شرکت جنگ کے وقت سے صدر وٹسن نے اتحادی مالک کے معتدلیں اور مزدوروں کو اس کا یقین دلایا کہ شرائط صلح پر ایمانداری کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب صلح کانفرنس میں اُس کو ناکامی ہوئی تو اُس کے سامنے صرف دو راہیں تھیں، ایک تو یہ کہ جن حکومتوں کے ساتھ اُس نے ناتا جوڑا تھا، اُن کو خیر باد کہے یا اُن عوام کے ساتھ غداری کرے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا تھا اور اُس نے موخر الذکر صورت کو ترجیح دی۔

مزدوروں کو کس طرح فریب دیا گیا انگلستان کی مزدور پارٹی دوسرے مالک کی مزدور پارٹیوں کی طرح اس تجویز کی پابند تھی کہ:-

”طبقہ دار جنگ اور سیاسی صورت حالات کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جنگ کو روکنے کے لئے وہ موثر اقدامیں ہر امکانی تدبیر کو بروئے کار لائے، اگر اس کے باوجود جنگ چھڑ جائے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ فوراً مداخلت کر کے جنگ کا خاتمہ کر دیں اور جنگ کی وجہ سے جو سیاسی اور اقتصادی تھپل پیدا ہو اُس کے ذریعہ سے عوام کو بیدار کریں تاکہ جلد سے جلد سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو جائے۔“

لیکن اس تجویز کے باوجود برطانیہ کی مزدور جماعت کے بیشتر افراد نے جنگ کی تائید کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو اس کا پورا یقین دلایا گیا کہ یہ لڑائی بلجیم کے تحفظ، معاہدات کے احترام اور جمہوریت کی بحالیت کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ برطانوی جنگی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مزدور پارٹی کی حمایت، اصل کرنے کی کوشش مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا اعتراف

خود لائڈ جارج نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ :-

”اگر مزدور پارٹی اس جنگ کی مخالفت کرتی تو جنگ کا موثر انداز میں جاری رکھنا محال ہو جاتا اور کامیابی کی راہ میں بڑی دشواریاں حاصل ہو جاتیں۔ ٹریڈ یونین (Trade Union) کے سب سے بڑے لیڈر نے ہماری کامیابی کے لئے دوران جنگ میں جان توڑ کوششیں کیں۔ مزدوروں کی امداد کے بغیر جنگ میں کامیابی محال کرنا قطعاً ناممکن تھا۔“

جب حکومت نے جبریت فوجی بھرتی کا پہلا مسودہ پیش کیا تو مسٹر آر تھر ہنڈرسن (Arthur Henderson) اور دوسرے مزدور لیڈروں کے لئے تھوڑی سی دشواری پیدا ہو گئی کیونکہ ٹریڈ یونین کانگریس اپنے اجلاس برٹل (Brussels) میں حکومت کی اس تجویز کے خلاف اظہار تاراضگی کی ایک تجویز پاس کر چکی تھی۔ آخر کار جب مسٹر اسکوٹھ نے مسٹر ہنڈرسن کو اس کا یقین دلادیا کہ اس مسودہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ صنعتی حلقوں میں جبریت فوجی بھرتی ہوگی تو مسٹر ہنڈرسن نے اس مسودہ کی حمایت میں تقریر کی ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسکوٹھ کی وزارت بدل کر قومی حکومت قائم ہوئی اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم نے مزدور لیڈروں کو قومی حکومت میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے کہا :-

”یہ بالکل ظاہر ہے کہ خواہ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا اس ملک میں کوئی حکومت چل رہی نہیں۔ کتنی جلد تک کہ مزدور پارٹی (میں یہاں پر تائید کا لفظ استعمال کروں گا) ملک اس کے ساتھ اتحاد عمل نہ کرے۔“

اسی تقریر میں آگے چل کر انھوں نے یہ بھی کہا کہ :

”یہ تو کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی وزیر مزدور نمائندوں کے مشورہ کے بغیر صلح کی گفت و شنید کا آغاز کر سکتا ہے۔“

مگر جس وقت مسٹر لائڈ جارج یہ تقریر فرما رہے تھے اُسی وقت وہ اپنی جہز پر یہ بھی طے کر چکے تھے کہ ان کی پیش رو حکومت نے مزدوروں سے جو وعدے کئے ہیں اُس کو وہ پورا نہ کریں گے۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں انھوں نے کابینہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسا مسودہ تیار کیا جائے جس کی رو سے ساٹھ سال تک کی عمر کے تمام لوگ فوج میں بھرتی کئے جائیں اور اگر ممکن ہو تو عورتوں کو بھی مستثنیٰ نہ کیا جائے مگر کابینہ نے اس کے بجائے نیشنل سروس بورڈ (National Service Board) کا قیام زیادہ مناسب سمجھا اور اس محکمہ کے افسر اعلیٰ مسٹر نیل جیمز لین کو بنایا گیا۔ مگر مزدور جماعت کی مخالفت کی وجہ سے یہ اسکیم ناکام رہی اور مسٹر جیمز لین کو ان کی ناپالی کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا۔ انقلاب روس سے پہلے انگلستان کی مزدور پارٹی حکومت کے پیچھے پیچھے کی رہتی تھی اور صلح کے باب میں اُس کے کوئی ذاتی خیالات نہ تھے مگر انقلاب روس نے صورت حال بدل دی۔ ناز کی حکومت کا خاتمہ کوئی نو سو

مزدوروں کو جو کامیابی حاصل ہوئی اُس نے اس ملک کے مزدوروں کو بھی بہت کافی تقویت پہنچائی اور انہیں ایک نوع کی خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور ملک کی تمام مزدور جماعتوں نے یہ تجویز پیش کرنی شروع کر دی کہ ”موجودہ حکومت، صلح کی طرف قدم اٹھانے کی اہل نہیں ہے“

۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو مزدور پارٹی اور ٹریڈ یونین کانگریس کا ایک متحدہ قومی جلسہ ہوا، جس نے جنگ کو ختم کرنے کے متعلق مزدوروں کی ایک متعینہ پالیسی کا اظہار کیا۔ یہ تجویز ولسن کی تجاویز اور روسی انقلابیوں کی تجاویز سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ مزدوروں کے اس اقدام نے اتحادیوں کو بڑی حد تک پریشان کر دیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں جنگ کی مخالفت میں جلسے ہو رہے تھے اور فوجی بھرتی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں جس سے عام انقلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

مسٹر لائڈ جارج نے اس موقع پر مزدوروں کی تجویز کو سامنے رکھ کر ایک تقریر مرتب کی اور آزاد خیال متعین کو بلا کر سنائی۔ اُس کے بعد ٹریڈ یونین کے جلسہ میں اسی تقریر کو دہرایا اور سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ مزدوروں کی صلح کی تجویز کسی جال میں بھی ”اُس تجویز صلح سے مختلف نہیں ہے جو ہماری حکومت نے مرتب کی۔ ہم میں اس کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد جنگ یورپ کے صرف اُس قانون کی حفاظت کرنا ہے جس کو آج ٹھکرایا جا رہا ہے۔ ہم معاہدوں کی شرائط کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں اور یونین کو دوبارہ زندہ کرنا ہمارا مقصد ہے“

خود مسٹر لائڈ جارج کا بیان ہے کہ اس تقریر کے ساتھ ہی تمام مخالفت کا فور ہو گئی اور دو لاکھ پچاس ہزار روگ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے جو مستثنیٰ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہی مزدور پارٹی نے ”اہل برطانیہ کے مقاصد جنگ“ کے نام سے ایک بیان شائع کیا جس میں خاص طور سے وزیر اعظم کی تقریر کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ:-

”۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو وزیر اعظم نے ٹریڈ یونین کانگریس کے نمائندوں کے سامنے جو معرکہ آرا تقریر کی ہے وہ

ان تمام تقریروں میں اہم ترین درجہ کی ہے جو اب تک دنیا کے سیاستدانوں نے موضوع جنگ پر کی ہیں۔“

مسٹر لائڈ جارج نے اپنے بیان کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بالفور کو ہدایت کی کہ وہ صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن سے استعفا کریں کہ وہ بھی ایک بیان اس کی تائید میں شائع کریں۔ مسٹر لائڈ جارج نے کسی جگہ بھی اپنی اس ہدایت کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ کرنے کی کوئی وجہ تھی مگر کونسل باؤس کے کاغذات (the intimate papers of Col. House) میں وزیر خارجہ کا یہ پیغام (مورخہ جنوری ۱۹۷۷ء) موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

”کچھ عرصہ سے ٹریڈ یونین کے نمائندوں اور وزیر اعظم کے مابین گفت و شنید ہو رہی تھی، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ابتدائے جنگ میں حکومت نے جو وعدے مزدوریوں سے کئے تھے ان سے وہ آزاد

ہو جائے۔ قومی نقطہ نگاہ سے یہ بید ضروری ہے تاکہ وہ اپنی فوجی طاقت بڑھائے اور مغربی محاذ جنگ پر فوجیں روانہ کی جاسکیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ حکومت برطانیہ فوراً اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کر دے۔ وزیر اعظم نے اعلان کر دیا ہے اور یہ اعلان مزدوروں نیز پارلیمنٹ کی مخالفت پارٹی سے مشورہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ (جلد سوم صفحہ ۳۴۹)

تار کے اختتامی الفاظ یہ ہیں:-

”وزیر اعظم کو اعتماد ہے کہ اس طرح کا بیان صدر کی اُن سابقہ تقریروں کے طرز پر ہو گا جن کا انگلستان اور دوسرے ممالک کی رائے عامہ نے پرزور استقبال کیا ہے“

مگر ولسن کو اس پیغام کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ تو پہلے ہی اپنے چودہ نکات کے سلسلہ میں ایک تقریر کرنے کا قصد کر چکا تھا۔

مسٹر لارڈ جارج نے، ولسن کی تقریر کے بعد ۱۸ جنوری سلسلہ کو پھر مزدور نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ:-

”لڑائی جیتنے یا کسی بڑے شہنشاہی مقصد کے حصول کا یہاں سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پندرہ

دن قبل اپنے مقصد جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہی مطالبہ صدر امریکہ کا بھی ہے۔ ہم تو صرف اُس مقصد کو حاصل

کرنا چاہتے ہیں جو بیک وقت حکومت امریکہ ٹریڈ یونین کانگریس اور ہماری حکومت کا مقصد ہے۔“

آپ نے دیکھا کہ مزدور جماعت صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کونسا مقصد ہے جس کے لئے اُن کو جنگ کی آگ میں جھونکا جا رہا ہے اور حکومت نے کس طرح اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔

(باقی)

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر - قیمت معہ محصول ۱۱/۴
منیجر نگار گھنٹو

مکتوبات نیاز

بعدہ نواز، گرامی نامہ کا شکریہ۔ جو گفتگو آپ نے چھپڑی ہے، اس میں شک نہیں بہت دلچسپ ہے، بشرط
اکہ آپ کی طرح کسی کو فراغ حاصل ہو اور اس سے لطف اٹھانے کی توفیق بھی۔
میری حالت تو اس دنیا میں ایسی ہے جیسے کسی امیر کے دسترخوان پر ضعف معده کا مریض! کسا منے سب کچھ ہے اور
پھر کچھ نہیں۔ اکبر مرحوم کا شعر ہے:-

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہو اک جھلک چہ ہم کیا ہیں، اک نظر ہیں

مگر میرا نظریہ، کائنات کے متعلق کچھ اور ہے۔ آپ نہیں گے کہ پھر شاعری شروع کر دی، لیکن آپ نے بحث ہی ایسی چھڑی
ہے کہ سوائے شاعری کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

غالب کہتا ہے:-
”اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ“۔ بیدل اپنی زندگی کا سامان
یوں پیدا کرنا چاہتے ہیں:-
”خونے پہ جگر جمع کن و رنگ بروں آ۔“
میں بالکل بخیر انداز گزار جانے کا قائل
ہوں، لیکن ”متوکلانہ“ نہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا آجنگ میری سمجھ میں نہیں آیا، کیا لذت رکھتا ہے۔

تادل بد نیا دادہ ام در کشمکش افتادہ ام
اندوہ فرصت یک طرت، ذوق تماشایک طرت

یقیناً بعض اوقات مجھے بھی اس گھڑی کا خیال آجاتا ہے، جب دلور کے ساتھ احساس بھی ختم ہو جائے گا، لیکن مستقبل
کو ”حال“ تک کھینچ لانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ زمانہ اور زمانہ کی تباہ کاریاں اپنے اختیار میں نہیں، انکو بھلا دینا بیشک ایک
حد تک اختیار میں ہے۔ زندگی سے گزر جانا اتنی بڑی بات نہیں جتنا زندگی گزار دینا۔ آپ آسان بات کو سوچ رہے ہیں
اور میں اس کو جو آسانی نہیں۔

بہر حال، اور کچھ کام نہ ہو تو آپ کی طرح بیٹھ بیٹھ سوچتے رہنا ککل کیا ہو گا ہے مزد کی چیز، لیکن جو آج کی انجمنوں
میں گرفتار ہے اسے اس بھلا دے میں نہ ڈالے ورنہ وہ کچھ نہ کر سکے گا۔

ہماری سوگوار سی اور اندوہنا کی کا بڑا تعلق یہاں کی حکومت سے بھی ہے کہ ہاتھ پاؤں چلنے کی حالت میں بھی وہ
بقا و حیات کی ذمہ دار نہیں، صنعت و دراندگی کے زمانہ کا کیا ذکر ہے۔ آپ لوگ سرا۔ دار ہیں آپ کی سمجھ میں یہ بات مشکل
سے آئے گی، میں مزید ہول اور سوائے اس کے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اس بحث لطیف میں یہ کمرہ عنقریب آپ کو پسند آئے گا، لیکن مجھے آپ کا یہ ”چبا چبا کے باتیں کرنا“ کب پسند آتا ہے۔ میں آپ کی سنتا ہوں تو آپ بھی میری سنتے۔ ایک غریب کی تسکین کے لئے یہ بھی کم نہیں

اسے تو مجھوئے خوبی بہ چہ نامست خواہم!

پورے دو دن یہ سوچتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ آپ کے خط کا جواب لکھوں لیکن باور کیجئے کہ ہمت نہ ہوئی، جب ضروری تھی تب بھی دل ہر وقت کانپتا رہتا تھا، اور اب کہ ضروری نہیں، وہی حال ہے۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے کہ آپ مجھ سے جس قدر دور ہیں، اتنا ہی مجھ سے قریب ہیں۔ اس قدر قریب کہ ”نتواں ترا و جان را ہم امتیاز کردن“!

آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا ہے اس کا امتضاء صرف یہ تھا کہ میں خود حاضر ہو کر ”خراج نیایش“ پیش کرتا، لیکن افسوس ہے کہ اس کی اجازت نہیں، اور اب بھی تو مصلحت نہیں، اس لئے آپ ہی بتائیے کہ جو باتیں صرف لکھا ہوں سے کرنے کی ہیں انہیں الفاظ سے کیونکر ادا کروں!

آپ کی نئی زندگی سے مجھے دلچسپی تو نہ ہونا چاہئے، لیکن اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی باقی رہی تو مجھے افسوس ہوگا میرے لئے تو زندگی کے تجربوں میں اب تلخ و شیریں کا امتیاز باقی نہیں رہا، لیکن خدا انخواستہ اگر آپ کو کسی وقت اس پر غور کرنا پڑا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی۔

اگر اجازت ہو تو ایک درخواست پیش کروں۔ اور وہ یہ ہو کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے یہ سمجھنے کا موقع دیجئے کہ آپ مجھے بھلا دیا ہے۔ مجھے زندہ رہنے کا شوق تو نہیں ہے لیکن ضرورت یقینی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہو جب ماضی کی تلخ کامیاں مجھے یاد نہ آئیں۔ آپ کے ساتھ میرے ماضی کا تعلق اتنا شدید ہے کہ میں آپ کو ”اپنا گزرا ہوا زمانہ“ کہتا ہوں، اس لئے آپ کیوں حیرت حال میں اس نوش کو شامل کریں، جس کے تحمل کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں۔ لیکن اگر آپ نے یہی فیصلہ کر لیا ہو کہ ہر صورت مجھے مرنا ہی چاہئے، تو بسم اللہ۔ رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو!

اللہ اللہ، کیا تیر ہیں، ذرا دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے چھوٹے ہوئے گزر جائیں اور میرے دامن میں لگ لگ جائے! کیوں دیوانے ہوئے ہو۔ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا!

میں قیامت تک تمہارے کہنے میں نہ آؤں گا۔ جانتا ہوں کہ تم سے کوئی معاملہ کزنادل کا خون کرنا ہے۔ اور اب یہاں اس کی تاب نہیں۔

میں یوں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں، لیکن تمہارے عہد و پیمان کی تائید مجھ سے ممکن نہیں۔ اگر تمہاری کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ میں تمہاری ”قول و فکر“ کا ضامن بن جاؤں، تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں تمہاری کامیابی کا ساتھی نہیں۔

باب الاستفسار کیا آپ مسلم ہیں؟

(جناب محمد مصطفیٰ اللہ صاحب - بارکپور)

میں آپ سے ایک نہایت مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں اور مختصر ہی اس کا جواب چاہتا ہوں یعنی یہ کہ آپ کیا واقعی مسلم ہیں، اگر ہیں تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساری دنیا کے تمام مسلمان، مسلمان نہیں ہیں اور اگر آپ مسلم نہیں ہیں تو پھر اس کا اعلان کیوں نہیں کرتے۔

(نگار) میں واقعی مسلمان ہوں، اور اگر میرے مسلمان رہنے سے ساری دنیا دائرۃ اسلام سے خارج ہوئی جاتی ہے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ لیکن یہ خدشہ آپ کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ اسلام ایسی جنس کیاب ہے کہ وہ سوائے میرے کہیں اور دستیاب ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ میری "نامسلمانی" کا مرتبہ اتنا بڑھائیے کہ مجھے خود اس سے حجاب آنے لگے۔ معاف فرمائیے آپ نے جس زاویہ نگاہ سے یہ سوال کیا ہے وہ درست نہیں اور اس لئے آپ کی خواہش کے مطابق بہت زیادہ مختصر جواب سے آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

آپ کو میرے اسلام کی طرف سے صرف اس لئے شبہ ہے کہ میرے عقاید، عام عقاید سے علیحدہ ہیں، لیکن عام عقاید کا اختلاف ایک شخص کو اس جماعت یا قوم سے علیحدہ نہیں کر سکتا جس میں اس کا نشو و نما ہوا ہے۔ اس لئے جب تک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ مجھے ملت اسلامی کے دائرہ سے خارج کر دے، خواہ میرے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

حیرت ہے کہ میں تو ایک حور و قصور پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان کو بھی باوجود اس مادیت پرستی کے مسلمان سمجھوں اور وہ میرے اسلام میں جو کثیر اخلاق و روحانیت ہے شبہ کرے۔ اب اس قسم کی طفلانہ باتوں کا زمانہ نہیں رہا ہے، کچھ کام کی باتیں کیجئے۔ میں اگر تعلیمات اسلام کو کسی ایسے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں جو آپ کے نقطہ نظر سے مختلف ہے، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم آپ علیحدہ ہیں۔

حسک واحد و عبارت انشائی

رہ گیا کفر و اسلام، سو اب یہ اصطلاحیں بالکل بے معنی ہیں اور صرف مولویوں اور پندتوں کے روٹی کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ آپ اس جھگڑے میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کیجئے اور نہ مجھے کافر سمجھ کر اپنی عاقبت خراب کیجئے۔

بخشن کفر و ایمانے کجاست

خود سخن در کفر و ایمان می رود !

تنوعات

گزشتہ تین ہزار سال میں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ جانین زلزلہ کی نذر ہوئی ہیں ————— دُنیا میں دو دھچلانے والی مخلوق ۱۳ ہزار قسم کی ہے۔ چڑیوں کی قسمیں ۲۴ ہزار ہیں اور حشرات کی سات ہزار ————— کوئے دن بھر میں کم از کم ۲۵ مرتبہ پانی پیتے ہیں ————— اگر دو سوانح والی نئی دوہین کے ذریعہ سے جو حال ہی میں طیارہوئی ہے، ایک میل کے فاصلہ پر کسی گھسی کو دیکھا جائے تو اس کی آنکھیں تک نظر آئیں گی ————— امریکن ہٹلوں کے کاروبار میں پانچ لاکھ پچاس ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں جو سالانہ ۲۰ کروڑ آدمیوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں ————— شنگھائی میں روزانہ اخبارات بجائے فروخت کرنے کے زیادہ تر کرایہ پردے جاتے ہیں اور ایک ہی کاپی متعدد آدمیوں کو دیکر ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ کرایہ وصول کیا جاتا ہے ————— لندن میں ہر مربع میل پر سالانہ ۲۴۰ ٹن کابل گرتا ہے ————— کوئین چائنا میں طلاق دینا بہت آسان ہے، چار آدمیوں کو جمع کر کے چاول کھانے کی تیلیوں کو توڑ دیا اور طلاق ہو گئی ————— ہیرا توڑنے کے کانٹے اس قدر نازک و صحیح ہوتے ہیں کہ پلک کا ایک بال بھی اس کے توازن کو متاثر کر سکتا ہے ————— امریکہ میں اسوقت تین کروڑ انسان ایسے بچتے ہیں جو نسل کے لحاظ سے جرمن ہیں ————— دُنیا کے تمام سمندر ۵۰۰۰۰۰۰۰ مربع میل زمین گھیرے ہیں۔ گویا کرۂ ارض کے ۷۰ فی صدی حصہ پر پانی کی حکومت ہے ————— یہ نپولین کی ایجاد تھی کہ مکانوں پر نمبر ڈالتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ایک طرف طاق نمبر پڑیں اور دوسری طرف جفت ————— فرانس کی اکاڈمی کا بیان ہے کہ یورپ میں ۶۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ساری دنیا میں ۲۷۹۶ ————— اوسط وزن سر کے بالوں کا چھ اونس ہوتا ہے۔ بال کا نشوونما ہر مہینے آدھا انچ ہے اور اس کا قطر انچ کا پچیسواں حصہ ————— نوزائیدہ بچے صرف دو باتوں کا خوف لیکر دُنیا میں آتے ہیں ایک گرنے کا خوف دوسرا بلند آواز کا، باقی جتنے خوف ہیں وہ اکتسابی ہیں ————— ہر مرتبہ جب گلاس میں پانی پیا جاتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ پتلا ہو جاتا ہے ————— اگر بارش اس پانی کو واپس نہ دے جو سمندر سے حاصل کرتی ہے تو تمام سمندر تین ہزار سال میں خشک ہو جائیں۔

یاد

(ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ)

میں ہوں فسرہ اک کلی گزری ہوئی بہار کی
 جدول و لفرب ہوں صفحہ روزگار کی
 درد بھری اک آہ ہوں قلب امیدوار کی
 خاک ہوں میں جلی ہوئی عشق کے شعلہ زار کی
 The ashes in the hearth of lust
 year's fire.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

میرہم زخم ہائے دل چارہ درد زندگی،
 غم بھی نصیب غم بھی ہوں راز بلند و پست بھی
 جمع ہے میرے سائے میں دور کہن کی ہر گھڑی
 میں ہی تو سجدہ گاہ ہوں ماضی ناگزشتہ کی
 I am the balm that softens all life's
 The heights, the depths, the anguish & scars
 Into my cooling dark your minutes the stars
 I am the temple of the living past.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

میں ہی نہیں خوشی کے دن میں ہی گھڑی لال کی
 میرا ہی طاق بخودی قبر ہے ہر خیال کی
 خندہ شاد کام ہوں آہ شکستہ حال کی
 میں ہوں صدائے بازگشت نغمہ لازوال کی
 I am the days you joyed, the days, you
 In my vast vault of silence safely kept
 I am your laughter, I your sobbing cry
 The Echo of a voice that can not die.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

حلقہ زلف شب ہوں میں سلسلہ سحر بھی میں
 میں ہوں وجود کائنات موت سے بغیر بھی میں
 میرا ہی نام "کل" بھی ہے "آج" کا مستقر بھی میں
 زیست بھی میں فنا بھی میں غلہ بھی میں سقر بھی میں
 I am the link that bridges Night & Dawn
 I am the soul that lives when all is gone
 The yesterday, when this today shall be
 I am your life, your death, your hell
 I am memory.

یعنی میں اُس کی یاد ہوں

فانی بدایونی

آدم گھنٹہ

ایک بل میں

یکن جابوں میں چھپ کے شیطان گیت اپنا سنار ہاڑ
رگوں میں ہوا رت عاش پیدا دماغ ماؤف ہو چلا ہوا
فضا میں تازہ ہوا اکا اک سانس کیلئے بھی گزر نہیں ہوا
اور اسکی تہ میں ہلاکتوں کی تباہ کاری چھپی ہوئی ہوا
غلط چکیٹ سودائیں بائیں نقوش حسرت چھپے ہوئے ہیں
اُدھر سے اکال آہی ہوا دھر سے اکال جا رہی ہوا
ہیں دو ہیں دائیں بائیں پیسہ ہوسکم اوپر شاؤٹ ہینس
جگہ جگہ سرخ تختیوں پر نظر کے آگے ہوا لفظ "خطہ"
زمین پیہم لرز رہی ہوا، فضا میں رعشے سے چھا رہی ہیں
دماغ و دل میں ہوا روح پیدا بغاوت و احتجاج کی سی

الہی کس چیز کا تجس مجھے یہ عالم دکھا رہا ہوا
خلاف معمول اتنی تیزی سے آج دل کیوں دھڑک رہا ہوا
زمین پہ سورج کی روشنی کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا
جو سنگ رووازہ ہو کسی جاتو اسچ کرچ پڑی ہوئی ہوا
ہر ایک کی شے میں ہر کثافت ہر ایک کے نے میں صحتیرے ہیں
برکیٹوں پر کسے ہوئے موٹروں کو بجلی چلا رہی ہوا
نظر کی حد تک لگی ہوئی ہیں بڑے سے اکال میں مشینیں
قدم قدم پر ہلاکتوں کا مہیب سامان ہو رہتا ہوا
وہ شور پیدا ہوا انجنوں سے کہ بام و درتھر تھرا رہی ہیں
تمام منظر کیفیت چھا رہی ہوا کچھ اختلاف کی سی

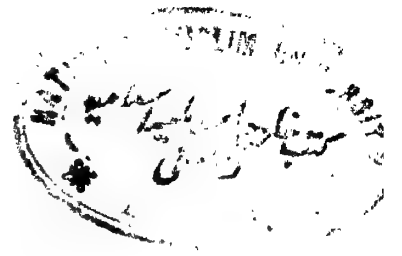
ام بنکر انھیں مشینوں کے ساتھ بیٹھا آدمی بھی،
 جانے کیوں تیرگی میں اسکو مٹری ہو ایس ہو میں گوارا
 ایک لوطے کے ڈھیر میں دو جہاں اسکے لئے ہویدا
 نہیں کاہن کے جبرو اسکو نہ جانے کیوں ملگئی ہوا راحت
 ہایک مردود و دو جہاں ہو جو اپنی خود داریاں مٹا دے
 غافل انسان موت میں بھی سمجھ رہا ہو فروغ ہستی
 نوں کی قیمت پہ تپتا ہو یہ ذوق و شوق و کمال اپنا
 ماہو تہذیب کا پیمبر اور اس کو اتنی خبر نہیں ہے
 ناع انسانیت گنوائی ہو اسنے لوطے کے ٹھیکروں پر
 ہیں ہو اسکی اپج کو کوئی اب اسکے انجام سے تعلق
 یالی جنت کے سامری نے اسے شکنجے میں کس لیا ہو
 مڑا ہوا ہو خموش و ساکت مشین کے دیوتا کے آگے
 اور اسکے ہمراہ پس رہی ہو متاع تسکین زندگی بھی
 نہ جانے کیوں ظلمتوں میں اسکے نصیب کا آگیا ستارا
 مشین اسکے لئے ہو دنیا، مشین اسکے لئے ہے عجبی
 رگوں سے ہوتی ہو خون کھینے میں اسکو حاصل نئی مسرت
 جو کند سگوں کی خاطر اپنا ضمیر کچلے، حیا گنوا دے
 رگوں میں یہ خون کی کمی کو سمجھ رہا ہے نفوذ مستی
 یہ جھوٹے سایوں میں دیکھتا ہو جلال اپنا جمال اپنا
 جسے یہ جلوہ سمجھ رہا ہے وہ اسکا نقد نظر نہیں ہے
 ہنر کی دولت کو اسنے قربان کر دیا چند کوٹلوں پر
 نہیں ہو بے روح انجنوں پر مسیر اسکو کوئی تفوق
 فریب دولت کے تیز ناگوں نے اسکو غفلت میں مٹس لیا
 بریک پر ہاتھ بندھ گئے ہیں نگاہ ہمتی نہیں شل سے

اثر یہاں سے نکل کے بھاگو یہ بزم انسانیت نہیں ہے

یہاں ہو شیطان کی حکومت خدا کی یہ مملکت نہیں ہے

فضل الدین اثر ایم۔ ا۔

غزل

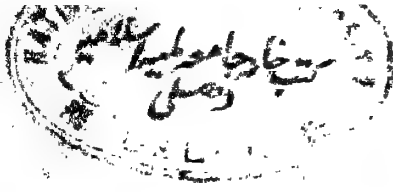


ماصلِ عشق تھا وہ عہدِ تنہا اپنا
ماہلِ لطف ہے خود آج مسیحا اپنا
رنج و راحت سے جدا تجھ سے میں کچھ چاہتا ہوں
کھو دیا لے ترے نیرنگِ کرم نے وہ بھی
مقصدِ زیست کی تعیین میں حیراں ہوجاں
اُن کا وہ حال کہ جیسے کوئی دولت پالی
غور سے دیکھ مجھے میرے مٹانے والے
ہائے وہ دن کہ دو عالم سے تو کیسوی ہو کر
ورنہ ہم اور غمِ ناشنوائی، توبہ
وصل کے دھوکے میں کھو بیٹھے شکیبائی بھی
کیا خبر تھی کہ غمِ عشق کا حاصل ہوگا
بچر تو تمکینِ شب ہجر کا کٹنا معلوم
زندہ رہنے ہی پہ ٹھہیرا ہے جو مرنا اپنا

تمکین (سرست) حیدر آبادی

تقریباً ہر ماہ

آپ حضرات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے کہ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ اُسی ماہ کے
انٹرک دفتر میں آجانی چاہئے ورنہ ڈاکخانہ کے جدید قانون کے زیر اثر ہم پچھلے ماہ کے پرچہ پر ایسے ٹکٹ لگا کر بھیجے پر مجبور نہ
ہوں گے بعض حضرات بیزنگ طلب کر کے واپس کر دتے ہیں۔ آئندہ ایسے کسی خط کی تعمیل نہ ہوگی اگر ایسے ٹکٹ وصول ہوں گے
ہیجر بخار



نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپے ششماہی تہی روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ہمیشہ یاد رکھئے کہ ہرچہ نہ ہو پونچھ کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
"منجر" نگار

جلد (۳۸)	فہرست مضامین اگست ۱۹۶۱ء	شمار (۲)
----------	-------------------------	----------

- | | | |
|----|---|----|
| ۲ | ملاحظات - قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے - ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان | ۲ |
| ۹ | عربوں کی سیاسی بیداری - محمد تقی صدیقی | ۹ |
| ۲۵ | ریڈیو کے آس پاس - (پروفیسر) رشید احمد صدیقی ایم۔ اے۔ | ۲۵ |
| ۳۰ | مرزا ابوالحسن آصف خاں - کوثر چاند پوری | ۳۰ |
| ۴۱ | سیف - ل۔ احمد اکبر آبادی - (اخذ و اقتباس از ہندوستانی | ۴۱ |
| ۵۵ | کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟ - امام۔ اکبر آبادی | ۵۵ |
| ۵۸ | نیازی آزاد خیالی - محمد عبدالشکور فکر نودی | ۵۸ |
| ۶۱ | باب الاستفسار (روح محفوظ اور خطاب و ثواب) | ۶۱ |
| ۶۵ | مطبوعات محصول - | ۶۵ |
| ۷۱ | دنیا میں صرف ایک گھر ہے اور ایک مسلمان! | ۷۱ |
| ۷۷ | منظومات - امیر القادری - طفیل احمد خاں - فضل الدین اثر - خلیل اللہ قریشی | ۷۷ |

منکار

ادبیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۳۸	اگست ۱۹۷۷ء	شمار - ۲
----------	------------	----------

ملاحظات

قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے

یہ ہے اصل بحث جو میرے اور ہندوستان کے بعض مولویوں کے درمیان ماہر النزاع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن انسانی کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے اور اس کے ثبوت میں وہ ”وحی یوحی“ اور ”لوح محفوظ“ والی آیات کو پیش کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ قرآن کا وحی ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے اور ”لوح محفوظ“ کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی میرے نزدیک درست نہیں (ملاحظہ ہو منکار جولائی سنہ ۱۹۷۷ء)۔ اس پر مجھے جتنی گالیاں مولویوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے (جو ان کے پد و پال گنڈا کے زیر اثر ہیں) دی جا سکتی تھیں، مل چکی ہیں اور مل رہی ہیں لیکن مجھے یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ جو دلائل میں نے اس عقیدہ کی تردید میں پیش کئے ہیں ان کا بھی جواب کسی نے دیا یا نہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ شاید اخبار الزفر میں دارالمنصفین کے کسی رفیق نے کوئی جواب شائع کیا ہے اور اخبار حق میں بھی کسی مولوی صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے۔ بہر حال یہ دونوں مضامین میرے سامنے نہیں آئے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا ہے اور وہ میرے لئے باعث تسکین ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

ان لوگوں کی طرف سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میری ترہ میں لکھتے ہیں وہ میرے پاس۔
حالاںکہ اصولاً اسے نگار ہی میں شائع ہونا چاہئے، تاکہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں میں جو گمراہی میرے مضامین سے پیدا
ہوتی ہے وہ دور ہو سکے۔ اس کے علاوہ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ میرے شبہات ہوتے ہیں عقل کی بنا پر یا پھر استشہاد
غرائفی پر، اور وہ جواب دیتے ہیں روایات سے۔ یعنی اگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلاں بات فلاں عقلی دلیل کی بنا پر یا فلاں
ایت کی رو سے قابل قبول نہیں، تو وہ اس دلیل کی تردید تو کرتے نہیں بلکہ صرف احادیث و تفاسیر اور اقوال کا پرھل
پیش کر دیتے ہیں یعنی ایک طرف وہ مجھے مرتد و کافر بھی کہتے جاتے ہیں اور دوسری طرف دلیلیں پیش کرتے ہیں جو
ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک مولوی صاحب نے تو جواب میں یہاں تک
لکھ دیا کہ ”قرآن کو تو خدا کا کلام کفار قریش نے بھی مان لیا تھا۔“ یہ سنکر مجھے بہت ہنسی آئی، اگر وہ مجھے تھے تو میں انکو
صرف یہ جواب دیتا کہ ”مولانا محمد اللہ میں کفار قریش میں سے نہیں ہوں، اور نہ کفار قریش کو اتنی اہمیت دیتا ہوں
کہ ان کا کسی بات کو مان لینا میرے لئے دلیل ہو سکے۔“

میں نے عبدالمجید صاحب دریا بادی کو بھی لکھا تھا (جو اسوقت اسلامی دنیا کے تنہا محاسب ہیں) کہ نگار کے
صفحات، ان کی گالیوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، (کیونکہ سوائے گالیاں دینے کے انھیں اور آتا ہی کیا ہے میں انکے
پر ہر لفظ کو مجسّمہ شائع کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں عقاید میں کیوں کسی کی تقلید کروں اور مجھے کیوں اس پر مجبور کیا
جائے کہ میں اسلام کا مطالعہ دوسروں کی نگاہ سے کروں۔ جس طرح عبدالمجید دریا بادی۔ سید سلیمان ندوی۔
منظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام کے سمجھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مجھے بھی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں
میں بھی اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں اور جس طرح وہ میرے عقیدہ کو الحاد و ارتداد سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی طرح
میں بھی ان کے اقوال کو لغو و جہل قرار دے سکتا ہوں۔ قرآن شریف ان کے سامنے بھی ہے، میرے سامنے بھی، جس طرح
انھیں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے، مجھے بھی دی گئی ہے، لیکن اس کا جواب ان کے پاس
صرف ایک ہوا کرتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے جو خصوصیات ایک شخص میں پائی جانی چاہئے، وہ مجھ میں نہیں
ہیں۔ گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان کے عقاید کے مطابق پہلے ہی سے مسلمان
ہے اور خود اپنی عقل سے کام لینا گناہ سمجھتا ہو۔ اگر واقعی قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایک شخص
اپنے آپ کو ایک کلامت پرست مسلمان ثابت کرے، تو بیشک مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، لیکن اگر قرآن ”ذکرى للعالمین“
ہے اور وہ تمام نوع انسانی کو دعوت دیتا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولویوں کا یہ کہنا کہ قرآن پاک کا سمجھنا صرف مولویوں
ہی کے لئے مخصوص ہے، کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے

میں اگر قرآن پاک کو خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس کا سبب صرف یہ ہے خود قرآن سے یہی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ سے میں خدا و رسول کی توہین و تکذیب کرتا ہوں، حالانکہ میری رائے میں خدا اور رسول اللہ کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ اسے کلام انسانی سمجھا جائے (جس پر میں تفصیل کے ساتھ اسی جینے کی اشاعت میں کسی دوسری جگہ اظہار خیال کر چکا ہوں)

وہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلاف کے عقیدہ کے خلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام اسلاف کی پیروی کا نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کا ہے۔ اگر اسلاف یہ عقیدہ رکھتے تھے تو وہ خود اس کے ذمہ دار تھے، ہم اس کے ماننے پر کیوں مجبور ہوں اور اگر صرف کسی کو مرد و ملحد کہہ کر قرآن کا کلام الہی ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے، تو اس سے زیادہ ان کی "بے باگبی" اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمارے علماء کا یہ طرز عمل کہ وہ اپنے اپنے اقوال کے خلاف کوئی بات سننا گوارا کر ہی نہیں سکتے اور فوراً مستقل ہو کر لوگوں پر جنت کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، یادگار ہے اس کلیسائی دور کی جب مذہب نام تھا بے چون و چرا یوں کی تقلید کا (کیونکہ عیسوی مذہب کسی عقلی بحث کا حریف نہ ہو سکتا تھا) اور چونکہ تاریخ اسلام میں بھی ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب شاہان اسلام سیاسی اغراض کی بنا پر مذہبوں سے غلط فتویٰ حاصل کیا کرتے تھے اور مولوی اپنی حمایت میں حکومت کی تلوار سے فائدہ اٹھاتے تھے، اس لئے وہ انانیت اب بھی جلی آتی ہے، لیکن ان کو سمجھنا چاہئے کہ مذہب کے باب میں اب ان اوچھے تہمیلاروں سے کام لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ جن نئے ہتھیاروں سے مذہب پر حملہ ہو رہا ہے، انہیں تہمیلاروں سے جواب دینا پڑے گا، محض غیظ و غضب، یا کافر سازی سے کام نہیں چل سکتا۔ اور یہی ہے وہ اصولی اختلاف میرے اور مولویوں کے درمیان جس کو وہ میرے کفر والی دکان پر قرار دیتے ہیں۔ چونکہ میں اسلام کو تنہی اور فطری مذہب سمجھتا ہوں، اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ اس کی ہر ہر بات عقل پر پوری اترنا چاہئے اور اسی لئے میں مسلمانوں کے عام عقاید کو درست نہیں سمجھتا اور قرآن پاک سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اگر واقعی مجھ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے تو اس پر مجھ کو تنبیہ کرنا چاہئے، نہ یہ کہ صرف بغض سے یہ کام لیکر جاہل مسلمانوں کو میرے خلاف مشتعل کیا جائے، اور بازاری لب و لہجہ میں مجھ پر لعن طعن کی جائے۔

مولویوں کا ایک اعتراض مجھ پر یہ بھی ہے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مجھے تاویل کا کیا حق حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیا قرآن میں تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو انہیں اور مجھے دونوں کو برابر کا حق حاصل ہے اور اگر نہیں ہو سکتی، تو وہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے صرف ظاہر معنی مراد لینے پر مجبور ہوں گے دراصل ایک یہ ممکن نہیں۔ متعدد آیات کلام مجید میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں ایک ہی لفظ کے معنی مقصود کے لحاظ سے کہیں کچھ اور کہیں کچھ لئے جاتے ہیں۔

علماء و کرام جواب دیں بہر حال میرے دل میں جو شبہات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہاں بیان کرتا ہوں اور علماء کرام سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان کے دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے۔ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اوّل صورت مانی جائے تو قرآن کو ”شے مخلوق“ ماننا پڑے گا۔ لیکن ”شے“ کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ ”کل شے ہا لک الہ وجہ“ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لئے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پرس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلام مجید کا ہر نسخہ، کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے، اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے۔ اس لئے لامحالہ اسے ”صفت ربانی“ ماننا پڑے گا۔ لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اسکی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

(۴) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ ”نطق خداوندی“ ہے جو جبریل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہنچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا، جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہلوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مائل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے وہ قرآن جو اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظ ترتیب مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پر یہ چیز حادث ہے، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہئے۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجما نجا نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالتاً پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں ”شان نزول“ کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی، اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی

ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قتل سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ ”ایسا کہو“ درحالیہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دُنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا دلیل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

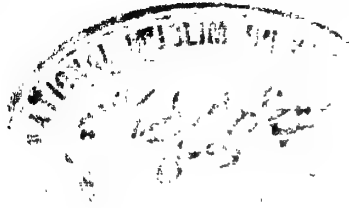
سورۃ فاتحہ میں الحمد للہ سے لیکر الٰہک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً ”ایک نعبہ“ سے اندازِ مخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضرانِ کریم خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۃ فاتحہ پہلے سے لوح محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا اندازِ مخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفار کہہ اور اُن کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ درحالیہ کہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت، کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفتِ لفظی کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ ”لفظ“ ہو جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اسکو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو ”خدا کا کلام“ کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہیں چند منجملہ شبہات کے جلی بنار ہیں قرآن پاک کو ”منطوق خداوندی“ سمجھنے سے مجبور ہوں۔ لیکن اگر

ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلام خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے، تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کئے جنہیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔



ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان

نائب فضل الدین اشترام۔ اے۔ آگرہ۔ تحریر فرماتے ہیں :-

قرآن یا اس سے متعلق موضوعات پر آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے والی چیز ہوتی ہے اور یقیناً موجودہ مسلمانوں کے حق میں بڑی خدمت ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ہر سال شکار کے کچھ پرچے گنوا بیٹھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بعض لوگوں پر اس قسم کی تحریروں کا اثر دیکھنے کے لئے انہیں دیدیتا ہوں اور مجھے اپنے تجربہ کا بڑا اصل مل جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ بھی جو زندگی میں حدود آب و گل سے آئے کچھ دیکھنے یا سوچنے کے مادی نہیں ہیں آپ کی تحریر پر حاکم سوچنے لگتے ہیں۔ مسلمان قوم کے زوال کی غالباً تباہی وجہ یہی ہے کہ اس نے ہر چیز کے متعلق سوچنا بند کر دیا ہے میں بھی مسلمان قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی سمجھتا ہوں کہ اسے از سر نو سوچنے کا مادی بنا دیا جائے۔ قرآن سے متعلق کچھ پہنچے آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب میں نے جولائی کا شمار ایک صاحب کو جو دنیا داری میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں پڑھنے کے لئے دیا تو انہوں نے اسی دن رات کو مجھ سے قریب ایک گھنٹہ گفتگو کی اور یہ سب گفتگو آپ کی موافقت میں تھی۔ وحی کی جو توضیح آپ نے کی ہے وہی توضیح بعض تعلیم یافتہ عیسائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے مجھے پنجاب کے پادری عبدالکریم ہمیشہ یاد ہیں۔ وحی کی توضیح کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ انجیل "کلام خدا" نہیں بلکہ "مکتوب کلام خدا" ہے۔

یہ کہنا کہ خدا کے تمام منصوبے اور ارادے کسی ایک کتاب پر ختم ہو جاتے ہیں، خدا کی برتری کو ٹھیس لگاتا ہے۔ اور۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی تسنیف کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانے سے رسول اپنی حیثیت سے بہت گرجاتے ہیں۔

(شکار) اس پہنچے کا شمار ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھئے اور دوسروں کو دکھا کر ان سے بھی پوچھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

جناب سلم حیدر آبادی فرماتے ہیں:

میں نے حیدر آباد کے اخبارات کو توجہ دلائی ہے کہ ماہ جون و جولائی کے شمار میں قرآن مجید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر اکثر حضرات (جو مستند علماء کرام سے نہیں ہیں) ذریعہ اخبارات بلا دلیل نیاز کے امتداد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے مستند علماء کرام اس مسئلہ خاص میں قرآن مجید ہی سے نیاز کا امتداد ثابت کریں۔

(نگار) معاف فرمائیے آپ نے ان اخبارات سے صحیح مطالبہ نہیں کیا۔ جو علماء کرام وحی کے معنی خدا کا کلام یا "منطوق خداوند" قرار دیتے ہیں، وہ نہایت آسانی سے میرا امتداد بھی قرآن پاک سے ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جو عقلی دلائل میں نے پیش کئے ہیں ان کا جواب دیں اور عقل ہی سے دیں اگر اسلام بے عقلوں کا مذہب نہیں ہے۔

جناب ظہیر احمد صاحب - مظفرنگر - فرماتے ہیں:

میں نے اخبار حق میں آپ کے خلاف کچھ تحریریں پڑھیں، میں نے اس کو خط لکھا ہے کہ جو خیالات نیاز صاحب کے ہیں وہ آجکل اکثر نوجوانوں کے ہیں۔ ان کو آپ جبراً اپنے اعتقادات کا پابند بنائیں اور انھیں افسوس کے بجائے دلائل بیان کریں۔ میں نے ان کو لکھا ہے کہ کوئی بھی مذہبی کتاب الہامی نہیں ہے۔ انسان الہامی کتب کے پیش کردہ اصول سے بہتر اصول بنا سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لئے "انسانیت" کافی ہے۔

(نگار) کیا آپ کو یقین ہے کہ حق جس کے یہاں معیار صحافت نام ہے صرف گالیاں دینے کا وہ آپ کی اس تحریر کو شل کر دے گا۔ کبھی نہیں۔ عقل کی بات کا جواب مولویوں کے پاس اب فتوائے کفر و ارتداد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ اس مہینہ ملاحظیات کے صفحات مجھے خود اس جنگ کے لئے وقف کر دیئے گئے جو میرے خلاف جاری ہے اور مغربی جنگ کے متعلق کوئی رائے زنی نہ کر سکا، حالانکہ اس وقت دنیا جن گھڑیوں سے گزر رہی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔

ہٹلر کی پیشکش صلح برطانیہ نے رو کر دی اور اپنا نازی حکومت کو سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ برطانیہ پر حملہ کرے، لیکن یہ حملہ او کس طرح ہو گا اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے، جو سکتا ہے کہ وہ پہلے اپنی ہمدرد سے بر آئر لینڈ کی کوشش کرے یا آئر لینڈ پر حملہ کر کے بحر اوقیانوس کی طرف آ کر اور برطانیہ کے درمیان خلیج حاصل کھینچے، لیکن وہ ایسا کرنے سے قبل ہٹلر کی طرف سے مطمئن ہو جانا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ روس نے برطانیہ کا خط لیکر اور ہٹلر ریاستوں کو بالشویک اصول حکومت تسلیم کرنے پر مائل کر کے جرمنی کو پس دینے میں ڈال دیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ برطانیہ پر حملہ کرے اور مصر، روس اور بلقان کی سلاوی حکومتیں مشرق کی طرف سے اس پر حملہ کر دیں۔ بہر حال جاڑوں کی آمد سے قبل ہی "ہو رہا ہے کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا"

عربوں کی سیاسی بیداری

(سلسل)

جزیرہ نمائے عرب جنگ عظیم کے بعد

جنگ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ عثمانی حکومت کی جگہ عربی حکومت کا نجد و حجاز قیام عمل میں آیا اور پانچ نئی ریاستیں قائم ہو گئیں (۱) حکومت حجاز (شریف حسین)۔ (۲) سلطنت نجد (ابن سعود)۔ (۳) امامت یمن (امام یحییٰ)۔ (۴) حکومت عسیر (سید محمد بن علی اد رسی)۔ (۵) حکومت شام (سید ملک رحمہ اللہ)۔ (ابن الرشید) اس تبدیلی نے عربستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا نئے نئے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہوئے مگر ان کا نام تر تعلق تو زائیدہ حکومتوں کے داخلی و خارجی مسائل سے تھا۔ ابن الرشید اور ابن سعود کے مابین شدید کشیدگی تھی اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ مدتوں سے خاندانی دشمنی کا ایک سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ دوسری طرف امام یحییٰ اور اد رسی کے تعلقات بھی بید ناخوشگوار تھے، اس کے وجہ آگے بیان کئے جائیں گے۔ سب سے زیادہ اہم ابن سعود اور شریف حسین کی کشیدگی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے بید نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ جنگ کے خاتمہ اور صلح کے بعد عربستان کو جو بھی فوائد حاصل ہوئے ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں حقیقی صلح کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور طرح طرح کے مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے۔

شریف حسین کو اس وقت دو حیثیتیں حاصل تھیں یعنی وہ ارض مقدس کا حکمران بھی تھا اور عربوں کی فوجی تحریک کا قائد بھی۔ مؤخر الذکر حیثیت کے ایک طرف اس کی حیثیت بلند کر دی تھی تو دوسری طرف پریشان کن حد تک اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی تھیں۔ ایک طرف ہندوستان کے مسلمان ناراض تھے کہ اس نے سلطان کے ساتھ ہندواری کی ہے اور اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ دوسری طرف قوم پر در عرب مجبور کر رہے تھے کہ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے ایفاء عہد کا مطالبہ کرے۔ ابن سعود کی دشمنی نے شریف حسین کی حیثیت اور زیادہ نازک

کر دی تھی۔ اُس کو اپنی اور ابن سعود دونوں کی جنگی طاقت کا پورا پورا احساس تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اگر کسی دن نجد و حجاز برسرِ پیکار ہوئے تو اُس کے لئے برطانیہ کی امداد ضروری ہوگی۔ اسی خیال سے وہ برطانیہ و فرانس کو اُن کے وعدے پورے کرنے کے لئے زیادہ مجبور کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ابن سعود اور شریف حسین کے تعلقات خوشگوار ہوتے تو شاید برطانیہ و فرانس کو اپنے وعدے پورے کرنے پڑتے۔

جہاں تک بغاوت کی تیاریوں کا تعلق تھا شریف حسین نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر بغاوت کے بعد جب عربستان میں نئے دور کا آغاز ہوا تو شریف حسین سے اُسی قدر ناما قبت اندیشی بھی ظاہر ہوئی۔ سب سے بڑی غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ اُس کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ بغاوت کی چونکہ اُس نے قیادت کی ہے اس لئے ہمسایہ حکومتوں پر اس کو ایک گویہ تفوق حاصل ہے۔ جہاں تک برطانیہ کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور بغاوت کے آغاز کا تعلق تھا ابن سعود اور ادریسی دونوں نے شریف حسین کے ان اقدامات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور قومی تحریک کی قیادت اس کو بخوشی سونپ دی اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا مگر اُن لوگوں کو کبھی اُس کا گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ اُسے چل کر شریف حسین خود ان لوگوں کے داخلی معاملات میں بھی دست اندازی کرے گا۔

خود ابن سعود کو وہابی تحریک کے سردار کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ صرف نجد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام عربستان میں اُس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

شریف حسین اور ابن سعود میں پہلا تصادم سنی ۱۲۹۷ھ میں ترابید (Turaib) کے نزدیک ہوا اس لڑائی میں ابن سعود کو کامیابی ہوئی اور اگرچہ موقع پر برطانیہ، شریف حسین کی حمایت کے لئے میدان میں نہ آ جاتا تو ابن سعود کی فوجیں ہار وک ٹوک جتا رہی ہوتیں۔ اس واقعہ نے شریف حسین اور اُس کے پیروں کی آنکھیں کھول دیں اور اُن کو اپنی جنگی کمزوریوں اور ابن سعود کی طاقت کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ اس موقع پر سب سے بہتر راہ یہ تھی کہ شریف حسین اور ابن سعود کے مابین صلح کرادی جاتی اور یہ فرض برطانیہ کا تھا۔ خود شریف حسین کے لئے بھی ضروری تھا خواہ اُس کو ابن سعود کو کچھ دینا ہی کیوں نہ پڑتا۔ مگر برخلاف اس کے شریف حسین نے ابن سعود کے قدیم دشمن ابن الرشید سے معاہدہ کی پالیسی کو پسند کیا۔ اسی سلسلہ میں کچھ اور قبائلی سرداروں سے بھی اُس نے معاہدے کئے اور امام یحییٰ پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

جنوری ۱۲۹۷ھ میں برطانوی افواج نے حدیدہ (Hadhramah) خالی کیا اور اُس کے ساتھ ہی ادریسی نے اُس پر قبضہ کر کے عسیر کی سلطنت میں اُس کو شامل کر لیا۔ عثمانی دور میں یہ بندر گاہ یمن کا تھا اب ادریسی کے قابض ہو جانے کی وجہ سے یمن کی تجارت کو اس سے سید نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا، اس واقعہ نے عربستان میں ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ اس موقع پر شریف حسین نے کچھ تو ابن سعود کے دوست ادریسی کو

نقصان پہنچانے کے خیال سے اور کچھ امام بیگی کو اپنا ہمدرد بنانے کے لئے امام بیگی کی حمایت کی۔ اسی سال ابن سعود نے اپنے قدیم دشمن ابن الرشید کو شدید شکست دی اور حکومت شام (Syria) کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا جس کی وجہ سے حکومت نجد کا ڈانڈا عراق کی سرحد سے مل گیا اور عربستان میں ابن سعود کی طاقت بھی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف شریف حسین کے ایک ایسے دوست کا خاتمہ ہو گیا جس کی ہمدردیاں شریف حسین نے ابن سعود کا مقابلہ کرنے کے لئے حاصل کی تھیں۔

قاہرہ کانفرنس کے کم و بیش چار ماہ بعد سلسلہ کے موسم بہار میں برطانیہ نے شریف حسین سے از سر نو گفت و شنید شروع کی اور ایک نئے معاہدہ کا مسودہ تیار کر کے لائسنس کو شریف حسین کے پاس روانہ کیا، اس معاہدہ کی دفعات اس درجہ نامعقول تھیں کہ ہر وہ شخص جو عرب مسئلہ کی نوعیت سے واقف ہوتا کسی حالت میں اس کو قبول نہ کرتا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ برطانیہ کو شریف حسین اور ابن سعود کی کشیدگی کا پورا پورا علم تھا نیز اس کا احساس تھا کہ برطانوی حمایت کے بغیر شریف حسین ابن سعود کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صورت حال کی اس نزاکت سے برطانیہ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس مسودہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر چیز یہ تھی کہ اس کی رو سے ایک طرف شریف حسین کے اختیار محدود ہو جاتے تھے اور دوسری طرف عراق و فلسطین کے علاقوں میں برطانیہ کو ”خاص حیثیت“ حاصل ہو جاتی تھی۔ صاف الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا کہ سین ریو کانفرنس (San Remo Conference) میں برطانیہ کے لئے جو انتہائی حیثیت ملے پائی تھی اور جس کو قبول کرنے سے عربوں نے انکار کر دیا تھا اس کو اب نئے انداز میں قبول کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی، شریف حسین کو اس مسودہ سے بے حد تکلیف ہوئی اور اس نے لائسنس کو بُری طرح پھینکا۔

۱۹۳۷ء کے موسم بہار میں پھر گفت و شنید کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ کم و بیش ایک سال تک جاری رہا۔ اس مرتبہ ماہ النزاع مسئلہ فلسطین کا تھا۔ برطانیہ کی خواہش تھی کہ شریف حسین فلسطین کے انتداب کو نیز اس برطانوی پالیسی کو تسلیم کرے جس کا اظہار بالفور اعلان میں کیا گیا تھا (یہاں پر یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اس اعلان میں فلسطین میں بسنے والے عربوں سے صرف ان کی شہری اور مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا) پہلے تو شریف حسین اس پر اصرار کیا کہ برطانیہ نے دوران جنگ میں جو وعدے عربوں سے کئے تھے ان کو پورا کیا جائے۔ بعد میں اس نے خود ایک تجویز پیش کی کہ فلسطین میں ایک قومی حکومت قائم کی جائے جس میں یہودیوں کو بھی نمایندگی حاصل ہو مگر کسی حال میں بھی اس کی ”سیاسی و اقتصادی آزادی“ دوسری عرب حکومتوں سے کم نہ ہو اور اس کو عرب حکومتوں کے وفاق میں شرکت کا بھی حق دیا جائے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو شریف حسین نے برطانوی وزیر اعظم ریمز میکڈونلڈ کو ایک پر زور خط لکھا جس میں

اُن وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جو دوران جنگ میں عربوں سے کئے گئے تھے۔ ابھی اس خط کو لکھے ہوئے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہابی فوجوں نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور شریف حسین کو حکومت حجاز سے دستبردار ہونا پڑا۔ اُس نے انگریزوں سے امداد طلب کی مگر اس کو صاف جواب دیدیا گیا کہ یہ کوئی سیاسی لڑائی نہیں بلکہ مذہبی لڑائی ہے اور برطانیہ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بالآخر پوسے حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہو گیا اور جنوری ۱۹۳۲ء میں ابن سعود کو حجاز کا باضابطہ بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

اس جدید دور نے عربستان میں ایک نئے باب کا آغاز کیا جس میں ابن سعود کی ذات بہت نمایاں ہے اس کے ساتھ ہی مغربی عربستان کی زندگی میں انقلابی تبدیلی کا ظہور ہوا۔ ملک میں ایک نئی حکومت قائم ہوئی جس نے عوام کے اندر شہری فرائض کا احساس پیدا کیا قدیم عربی روایات اور اسلامی فقہ کی تجدید ہوئی۔ ابن سعود کے سامنے چند اہم اور پیچیدہ مسائل بھی تھے جن کا فوری حل ضروری تھا یہ مسائل صرف داخلی نہ تھے بلکہ اُن کو بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ وہ ایک طرف اسلام کے ارض مقدس کا حکمران تھا اور دوسری طرف اُس کو وہابی تحریک کی سرداری بھی حاصل تھی اور وہابیوں اور دوسرے اسلامی گروہوں میں شدید اختلافات تھے۔ اُس کے بعد حدود حکومت کے تعین کے متعلق کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ تیسرا اہم مسئلہ برطانیہ اور دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ ان تمام مسائل کو ابن سعود نے بڑی دور اندیشی و توجہ کے ساتھ حل کیا۔ مئی ۱۹۳۲ء میں ابن سعود نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو ”معاہدہ جدہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ متعدد اعتبار سے اُس مسودہ سے بالکل مختلف ہے جو شریف حسین کے سامنے لارنس نے پیش کیا تھا۔ اس معاہدہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ عراق و فلسطین کے علاقہ میں برطانیہ کی ”خاص حیثیت“ کا کوئی ذکر نہ تھا، جس سے بالظہور اعلان کی تائید ہوتی۔ اس معاہدہ کی رو سے ”جلالہ الملک عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل فیصل سعود“ کو نجد و حجاز کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی مدت صرف سات سال تھی چنانچہ ۱۹۳۷ء میں طرفین نے اس کی تجدید کی۔

برطانیہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے بعد ابن سعود نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے اُن غیر حکومتوں سے معاہدے کئے جن کا تعلق اسلامی ممالک سے تھا۔ چنانچہ ایک طرف بالینڈ، فرانس، روس اور اٹلی، دوسری طرف ایران و ترکی سے معاہدے کئے۔ عرب نقطہ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم معاہدے وہ ہیں جو ابن سعود نے عرب حکومتوں سے کئے ہیں یعنی یمن، عراق اور مصر سے، جنہوں نے اقتصادی اور تمدنی ترقی کی وہ تمام شاہراہیں کھول دیں جو اب تک بند تھیں۔ ابن سعود کے دور حکومت میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ نجد کے خانہ بدوش عربوں کو اُس نے بستیوں میں آباد کیا اس وقت تک کم و بیش اُن کی ستر نو آبادیاں قائم ہو چکی ہیں ان

بستیوں میں چار سو سے لیکر چھ ہزار تک لوگ آباد ہیں اور اب بجائے صحرا نور دی کے وہ زرعی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ابن سعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابن سعود کے زمانہ تک عربستان میں باربر داری کا کام اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ کام موٹر لاریوں اور موٹر ٹرک سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ریل و سایل اور آمد و رفت کے جدید ترین وسائل کو بھی ملک میں روشناس کیا جا رہا ہے۔ وہ سڑکیں جن پر پہلے کارواں گزرا کرتے تھے اب وہاں موٹر دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ملک میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے اور انسان بہ آسانی جدہ سے لیکر مدینہ تک اور بحر احمر سے لیکر ابائے فارس تک موٹر پر سفر کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں لاسکی کے اسٹیشن قائم ہیں۔ نئی نئی معدنی تلاش کی جا رہی ہیں۔

تاریخ انتداب عرب جنگ عظیم کا اختتام عربستان کے شمالی علاقہ کے لئے مصائب اور خلفشار کا ایک طوفان عظیم اپنے ساتھ لایا۔ وہ علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے وہاں مصائب و کشمکش کی تمام ذمہ داری یورپی طاقتوں کے اشتعال انگیز اقدامات کے سرے۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے خود عاید کردہ فرض کو ادا کرنے کے لئے سین ریمو (San Remo) کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں یہ فساد و خونریزی ناگزیر تھی۔

انتداب خود مجلس اقوام کا عاید کردہ نہ تھا۔ بلکہ یہ تجویز تھی اس سپریم کونسل (کی جوائنٹی، فرانس اور برطانیہ کے نمائندوں پر مشتمل تھی اور یہی تین طاقتیں تھیں جن کے مفاد عثمانی سلطنت کے علاقوں سے وابستہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اطمینان کے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے اپنے اپنے مفاد کے مطابق کئے۔ مجلس اقوام نے عثمانی سلطنت کے متعلق یہ اصول قائم کر دیا تھا کہ انتداب کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ کے باشندوں کی خواہش کا احترام ضروری ہے مگر اس اصول کو سپریم کونسل کے ممبروں نے قطعاً پس پشت ڈال دیا جہاں تک ملک کے بسنے والوں کی خواہش کا تعلق ہے، اس کا علم تمام اادیوں کو پورا ہوا تھا، کیونکہ کنگ کرسٹین رپورٹ (King Crene Commission Report) اور دمشق کانگریس کی تجاویز اُن کے پاس موجود تھیں۔ مگر اس معاملہ میں فرانس و برطانیہ کی رہنمائی صرف اُن کے مفاد نے کی۔

سپریم کونسل نے مجلس اقوام کے ایک اور اصول کو ٹھکرا دیا جس میں واضح انداز میں تاکید کی گئی تھی کہ عثمانی سلطنت کی بعض قومیں جو منازل ترقی طے کر چکی ہیں اور وہ آزاد اقوام کے دوش پر دوش کھڑی ہو سکتی ہیں اُن کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے معمولی طور پر زیر انتداب رکھا جائے تاکہ وہ سیاسی اور انتظامی امور میں پختہ کار ہو جائیں اور خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ جہاں تک عراق و شام کا تعلق ہے سین ریمو کانفرنس نے اس اصول کا برائے نام ہی سہی مگر احترام کیا۔ لیکن فلسطین کے مسئلہ میں تو ان لوگوں نے کمال ہی کر دیا

یہاں تو برائے نام بھی اس اصول کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ فلسطین کا انتخاب برطانیہ کو سونپا گیا اور اُس
مسلحہ میں آزادی تسلیم کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔
انقلابی علاقہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا:-

(۱) عراق مع ولایت بصرہ، موصل اور بغداد (برطانیہ) — (۲) فلسطین (برطانیہ) —
(۳) شام کا مشرقی اور مغربی علاقہ اور لبنان (فرانس) — (۴) عراق۔

عراق سین ریمو کانفرنس کے فیصلہ کی اشاعت کے ساتھ ہی عربستان میں شدید خلفشار کے آثار نظر آنے لگے۔ عراق
میں تو باضابطہ بغاوت ہوئی۔ اگرچہ یہ بغاوت کامیاب نہیں ہوئی اور عراق بارہ سال تک زیرِ انتداب نہیں
ہا۔ مگر حکومت کی پالیسی میں تبدیلی یقینی طور پر ہو گئی۔ عراق کا بادشاہ فیصل کو منتخب کیا گیا اور اس انتخاب میں کسی قسم کی
بے عنوانی نہیں ہوئی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فیصل کے انتخاب کے لئے زمین انگریزوں نے تیار کی۔ یہ قصہ
۲۳ اگست ۱۹۳۲ء کا ہے، اور یہ دو فیصل کے انتقال کے وقت (۸ ستمبر ۱۹۳۳ء) تک جاری رہا۔ فیصل کے دورِ حکومت
میں ملک نے سیاسی ارتقاء، دستوری ترقی اور آزادی کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں۔ فیصل خداداد قابلیت
اور عجیب و غریب اہلیت کا مالک تھا۔ ملک کے اہم ترین اور پیچیدہ مسائل کو اُس نے جس خوبی کے ساتھ سلجھایا ہے
اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو عراق کو باضابطہ مجلسِ اقوام کا ممبر تسلیم کیا گیا اور یہ اُس کی دستوری ترقی کی آخری منزل
تھی۔ اس درمیانی دور میں برطانیہ و عراق کے مابین چار معاہدے مختلف اوقات میں ہوئے اور ہر معاہدہ کے وقت
دونوں میں شدید کشاکش رہی۔ ہر موقع پر برطانیہ نے گھما پھرا کر عراق سے سین ریمو کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرانے
کی کوشش کی اور دوسری طرف عراق نے خود برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہا۔ دونوں ملکوں کے
بیچ میں فیصل کی ذات حایل تھی جو توازن برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض وقت صورت حال اس درجہ نازک
ہو جاتی کہ ظاہرِ مصالحت کے سب دروازے بند نظر آتے۔ فیصل ایک طرف برطانیہ کو دباتا اور دوسری طرف قوم پرور
عرب لیڈروں کو زیادہ وسیع نقطہ نظر رکھنے کی تعلیم دیتا۔ غرض یہ فیصل ہی کی ذات کا کرشمہ تھا کہ ہر بار اُچھے ہوئے مسائل
سلجھ جاتے اور مصالحت ہو جاتی۔

عراق کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب
عیسائی اور اسی ہزار کے قریب یہود عراق میں آباد ہیں۔ یہودیوں کی بیشتر آبادی بغداد میں ہے۔ ملک کی کل آبادی
خالص عرب ہے۔ ۱۰ حصہ میں بیشتر آبادی کردیوں کی ہے جو سنی مسلمان ہیں۔ اُن کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہو گی اور
اُن کی بیشتر آبادی ولایت موصل کے شمال میں ہے۔ عراق میں ۳۵ ہزار کے قریب مسطورہ عیسائی بھی پائے

جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ شروع میں ان اقلیتوں کی وجہ سے بڑے بڑے الجھاؤ پیدا ہوئے مگر فیصل نے اس مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا اور اب تمام اقلیتیں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہیں

شام و لبنان جنگ کے بعد عراق نے جو ترقی کی اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن جہاں تک شام کا تعلق ہے اُس کا دامن اُن ترقیوں سے قطعاً پاک ہے۔ عربستان کا یہ علاقہ فرانس کے حصہ میں آیا خلفشاً اور غوریزی شام میں بھی ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سلسلہ میں فرانس و شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا ہے جس سے مستقبل کے متعلق کچھ امید بندھی ہے۔ لیکن انتداب کے وقت سے لیکر اس معاہدہ کے وقت تک شام نے سوا تباہی و بربادی کے اطمینان و بہبود کی شکل نہیں دیکھی۔

سین ریمو کانفرنس میں فرانس نے کوشش کر کے شام و لبنان کا انتداب حاصل کیا اور دونوں علاقوں میں جداگانہ انداز کی حکومتیں قائم کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس دونوں علاقوں سے جداگانہ انداز اور مختلف نوعیتوں کے فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ لبنان کا علاقہ مشرق قریب میں فرانس کے اثر اور رسوخ کا آہنی قلعہ تھا۔ اسی علاقہ میں فرانس کے قدیم دوست، میر و نائٹ عیسائی آباد تھے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے فرقے بھی وہاں جو آباد تھے وہ بھی فرانس کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ برخلاف اس کے شام میں عرب مسلمان آباد تھے اور دمشق تو عربستان کی قومی تحریک کا مرکز ہی تھا چنانچہ فرانس نے لبنان کو مضبوط اور شام کو کمزور کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس سلسلہ میں فرانس نے جو سب سے پہلا قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ شام کے علاقہ سے کچھ حصہ نکال کر لبنان میں شامل کر کے اُس کا رقبہ بڑھا دیا۔ یہ نیا علاقہ شمال و جنوب اور مشرق سے لیا گیا۔ اس اضافہ کی وجہ سے ایک طرف کچھ ساحلی علاقہ لبنان میں شامل ہو گیا اور طرابلس، بیروت اور سیڈون وغیرہ کے ساحلی شہر اُس میں شامل ہو گئے اور بعلبک اور بقاع کے زرخیز میدان بھی اس کو مل گئے۔ اس کی وجہ سے دوسری طرف شام کی بحری تجارت کا تقریباً بالکل خاتمہ ہو گیا اور اُن علاقوں کی مسلمان آبادی بھی اس سے سید پر اثر و غم ہوئی کیونکہ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔

اپنے اثر و اسے علاقہ میں اضافہ کرنے کے بعد فرانس نے اُس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فیصل کی عربی حکومت کے دور میں ملک کو حاصل تھا۔ چنانچہ ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

- (۱) حکومت لاذقیہ - یہ علاقہ لبنان اور سنجاق اسکندرون کے درمیان واقع ہے اور اس کا دارالسلطنت لاذقیہ ہے
- (۲) جبل دروز - یہ دمشق اور مارا ویرون کی سرحد تک ہے اور پہاڑی علاقہ ہے اس کا دارالسلطنت سویدہ ہے
- (۳) حکومت شام - اس کا دارالسلطنت دمشق ہے اور باقی ماندہ انتدابی علاقہ پر مشتمل ہے۔

اُن کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں فرانس نے قائم کی ہیں۔

شام و لبنان کی آزادی فرانسیسی انتداب کی تاریخ بہ آسانی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور (۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۶ء) کو دور تاریک سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ ناماقبت اندیشی اور ظلم و حماقت کا وہ دور تھا جس میں حکمران طبقہ نے نفرت اور بے اطمینانی کی تخم ریزی کی اور اس کا ثمر ۱۹۲۶ء کی بغاوت کی شکل میں اُن کو ملا۔ یہ دور اسی بغاوت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ دوسرا دور (۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۵ء تک) گفت و شنید کا دور ہے۔ فرانس کو اس دور میں تمام دنیا کے سامنے اپنی نااہلی اور خام کاری کے لئے رسوا ہونا پڑا۔ اسی زمانہ میں فرانس نے عرب لیڈروں سے مصالحت کی بھی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تیسرا دور ۱۹۴۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اُس معاہدہ سے ہوتی ہے جو فرانس نے بعد از خرابی بسیار شام سے کیا۔

پہلا دور مارشل لا اور کشت و خون کا دور تھا جس میں فرانس نے جی کھول کر ظلم کیا۔ بالآخر ۱۹۲۵ء میں تنگ آمد یہ جنگ آمد عربوں نے بغاوت کی۔ یہ قصہ اب رجلائی کا ہے۔ اس موقع پر فرانسیسی فوجوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ فرانس نے فوراً تیس ہزار آزمودہ سپاہیوں کی ایک فوج روانہ کی مگر باغیوں نے اُن کو بھی شکست دی اور کوئی بچہ فرانسیسی فوج اس معرکہ میں کام آئی اور تمام سامان حرب بھی باغیوں نے لوٹ لیا باغی فوج بڑھتی ہوئی دمشق تک پہنچ گئی۔ اس موقع پر عرب لیڈر جو قید تھے وہ جیل خانوں سے نکل بھاگے اور باغیوں سے آئے یہ تقریباً سب کے سب دروزی عیسائی تھے۔ اب اس بغاوت نے بالکل قومی رنگ اختیار کر لیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے فرانس نے بعض ایسے انسانیت سوز مظالم کئے ہیں کہ ان کی دوسری مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں مل سکے۔ بہر حال بغاوت بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور حکومت نے اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کی۔

اس دور کی ابتداء ام پونسوٹ (M. Ponsot) کے ہائی کمشنر کے عہدہ پر تقرر سے ہوتی ہے یہ ایک تجربہ کار سولین تھے، انھوں نے سب کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور عرب حلقوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کے باوجود فرانس اور شام کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ ام پونسوٹ نے اپنے تقرر کے چوتھے سال جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور کچھ عرصہ کے بعد نئے دستور کے تحت انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا پورا ثبوت دیا۔ اس چیز نے اُن کو عرب حلقوں میں بے حد مقبول بنا دیا۔ ام پونسوٹ نے اپنے قیام کے آخری سال میں ایک نئے معاہدہ کا مسودہ عرب جمہوریت کے سامنے پیش کیا مگر عرب لیڈروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی سلسلہ میں دو قوم پرور عرب لیڈروں

نے شامی کابینہ سے استعفیٰ بھی دیدیا۔ اب پچھلے عربوں میں جوش و خروش کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی زمانہ میں ام، پونسٹ نے اپنے عہدہ کی مدت پوری کی اور ان کی جگہ پر ام، ڈی، مارٹل (M. D. Martel) کا تقرر ہوا۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شامی کابینہ کے وزیر اعظم کو بلا کر اس مسودہ پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ وزیر اعظم فرانسیسی حکومت کے نامزد کردہ تھے، انہوں نے اس مسودہ پر دستخط کر دے۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس ملی کے سامنے پیش ہوا تو ممبروں کی اکثریت نے اس کو مسترد کر دیا اس کے جواب میں ام، ڈی، مارٹل نے مجلس ملی کو غیر تعینہ مدت کے لئے معطل کر دیا۔ اسی سلسلہ میں ٹاؤن ہال میں جلسہ ہو رہا تھا کہ یکایک پولیس نے چھاپا مارا اور بیشتر لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں پر جرم ثابت نہ ہو سکا مگر ان کو جلاوطن کر دینا حکومت نے مناسب سمجھا۔ اس چیز نے تمام ملک میں اس سرے سے لیکر اس سرے تک آگ لگا دی اور پورے ملک میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ابھی ہڑتال ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ اور عرب لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کے اس اقدام نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک بھر میں بغاوت کی فضا پیدا ہو گئی اور ہڑتال برا بھلا جاری رہی، جس کی وجہ سے ملک کے کاروباری حلقہ میں جمود پیدا ہو گیا۔ اس کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا اور حکومت کی انتھک کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم نہ ہو سکی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑی۔ یعنی فرانس اور شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو انگلستان اور عراق کے معاہدہ کے طرز کا تھا۔

فرانس نے شام میں جو تجربات حاصل کئے اس کی قیمت بھی اس کو بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ سبزاؤں، نماری جانیں ایک طرف ضائع ہوئیں اور دوسری طرف فرانسیسی خزانہ پر فوجی اخراجات اور دوسری ضروریات کا سلسلہ میں ۲۲ کروڑ پونڈ (تقریباً ایک ارب ہم کم رو روپیہ) کا بار پڑا۔

فلسطین سب سے آخر میں فلسطین کے نام کا نام انتداب کا منبر آتا ہے۔ انتداب فلسطین کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بہت کافی مواد موجود ہے۔ لیکن اصل تو وہ حد درجہ منتشر ہے اور اگر کیا بھی کر لیا جائے تو اس کو ہاتھ لگانے میں سیدھا احتیاط اور چھونک چھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو غیر جانبدار اور دیانتدار مصنفین ہیں ان کی تصانیف بھی بہت کم پائی جاتی ہے کیونکہ معلومات کے عربی ذرائع ان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں دوسری طرف صیہونی پروپیگنڈے کا بحر ناپیدا کنار ہے جو یورپ کے گوشہ گوشہ میں ٹھانٹھیں مارنا نظر آتا ہے۔ عموماً دنیا کے قائل ذکر پرس (دوسرے) اور مغربی جمہوریوں کے خبر رساں ادارے یہودیوں کی جنبش ابرو پر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور خصوصاً انگریزی بولنے والے سمجھنے والی دنیا کے تو تقریباً تمام اخبارات ان کے ہاتھ میں ہیں۔ برخلاف اس کے عرب ابھی اول تو پروپیگنڈے کے میدان میں طفل مکتب ہیں اور دوسرے مالی اعتبار سے عربوں کو اس کی استطاعت نہیں کہ اس باب میں وہ

روپیہ پانی کی طرح بہا سکیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں شاید ہی عرب نقطہ نگاہ سے کوئی کتاب اس موضوع پر نظر آئے۔ یہودیوں کے پاس دولت کی کمی نہیں اور وہ بے دریغ دولت اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس سال سے دنیا فلسطین کے مسئلہ کو صیہونی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے۔ معلومات کا دوسرا اہم ذریعہ برطانوی سرکاری محکمہ ہو سکتا تھا مگر وہ ان بھی میدان صاف نظر آتا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبضہ میں بعض اہم دستاویزیں ہیں جب تک وہ شایع ہو کر عوام تک نہ پہنچیں اس وقت تک مسئلہ فلسطین کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ دارالعوام اور دارالامراء کے ممبروں نے بارہا حکومت سے ان دستاویزوں کی اشاعت کی اپیل کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی یہودیوں کے لئے دوسری آسانی یہ ہے کہ متذکرہ بالا دونوں ایوانوں میں یہودی ممبروں کی کافی تعداد موجود ہے جو ہر موقع پر یہودیوں کی فاضلانہ انداز میں وکالت کرتی ہے لیکن غریب عربوں کی آواز وہاں تک پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

معلومات کا ایک اور ذریعہ ہے اور وہ پرمانٹ منڈریٹ کمیشن (Permanent Mandates Commission) کی کارروائیوں کی کتاب ہے۔ مگر یہاں بھی اک طرف حالات نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود جنیوا (Geneva) میں یہودیوں کے محکمہ اطلاعات کا ایک بہت بڑا اور باضابطہ دفتر موجود ہے جو برابر کمیشن کو فلسطین کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس طرح کا کوئی ذریعہ عربوں کے پاس نہیں۔ فلسطین کا عربی پریس جو اطلاعات بہم پہنچاتا بھی ہے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے میرے اس بیان کی تائید وزراء کی تقریروں اور سفید کاغذ (White Paper) کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔

شاید مسئلہ فلسطین کے مطالعہ کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ متعلقہ جماعتیں جو آج فلسطین پر اپنا حق ظاہر کر رہی ہیں ان کے دعوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربوں کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ مدت دراز سے فلسطین میں آباد ہیں اور ملک پر ان کا آج بھی قبضہ ہے اُس کے بعد عربوں کے اُن سیاسی حقوق کا نمبر آتا ہے جو شریف حسین اور برطانیہ کے معاہدہ کی رو سے اُن کو حاصل ہوئے تھے اور جن کے معاوضہ میں عربوں نے جنگ میں اتحادی طاقتوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اب جبکہ شریف حسین اور ہنری میک ان (McMahon) کی خط و کتابت شایع ہو چکی ہے حکومت برطانیہ یا کوئی جماعت اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے کہ ارض فلسطین کا تعلق اُس علاقہ سے ہے جس کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

فلسطین میں آج عرب جو انتداب کے خلاف برسر جنگ ہیں اُس کا یہود دشمنی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ اسلام کے تمدنی اثر کا طفیل ہے کہ قرون وسطیٰ اور دو جدید دونوں دوروں میں عربوں کی تاریخ کا دامن یہودیوں پر مظالم کے داغوں سے قطعاً پاک رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہودی قوم نے تو عرب حکمرانوں کی سرپرستی

میں بڑی بڑی ترقیوں کی ہیں۔ اور آج بھی ان تمام قصوں کے باوجود وہ تمام یہودی اقلیتیں جو دوسری عرب حکومتوں میں آباد ہیں ان کے ساتھ اُس سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے جو امریکہ یا انگلستان کی حکومتیں ان مالک میں بننے والے یہودیوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ عربوں کو تو انگریزوں سے بھی کوئی دشمنی نہیں وہ تو صرف اپنے اُس سیاسی حق کی حفاظت کر رہے ہیں جو ان سے چھینا جا رہا ہے۔

فلسطین پر یہودیوں کے حقوق عربوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسطین عہدِ عتیق میں ان کا وطن تھا اور اب پھر ان کو وہاں جا کر آباد ہونے اور یہودی ریاست قائم کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہودیوں کے استیصال کے وقت سے لیکر آج تک (۱۸ سو سال سے) فلسطین میں یہودیوں کی بہت ہی قلیل اقلیت آباد چلی آرہی ہے۔ سترہ میں جنگ کے اختتام پر فلسطین میں یہودیوں کی آبادی ۵۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو تناسب آبادی کے اعتبار سے آٹھ فیصد ہی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی آبادی نوے فیصد ہی تھی۔ مگر یہودیوں کے مطالبہ کی اصل بنیاد یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے اتحادیوں کی جو امداد کی تھی اُس کے معاوضہ میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنا دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بالفور اعلانِ وجود میں نہ آتا تو اتحادی یہودیوں کی گراں قدر خدمات سے محروم رہتے اس لئے یہودی اپنے اس دعوے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ایک چیز قابلِ غور ہے۔ اول تو یہ کہ بالفور اعلانِ مشروط تھا اور دوسرے یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کرنے سے پہلے ہی عربوں سے ایک معاہدہ کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آزادی برقرار رہے گی اور اس وعدے کو متعدد موقعوں پر برطانیہ نے دہرایا بھی تھا۔

الفور اعلان میں اس کا وعدہ تو ضرور کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنایا جائے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ”فلسطین کی غیر یہودی آبادی کے سیاسی اور مذہبی حقوق پر“ یہ چیز اثر انداز نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو صرف ان کا قومی وطن ہی بنایا جائے بلکہ وہاں یہودی ریاست کا قیام بھی عمل میں آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر ذمین (Dr. Zamin) جو بہت بڑے یہودی لیڈر ہیں انھوں نے بار بار اس کا اعلان کیا ہے کہ صیہونیت کا مقصد یہ ہے کہ ”فلسطین کو اسی طرح یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے جس طرح امریکہ اہل امریکہ کا وطن ہے اور انگلستان انگریزوں کا“

انگریزوں نے یہودیوں سے جس وقت یہ وعدہ کیا تھا شاید وہ اسکی اہمیت اور اس کے نتائج سے واقف نہ تھے۔ عربوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ارادہ کیا کہ دوسری پالیسی اختیار کی مگر یہ خیال شاید غلط ہے۔ انگریزوں نے جو وقت یہ وعدہ کیا تھا اس وقت ان کی موت و زمرگی کا سوال درپیش تھا۔ ان کے پاس اس کا موقع نہ تھا کہ اس مسئلہ کی جزئیات پر وہ غور کر سکتے۔ لیکن برطانیہ کو اُس کی اس پالیسی کے لئے کبھی بھی معاف نہیں

کیا جاسکتا جو اُس نے جنگ کے بعد اختیار کی۔ اُس وقت یہودیوں کے ارادے عالم آشکار ہو چکے تھے اور یہ چیز بھی بالکل صاف ہو چکی تھی کہ قومی وطن کی آرملیکر فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے درپے ہیں۔ انگریزوں کو دوسری طرف اس کا بھی علم ہو چکا تھا کہ عرب اپنے وطن اور اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینے پر آمادہ ہیں۔ تاریخ پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اس نوعیت کے واقعات کا اگلا ابتداء ہی میں سدباب نہیں کیا جاتا تو آگے چل کر شدید خونریزی ناگزیر ہوتی ہے۔

کنگ کرسن کمیشن (King Crene Commission) اور دیگر ذرائع بھی آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔ مگر حکومت برطانیہ نے سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں یہودیوں نے فلسطین میں جو مظالم شروع کئے تھے وہ راز نہ تھے بلکہ ہر شخص اُن سے واقف تھا۔ یہودی جو روپیہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اُس کو ملکی ترقی پر صرف کرنے کے بجائے عربوں کو اُن کے گھروں سے محروم کرنے کے لئے پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ حکومت برطانیہ نے پہلے تو ان حادثات کی پرواہ نہیں کی اور مداخلت کی بھی تو یہودیوں کی حمایت میں۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے کچھ ایسے معاہدے کئے ہیں جو اب تک ظاہر نہیں ہو سکے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت برطانیہ دنیا کے اس دور و دراز گوشے میں بجائے عرب ریاست کے یہودی ریاست کے قیام کو اپنے شہنشاہی مفاد کی حفاظت کے لئے بہتر اور ضروری سمجھتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے موسم بہار میں رائل کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اُس کے ساتھ امید بندھ گئی کہ اب حالات کی صحیح جانچ پڑتال ہو جائے گی اور مسئلہ کے سر پہلو پر پوری روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو تمام امیدیں مبدل ہو گئیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض اعتبار سے کمیشن کی رپورٹ بہت زیادہ قابل ستائش ہے مگر اسی درجہ یہ ناقص و نامکمل بھی ہے۔ اکثر ایسے واقعات بھی اس رپورٹ میں موجود ہیں جو اب تک عوام کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور سرکاری ذرائع سے وہ روشنی میں نہ آ سکے تھے۔ اس رپورٹ میں برطانیہ کی بعض غلط کاریوں کو بھی عیاں کیا گیا ہے۔ نیز اُس کے مطالعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ رپورٹ کے مصنفین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ انتداب ناقابل عمل تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کا بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کے ممبر یہودیوں کے بیانات اور پروگراموں سے بھی متاثر ہیں اور اس کا اُن کو کوئی احساس نہیں ہے کہ اس فن سے عرب ناواقف ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں نے عربوں کے بیانات پر ہمہ ردی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے اُن کی شکایات کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے اس کی ذمہ داری صرف کمیشن کے ممبروں ہی کے سر نہیں بلکہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں نے کمیشن کا مقاطعہ کیا اور کمیشن کی واپسی سے قریب چند روز قبل یہ مقاطعہ ختم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن نے سات آٹھ ہفتے برطانوی اور یہودی گواہوں کے

بیانات پر صرف کئے اور عربوں کے حصہ میں صرف پانچ پونے آئے۔ کل ۱۱۲ اشخاص کے بیانات کمیشن نے قلمبند کئے انہیں صرف ۱۲ عرب تھے اور سو برطانوی اور یہودی اشخاص تھے۔

کشنروں نے مسئلہ فلسطین کے پس منظر پر بحث کرتے ہوئے بالفور اعلان اور اُن وعدوں پر بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے جو یہودیوں سے برطانیہ نے دوران جنگ کئے تھے مگر برطانیہ نے جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ شریف حسین اور ہنری میک مان (Mr. McManis) خط و کتابت کا سرسری طور پر ذکر ہے مگر بالفور اعلان کے بعد برطانیہ نے جنوری ۱۹۳۷ء میں شریف حسین سے جو وعدہ کیا تھا یا جون ۱۹۳۷ء میں سات عرب لیڈروں کے میموریل کے جواب میں جو اعلان برطانیہ نے کیا تھا اُن کا کوئی ذکر کمیشن کی رپورٹ میں نہیں ہے۔

کمیشن نے مسئلہ فلسطین کا جو حل پیش کیا ہے وہ اس خیال پر مبنی ہے کہ عرب اور یہودی دونوں فلسطین میں آباد ہیں اس لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے کمیشن نے اس سلسلہ میں پوری اسکیم پیش کی ہے اُسکی رو سے فلسطین کا مغربی علاقہ یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ مجوزہ علاقہ موجودہ یہودی آبادی کے رقبہ سے کئی گنا زیادہ ہے کمیشن کی یہ بھی تجویز ہے کہ بیت المقدس اور بیت اللحم کے مقدس شہروں میں مستقلاً برطانوی انتداب کا قیام عمل میں لایا جائے اور بقیہ حصہ میں عرب ریاست قائم کی جائے اور اس کا تعلق دوسری عرب ریاستوں سے بھی ہو اور دونوں ریاستوں کو مجلس اقوام کی ممبری کا حق ہو۔ وہ مسئلہ جس کو سلجھانے کے لئے کمیشن کا تقرر ہوا تھا اُس کو کمیشن نے اور بھی الجھا دیا ہے۔ جس علاقہ کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس میں اس وقت پانچ لاکھ عرب آباد ہیں۔ اُس پر تم یہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں کا دعوئے ہے کہ اُن کی تجویز قابل عمل بھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کی مجوزہ اسکیم تین اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تجویز قابل عمل ہے دوسرے برطانیہ کے تمام سابقہ وعدے اس سے پورے ہوتے ہیں جو عربوں اور یہودیوں کے ساتھ کئے گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ عربوں یا یہودیوں کے ساتھ اس میں بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔

فسادات فلسطین کے سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ قدرتی پیداوار نہ تھے بلکہ اس کی تمام ترمیم داری آفندی طبقہ کی سازش مفتی اعظم کے سیاسی اغراض، اٹلی، جرمنی اور روس کے پروپیگنڈے کے سر ہے۔ ابتداء کے فسادات کا جہاں تک تعلق ہے بعض حلقوں میں اس بیان کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر انتدابی حکومتوں کے کمیشن کی رپورٹ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ یہ فسادات دراصل نتیجہ ہیں اُس محبت اور لگاؤ کا جو عربوں کو اپنے وطن اور تمدن کے ساتھ ہے۔ آج بغاوت اپنے شباب پر ہے اور اُس کا سب سے زیادہ زور شہروں میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں ہے اور اس کا فوری سبب رائل کمیشن (Royal Commission) کی تجویز تقسیم ہے جس کی وجہ سے عربوں کو

پنا گھر بار چھوڑ کر غیر علاقے میں جا کر آباد ہونا پڑے گا۔ تقریباً تمام قومی لیڈر یا توجیل خانوں میں ہیں یا جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اب عنان قیادت خود مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے گھر بار کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دینے پر تیار ہیں۔ اس جوش و خروش کو کسی طرح بھی غیر ملکی پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا۔ غیر ملکی پروپیگنڈا سلگتی ہوئی آگ پر پنکھے کا کام کر سکتا ہے مگر اس میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بغاوت کو مہینوں اور برسوں تک مسلسل زندہ رکھ سکے۔

اس بغاوت میں تو اعلیٰ طبقہ کے عربوں کو بھی کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ کسان اور مزدور عرب جو بغاوت کر رہے ہیں وہ تو زمیندار عربوں سے بھی کچھ کم ناراض نہیں کہ انھوں نے اپنی جائیدادیں یہودیوں کے ہاتھ کیوں فروخت کیں جس کی وجہ سے اُن کو اپنے گھر بار سے دست بردار ہونا پڑا ہے۔ دوسری طرف عرب اپنے لیڈروں سے ناخوش ہیں کہ انھوں نے پہلے ہی اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا تھا۔ غرض اس وقت عنان قیادت اُن کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھ میں ہے خود جن کی موت و زندگی کا اس وقت سوال ہے، باغیوں کا تشدد صرف انتہائی طاقت ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا یکساں شکار عرب زمیندار اور وہ دلال بھی ہیں جو خرید و فروخت کے معاملات طے کر رہے ہیں۔

دوسری غلط فہمی یہ پیدا کی جا رہی ہے کہ یہودیوں کی آمد سے عربوں کو اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہودی دولت اور ذہانت سے ملک نے کچھ نہ کچھ اقتصادی ترقی ضرور کی ہے۔ عرب زمیندار اُن کی آمد کی وجہ سے مالدار بھی ہو گئے ہیں اور عرب مزدوروں کی مزدوری بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہودیوں کی آمد ملک کے لئے نئی نئی ضرورتیں اور نئے نئے بار بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ انتہائی پالیسی کی وجہ سے نئی نئی خدمات کی ضرورتیں پیش آئیں، حفاظت عامہ کے لئے پولیس میں اضافہ کیا گیا۔ بلا ضرورت عمارتوں کے ٹھیکے دینے پڑے تاکہ یہودی مزدوروں کے لئے روزگار پیدا کیا جائے۔ ان سب وجوہ سے فلسطین جیسے مفلس ملک کے میزانیہ پر غیر ضروری بار ڈالا گیا۔ ان سب باتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کی آمد سے بہت زیادہ اقتصادی فائدہ پہونچا ہے تو بھی یہ ایک بے حقیقت استدلال ہے کیونکہ اگر ایک طرف فلسطین کو یہ فوائد حاصل ہوئے تو دوسری طرف یہی چیز فلسطین میں بسنے والے عربوں کی سیاسی زندگی کا چراغ گل کر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی تقریباً پانچ فیصد تھی ۱۹۴۷ء میں یہ بڑھتے بڑھتے اٹھارہ فیصد ہو گئی اور آج کل جس سرعت کے ساتھ یہودی جہا جبرین فلسطین میں آ رہے ہیں اُس سے اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ آئندہ دس سال میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ اقتصادی فوائد کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔

مسئلہ فلسطین کا کوئی معقول حل اس وقت تک دستیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمران انصاف سے کام نہ لے

تشدد خواہ وہ جسمانی ہو یا سیاسی لا حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے جب سے تشدد کی راہ اختیار کی ہے دنیا کی نظریں اُن کی طرف اٹھ گئی ہیں اُس سے قبل بیس سال تک جینیوا، لندن اور بیت المقدس میں پُر امن انداز میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی گئیں اور وہ سب ایک ایک کر کے ناکام رہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تشدد سے عربوں کو جس قدر فائدہ ہوا ہے اُسی قدر اُن کی تحریک کو نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس تشدد کو ختم کرنے کی ہر حکمت اور آسان صورت یہ ہے کہ اُس کے اسباب کا سد باب کیا جائے۔ اس تشدد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ عربوں کا تشدد نتیجہ ہے حکمران طبقہ کے اُس اخلاقی تشدد کا جو عربوں کے ساتھ اُس نے روا رکھا ہے۔ عربوں کے اس تشدد کو اب دنیا کی کوئی طاقت اُس وقت تک روک نہیں سکتی۔ جب تک کہ حکمران طبقہ اپنے اخلاقی تشدد کو ختم نہ کر دے۔

وہ لوگ جو پروپیگنڈے کے پردوں کو چاک کر کے اصل تصویر کو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے فلسطین کے مسئلہ کا حل تلاش کر لینا زیادہ دشوار نہیں بشرطیکہ حکمران طبقہ بھی عقل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ ایک ایسا ملک جہاں مدت دراز سے ایک ایسی قوم آباد چلی آتی ہو جس کو اپنے وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ ہو وہاں باہر سے کسی دوسری قوم کے آباد ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں اب تک جو تجربات حاصل کئے گئے ہیں وہ کافی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ عربوں کو یہودیوں کے ساتھ کوئی مخالفت ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فلسطین کا کسان اپنے وطن سے دستبردار ہونے کے مقابلہ میں اپنی جان قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور اسباب سے قطع نظر صرف یہی ایک ایسی چیز ہو جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ فلسطین کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس حقیقت کو محسوس کیا جائے اور اس کو ہر وقت پیش نظر رکھا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانا یا وہاں یہودی ریاست کا قیام برطانیہ اور یہود دونوں کے جھڑپوں کے جھڑپوں سے باہر ہے۔ اگر متذکرہ بالا حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسطین کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہاں عربی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور وہاں صرف اسی قدر یہودی رکھے جائیں جس سے عربوں کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ سب قومیں امن و عافیت کی زندگی گزار سکیں اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسئلہ فلسطین کا یہ حل دیانتداری اور انصاف کا حل ہے اور یہ قابل عمل بھی ہے۔ اس سے فلسطین میں بننے والے عربوں کے حقوق کی ایک طرف حفاظت ہوگی اور دوسری طرف اُن کے قومی جذبات بھی اس سے آسودہ ہوں گے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اُس وقت فلسطین تمدنی اور روحانی اعتبار سے الگ قومی وطن

بھی بن سکیگا اور اُن کو فلسطین سے جو قدیم تعلق ہے اس کی بھی تجدید ہو سکے گی۔ اُس حالت میں فلسطین کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں گے۔

فلسطین کے مسئلہ کا اس سے زیادہ قابل اطمینان اور قابل عمل حل ملنا دشوار ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ اختیار کی گئی تو اُس سے عربوں، انگریزوں اور یہودیوں کی لاتعداد جانیں تلف ہوں گی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ یہودیوں کو یورپ کی حکومتوں میں جن مصائب کا شکار ہونا پڑ رہا ہے اُس سے اُن کو بچانے کے لئے فلسطین کے بجائے کوئی دوسرا ملک تلاش کرنا چاہئے کیونکہ فلسطین خود ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس وقت جتنے یہودی وہاں پہنچ گئے ہیں انھیں کا بار اٹھانے سے وہ قاصر ہے۔ سلطنت برطانیہ بجد وسیع سلطنت ہے، اُس کے ذرائع اور وسائل بھی اُسی اعتبار سے وسیع ہیں۔ اب جبکہ عربوں کی قسمت پر اُس نے یہودیوں کا حل تلاش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا یہ اُس کا فرض ہے کہ اُن کو کہیں اور کسی نہ کسی طرح کھپا دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اور دوسری یورپی حکومتوں میں یہودیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم کئے گئے ہیں وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اُن مظالم کے مصنفین کے دامن پر اب تک رہنے والے بدنام داغ ہیں۔ مہذب حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور آج جو بار فلسطین کے کاندھوں پر ڈالا جا رہا ہے اُس کو وہ خود سنبھالیں۔

محمد عتیق صدیقی

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب ترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲/ دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی۔ کمار پالتا صاحب۔ قیمت ۲/

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین احمد صاحب مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴/

مینجر شکار۔ لکھنؤ

ریڈیو کے آس پاس

شام کا وقت ہے برسات کا موسم، شہر کے چوراہے پر ہوٹل واقع ہے جہاں بارش سے پناہ لینے کے لئے ہر طرح کے بے فکرے۔ مراقی۔ مولوی۔ پنڈت۔ مزدور۔ طالب علم۔ پھیری والے۔ کسان۔ کارخانہ والے۔ جوان۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت مرد۔ ہوٹل کے برآمدہ میں ریڈیوسٹ کے آس پاس جمع ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ بادل گرجا جو ہے۔ مینہ برسنے لگتا ہے۔ ایک کوندا ہوا۔ زور کا ایک تڑا قا۔

مولوی صاحب :- ویسٹج الرعد وجمده
ایک دیہاتی :- مولوی صاحب اسی کا کرت ہو، برکھا ہوئے دیو۔

ایک نوجوان :- الہی یہ گھٹا دو دن تو بر سے۔
دوسرا بے فکر :- لپٹ جاتے ہیں وہ بچلی کے ڈر سے۔

ایک آواز :- کہو مولوی صاحب کیسی کہی ؟
مولوی صاحب :- شامتی۔ دوزخ کا ایندھن۔

پنڈت جی :- شانتی، شانتی۔

بے فکر :- دھن ہے ہمارا ج۔ کیا نام لیا ہے۔

(بارش تیز ہو جاتی ہے)

پنڈت جی :- رام رام، گھنگ میں جوہ ہو تھوڑا ہے۔
ایک نحیف آواز :- (غکین بچہ میں)

یہ کہو دابر دباراں سے اگر بر سے تو یوں بر سے

کہ جیسے خون برستا ہے ہمارے دیدہ تر سے

ایک بڑھیا :- ارے کل جچھے، تیری انھیں باتوں سے تو دنیا چوہٹ ہو رہی ہے۔

بڑھا شوہر :- (کھانتے ہوئے) تم کو دنیا کے چوہٹ ہونے کی پڑی ہے۔ یہاں کھانتے کھانتے لپتھن نکلا جا رہا ہے

بڑھیا :- ارے تم کو کھانے سے تھوڑے ہی کوئی روکتا ہے۔ دنیا چوہٹ ہو یا نہ ہو، تم تو کھانے جاؤ۔

ایک ٹانگہ والا :- (منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے) بڑے میاں گھر کا جھگڑا گھر میں چکانا۔ ٹانگہ ہانکتے تو یہ دن کا ہے کو دیکھنے پڑتے۔ چلو چھٹ کا میلہ دکھلاؤں۔

ایک کسان :- بڑا کھا دیو کا کرپا۔

ایک موٹا جہا جن :- ”بھار مندا بھو تو آئے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا“

طالب علم :- کسان سے اُچھے تو اچھا نہ ہوگا۔

پولیس کا سپاہی :- کچھ برا بھی نہ ہوگا۔

اتنے میں کچھ بچوں کے رونے لیلانے کی آواز آنے لگی۔ ماؤں نے انہیں پٹینا اور شوہروں کو کوسنا شروع کیا جو انہوں نے گانا اور ادھیڑوں نے سب کو سمجھانا شروع کیا۔ مونگ پھلی والے نے آواز لگائی، خستہ بادام لے لو۔ ہوٹل کا مالک گھومتا ہوا آیا۔ اور بالآخر یہ طے پایا کہ جب تک بارش نہ کھلے ہوٹل کے ریڈیو سٹ سے سب کی تواضع کی جائے ریڈیو نے تھوڑی سی گھر گھر اہٹ کے بعد اعلان کیا :-

”یہ دہلی ہے، اس وقت سات بجے ہیں“

ایک آواز :- کیا بات کہی ہے گویا ہم کو معلوم نہیں۔ وقت البتہ بُرا ہے۔ گھر والی دھنت میں رہی ہوگی بھائی گرم مسالہ مانگتے اور جینی کھانے آئی ہوگی۔

دوسری آواز :- اے بھائی سننے تو دو۔ گھر کا کھڑاگ کہاں پھیلایا۔ وہ دیکھو کوئی صاحب بکھان دے رہی ہیں ریڈیو :- ”یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہئے“

ایک آواز :- واہ بہ واہ۔ بالکل آلو کی دم فاختہ ہی ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک صاحب قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ سامنے سے موٹر آئی۔ ارا راراد صراط موٹر اوپر سے گزر گئی۔ مرگئے مردود نہ فاختہ نہ درود۔ دوسری آواز :- بھائی زمانہ نازک ہے۔

تیسری آواز :- بڑا نازک جیسے صنف نازک۔

چوتھی آواز :- سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ ہاتھ لائیے گا۔ جناب کا تنہا۔

(سب تہقہہ لگاتے ہیں)

دور سے ایک آواز :- منحوس۔

ریڈیو :- اگر آج ہم اس بات کا عہد کر لیں کہ ہم کو اپنی حالت سدھارنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو نیچا دکھاسکے۔

ایک آواز :- کہتے ہوئے شرم نہیں آئی عہد کر لیں، عہد کر لیں۔ عہد کرتے کیا دیر لگتی ہے۔ سینکڑوں دفعہ عہد کئے۔ کیا ہوا۔ نیک حرام۔

ایک آواز :- ہاں کچھ اور لگاؤ، ہندوستان کی نجات کو ہم سے کیا جب گھروالی سے نجات نہیں تو پھر کیسی کوئی اور نجات۔ واہیات۔

ایک عورت :- کلمو۔ ریڈیو نے گھر گھر اگر گت بدلی۔

اندراں دروے کہ درد دل بود، در اں یافتن
در حجاب زلف باناں، نور ایماں یافتن

ایک قلمبر :- ہو۔ حق۔

ایک شاعر :- کیا بات ظالم نے کہی ہے۔ نورایماں یافتن۔

ایک صاحب :- ہوش میں آؤ۔ سوپ ایسے کان ہیں، لیکن سناٹی نہیں دیتا۔ نورایماں یافتن، میں یہ جانتا ہوں
شاعر :- ہوش میں آؤ۔ تم حسن کلام کیا جانو۔ زلف کے ساتھ یافتن ہی ٹھیک ہے۔ باد وا۔

معترض :- اور نورایماں ؟

ایک آواز :- چپ بے ایمان۔

ایک بے فکر :- ارے بھائی جانے دو۔ نوربان کا بھی تو کوئی حق ہے۔

ایک آواز :- یار کچھ اور لگاؤ۔ یہ آداب تسلیمات قسم کا گانا کون گئے۔ (ریڈیو میں گھر گھر اڑھٹ)
اناؤنسر :- اب پٹیلے والے عاشق علی خاں صاحب گوسازنگ کا خیال تڑپا۔ تیس گائیں گے۔ آ۔ آ۔ آ۔

(گلا صاف کرنے کا جھٹکا) آ۔ آ۔ آ (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) بھو۔ بھو۔ بھو۔

ایک بزرگ :- سبحان اللہ اپنے فن کا امام ہے۔ اب یہ لوگ کہاں اور یہ فن کہاں۔

ریڈیو :- بھو۔ بھو۔ بھو۔ آ۔ آ۔ آ۔ (مجمع میں غلط فشار اور جھجھک)

منبر دوڑتا ہوا آیا اور پکارا۔ ارے ریڈیو کس نے بکاڑا۔

ایک صاحب :- جناب گھوڑ سارن ہے۔

(ریڈیو کی چابی بنی گئی)

اناؤنسر نے اعلان کیا :- ”اب طمنیہ جان ایک غزل سنائیں گی۔“

ایک آواز :- جزاک اللہ کیا تاریخی نام ہے۔

دوسری آواز :- کیا ہندو مسلم اتحاد کا پہلو نکالا ہے۔

تیسری آواز :- جی اور کیا مسجد بھی ہے باجا بھی ہے

ترے عشق میں زندگان لٹا دی

عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی

ایک آواز :- کیا پڑتا شیر شعر ہے
دوسری آواز :- کیوں نہیں - اور بھئی جوانی تو لٹا دینے کی چیز ہی ہے (گا کر) آؤ پیاسونی لاگے سحر!
ایک بڑھا :- سرد آہ کھینچ کر، رہے نام اللہ کا - اب عناصر میں اعتدال کہاں -
ایک لوفر :- رام رام چپنا - پرایا مال تکنا -
اخبار نیچے والا لڑکا :- چین میں چیاؤں پیاؤں - چیمبرلین کی چھتری -
پھیری والا :- ہر مال چھ پیسے کا - ہر مال چھ پیسے کا -
یہ سب کی گرجا آواز :- ارے نکالو اس اخبار نیچے والے لونڈے اور بساطی کو - ہوٹل میں لڑائی کا مول تول ٹھیک نہیں
(ریڈیو کی گھنٹی گھائی گئی - آواز آتی ہے) ”آپ جتن خانم امور خانہ داری پر تقریر فرمائیں گی“
”گھر کی بیویوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں“
ایک بے فکر :- ارے فتوٰ استاد، یہ عورتیں ریڈیو پر گھر گھر ہستی کا کھڑا گھسیلا قی ہیں - برسات میں تو کچھ چٹ پیسلونی تھا
فتوٰ استاد :- ادبے لٹے کبھی تو کام کی بات سن لیا کر گھر والی میں کیا کیڑے پڑے ہیں - یہی بچھن ہیں تو بیٹا
بھیک مانگو گے اور بھونی بھانگ نہ ملے گی -
بے فکر :- اُستاد تم تو سٹھیا گئے ہو - آپن نے کیا کہا جو لگے اول فول بکنے -
فتوٰ استاد :- چپ بے نہیں دیتا ہوں ایک لیوٹا ہتھیلی پیٹ میں گھس جائے گی -
(بہت سی آوازیں) جانے دو اُستاد جانے دو - لونڈا ہے کیا جانے بھلے مانسوں میں بندھا ہوا تو
جانے - (بے فکر سے مخاطب ہو کر) ادھر آ بے ادھر آ - اُستاد کے سامنے کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ
بے فکر نے کان پکڑ کر اٹھنا بیٹھنا شروع کیا -
ایک آواز :- ایک دو تین -
دوسری آواز :- تاک دھنا دھندن - تاک دھنا دھندن -
بچے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں -
ریڈیو سے آرکسٹرا بجاتا ہے - جو اسی اٹھک میٹھک کے وزن پر ہے -

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ام - ۱۷

مرزا ابوالحسن آصف خاں

(مسل)

آصف خاں اور نور جہاں میں کشیدگی شہر یار نور جہاں کا داماد تھا اور نور جہاں کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی وہ شہر یار کے لئے میدان صاف کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ شاہجہاں کی جگہ وہی شہنشاہ ہند ہو اسی لئے شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان اس نے اختلاف پیدا کر دیا اور معمولی باتوں پر اس قضیہ کو بڑھاتی رہی، اگرچہ آصف خاں نہایت سمجھدار و دراندیش اور محتاط تھا اور وہ ان سب سازشوں کو دیکھ رہا تھا لیکن بمقتضائے احتیاط خاموش تھا تاہم شاہجہاں کو اس کی بیٹی منسوب تھی اس لئے مخالفین کو قدرتی طور پر اس کے خلاف سازشیں کرنے کا موقع میر تھا چنانچہ ان کو اس ناپاک مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل ہو گئی اور آصف خاں شاہجہاں کی جانب داری میں مشہم ہو گیا۔ نور جہاں بھی اُس سے منحرف ہو گئی یہ وہ زمانہ تھا جب آصف خاں کی ماں اور باپ اعتماد الدولہ کا تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے انتقال ہو چکا تھا، اس لئے نور جہاں کے دل میں بھائی کی طرف سے جو غبار پیدا ہو گیا تھا اس کا رفع کرنے والا بھی اب کوئی نہ تھا۔ حقیقت میں یہ نور جہاں کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ایسے دشمن اور تجربہ کار بھائی کو جو حکومت کا رکن رکین تھا اور ممکن تھا کہ اس گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا، اپنا مخالف بنا لیا۔ نور جہاں کے دل میں آصف کا بیٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور وہ اُسے اپنے مقاصد میں مغل سمجھ رہی تھی۔ وہ شاہجہاں کو باغی قرار دیکر اس کی تبنیہ بھی کرتا چاہتی تھی بعض مشیروں نے یہ رائے دی کہ آصف خاں اور مہابت خاں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں اگر مہابت خاں کو جو بہادر اور صاحب فوج ہے شاہزادہ پر تویز کے ساتھ شاہجہاں کے مقابلہ پر بھیجا جائے تو وہ ضرور اس ہم کو درست طریقہ پر انجام دے گا، نور جہاں نے چند فرمان مہابت خاں کی طلب میں کابل بھیجے، مہابت خاں تجربہ کار اور جہاندیدہ جنرل تھا وہ بیگم کی ان کارروائیوں کو پسند نہ کرتا تھا بلکہ خود نور جہاں کی طرف سے متوہم تھا، اسی لئے اس ہم پر جاننا چاہتا تھا تاہم اس نے لکھا کہ شاہجہاں کو باعث فتنہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کا استیصال مد نظر ہے تو پہلے اس فساد کی جڑ پر کلہاڑی چلائی

جائے یعنی آصف خاں کو حضوری سے الگ کر دیا جائے میں ایسی شرط پر دربار میں آنے کی جرأت کر سکتا ہوں یہ درخواست فوراً منظور ہو گئی اور آصف خاں کو خزانہ لانے کے حیلہ سے آگرہ بھیج دیا گیا، یہ وقت بہت نازک تھا آصف خاں آگرے سے تمام روپیہ، اثیر فیاں اور سونا چاندی جو ان کے آغاز سلطنت سے وہاں رکھی ہوئی تھی لے کر لاہور جانا چاہتا تھا اور صورت یہ تھی کہ شاہجہاں کو خزانہ کے منتقل ہونے کی اطلاعات مل چکی تھیں، وہ خزانہ پر قبضہ کرنے کے خیال سے ماندو سے آگرہ کی طرف چل پڑا تھا بلکہ فتحپور پہنچ چکا تھا اگر آصف خاں اس وقت خزانہ لے کر روانہ ہوتا تو یقیناً شاہجہاں سے اس کا مقابلہ ہو جاتا اس وقت یا تو وہ داماد پر تلوار اٹھاتا یا خزانہ لے کر دھوٹے کر دیتا اور یہ دونوں صورتیں اچھی نہ تھیں لہذا اس نے بڑی دانائی اور دور اندیشی سے کام لیا کہ جہانگیر کی خدمت میں عرضی بھیجی کہ شاہجہاں خزانہ پر قبضہ کرنے اور آگرہ سے اس وقت حلقہ سے خزانہ کا نکالنا مناسب نہیں ہے، میں خزانہ کو خدا کے سپرد کر کے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔

اب شاہی دربار میں شاہجہاں کے استیصال کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں کابل سے مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز کو اس کے مقابلہ کے لئے بلایا گیا تھا بادشاہ دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھا شاہجہاں کے نام احکام جاری ہو رہے تھے کہ دکن واپس جاؤ وہ درخواست کرتا تھا کہ پہلے حضور میں آکر مجھے اپنے جرائم معاف کرانے دیجئے پھر کہیں جاؤں گا مفسدوں نے شاہجہاں کی اس ضد کو جو سراسر خلوص و اطاعت پر مبنی تھی بغاوت اور سرکشی پر محمول کیا تو شاہجہاں نے اس خیال کو تقویت دیکر جہانگیر کو بیٹے کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ باپ بیٹے کی فوجوں میں لڑائی ہوئی اگرچہ جنگ کی ترتیب مہابت خاں کی رائے سے ہوئی تھی مگر آصف خاں بھی بادشاہ کی طرف سے تلوار میدان سے نکالے داماد کے مقابلہ میں میدان میں آیا اس نے شاہجہاں کے لشکر کو شکست دیکر پیچھے ڈھکیل دیا صرف یہی نہیں کہ باپ بیٹے کی جنگ میں آصف خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا بلکہ اس کا دوسرا داماد اور شاہجہاں کا ہم زلف صفی خاں بھی بادشاہ کی خیر خواہی میں جان لٹا رہا تھا جس کی بدولت اُسے ہفت صدی سے سہ ہزاری کیا گیا اور سیف خاں کا خطاب دیا گیا لیکن آصف خاں کی یہ تمام خدمات اور جاں نثاریاں محض اس بنا پر کہ وہ شاہجہاں کا خسر ہے کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں اور شاہجہاں کا مقصد ہی یہ تھا کہ آصف خاں دربار سے دور رہے چنانچہ اٹھارہویں سن جلوس ۱۶۳۷ء میں آصف خاں کو بنگالہ و اڑیسہ کی صوبہ داری پر نامزد کر کے خلعت خاصہ اور تشریف مرصع عنایت کی گئی اس کے لڑکے ابوطالب کو دو ہزاری منصب دیکر باپ کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن یہ وقت وہ تھا جب مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز نے شاہجہاں کو دکن کی سرزمین سے نکال دیا تھا اور وہ بنگالہ کا رخ کر چکا تھا ایسی حالت میں آصف خاں کا بنگالہ

جانا نورجہاں کے سیاسی مقاصد کے بالکل ہی خلاف تھا چنانچہ آصف خاں کو اس بہانہ سے کہ پھوپھی کو بھتیجے کی جدائی بہت شاق ہے واپس بلا لیا۔ آخر شاہجہاں نے جو نورجہاں کا اصل حریت تھا شکست کھا کر باپ سے استدعائے معافی کی جہانگیر نے بیٹے کو معاف کیا اور یہ قصیدہ اس طرح طے ہو گیا مہابت خاں کو اس سے پہلے شاہزادہ پر دیز سے جدا کر کے بنگالہ بھیج دیا گیا تھا اور اس کی جگہ خان جہاں مقرر ہو چکا تھا، یہ کارروائی بھی نورجہاں کے ایما اور اشارے سے ہوئی تھی پر دیز کے پاس غالباً ایسے زبردست جبرئیل کار کھنا خلاف مصلحت تھا چنانچہ آصف خاں اور خدائی خاں کو پر دیز کے پاس بھیج کر مہابت خاں کو بنگالہ روانہ کر دیا گیا۔

مہابت خاں نے بنگالہ پہنچ کر وہاں کی رعایا اور امراء پر بہت مظالم کئے

آصف خاں اور مہابت خاں

بادشاہی دیوانوں اور متصدیوں کو بھی سرزمین بنگال سے نکال دیا

رعایا نے جہانگیر سے فریاد کی، اب حالات اور تھے اگرچہ نورجہاں جس کے اشارے سے مہابت خاں نے شاہجہاں کو مصائب میں مبتلا کیا تھا دربار پر چھائی ہوئی تھی لیکن جہانگیر باوجود اس کے کہ نورجہاں سے بے انتہا محبت کرتا تھا فریادیوں کی درخواستوں پر بہت توجہ کرتا تھا، جب اس قسم کی درخواستیں پیش ہوئیں تو آصف خاں نے اس کے مظالم کو خوب بڑھا چڑھا کر بادشاہ کے سامنے بیان کیا اُسے انتقام کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا تھا، مہابت خاں کی شکایات میں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ اس نے محلات شاہی پر بھی تصرف کیا ہے، چنانچہ ایک افسران شکایات کی تحقیقات کے لئے بنگال بھیجا گیا اُسے حکم تھا کہ تحقیقات کے بعد مہابت خاں کو خزانہ اور ہاتھیوں سمیت دربار میں لے آئے۔

یہ سب کچھ آصف خاں کی ہدایت سے ہو رہا تھا مہابت خاں نے ہاتھی اور خزانہ بھیج دیا مگر خود نہ لے آیا اپنے آنے کے لئے مہلت کا طالب ہوا، آصف خاں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا اور جانتا تھا کہ آصف خاں اس کی عزت و آبرو کے درپے ہے اس نے پانچ ہزار بہادر راجپوت ملازم رکھے اور دو مہینے کے بعد فوجی ساز و سامان درست کر کے آگیا۔

اس درمیان میں آصف خاں کے اشارے سے بنگال کے ہزاروں فریادی آگئے جو مہابت خاں کی زیادتیوں پر بادشاہ کو متوجہ کرتے تھے، لیکن مہابت خاں پوری تیاری کے بعد آیا تھا اُس کا زیر کرنا آسان نہ تھا۔ بادشاہ کو مہابت خاں کے آنے کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جب تک شاہی مطالبات ادا نہ ہوں اور فریادیوں کی تکالیف رفع نہ ہوں، انصاف یہ ہے کہ مہابت خاں کو دربار میں آنے نہ دیا جائے، نورجہاں نے سفارش بھی کی لیکن بادشاہ عدالت کے مقابلہ میں بہت سخت تھا اس نے اپنے حکم کو تبدیل نہ کیا۔

شاہی ضابطہ تھا کہ کوئی امیر اور منصبدار اپنی اولاد کی شادی بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ کر سکتا تھا مہبت خاں نے اپنی لڑکی کا عقد ایک نقشبندی بزرگ زادہ سے اذین شاہی کے بغیر ہی کر دیا آصف خاں نے اس اور اس کے غور اور رعونت پر محمول کر کے بادشاہ کے گوش گزار کیا اور مہابت خاں کے داماد پر غور دار کو گرفتار کر کے قید کر دیا، جہیز کا سامان بھی ضبط ہو گیا، اس موقع پر آصف خاں اگرچہ اپنی تمام سازشوں میں کامیاب ہو رہا تھا لیکن اس نے مہابت خاں کو پہچانتے میں سخت غلطی سے کام لیا اور اس کے معاملہ کو معمولی معاملہ سمجھ لیا مہابت خاں ایک زبردست، تجربہ کار، اور دور اندیش سپہ سالار تھا وہ آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔

اس وقت جہانگیر کا بل جا رہا تھا اور دریائے بہٹ (اٹک) کے کنارے خیمے لگے ہوئے تھے دریا پر پل باندھ دیا گیا تھا تاکہ فوج کے گزرنے میں کوئی دشواری حاصل نہ ہو بادشاہ کے کوچ سے ایک روز قبل حسب دستور تمام امراء نے دریا کو عبور کیا آصف خاں، خدائی خاں، خواجہ ابوالحسن اور جلال امیر دریا پار چلے گئے، جہانگیر اور نور جہاں چند افسروں کے ساتھ ادھر رہ گئے۔

آصف خاں نے ایسی مجرمانہ غفلت سے کام لیا کہ مہابت خاں کا کچھ خیال ہی نہ کیا اور دریا کو عبور کر کے عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ مہابت خاں نے اس موقع کو غنیمت جان کر سات آٹھ ہزار سپاہ ہمراہ لئے اور رات کے آخری حصہ میں حکم دیا کہ شور و غل مچائے بغیر بہت خاموشی سے دو ہزار سوار پل پہنچے جائیں۔ ادھر سے کوئی ادھر جانا چاہئے تو اسے نہ روکیں البتہ ادھر کا آدمی ادھر نہ آنے پائے اگر زیادہ شور مچے تو فوراً پل میں آگ لگا دی جائے، پھر چار پانچ ہزار سوار ساتھ لیکر آپ خیمہ شاہی کی طرف گیا۔ یہ انتظام پہلے ہی کیسا جاچکا تھا کہ دریا پار سے حملہ ہو تو پل میں آگ لگا دی جائے تاکہ اراد کے ذرائع بالکل منقطع ہو جائیں، جو وقت مہابت خاں نے جہانگیر کے خیمہ کو گھیرا ہے۔ بادشاہ آرام کو رہا تھا خواجہ سراؤں نے پیرویا کر ہوشیار کیا کچھ لوگوں نے مہابت خاں کو خواب گاہ کے قریب آنے سے روکا مگر مہابت خاں کا سیلاب رکنے والا نہ تھا، بادشاہ تلوار لیکر اٹھا مہابت خاں اس وقت قریب آچکا تھا، بادشاہ نے غضبناک ہو کر پوچھا مہابت نکم حرام یہ آنا کس قسم کا ہے؟

مہابت خاں ڈر گیا اور کورٹش کے مقررہ آداب ادا کئے مخالفوں کی شکایت کی اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اپنے ہمراہیوں کو الگ کھڑا کر دیا آپ قد مبسوس ہوا اور تین دفعہ بادشاہ کے گرد پھرا، پھر عرض کیا مجھے کامل یقین تھا کہ آصف خاں ذلت و غراری کے ساتھ مجھے ہلاک کر ادیگا اس لئے مجبوراً یہاں چلا آیا اگر مجھے قابل سیاست خیال فرمایا جائے تو یہیں قتل کر دیا جائے مگر دشمنوں کے حوالہ کیا جائے، بادشاہ نے خشکیں ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر چاہا کہ اس کا کام تمام کر دے مگر میر منصور بخشی نے ترکی زبان میں عرض کیا کہ غصہ کا

وقت نہیں ہے صرف تسلی کر دیجئے، مہابت خاں کے آدمی ہر طرف چھائے ہوئے تھے مگر وہ خوشامدانہ گفتگو کر رہا تھا، مہابت خاں نے بادشاہ سے سوار ہونے کو کہا بادشاہ نے کپڑے بدلنے کی غرض سے نورجہاں کے پاس جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور اسی حالت میں اپنا گھوڑا سلووی کے لئے پیش کیا مگر غیرت شاہی نے اس کے گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ دی، پھر بادشاہ اس پر خاصہ پر سوار ہوا دولت خانہ سے کچھ دور چلنے پر مہابت خاں حوضہ دار ہاتھی لے کر آیا اور عرض کیا کہ شورش کا اندیشہ ہے بہتر یہ ہے کہ ہاتھی پر بیٹھ کر شکار گاہ کی طرف تشریف لے چلئے بادشاہ ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ مہابت خاں کا ایک معتمد راجپوت ہاتھی کے آگے اور دو حوضہ کے پیچھے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران میں مقرب خاں بھی مہابت خاں کی اجازت سے بادشاہ کے قریب جا بیٹھا مقرب خاں کی پیشانی پر اس طوفان بے تمیزی میں ایک زخم بھی آگیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا، خدمت پرست خواص بھی جس کے ہاتھ میں شراب خاصہ کا پیالہ تھا قریب پہنچ گیا اور راجپوتوں نے برچھے کی نوک سے بہت روکا مگر وہ بھی حوضہ کا کنارہ کپڑے بیٹھ گیا۔ نورجہاں کو معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی اور بہت تبدیل لباس خواہر خاں خواجہ سرا کے ساتھ بل سے گزر کر دریا کے اس پار اپنے بھائی آصف خاں کے پاس چلی گئی، آصف خاں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے حواس پر لگندہ ہو گئے۔

مہابت خاں ہاتھی کو اپنے خیمہ کی طرف لے گیا اور بڑے احترام سے بادشاہ کو اپنے خیمہ میں اتار اب مہابت خاں کو نورجہاں کا خیال آیا فوراً ہی معلوم ہوا کہ وہ آصف خاں کے پاس چلی گئی مہابت خاں کو یہ شکر اپنی غفلت پر بہت افسوس ہوا پھر مہابت خاں بادشاہ کو شہر بار کے خیمہ میں لے گیا۔

اگرچہ مہابت خاں بہت ہی آزمودہ کار فوجی افسر تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کرنے کو تو اس نے یہ کام کر لیا تھا مگر اس کے حواس بجا اور عقل ٹھکانے نہ تھی کچھ دن نہ بڑا تھا اس کے آدمی خیمے کو گھیرے کھڑے رہتے تھے اور وہ خود دست بستہ بادشاہ کے سامنے حاضر رہتا تھا لیکن بادشاہ پر کسی قسم کا خوف یا رعب نہ تھا وہ بڑے ضبط و استقلال کا اظہار کر رہا تھا مہابت خاں مقررہ وقت پر بادشاہ کو تخت پر بٹھاتا اور شراب بھی پلاتا تھا عرض بہت فرامرداری کا اظہار کرتا تھا آصف خاں نے تمام امراء کے مشورہ سے طے کیا کہ صبح کو لڑ بھر کر بادشاہ کو مہابت خاں کی قید سے چھڑالینا چاہئے، جہانگیر نے مہابت خاں کے کہنے سے نورجہاں اور آصف خاں کو اس ارادے سے باز رہنے کی تاکید کی اور مقرب خاں کے ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ میرے مقابلہ میں تم لوگوں کا جنگ کرنا زیبا نہیں میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔

مہابت خاں نے آصف خاں کو لکھ دیا کہ تم بڑے عقلمند بنتے تھے محض تمھاری وجہ سے بادشاہ کا یہ حال ہوا، بہتر یہ ہے کہ وزارت مجھ پر چھوڑ دو میں بادشاہ کی خدمت کروں گا تم پنجاب اپنی جاگیر پر چلے جاؤ، آصف خاں نے

اس خیال سے کہ یہ سارے نامہ و پیام مہابت خاں کی رائے سے ہو رہے ہیں بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور لڑنے مرنے پر تیار ہو کر مل پر آیا مگر راجپوتوں نے فوراً آگ لگا دی بہادریوں نے دریا میں گھوٹے ڈال دئے بہت سے ڈوب گئے کچھ خستہ حال گنارے پر پہنچے۔ خدائی خاں نے سات آدمیوں کے ساتھ مہابت خاں کی فوج سے جنگ کی مگر پھر دریا کو تیر کر چلا گیا۔

آخر آصف خاں نے سب امیروں کو ہمراہ لے کر نور جہاں کو ہاتھی پر سوار کیا اور ایک پایاب گھاٹ سے دریا کو عبور کیا لیکن جس گھاٹ سے فوج اتر رہی تھی وہاں دو تین غارتھے اس لئے فوج میں برہمی پیدا ہو گئی۔ آصف خاں بھی نور جہاں کی عماری سے جدا ہو گیا، آصف خاں خواجہ ابوالحسن اور نور جہاں ابھی دریا سے نکلے نہ تھے کہ مہابت خاں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اس حملہ سے فوج بے ترتیب ہو گئی کچھ لوگ دریا سے اتر آئے کچھ کچھ دریا ہی میں رہے کچھ لوٹ گئے۔ نور جہاں کا ہاتھی تیر کر نکل آیا اور وہ بادشاہ کے پاس چلی گئی آصف خاں کا بیٹا ابوطالب اور چند دوسرے نامور سردار بھی آگئے خدائی خاں لڑتا بھڑکتا راجپوتوں کو سامنے سے ہٹا کر خیمہ شاہی تک پہنچ گیا خدائی خاں پر اس وقت سخت یورش تھی ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، اس کے تیر خیمہ میں بادشاہ کے قریب جا کر گر رہے تھے فخر خاں سامنے آ گیا۔ مہابت خاں نے کہا اس کم بخت کی جرات ملاحظہ فرمائیے کہ کہ اپنے آقا کے ولی نعمت پر تیر چلا رہا ہے بادشاہ نے بہت پیام بھیجے کہ اس کو ششش سے باز آؤ مگر اس نے ایک دھسائی، مہابت خاں کی فوج برابر اس کے مقابلہ میں جمی ہوئی تھی مگر اسکی امداد کو کوئی نہ آتا تھا بلکہ اُسے لڑائی سے روکا جا رہا تھا مجبور ہو کر وہ پھر دریا کو عبور کر کے واپس ہو گیا۔

آصف خاں کی گرفتاری آصف خاں نے دیکھا کہ کوئی کام نہیں بنتا اور یہ سب کچھ میرا ہی کیا دہرا ہے مہابت خاں انتقام لئے بغیر نہ چھوڑے گا اس لئے وہ اٹک چلا گیا جہاں اس کی جاگیر تھی بہت سے امراء مہابت خاں سے معافی کا وعدہ لے کر اس کے پاس چلے گئے، آصف خاں بھاگ کر اپنے ڈھائی سو ہمراہیوں کے ساتھ اٹک کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا، مہابت خاں نے راجپوتوں کی فوج اس کے تعاقب میں بھیجی پھر نور جہاں کو بادشاہ کے پاس چھوڑ کر اس نے اپنی آدمی فوج کو بادشاہ کی حفاظت پر مامور کیا اور نصف فوج ساتھ لے کر وہ آصف خاں کے پیچھے گیا۔ آصف خاں کے ساتھ مہابت خاں سے مل گئے اور مہابت خاں، آصف خاں اور اس کے بیٹے ابوطالب کو قید کر کے بڑی بے آبروئی سے بادشاہ کے پاس لایا۔

بادشاہ مہابت خاں کے خوش کرنے کو اکثر نور جہاں اور آصف خاں کی برائی کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ نور جہاں نے بہت فساد مچا رکھا ہے اور میری محبت ظاہری سے فائدہ اٹھا کر شاہ جہاں کو میرا مخالفت بنا دیا۔

ب میں ان دونوں بھائی بہنوں کا منہ دیکھنا نہیں چاہتا یہ ساری گفتگو نور جہاں کے مشورے سے ہوا کرتی تھی۔ نور جہاں کی صن تدبیر سے جب بادشاہ جہاوت خاں کی قید سے رہا ہوا اور **صفت خاں کی رہائی** جہاوت خاں بھاگ گیا تو بادشاہ نے افضل خاں کو اس کے پاس بھیج کر پیام دیا کہ صفت خاں اور اس کے لڑکے ابوطالب اور دانیال کے بیٹوں کو ہمارے پاس بھیجو تو تمہارا قصور معاف کر دیا جائے گا۔ جہاوت خاں نے دانیال کے بیٹوں کو افضل خاں کے حوالہ کر دیا آصف خاں کی نسبت یہ عذر کیا کہ راجہاں سے مجھے اطمینان نہیں ہے جب تک میں لاہور سے نہ گزر جاؤں آصف خاں کو نہیں چھوڑ سکتا۔

دشاہ نے پھر افضل خاں کو بھیجا اور اپنے اور نور جہاں کی طرف سے قسموں کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ میرے یا یگم کے ہاتھ سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہونچے گا جہاوت خاں پہلے طائر رہا پھر تین چار منزل کے بعد آصف خاں دلا کر عہد لیا اور خلعت، گھوڑا وغیرہ دیکر بادشاہ کے پاس بھیج دیا، مگر ابوطالب کو اپنے پاس رکھا جب اطمینان ہو گیا کہ فوج اس کے تعاقب میں مقرر نہیں ہوئی تو ابوطالب کو بھی عزت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

وزارت آصف خاں کی رہائی کے بعد ۱۷۰۳ء میں کابل سے واپس ہوتے وقت لاہور پہونچ کر اسکو پنجاب کی صوبہ داری اور عہدہ وزارت پر مامور کیا گیا اسکے بعد ہفت ہزاری عہدہ (ہفت ہزار سوار) لیا گیا۔

جہانگیر کا انتقال اور آصف خاں کی سرگرمیاں ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے کشمیر سے لاہور آتے ہوئے انتقال کیا اسی حادثہ سے قبل شہر یار جس کو نور جہاں مسند خلافت پر بٹھانا چاہتی تھی، دارالشعب میں مبتلا ہو گیا اور مونچھوں، ابرو، اور پلکوں کے بال بالکل جھڑ گئے، صاحب آثار الامراء کا بیان ہے کہ آتشک کی وجہ سے یہ عارضہ پیدا ہوا تھا بہر حال وہ کچھ تو شرم کی وجہ سے اور کچھ علاج کرانے کی غرض سے لاہور چلا آیا تھا۔ جہانگیر کا پوتا یعنی خسرو کا بیٹا داؤد بخش قید میں تھا۔ نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خاں کو جہانگیر کی تجہیز و تکفین اور معاملات ملکی میں مشورہ کرنے کی غرض سے اپنے پاس طلب کیا لیکن آصف خاں نہ گیا اور داؤد بخش کو قید سے نکال کر بادشاہ بنا دیا اسی کے ساتھ اسنے ایک ہندو کو جس کا نام بنارسی تھا اور نہایت تیز رو تھا اپنی انگوٹھی دیکر شاہ جہاں کے پاس بھیجا اور بہت جلد آنے کا زبانی پیام دیا۔

۱۷۰۳ء آثار الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳ — توڑک جہانگیری جلد دوم — ۱۷۰۳ء آثار الامراء صفحہ ۱۵۳ — توڑک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۲۲۳۔

۱۷۰۳ء آثار الامراء جلد دوم — توڑک جہانگیری جلد دوم۔

نورجہاں کی نظر بندی اور عظیم خاں میر بخش کو اپنے یہاں بلا کر قید کر دے آصف خاں کی دوسری بہن صادق خاں کے عقد میں تھی وہ بھی نورجہاں کا شریک کار تھا، نورجہاں نے چند بار آصف خاں کو بلایا مگر اس نے عذر کر دیا آصف خاں آگے آگے لاہور کی طرف آ رہا تھا نورجہاں پیچھے پیچھے جہانگیر کی نقش کے ساتھ آ رہی تھی دوسرے دن بھیڑ میں قیام ہوا اور جہانگیر کی تجہیز و تکفین کر کے بخش کو آگے روانہ کر دیا گیا تاکہ لاہور میں بارغ نورجہاں ہیں اس کو دفن کر دیا جائے ہر شخص سمجھتا تھا کہ آصف خاں یہ جو کچھ کر رہا ہے سب شاہجہاں کے لئے ہے داؤد بخش کو زبردستی قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اس لئے تمام امراء اس کی فرمانبرداری کر رہے تھے لیکن نورجہاں اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھی اس لئے آصف خاں نے نورجہاں اور اپنی دوسری بہن اہلیہ صادق خاں کے گھر پر نگرانی کے لئے پیرسہ بٹھادئے اور آدمیوں کی آمد و رفت بند کر دی بلکہ نورجہاں کو شاہی محل سے لاکر اپنے گھر میں رکھ لیا، چنانچہ آثار الامراء میں ہے

”بلکہ گویند یکم را از محل بادشاہی بر آوردہ در منزل خود جاداد“

شہر یار سے مقابلہ شہر یار نے لاہور میں جہانگیر کے مرنے کی خبر سنی تو شاہی خزانوں اور کار خانوں پر متصرف ہو کر بادشاہی کا دعویٰ کیا اور لشکر جمع کرنے کے لئے اس نے خزانوں کا منہ کھول دیا چنانچہ ایک لاکھ روپے صرف کر کے ایک ہفتہ میں کافی لشکر جمع کر لیا اور مرزا بایستقر خاں ولد دانیال کو جہانگیر کے مرنے پر بھاگ کر شہر یار کے پاس آگیا تھا۔ اس کا سپہ سالار بتایا، بایستقر خاں لشکر بیکر راوی کے پار آیا اور شہر یار دو تین ہزار سواروں کے ساتھ شہر لاہور کے باہر لڑائی کے نتیجے کا منتظر رہا۔

اس طرف سے آصف خاں بڑی شان و شوکت سے داؤد بخش کو ہاتھی پر بٹھا کر چلا ایک ہاتھی پر وہ خود سوار ہو کر قلب لشکر میں قائم ہوا لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا پہلے ہی حملہ میں بایستقر خاں کو شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ شہر یار شکست کی خبر پا کر قلعہ میں چلا گیا۔

شہر یار کی گرفتاری اگلے دن آصف خاں نے قلعہ کے قریب ہی جیسے نصب کئے شہر یار کے اکثر ساتھی آصف خاں سے آئے اور رات کے وقت کچھ لوگ ان کی امداد سے قلعہ میں داخل ہو گئے اور داؤد بخش کو تخت پر بٹھا دیا شہر یار جہانگیر کی مرم سرا کے ایک کونہ میں چھپا ہوا تھا فیروز خاں خواجہ سرانے اس کو پکڑ کر لاہور دی خاں کے سپرد کیا اس نے اس کی کمر کاٹک کھول کر دونوں ہاتھ

باندھے اور داؤ بخش کے سامنے حاضر کر دیا وہاں اُسے پہلے قید کیا گیا پھر دو دن کے بعد آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔ پھر چند دن کے بعد طہمورت اور ہوشنگ پسران دانیال کو بھی گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ آصف خاں نے فتح کی مسرت افزا نوید شاہجہاں کی خدمت میں بھیجا شاہجہاں کو ساہوکاروں کے خطوط سے یہ حالات معلوم ہو گئے تھے اس نے خدمت پرست خاں، رضا بہادر کو احمد آباد سے آصف خاں کے پاس لاہور بھیجا، اور اپنے ہاتھ سے یہ خط لکھا کہ مصلحت وقت کا اتنا خد ہے کہ داؤ بخش اور دوسرے شائسہ اداؤں کو قتل کر دیا جائے چنانچہ آصف خاں نے ۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو اتوار کے دن داؤ بخش کو قید کر کے شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا اور ۲۶ جمادی الاول کو گرگشاسپ اور اس کے بھائی، نیز شہر یار طہمورت اور ہوشنگ پسران سلطان دانیال کو قتل کر دیا۔

عہد شاہجہانی شاہجہاں آگرہ میں اورنگ نشین حکومت ہوا تو آصف خاں لاہور میں تھا، شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے اس کو فرمان لکھا جس میں بہت سے القاب و خطابات کے بعد اپنی تخت نشینی کا وقت تحریر کیا یہ بھی لکھا کہ آپ کے کہنے سے ہم نے اپنا لقب ”شہاب الدین مقرر کیا ہے، ساتھ ہی شوق ملاقات کا اظہار بھی کیا، اپنا وہ خلعت بھی آصف خاں کے لئے بھیجا جو جلوس کے دن پہنا تھا، اور آٹھ ہزاری منصب بندر لاہوری۔ ۲۲ رجب ۱۰۳۷ھ میں آصف خاں داراشکوہ، محمد شجاع اور اورنگ زیب آصف خاں دربار شاہجہانی میں کو ساتھ لے کر لاہور سے آگرہ آیا اور بادشاہ کے حکم سے سکندرہ میں مقیم ہوا، ممتاز محل بیٹوں سے ملنے گئی آصف خاں نے اس کا استقبال کیا، آصف خاں کو مہر اوزک جو ممتاز محل کے پاس رہتی تھی عنایت ہوئی اور وزارت کا منصب، عین الدولہ کا خطاب ملا، گفتگو کے وقت بادشاہ لفظ عمو سے مخاطب کرتا تھا، آٹھ ہزاری منصب آٹھ ہزار سوار سپہ سہ اسب کا منصب ملا، جو آج تک کسی امیر کو نہ ملا تھا اس کے بعد جب آصف خاں نے اپنی فوج کا معائنہ کرایا تو نو ہزاری کر دیا گیا اور نہایت آباد جاگیر جس سے پچاس لاکھ روپیہ وصول ہوتا تھا مرحمت کی گئی۔

۱۰۳۹ھ میں نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال کی غرض سے فوج آصف خاں کی سپہ سالاری تعینات ہوئی جس کے ایک حصہ کی سرداری شائستہ خاں ولد آصف خاں کے سپرد تھی، اس فوج کا سپہ سالار اعظم خاں تھا۔ سپہ سالاری کا عہدہ نہایت اہم تھا فوج میں بڑے بڑے امیر اور سردار ہوتے تھے ان پر اثر قائم رکھنا آسان نہ تھا اور بغیر اثر و اقتدار کے فوجی مہمات کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں

معرکہ جنگ و جدال میں فوج اور امراء پر اقتدار قائم رکھنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے اعظم خاں سپہ سالار تو ہو گیا مگر وہ سپاہ کو قابو میں نہ رکھ سکا امراء اس کی مسادات کا دم بھرنے لگے جس سے تنظیم میں فرق پڑ گیا، پھر اعظم خاں سے کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ وہ انعام یا منصب عطا کر سکتا ہے بادشاہ نے یہ کیفیت دیکھ کر برہان پور میں مبین الدولہ آصف خاں کو سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کیا۔

عادل شاہ کی گوشمالی ۱۱۸۵ھ میں آصف خاں برہان پور سے محمد عادل شاہ بیجا پور کی گوشمالی کے لئے بڑے تڑک و احتشام سے زبردست فوج لے کر روانہ ہوا حوالی بیجا پور میں اس نے خیمہ لگائے اور بارودھاڑ شروع کی لیکن محمد امین مصطفیٰ خاں اور خیریت خاں چالیس لاکھ روپے کی پیشکش لیکر قلعہ سے نکلے اور صلح کر لی، لیکن خواص خاں جو اس وقت سلطنت بیجا پور کا کرتا دھرتا تھا وہ جانتا تھا کہ ملک ویران ہے اور لشکر شاہی میں غلہ، گھاس، لکڑی اور دوسرے سامان رسد کی قلت ہے ایسی حالت میں آصف خاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا، اس لئے وہ بدستور مدافعت میں مصروف رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ لشکر میں نہ صرف غلہ ہی کا قحط تھا بلکہ تمام ضروری چیزیں بھی نایاب تھیں حتیٰ کہ ایک جوڑ جوتے کی قیمت چالیس روپیہ تھی اور ایک گھوڑے کی نعلبندی میں دس روپے صرف ہوتے تھے پھر یہ ملک بھی بالکل ویران تھا مجبوراً مبین الدولہ بیجا پور سے محاصرہ اٹھا کر رائے باغ اور مرج کی طرف قتل و غارتگری کرتا ہوا رہی ہوا۔ جو بہت آباد ملک تھا پھر برسات کے قریب کی وجہ سے واپس آ گیا۔

آصف خاں سے شاہجہاں کی کشیدگی اس ہم کا ایک ناگوار واقعہ یہ ہے کہ ایک دن خلوت میں اعظم خاں نے آصف خاں سے کہا کہ بادشاہ کو اب میری اور آپ کی ضرورت نہیں ہے آصف خاں نے کہا میرے اور تمہارے بغیر سلطنت کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کو بھی کسی طرح اس گفتگو کا علم ہو گیا اور اس کو سخت ناگوار سی ہوئی فرمایا کہ آصف خاں کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ آئندہ امور سلطنت میں اُسے کوئی شکیف نہ دی جائے۔

خان خانانی کا خطاب اگرچہ اس واقعہ کے بعد دونوں میں خلوص نہ تھا لیکن بظاہر آصف خاں کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی بلکہ جہا بابت خاں کے مرجانے پر شہ جلو سس میں خان خانانی اور سپہ سالاری کا لفظ اس کے خطابات میں بڑھا دیا گیا۔

انتقال ۱۱۸۵ھ کو آصف خاں نے مرض استسقا یعنی جلد ر میں انتقال کیا۔
”زہے افسوس آصف خاں“ تاریخ وفات ہے۔

بادشاہ علالت کے دوران میں چند بار اسکے گھر گیا، بادشاہ کو اس کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا، آصف خاں کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جوان دنوں صوبہ بہار کا ناظم تھا ممتی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا، آصف خاں کے دوسرے لے ماثر الامرا جلد ادلی صفحہ ۱۵۸

بیٹوں اور بیٹیوں نیز بیگم صاحبہ (اپنی بیٹی، بادشاہ بیگم) کی دلجوئی کی سب کو بغیر سبے ہوئے نوکریوں کا خلعت دیا آصف خاں کے متعلقین میں جو شخص منصب کے لائق تھا اُسے منصب دیا گیا اور جو تنخواہ کے قابل تھا اُس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

شاہجہاں جب آصف خاں کی عیادت کو گیا تو اس نے علاوہ لاہور والی عیال کے جسکی تعمیر پر بیس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور علاوہ ان مکانات کے جو دہلی آگرہ اور کشمیر میں واقع ہے دو کروڑ پچاس لاکھ روپے کے جواہرات، چاندی، سونا اور اجناس بادشاہ کے سامنے پیش کر کے التجائی کر ان سب کو خزانہ عامرہ میں داخل کر لیا جائے۔ کیونکہ مال دولت جمع کرنے کا مقصد سوا اسکے اور کوئی نہیں ہے کہ اولاد کے آرام و راحت میں کام آئے لیکن میرے اولاد اور اعزہ آپ کے فیض التفات سے خوش و خرم ہیں، ایسی صورت میں یہ مال و متاع خزانہ ہی میں داخل ہونا چاہیے۔

بعض کتابوں میں ان چیزوں کی تفصیل لکھی ہے :- جواہر :- ۳۰ لاکھ روپے کے —————
اشرفی :- ۳ لاکھ یعنی بیالیس لاکھ روپے کی ————— نقد :- ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے —————
سونے چاندی کے ظروف :- تیس لاکھ روپے کے ————— دوسری اجناس :- تیس لاکھ روپے کی —————
بادشاہ نے اس میں سے بیس لاکھ روپے لے کر تینوں بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو تقسیم کر دئے، لاہور کا محل داراشکوہ کو عنایت کیا گیا جو آصف خاں کا نواسہ تھا۔ باقی اشیاء ضبط کر لی گئیں۔

آصف خاں کو شاہجہاں کے حکم سے جہانگیر کے روضہ کے غریب جانب دریائے راوی کے کنارے دفن کیا گیا مقبرہ قبر پر عالی شان گنبد تعمیر ہوا اور باغیچہ بھی نصب کیا گیا۔

نوشی کا لے خاں صاحب نے تاریخ عمارات شاہان مغلیہ کے صفحہ ۱۱۹ پر مقبرہ اعتماد الدولہ کے حالات میں لکھا ہے :-
ایک گورنر میں ابوالحسن امین الدولہ آصف خاں کی قبر ہے جن کا منصب شاہجہاں بادشاہ کا عطا کیا ہوا نو ہزاری تھا

وزیر اعظم بھی تھے اور شاہجہاں بادشاہ کے سر بھی تھے ۱۶۵۲ء میں مرض استسقا سے انتقال کیا۔

معاذ نہیں منشی صاحب موصوف کی اس تاریخی کاوش و جستجو کا ناغہ کیا ہے اور اس میں کہاں تک اصلیت ہے سن وفات تو منشی صاحب نے غلط لکھا ہے، آصف خاں سلطنت میں فوت ہوا ہے، سلطنت میں وہ زندہ و سلامت تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو کسی نے اُسے لاہور سے اٹھا کر آگرہ میں باپ کی آغوش میں لا رکھا ہو مگر اُسی کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی نورجہاں بھی تو اعتماد الدولہ کی بیٹی تھی وہ لاہور ہی میں موجود اب ہے۔ ممکن ہے جہانگیر کی رعایت سے نورجہاں کو وہاں رہنے دیا گیا ہو، بہر حال میرے مطالعہ میں جس قدر تاریخی کتابیں ترتیب مضمون کے وقت نہیں ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ ابوالحسن لاہور سے آگرہ آ گئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

کوثر چاند پوری

سیفو

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :-

”اگر دنیا کے تمام شعرا سے سوال کیا جائے کہ وہ کون سا پیش بہا خراج ہے جو زمانہ نے انسانی فطرت (جنین)

کی غفر مندی کے ذریعے سے حاصل کیا، تو وہ بلا تامل اور متفقہ طور پر جواب دیں گے کہ سیفو کے گمشدہ اشعار !“

شیکسپیر کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مردوں میں ہومر برترین شاعر ہے، مگر سیفو بغیر استثنائے تہوں میں ہر ترین شاعر ہے عجیب بات ہے کہ ہومر اور سیفو صرف کمال فن کے اعتبار سے شعرائے عالم کے سرخیل ہیں بلکہ قدامت کے لحاظ سے بھی ہیں اور اس پہلو سے ان کے کمال فن کا کما حقہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

سیفو کی مقبولیت کو دنیا کے کسی ملک اور کسی زمانے کا کوئی شاعر نہیں پہنچتا، کیونکہ دنیا میں کسی شاعر کی تصویر کسی ملک کے سکوں پر چھپائی نہیں ہوئی۔ یہ اعزاز اور خصوصیت صرف سیفو کا مقدر تھا۔

دوسرا ثبوت سیفو کی عظمت اور مقبولیت کا یہ ہے کہ تین سو سال سے سیفو اور اُس کے کلام کے متعلق جستجو جاری ہے اور براہِ مجتہدین فن و ادب تحقیق و تلاش دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مکمل کتاب ۱۹۵۸ء میں سٹرو ہارٹن (Wharton) نے لکھی جسے سیفو کے باب میں ”لفظ آخر“ کا درجہ دیا گیا۔ مگر بیس سال پور سے نہ ہونے پائے تھے کہ سر ہینر (Heine) نے ایک جامع تراجم پیش کر دی۔

سیفو کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لئے متعدد دیورپی شعرائے سیفو کے ایک ایک پارے کو لیکر پوری نظمیں لکھی ہیں جو دنیا کی تاریخ ادب میں نئی اور نرالی ادبی کاوش ہے۔ کسی شاعر کے خیال کو اُس کے ایک لفظ یا کلمے سے اُس شاعر کی طرح تخیل کرنا، اُسی کے ماحول میں احساس کرنا، اور اُس کی تخیل و احساس کو اپنا لینا درحقیقت اہرامِ مصریٰ کو آن واحد میں کھڑکھڑانے کے برابر مشکل کام ہے، اگرچہ سیفو کے خوابوں کی تعبیر نہیں بیان گئی بلکہ اُس کے خواب خود دیکھے گئے، اقطع نظر اس سے کہ ان شاعروں کو کس حد تک کامیابی ہوئی، یہ مجرد واقعہ کہ سیفو کے کلمے پر سیفو ہی کی زبان و انداز میں نظمیں کہی جائیں اور اُس کا رنگ اور سیرت پیدا کی جائے ایک کارِ عظیم و عجیب ہے ! چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک جشنِ دعوت میں یونان کا مشہور مقنن سولن بھی شریک تھا۔ سولن کے پیچھے نے اُس صحبت میں سیفو کے بعض شعر پڑھے۔ سولن ان اشعار سے اس قدر متاثر ہوا

کہ اُس نے وہ اشعار اُسی وقت یاد کئے اور پھر ایک سوال کے جواب میں کہنے لگا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں ان اشعار کو یاد کے بغیر مرنے کا ہوتا ہوں۔

دوسرا تاریخی واقعہ اس کے دو سال بعد کا ہے۔ اپکرائس (Apicratis) کے ڈرامہ کا ایک کردار خمر کرتا ہے کہ اُسے سیفوکائیٹ یاد ہے! اس واقعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُس وقت کی سوسائٹی میں سیفوکے اشعار کا کیا درجہ تھا۔ سسر کے زمانے میں بھی سیفوکے گیت گائے جانا ثابت ہے اور پھر تیسری صدی عیسوی تک کی شہادت ملتی ہے کہ سیفوکے نغمے ذوق و انہماک کے ساتھ گائے جاتے اور انسانوں کو وجد میں لاتے تھے۔

اس کے بعد یقینی شہادت تو نہیں مگر ساتویں صدی عیسوی میں بھی سیفوکے نعمات کی مقبولیت کے اشارے ملتے ہیں کہ وہ بالکل محو نہیں ہو گئے تھے۔ کیونکہ اُس صدی کے نغموں نے سیفوکے حوالے دئے ہیں۔

ایک اور خاص بات سیفوکے عظمت کے ضمن میں یہ ہے کہ ساتویں صدی کے بعد سے سیفوکا نام اور کلام محو ہو کر پندرہویں صدی کے آخر تک کہیں اُس کے متعلق اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن سولہویں صدی میں اُس کی مقبولیت اور عظمت پھر اپنا مستحق مرتبہ پالیتی ہے!۔

ہو مگر کی طرح کسی شاعر کا کلام ہمیشہ مقبول و معزز رہ سکتا ہے، غالب کی طرح مردود ہو کر مقبول بھی ہو سکتا ہے اور نظیر کی طرح متصل مقبول بھی رہ سکتا ہے اور مردود بھی، لیکن یہ خصوصیت تنہا سیفوکو حاصل ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انتہا درجے پر مقبول رہنے کے بعد انسانی مانتے سے یکسر محو ہو جائے اور آٹھ صدیوں تک بالکل گمنام رہ کر پھر وہی عظمت و قبولیت حاصل کر لے۔

سیفوکے اخلاقی حالت اور اُس کے کردار کے متعلق دو باتوں نے سخت الجھن اور مغالطہ پیدا کر دیا۔ ایک تو اس کا اپنی شاگردوں سے غیر معمولی اظہار محبت کرنا جو اُس کے موجود اشعار کا بھی غالب موضوع ہے اور خاص کر اُس کی وہ نظم جو سیفوکے اپنی شاگرد ایتھیس کو مخاطب کرتے لکھی ہے اور دوسری بات وہ خط ہے جس کو غیر مستند طور پر اووڈ کی تصنیف کہا گیا ہے، سیفوکے منسوب کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب فاؤن (Phaon) کو لکھا تھا۔

فاؤن کے افسانے کا مسالا اصل میں بعض نغموں کی تاویلوں کا نتیجہ ہے۔ سیفوکے دن مقام ایسیس میں بھی رہی تھی، اور وہاں اُس کی ہم نام ایک ڈیرہ دار (Phaon) بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جب سیفوکے رسوا کی جانے لگی تو ان نغموں میں سے کسی نے ان داستانوں کو اُس ڈیرہ دار سیفوکے منسوب کر دیا۔ یہ خیال شاید اس لئے پیدا ہوا کہ جس بالکل شاعر کے نام اور حوالے سے لوگ اپنے فن صرف و نحو کو معزز بناتے ہیں اُسے رسوائی سے بری ہونا چاہئے۔

مگر بعد کے یونانی طبع نگاروں نے جو تاریخ ادب میں ایک کامیڈین (Comic Poet) کہے گئے ان افسانوں کو لیکر متعدد ڈرامے لکھ ڈالے۔ بعد پھر ناموں کی تیور مٹ کر ان داستانوں کو اُس ذات سے منسوب سمجھا گیا جو نہایت

مشہور تھی۔

قدیم زمانے کے جن لوگوں نے سیفوقے نام کو ذلت و رسوائی سے پاک رکھنے کی کوشش کی ان میں سب سے پہلے فلسفی میکسیس کا نام آتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ کردار اور شریفانہ اخلاق کا انسان تھا اور اس کے خیال میں سیفوقا اپنی شاگرد لڑکیوں سے غیر معمولی محبت کرنا کوئی انہونی بات نہ تھی اور اس کی یہ محبت اس محبت سے مماثل تھی جو حکیم سقراط کو اپنے شاگردوں سے تھی یعنی میکسیس، سقراط اور سیفوق کی محبت کو معصوم سمجھتا تھا۔ اس نے نتیجہ نکالا تھا کہ ان دونوں کی رسوائی کی ذمہ دار ان کی ہمدردانہ فطرتیں تھیں، اور کثرت احباب کے ساتھ ان کی حسن پرست طبیعتوں کو غلط طور پر سمجھنے کا نتیجہ! وہ خود سیفوقے کلام سے اس کے اخلاق و کردار کی بلندی ثابت کرتا اور بتاتا ہے کہ سیفوقا ایک بھائی جو اسکندریہ میں تھا، ایک ڈیرہ دار دریشا (جس کا تاریخی لقب روڈولف "Rohdolph" تھا) کی محبت میں خراب و خوار ہوا تو سیفوق نے ایک نظم میں اسے سخت تنبیہ کی۔

اس کے معاصر اور مستند شاعر الکائیس نے سیفوق کو ان غلطوں میں مخاطب کیا ہے:-
 "بغض کے پھول بننے والی، مسکراہٹ سے شھاس برسانے والی، پاکیزہ سیفوق! میں تجھے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر حجاب کرتا ہوں!"

سیفوق نے اس نظم کا جواب نظم سے دیا:-
 "تیری خواہش اگر کوئی عمدہ بات کہنے کی ہوتی تو تیری آنکھوں کو شرم، چھو سکتی اور توجہ کچھ کہنا چاہتا تھا بر ملا کہہ سکتا!"

سیفوق کی محبت کے ان افسانوں پر سب سے پہلے ایک جرمن نقاد ویلیکر (Welleker) نے درایت کی نظر ڈالی اور اپنے استدلال سے سیفوق کو تمام انسانی اور نسوانی خوبیوں کا مجسمہ قرار دیا۔ مسٹر سیور (Mendham) نے اس سے اختلاف کیا اور بحث کی گر اگر می اتنی بڑھی کہ دونوں حد سے تجاوز کر گئے۔

اس وقت کے ادنیٰ طریقہ نگار شعرا، سیفوق کو ایک آفادہ، عشت پرست اور لیسباس کے اوہاش طبقے میں اپنی شاعری اور پست اخلاقی کے سبب مقبول ہونے کے رنگ میں پیش کر کے ان بحثوں کے لئے موضوع پیدا کر گئے اور ان بحثوں کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ سیفوق مسلم طور پر اگر اپنے زمانے کے معیار اخلاق سے بالاتر نہ تھی تو گری ہوئی بھی نہ تھی۔ اس گفتگو کے آخر میں انساٹکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کا یہ قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "اگر مثلاً اس قمار کے کو سامنے رکھا جائے جو اسٹونیز نے سقراط کا بنا کر پیش کیا تھا تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ سیفوق کے متعلق اس ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس تمام کو یکسر نفقات سمجھیں۔"

ذکورہ بالا شبہاتوں سے سیفوق کے کردار کو اس گندگی سے پاک کیا گیا ہے جو یونانی طرز نگاروں نے اس کے

سرستونی تھی اور جس کی تفصیلات اور دلائل اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اور اس واقعے سے بھی اٹھار کیا گیا ہے کہ اُس قصے کی اگر کوئی اصلیت ہوتی تو اُس وقت کے یونانی ادب میں اُس کا ذکر آتا۔ یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ چونکہ بعض قدیم بیانات میں ایڈونس کو فاؤن کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لئے یہ فسانہ وٹیس واڈونس کے قصے کی یاد تازہ کرنے کے لئے وجود میں آیا۔

لیکن اس تمام تحقیق و تلاش میں جو انسانی فکر و جستجو کا نتیجہ خیز کارنامہ ہے، ایک بات کیسر نظر انداز کر دی گئی ہے اور وہ سیفو کا انسان اور عورت ہونا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ سیفو اُس قوم کے افراد میں تھی جو حسن کے مظاہر کی دیوانی تھی، لیکن یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا کہ سیفو کو کسی سے محبت ہوئی۔ وہ محبت جو دو گوشت پوست کے انسانوں میں ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا جاسکا کہ سیفو کو اپنے شوہر سے محبت تھی۔ فاؤن کے افسانوں کو قیاسات سے غلط ثابت کیا گیا ہے کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر دوسرے پہلو سے بھی قیاسات کی شہادت مانی جائے تو خود ایک انگریز نقاد کو تسلیم ہے کہ یہ افسانہ، سیفو کی شاعرانہ شخصیت پر حیرت لباس کی طرح زیب دیتا ہے۔

ایک ایسی شاعرہ جس کا مانی پچیس صدی کا ارتقا بھی پیدا کر سکے، محبت کے بغیر اتنی زبردست مغنیہ محبت بن جائے! قیاس قبول نہیں کرتا۔ شاعر اگر حقیقی ہے تو اُس کے لئے محبت ناگزیر ہے! پھر سیفو کی توقیر شعراء کے سلیپے میں ڈھلی تھی! اور اُس کے ساتھ نفس انسانی کی رمز شناسی، جذبات کی سچی قدر دانی، راحت و آرام کی زندگی، یہ سب لوازم مہیا ہوں اور محبت کو دخل نہ ملے! عقل نہیں مانتی ایسی سیفو کا کسی کی محبت میں دیوانہ ہو جانا، اُس کا محبت سے محروم رہنا بے شک حیرت انگیز ہو سکتا ہے! اس کے برخلاف محبت کرنا اور نہ اس ہونا جو سچی محبت کا انعام ہے اور پھر اُس محبت پر قربان ہو جانا، سیفو کی ہستی کو ایک شعر نغز بنا دیتا ہے۔ محبت کا ایک شاہکار پیش کر دیتا ہے۔ سیفو کی ذات سے اس واقعے کی نسبت نے اُس کی شخصیت میں ایک طلسمی کشش پیدا کر دی ہے جن محققین نے اس فسانے کو بے اہل ثابت کرنے کے لئے کاوشیں کیں، کوئی شک نہیں کہ تحقیق کی دنیا میں قابل صد تحسین کام کیا ہے، لیکن شعر و شباب کی دنیا میں تو اسے شکست طلسم سے تعبیر کیا جائے گا اور اس سے انکار نہ کیا جاسکے گا کہ اس سراسر تخیلی قہقہے نے ہمیں بہاؤ و پارے پیدا کر ادئے اور اعلیٰ قسم کی نظم و مترو جود میں آگئی۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن سیفو کا یہ ”نامہ محبت“ اس قابل ہے کہ باقی رہے۔

سیفو کا محبت نامہ

سچے بتانا، جب تم نے یہ خط پڑھا تو کیا میری صورت بھی تمھارے ذہن میں آگئی تھی؟ اور کیا آخر میں نام پڑھنے سے پہلے تم جان گئے تھے کہ خط کس کا ہے؟
تم کہو گے کہ میرا محبوب مشغلہ تو گیت بتنا ہے، میں نے یہ نوہ کیوں لکھا؟ ہاں، مگر میری محبت مغموم ہے۔

یہ نوحہ ایک مغموم نغمہ ہی تو ہے! حالانکہ میرے برہم سے آنسوؤں کا گیت نہیں ٹکلتا! مگر میں اس طرح پھنک رہی ہوں جیسے کئی کا بھرا ہوا اور تیار کھیت تیز چرواہا میں لودیتا دکھائی دے!

فاؤن، ایٹنا کے گشت زاروں میں پھر رہا ہے اور میرے دل میں ایٹنا کی آگ روشن ہے! میرے برہم کے تار لے ہوئے ہیں لیکن مجھے کسی گیت کا اہام نہیں ہو رہا ہے، وہ دماغ جو گیتوں میں بات

کرتا ہو خیالات سے خالی ہے!

لیسباس کی دو شیرہ لڑکیاں، ہاڑھال کی کنواریاں، اور میتھنا کا کنارہ اب مجھے نہیں بھاتے۔ انکٹوریا اور سائڈرو کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے اور نہ ایتھیس میں کوئی دلکشی، اور میری وہ محبت جس میں سیکڑوں شریک تھے اور جو میری رسوائی بھی بن گئی اب صرف تمہارا حصہ ہے۔ تنہا تمہارا! تم کہتے خود غرض ہو!

تم خوبصورت ہو ایسے کہ جوانی تم سے چہلیں کر رہی ہے، اور اسے حسن پر لذت! تمہاری خوبصورتی اور جوانی میری نظروں کا جال بن گئی ہے! تم اگر گز اور ہیل اٹھا لو تو فیڈس (Hecuba) بن جاؤ گے، اور جو اتھے پر ایک سینک لگا لو تو باخس (Bacchus) نظر آؤ گے! فیڈس نے دو شیرہ کرپٹ کی آرزو کی اور باخس نے ڈیفنی کی۔ لیکن گیت گاتا تو کرپٹ والی جانتی تھی اور نہ ڈیفنی! ایسے شیریں نغمے! یہ دہر گیت تو میوزوں نے بس سیفو کو سکھائے ہیں جن سے دنیا گونج رہی ہے! الائیٹس بہتر گیت لگتا ہے لیکن اُس کی شہرت برتر نہیں، اگرچہ میرا اور اُس کا وطن ایک ہے، ساز ایک ہے!

بے مہر فطرت نے مجھے زیبائی نہیں بخشی، لیکن اُس کے بدلے میں روشن درسا ذہن دیدیا ہے! میرا جسم وقد مختصر ہے، لیکن میرا نام زمینوں اور سمندروں سے بڑا ہے۔ یہی میری قدر و قیمت کا پیمانہ ہے! میرا روپ رنگ سانولا ہے، پرکالی رنگت والی اینڈرومیڈا (Andromeda) پر سیڈوس (Cecrops) کی ٹکا ہوں میں گوری تھی! رنگ دار کبوتروں میں سفید کبوتریاں اکثر دیکھی جاتی ہیں اور سیاہ کھوکھوے کی مادہ سبزہ رنگ ہوتی ہے! لیکن تمہیں اگر اپنا ہی سا جوڑا چاہئے تو یاد رکھو کبھی نہ پاؤ گے۔ ایسی کوئی نہ لے گی! ہاں، اگر تم مجھے پڑھو گے تو میرا حسن و جمال بڑھ جائے گا! اور تم کہتے بھی تو تھے کہ تو بس باتیں کرتی رہ!

مجھے یاد ہے کہ جب میں گاتی — کہ محبت کرنے والے ہی گانا جانتے ہیں — گاتی ہوتی، تو تم میرا منہ چوم لیتے تم میرے گانے کی تعریف کرتے، میری ہر چیز اور سہرات سے خوش ہوتے — خاص کر جب محبت تسکین پاتی! میرا چنچل پن تمہیں بہت بھاتا، میری چلبلاہٹ تمہاری نظر میں بہت پیاری ہوتی! اود! جب ہماری محبت اپنا حق

لے لے پالو سورج کا دیوتا۔ لے لے ایک حسین دو شیرہ جو ستارہ بنا دی گئی — لے لے ایک یونانی ہیر جس نے اینڈرومیڈا کو رانی دلائی

ایسی تو خواب ناک کاہلی میں خستہ و خموش پڑے رہنا! کس قدر مزہ دار گھڑیاں ہوتی تھیں!

گمیر نے نئی فتوحات — سسلی کی لڑکیاں ہو اور تم! اب لیسا بس کہاں؟ مگر میں بھی سسلی ہی کی ہوں! اسے
لیگیا کی مانو اور لڑکیو! اس فراری کو پٹا دو! اس کی چکنی چڑی باتوں میں نہ آنا۔ میں بھی انھیں لفظوں کو سن چکی ہوں!
آئریکس (جسموع) والی دیوی! میں تو تیری زبان ہوں — میری مدد فرما! میرے باپ کی موت پر جب
اس کی مٹی میرے آنسوؤں سے بھیگی تو میں نے جیسے ہی بہا ریں تو دیکھی تھیں! میرے بھائی نے ایک بیسوا کے پیچھے
اپنی دولت اور عزت کھودی اور اب اُسے بری طرح پھر حاصل بھی کرنا چاہتا ہے جس طرح کھوئی تھی، اُس نے اپنی بہن
سے کھری کھری سنیں۔ یہ تو میرے ضمیر اور صاف گوئی کا تقاضا تھا۔ اور یہ مصیبتیں نہ ہوتیں تب بھی میری بچی کی فکر میں کیا کم تھیں
لیکن اب سب سے بڑھ کر میرے غموں کا باعث تم ہو! میری ناؤ لگی اور مخالفت ہوا ایسے تیز ہیں! اب میرے کیسو
پریشان رہتے ہیں اور اُن لنگیاں کینوں سے خالی! میرا لباس گھٹیا ہے اور میرے سر پر نہ تو سنہری دمک دکھاتی دیتی
ہے اور نہ اُس میں عربستان کی شبنم مہکتی ہے۔ میں اچھے لباس اور جواہر سے سجوں تو کس کے خوش کرنے کو؟ میرے
جذبات کا دیوتا تو سمندر پار جا رہا ہے!

میرا دل اب اتنا گداز ہو گیا ہے کہ ایک کانٹا بھی مجھے ہلاک کر دینے کو کافی ہے۔ میرے جینے کی اب کوئی وجہ انگر
ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ زندگی بھر محبت کئے جاؤں!

میری پیدائش کے وقت بہنوں نے خیال رکھا تھا کہ میرے گرتے میں موٹا ڈورا نہ ہو۔ میری سناعت نے مجھے ایسے
ساخے میں ڈھال دیا کہ تھیلیا (مضمکہ) کی تعلیم میرے قلب کو متاثر کرتی ہے! پھر اگر ایک چکنے گالوں والے نوجوان
کی محبت کا روزِ ظفر مندی مجھے گمراہ کر دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

سحر کی دیوی! میں ڈرتی تھی کہ تو اُسے مجھ سے چھین لے گی، اور وہی ہوا!

اے آسمان کے چاند! اُس کا واسطہ جو سب کا واسطہ ہے، فائون کو کچی نیند میں نہ اٹھا دینا!
وینس اُسے اپنے رتھ میں بٹھا کر اوپ کر لے گئی ہے، مگر میں ڈرتی ہوں کہ کہیں مرغِ اُس کی خوب روئی کو دیکھ پائے!
یٹھا برس! بالکل جوان نہ بالکل لڑکا! ہاں، تیرا سن دس سال تو بس ایک جوہر ہے — صرف ایک مسرت! آنا و مجسم
رعنائی! میری گود میں آجا! تو محبت نہ کر، میری تو اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے محبت کرنے دے!

میں اگرچہ تھیں خط لکھ رہی ہوں مگر آنسو ہیں کہ اُمڑے آرہے ہیں۔ کاغذ کے یہ دھبے دیکھ لو!
لیکن اگر تھیں جانا ہی تھا تو پیارا خلاص کے ساتھ رخصت ہوتے! یہ کہتے ہوئے جاتے کہ ”لیسا بس والی خیر باد!“

میرے آنسوؤں کی اور میرے بوسوں کی تم نے قدر نہ جانی! کاش میں اُسوقت انمازہ کر سکتی کہ مجھے کیا دکھ پہنچے
والا ہے! تمھاری یاد میرے پاس تو لامت و ندامت بن گئی ہے، مگر تمھارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو تمھیں میری
یاد دلائے، حالانکہ میں تمھیں چاہتی ہوں!

میں نے تم سے کچھ نہیں چاہا۔ کچھ نہیں، بجز اس کے کہ میری محبت کو نہ بھلانا! میرے پیارے! محبت کی
قسم۔ اور محبت خدا کرے تمھارے پاس رہے۔ نوؤں میوزوں کی قسم، جب کسی نے کہا کہ میری تمام خوشیاں
اُڑ گئیں تو میری آنکھ سے نہ تو آنسو گرا اور نہ منہ سے ایک حرف نکلا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھا ہی نہیں، میرے گلے
میں آواز تھی ہی نہیں! میرا سینہ برن کی چٹان تھا! لیکن جب غم کو زبان ملی تو میں نے چھاتی پیٹ لی، بال
نوح ڈالے، اور جان گھلا دینے والے صدمے سے چیخا کی! بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کی چٹان کے سامنے ایک ماں کا
حال ہو!

میرا بھائی کرکس میرے غم کو دیکھ کر ہنستا ہے اور میرے صدمے کے سبب کو زیادہ شرمناک بنانے کے لئے
کہتا ہے: "اتنا رنج کیوں کرتی ہے، اس کی بیٹی تو زندہ ہے!"

محبت اور ندامت کبھی متفق اور یکجا نہیں ہو سکتے۔ میرا مجروح سینہ لوگوں کی نگاہوں کے لئے کھلا ہوا ہے!
میرے خیالات فاؤن کے قبضے میں ہیں اور میرے خوابوں کو دن کی طرح روشن وہی بناتا ہے! فاؤن، تم کو مجھے
دودھو گر خوابوں میں میرے پاس رہتے ہو! مگر مینڈے جتنی خوشی مل سکتی ہے وہ بہت مختصر نہایت قلیل ہوتی ہے!
میں اکثر دیکھتی ہوں کہ میرا سر تمھارے بازو پر رکھا ہے، یا میرا سیدھا تمھارا کلیہ ہے۔ بعض دفعہ یہ اختلاط اتنا حقیقی ہوتا
ہے کہ میرے ہونٹ۔ میرے سب حواس جاگ پڑتے ہیں! میں زبان در دھن تمھارے بوسہ کی لذت محسوس
کرتی ہوں۔ بوسہ لینے اور بوسہ دینے، دونوں قسم کی لذت! اور پھر محبت کی رسم پوری ہوتی ہے۔ کتنی میٹھی اور
پر لذت! فاؤن! تمھارے بغیر محبت کا مزا کیا!

لیکن جب دن اپنی صورت اور سب کچھ دکھانے آجاتا ہے تو میں بڑبڑاتی ہوں کہ میرے خواب اتنی جلدی
ختم ہو گئے، اور میں جنگل میں نکل جاتی ہوں۔ گویا میری مایوسی و محرومی کا علاج اس سے ہو جائے گا! کیونکہ اُس
جنگل نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس کا دیکھنا سب کو خوش کر دیتا ہے! میں پاگلوں کی طرح سر کھلے دباں پہنچتی
ہوں اور کھوکے اندر سیاہ اور کھر دردی چٹان ٹٹکتی دیکھتی ہوں جواب سے پہلے مصفا مر معلوم ہوا کی تھی! میں
اُس کنج میں جاتی ہوں جہاں ہم اکثر سوئے تھے اور جس کے جھونرے ڈالیاں ہمارے اوپر جھکے رہتے تھے،
مگر وہ کنج اب اوچڑ معلوم ہوا، کیونکہ جنگل کی رونق اور میرا آقا تو معبود ہی نہ تھا۔

وہ سبزہ زار جس پر تم پڑے رہتے تھے، جس کے اوپر تمھارے قدموں کے نشان تھے، میں نے اُس جگہ کو

ہاتھ سے چھوا! آہ، وہ سبزہ جو کبھی اتنا پیارا تھا آج میرے آنسوؤں سے سنبھا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی ڈالیاں آہیں بھر رہی تھیں اور چڑیوں کے چھچھ غائب تھے! بس ایک غمزہ لیل چنچ رہی تھی، اسلئے کہ اُس کا۔ شوہر نہیں۔ محبوب مارا گیا ہے! لیل ہائے گل پکارتی ہے اور سیفو ہائے دل!

پھر زات آکر اُس کینج کو سلا دیتی ہے۔ میں اُس بلوریں چشمے پر جاتی ہوں جو دیوتا کا استھان ہے اُس پر کنول کی ڈالیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں چشمے کے کنارے گھاس پر گر جاتی ہوں تو ایک نعت آکر کہتی ہے:-

”تو اگر محبت کی آنچ نہیں سہا سکتی تو امبرسیا (Ambrasia) کے ساحل پر جا جہاں سے دُکیان نے چھلانگ ماری اور پائڑھا کے دل میں اُس کی محبت پیدا ہو گئی۔ دُکیان کو کوئی صدمہ نہ پہنچا اور اُس کا دکھ درد مٹ گیا۔ تو بھی لو کیڈیا کی چوٹی پر چڑھ جا اور بے خون جست لگا۔ تیرے لئے بھی وہی ہو گا!“

یہ کہا اور وہ آواز اور آواز والی غائب ہو گئی۔ میں اٹھی، آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو جھرنے لگے، میں نے کہا:-

”اچھا نعت، میں محبت کی دیوانی جاتی ہوں چوٹی پر، مجھے ہراس بھی نہیں ہے، جو مقدر! ہواؤ آؤ، میرے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھانے میں تمہیں تکلیف نہ ہوگی! محبت کے فرشتے! آؤ اور مجھے اپنے پردوں پر اٹھالے کہ لو کیڈیا کا کنارہ میری موت سے بدنام نہ ہو!“

میں اپنے برہم کو جو میرے اوتھیس کے لئے مشترک فخر کا باعث تھا، فیس پر چڑھاتی ہوں۔ میرے برہم پر یہ شعر لکھوا دینا:-

”یہ برہم سیفو کا نذرانہ ہے! وہ جتنا سیفو کے لئے موزوں تھا اتنا ہی موزوں تیرے لئے ہے!“

آہ، مگر ادبھاگ جانے والے تو مجھے ایکٹیم کے کنارے جانے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ تو ہی کیوں نہیں آجاتا کہ لو کیڈیا کی موجوں سے بہتر علاج تو تو ہے! تو فیس دیوتا کی طرح گہر داور جوا غمزہ ہے! اُف، تو بحری چٹانوں سے زیادہ سنگدل ہے۔ تو میری موت سے ایک شاندار خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے!

ہمارے دونوں کے سینے متصل ہونے کی جگہ، میں لو کیڈیا کی چوٹی پر سے کود رہی ہوں! فائون، یہ وہی تو سید ہے جسے تم نے فطنت کی آگ سے معمور کیا تھا!

اے کاش میں گا سکتی! لیکن غم کی آگ نے میرے دل کو بلا ڈالا، اور میری فطنت و صنعت کو تباہ کر دیا۔ اب میرے گیتوں میں وہ ہنروری نہیں رہی، اب میرا برہم چپ ہے۔ اُس کے تارخوش ہیں۔

لیسباس کی بیاہتا اور کنواریو! اب لیا کے گیتوں میں تمہارے نام بڑے پیارے لگتے ہیں، لیکن لیسباس کی محبت میرے لئے تو رسوائی لائی! اب تم میرے گیت سننے اٹھیں نہ ہونا! وہ سب کچھ جسے تم سما دی سمجھتی تھیں۔

فاؤن کے ساتھ اڑ گیا! میں — میرے فاؤن — کہنے والی ہی تھی! برصیب سیفوا! جاؤ، اور اُسے بلاؤ تو پھر میں تمہیں گیت سناؤں گی! میری فطنت کو چمکانے اور ماند کرنے والا تو فاؤن ہے! اُن، مگر میری التجائیں کس کام کی! اُس کا دل کب پہنچتا ہے! میری التجائیں تو تیز ہواؤں کے ساتھ یہ جاتی ہیں! او گھونگے! تو ہی میری التجاؤں کو لے جاتا اور اُسے واپس بلا لاتا!

ہاں، چڑھاوے کے پھل پھول تولد چکے ہیں، تو روانہ کیوں نہیں ہوتا، اور میرے دل کو کیوں عذاب دے جا رہا ہے؟ اُٹھ، ونیس دیوی محبت کرنے والوں کے لئے سمندروں کو ساکن کر دیتی اور بادِ مراد چلا دیتی ہے! روانہ ہو جا، کیونکہ تیری کشتی کا کھوتا ہے، وہ اپنے نازک ہاتھوں سے پالین چڑھائے گا! لیکن اگر تجھے سیفو سے گریز ہی ہے، تو اُس سے بے وجہ بھاگتا ہے، تو نفرت سے لکھی ہوئی ایک سطر بھیج دے تاکہ میں لو کیڈیا کی چوٹی پر چڑھ کر قسمت آزماؤں!

جیسا کہ ادب کہیں بتایا گیا ہے یہ ”محبت نامہ“ اوڈ کا کہا جاتا ہے مگر مستند نہیں ہے۔ بہر صورت ایک ادب پارہ ہے۔ اُسے سیفو نے لکھا یا نہیں، وہ ایک پارہ ادب ہے۔ اور اُس کو وجود میں لانے والی اگر سیفو نہیں تب بھی وہ اُس کے وجود میں آ جانے کا سبب تو ہے!

سیفو کی صناعت شعری

اپنے زمانہ میں سیفو کو جذبات انسانی کے گیت گانے والی واحد مغنیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سیفو کی شاعری کو ایسا مافوق بنا دینے والے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لئے سب سے پہلے اُس کے ہم عصر شعرا اور نقادوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چھ سو سال قبل مسیح جب سیفو نے دنیا سے اپنی عظمت و عزت کا خراج وصول کیا، اُس وقت یونانی ثقافت (کلچر) کے مرکزوں میں نغماتی شاعری عجیب اور مخصوص طریق پر مقبول تھی۔ خاص کر (عظیم) جزیرے کے لوگوں میں یہ صنف شعر و ج کمال کے آخری نقطے پر پہنچ گئی اور یونان کے ذہین مطالعے کا موضوع اور ڈکی وائو کا محبوب ترین مشغلہ تھی۔

ان نغمات کی مملکت، ان گیتوں کی راجدھانی مٹی لین تھا، جہاں مقدس قربان گاہوں پر، مر کے معطر کنجوں میں چشموں کی منہ رو اینوں پر، لاجوردی سمندر کے کناروں پر، اور رنگ و بو کے باغوں میں، حسن اور عشق کی جوان آنچ کو الفاظ میں بند کیا جاتا تھا۔ اور زمزمہ و شعر کی اس دنیا، فصاحت و تروتم کے اس عالم پر گیتوں کی رانی سیفو کی حکمرانی سب نے مان لی تھی۔ اُس کے حضور ان گانے والوں کا ایک مختصر دربار لگتا تھا، اُس کے ہم عصر نغمہ سرا، حتیٰ کہ الکائیں بھی سیفو کی کاغیت گاتے تھے!

سیفو کا کمال شعر اس حقیقت میں چھپا ہے کہ سیفو کے عہد سے لیکر فنِ انتہا کی خردہ گیری جتنی زیادہ شدید

ہوتی گئی۔ دوسری ناقابل انکار حقیقت سیفوی صناعت کے باب میں یہ ہے کہ اُس کا سرمایہ شعر ایک ہزار سال تک ہر وقت کی بول چال کا جز رہا، روزمرہ کے حوالوں میں آتا رہا، استناد کے طور پر مستعمل رہا۔ خیالات بدلتے رہے، نقطہ نظر میں فرق آتا رہا، لیکن سیفو کے اشعار میں فرسودگی پیدا نہ ہوئی، اُن کی مدت قائم رہی، وہ اُسی طرح تازہ و شگفتہ رہے، اُن شعر میں جتنی نزاکتیں پیدا کی گئیں وہ گویا سیفو کے کلام سے ہی لے کر پیش کی گئیں، کیونکہ وہ ہر زمانے کے نقد پر پورا اُترتا رہا۔ شاعر اپنا تفوق سیفو کے اتباع سے ثابت اور نقاد اپنا فن اُس کی سند سے قلم کرتے رہے۔

اسے موجودہ و آئندہ زمانوں کی خوش نیتی سمجھنا چاہئے کہ سیفو کے کلام کے چند نمونے فنا کی دہر سے بچ رہے ورنہ اگر یہ بھی ضائع ہو جاتے تو اس عہد کا نقاد، یونان قدیم کے نقادوں کے اُن تبصروں کو سمجھ بھی نہ سکتا جو سیفو کے اشعار پر لکھے گئے۔ اٹلس ڈنٹن (Atlas Danton) عہد جدید کے ایک انگریز نقاد نے شعر پر ایک مقالہ لکھا ہے، اُس کی وہ چند سطریں جو سیفو سے متعلق ہیں اس جگہ نقل کر دینا مناسب نہ ہوگا:-

”سیفو نے پہلا ایسے فن نہیں کاسا کئے تھے، اور اُس کے بعد بھی انسانی روح نے جذبات کی آگ میں تہہ کر لیسی آہ اور کراہ کہی نہیں کی۔ فنی اعتبار سے بھی صفائی، سلاست اور اُس شامہ ایجاز کلام میں جو کسی صناعت کو ہم غیب بھی شاذ ہی سکھاتا ہے، دنیائے سیفو کا ثانی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کوئی ایسا بھی نظر نہیں آتا جو سیفو کے مقابلہ میں دوسرا درجہ پانچواں کا بھی حق ٹھہرے!“

اس زمانے کے ایک دوسرے نقاد ہے، اسے اسائنڈ نے (D. H. Lawrence) لیسیاس والوں کی اس خصوصیت کا قصیدہ پڑھا ہے کہ وہ جسمانی حسن اور مناظر قدرت کے پرستار تھے اور پھر سیفو کے کلام کی خصوصیتوں کو اُجاگر کیا ہے اُس نے سیفو کی بعض تشبیہات بھی پیش کی ہیں، مثلاً:-

چاند کو ”آہستہ الجھال ونیس کی سچا رنگ“ کہا ہے۔

دوسری جگہ چاند کو ”آسمانوں کی دلفریب حکمران“ کہا ہے۔

ایک اور مقام پر چاند کو ”گلابی انگلیوں والی“ اور قربانگاہ پر قص پرستش کو منور بنانے والی ”کہا ہے۔

نور سحر کو ”سنہری چیاؤں والی“ کہا ہے۔

نخلستان کو ”سیب کی شاخوں میں بہنے والے چشمے کے راگ نام و غنودہ“ بتایا ہے۔

لونگ میں ”شہد کی جہک“ سو گئی ہے۔

”پھولتی جوانیوں سے ہار گندھواے“ ہیں۔

یونانی زبان میں چاند کے لئے جو لفظ مستعمل ہے وہ گرادر (درت۔ نخی) کے لحاظ سے مونث ہے۔ (ادارہ)

رات کو ”بہت سے کانوں والی“ کہا ہے
 زمین کو ”بے گنتی پھول ملاؤں سے بھی ہوئی“ کہا ہے۔
 قمری کے مجسمے کے پروں کو ”موت کی خشکی سے نڈھال“ دکھایا ہے۔
 مجسمے کی آواز کو ”گرمی موسم کو مسحور کرنے کا منتر“ کہا ہے۔
 جوتسا میں ماری پھرتی چڑیا کے حسن کو سراہا ہے۔

بلبل کو ”سروش بہار“ کہا ہے۔
 سیب کی رنگت کو ”میٹھا انفعال کہکڑا سے گل داؤدی سے متقابل کیا ہے
 اپنی شاعری کے تار و پود کو ”نیمفون (Nymphon) کے باغ کی آرائش“ کہا ہے۔
 ایک نوجوان اور اُس کی دو شیرازی کا مکالمہ لکھا ہے۔

یونان قدیم کے اکثر نقادوں نے سیف پر تبصرے لکھے لیکن بہتر تعریف و توصیف اور کچھ نہ لکھ سکے۔ ان قدیم تبصرہ نگاروں کی توصیف اس لئے زیادہ وزن دار ہے کہ وہ اپنے ادب کی روایات اور اپنی زبان کی نزاکتوں سے زیادہ واقف تھے۔

سیف کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن کی فنی خوبی اور طرز بیان کا حسن پہچاننا تو ہمارے لئے ممکن نہیں، تاہم خیالات و جذبات سے بھرے طور پر ہم شراہور ہو سکتے ہیں !
 دینس دیوی کی شان میں :-

مردیں تخت پر بیٹھے والی لازوال ساپس ! خداوندیو پیڑ کی بیٹی ! تو سب پر کر سکتی ہے۔ میری روح
 کو بھی غلوں سے نجات دے ! کہتے ہیں پچھلے زمانے میں تو اپنے باپ کے سادی محل سے نکل آتی تھی ! یہ اگر
 سچ ہے تو سادی ملک ! میری اتھاؤں پر بھی رحم فرما ! اور اپنے سنہری رتھ کو ایک بار پھر کاشاں کی مڑک
 پر دوڑا دے ! تیری محبوب قمریوں کے پروں کی پھر پھر اڑت سے تاریک دنیا کی ہوا میں پھر اک دفعہ
 پائیزہ بن جائیں !

مقدس دیوی ! میں ایک آواز سن رہی ہوں ! کیا یہ تیرے غیر فانی ہوں کی صدا ہے ؟ کیا تیرا جلوہ و
 جمال کی کریش پھیلا دیئے والا چہرہ مجھ سے میرے غم کا حال پوچھ رہا ہے ؟

دیوی ! میری محبت کی دیوانی روح تجھ سے اور کچھ طلب نہیں کرتی، بس یہ سننا چاہتی ہو کہ جو دشمنہ سیفو

لے ڈایا نیسا میں نے اسی نظم پر تبصرہ کیا ہے :-

کے رنج و الم کا باعث ہے وہ سیفو کے پہلو سے آگے لگی! اگر تھے لینے سے نفرت ہے تو تھے دینے پر ناز کر لی
وہ اگر شرمیلی اور بوسے سے گریز کرتی ہے تو خود بوسے دینے لگے گی!
ملکہ، ایک دفعہ اور آجا، اور اپنی اس پیارن کو غم کے پنجے سے چھڑا دے! اور میری کشت آرزو کو سرسبز
بنادے! آ، اور مجھ پر ہمیشہ مہربانی فرما۔ میری دوست بن جا!
محبوب لڑکی کے نام:-

وہ جسے تو اپنا مہمان بنالے، جو تیرے روبرو ہو، قریب بیٹھ کر تیری مٹی مٹی باتیں سننے میں محو ہو سکے، تیری
ہنسی کے نشے سے مست ہو سکے، دیوتاؤں کا ہم سر ہے!

مگر یہی منظر میرے پہلو میں میرے دل کو لرزادیتا ہے! میں تیری صورت پر نظر ڈالتی ہوں تو گونگی ہو جاتی
ہوں، منہ سے بات نہیں نکلتی! اُس گھڑی ایک شعلہ بھوک کر میری ہستی پر چھا جاتا ہے۔ میری آنکھیں دکھ
نہیں سکتیں، میرے کان سن نہیں سکتے، میرے اعضا میں بار بار ایک تھر تھری دوڑ جاتی ہے، میرے ہاتھ پر
پیسے کی شبنم انشاں ہو جاتی ہے، میرا رنگ اڑ جاتا اور میں سفید پڑ جاتی ہوں، میں دیوانی ہو جاتی ہوں، نزع
کی طرح میرا دم گھٹنے لگتا ہے!

ایک مجسمہ شباب در عنائی جوان کو دیکھ کر کہتی ہے:-

”حسین دوست! سامنے آ، میری طرف دیکھ، اور اپنی آنکھوں میں مستور رعنائی کو عریاں کر دے!“

ایک پارے میں اپنے اظہار احساس کے ساتھ انسانی فطرت پر طنز بھی کر جاتی ہے:-

”وہ مجھے زیادہ دکھ پہنچاتے ہیں جن کے ساتھ میں اچھا برتاؤ کرتی ہوں!“

اپنی میوز (سروغن غیبی) کو مخاطب کرنے میں لطیف تعلق بھی ہے:-

”میری بغفشتہ کی بننے والی میوز! میں تجھے اپنا جایز حصہ انگیتی ہوں!“

حسن صورت اور حسن سیرت کی تصریح کرتی ہے:-

”جو حسین ہے، وہ دیکھنے ہی کا حسین ہے، جو نیک ہے، وہ حسین پہلے ہے!“

اپنے شاعرانہ احساس کو اس طرح بیان کرتی ہے:-

”ساحل پر کھرب ہوئے بلورے ٹکڑوں کو چھڑومت، یوں ہی پڑا رہنے دو!“

حقیقت کی عقدہ کشائی کرتی ہے:-

”مجھے وہ شہید نہیں چاہئے جس کے اندر مہال ہے!“

اسی نظم پر لاطینی نقاد لائینس نے بحث کی ہے۔

جذبات کا نغمہ اس طرح سناتی ہے :-
 ”چاند اور ثریا اپنی اپنی جگہ قائم ہو چکے ہیں،
 آدھی رات آپکی ہے، وقت جا رہا ہے،
 چلا جا رہا ہے، اور میں اکیلی پڑی ہوں!“
 ایک شاعرانہ احساس سناتی ہے :-
 ”نیچے، سیب کی ڈالیوں کو چومتا، پانی بہہ رہا ہے،
 اوپر کی پتیاں سرسرا کر گہری نیند بھا رہی ہیں!“
 ایک دوسرا :- ”قربان گاہ کے گرد کنواریاں کھڑی ہو گئیں،
 اُن پر، چودھویں کی چاندنی چٹنگ رہی تھی!“
 فطرت محبت اور جذبات کے طوفان کو ایک لفظ میں بند کر لیتی ہے :-
 ”حسین و شیزہ جب محبت کرتی ہے،
 تو بہت سے بار گوندھ ڈالتی ہے!“
 شباب اور عشق کی تصویر کھینچتی ہے :-
 ”آ، دینس، آ، اور
 ان اپنے اور میرے دوستوں کے لئے، طلائی کوزوں کو
 محبت کی شراب اور لذتوں سے بھر دے!“
 ایک ”شادیانے“ میں جذبات کو اس طرح گاتی ہے :-
 ”نئی دلہن، جس کے سینے میں گلابی محبت کا گھر ہے،
 اسے پافوس کی طرح سندر دلہن!
 سہاگ پلنگ طیار ہے،
 جا، اُس سے مل اور،
 اختلاط کی مٹھاس میں شریک ہو جا،
 روشن زہرہ کی کرنیں ہیرا دیوی کی روپلی چوکی
 کو حیران تمناؤں دیکھتے ہوئے،
 تیرے دل میں اُسے دھوہر کی مسند نشین کر دیں گی!“

شام کے منظر کی کیفیات کو کس نزاکت تکمیل سے پیش کرتی ہے :-

”صبح کی چمک نے جن چیزوں کو دور بھگا دیا تھا،

زہرہ (شام کا ستارہ) تو اُن کو گھول رہی ہے،

تو بھیڑوں اور بچوں کو اس طرح بلارہی ہے،

جیسے بچوں کو ماں سینے سے لپٹانے کو بلاتی ہے!“

اپنی حسرت کو کتنا حسین بنا دیتی ہے :-

”کیا میں ابھی کنوار سپر کی آرزو رکھتی ہوں!“

آرزوؤں کی نارسائی کا حسین ترین استعارہ ہے :-

”اے دوشیزہ! تو اُس شیریں اور سرخ سیب کی مانند ہے

جو سب سے اونچی ڈالی میں،

باغباں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے —

نہیں، چھپا ہوا نہیں بلکہ اُسے ترسار رہا ہے!“

نور و س اور اُس کی دوشیزگی میں مکالمہ کراتی ہے :-

نور و س :- تو کہاں گئی، کہاں چلی گئی، میری دوشیزگی؟

دوشیزگی :- فوجان لڑکی، اب میں تیری نہیں ہو سکتی، میرا جاتا تو ایک صبح کی غمش آمد ہے!“

کیفیات شباب کی تصویر یوں بناتی ہے :-

”اور اُن کے بھاری پیپٹوں پر،

رات کی تاریک نیند پڑی لوٹ رہی ہے!“

ایک گل انعام کی تعریف کرتی ہے :-

”دودھ سے زیادہ سفید،

ریشم سے زیادہ نرم،

گلاب سے زیادہ نازک،

رباب سے زیادہ مترنم،

زرگس سے زیادہ لوچدار،

اور سونے سے بہتر سونا!“

ل۔ احمد (اکبر آبادی)

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

جولائی ۱۹۷۷ء کے لکھنؤ میں نیاآر صاحب نے مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، تقریباً وہ صحیح ہے اور مسلمانوں میں ہر نکتہ سنج و دقیقہ رس کے روبرو قرآن کا یہی آٹھایا ہے۔ لیکن مسلم عوام کے غوت کی وجہ سے کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا اظہار کر کے توہم پرستی کو دور کرنے میں مدد دے۔ اگر نیاآر صاحب کی یہ صاف بیانی اپنی ذاتی تشہیر سے پاک ہے اور صرف مسلم قوم کی اصلاح کے لئے ہے تو سب سے پہلے اس جرأت کی داد دیتا ہوں۔ اگرچہ اس موقع پر داد دینا بھی مقدس گروہ کے نزدیک کفر میں داخل ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک قوم میں ایسے جبری اور صاف گو نہ ہوں گے، مسلمان کبھی شاہراہ اسلام پر نہیں آسکتے، بلکہ ہمیشہ کفر و اسلام کی بحث اور رسم پرستی میں پڑے رہیں گے۔

آج سے چند صدی پیشتر یورپ کی توہم پرستی کا بھی سہی عالم تھا جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے لیکن جب وہاں کے چند علم دوست دلیروں نے عیسائی مذہب کے باب میں صاف بیانی سے کام لیا اور خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی تو مذہبی جماعت میں ہل چل مچ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا اقتدار خطرہ میں ہو تو فلاسفہ کی جماعت اور ان کے ہمنواؤں سے جن جن کو بدلائینا شروع کر دیا اور چونکہ حکومت کی باگ ڈور نام نہاد مذہبی جماعت کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس کے نزدیک جو بداعتقاد ہوتا اُس کو سزا دی جاتی۔ اس مذہبی جماعت نے اپنے خلاف اعتقاد جماعت کو ایسی سخت و شدید سزائیں دینا شروع کیں کہ انسانوں کا خون کھولنے لگا اور ہر جہی و سنگدلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عیسائی مذہب اور پادریوں سے بد دل ہونے لگے، تاہم مظالم میں کمی نہ ہوئی۔ چنانچہ پیہم شدید مصائب اور ظلم وعدوان کے باعث رفتہ رفتہ لوگ مذہبی جماعت سے منحرف و متنفر ہونے لگے، یہاں تک کہ توہم پرستی سے آزاد ہو کر آج تمام یورپ تمام دنیا پر قابض ہے۔ اب میں اصل موضوع کو لیتا ہوں۔ ہمارے مقدس گروہ نے خدا کا آئیڈیا جس طرح پر مسلمانوں کے روبرو پیش کیا اس نے خدا کے تصور میں تجسیمیت پیدا کر دی جس سے عوام توہم پرست ہو گئے اور ایبل بہ زوال — حالانکہ خدا کوئی جسمانی کیفیت رکھتا ہے اور نہ مثل انسانوں کے جذبات سے لبریز ہے۔ خدا کا بہترین تصور قل ہوا اللہ احد نے پیش کیا ہے جس میں کسی اضافہ

کی ضرورت نہیں۔

خدا کی ہستی اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لئے اول تو سورہ اخلاص کافی ہے۔ دوسرے کلمہ "فی فلک سبحون" کے اعلان سے علی قوت کو سمجھنا چاہئے۔ کائنات میں کوئی چیز، کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ ایسا نہیں جو سرگرم عمل نہ ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرے جن کو سائنس کی اصطلاح میں (Electron) اور (Proton) کہتے ہیں اور جو انسانی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اپنے بڑے ذروں کے گرد ہر وقت دہریہ گردش کرتے رہتے ہیں انسان کی لاش جو ایک مدت سے مدفون ہے یا نذر آب و آتش کر دی گئی ہے، اس کے ذرے بھی بے عمل نہیں۔ ایک آہنی صندوق اور فولادی طرن کے ذرات بھی ہر وقت عمل کرتے رہتے ہیں۔ عمل کے متعلق کوشن جہاز ارج کا قول ہے کہ جس قوت کا نام عمل ہے، وہی خدا ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ پوشیدہ قوت جو ہر چیز سے عمل کو رایتی ہے خدا ہے۔ جس طرح روح نظر نہیں آتی، لیکن ہے۔ اسی طرح خدا نظر نہیں آتا۔ لیکن ہے ضرور۔ پس روح یا جوہر برق، برق یا جوہر برق۔ اور حیات یا جوہر حیات جس قوت نے پیدا کی ہے وہی خدا ہے۔ وہی حتی و قیوم ہے اور مذہب کی زبان میں وہی رب العالمین ہے، جو حسب استعداد سب کو روحانی و جسمانی غذا پہنچاتا رہتا ہے۔

اس کے بعد وحی الہام اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ایک میخوار جو سیستہ کی حالت میں بات کرتا ہے، کیا تم اس کے کلمے سنکر نہیں کہتے کہ یہ بپنے والا نہیں بول رہا ہے بلکہ کوئی اور ہے؟ حالانکہ نشہ کی حالت میں جس قدر الفاظ آواز کے ساتھ نکلتے ہیں وہ تمام شرابی کے حلق و زبان سے ادا ہوتے ہیں، لیکن تم اس پر یقین نہیں کرتے، مگر جب وہ ہوش میں بات کرتا ہے تو کہتے ہو کہ یہ بولنے والی کلام ہے جو اسی کے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے بالکل سہی مثال وحی کی ہے کہ بانی اسلام جس وقت جذب و کیف کی حالت میں بولتے تھے تو اگرچہ الفاظ آپ ہی کی زبان و حلق سے نکلتے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن محرک وہ قوت ہوتی تھی جو نشہ تو حید سے لبریز ہوتی۔

بانی اسلام نے خدا کی ہستی کا تصور کیا، اور رفتہ رفتہ کشف و مجاہدے کے ذریعہ، انہماک و محویت کے ذریعہ جب حقیقت کو پایا تو آپ کا شعور اس قدر کامل ہو گیا کہ کائنات کے تمام راز آپ پر روشن ہو گئے۔ قصہ و مجر داوار عالم محویت میں آپ اس درجہ سربلحس و ذکی الفہم ہو جاتے تھے کہ اپنی ذات کا اور اپنے وجود پاک کا احساس تک باقی نہیں رہتا تھا، بجز اس قوت لازدال کے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ایسی حالت میں جو بات، جو کلام، اور جو اشارہ، یعنی جو الفاظ اور فقرے آپ کی زبان مبارک سے نکلتے تھے وہ اسی قوت و فطرت کے قانون کے مطابق ہوتے تھے جس کی تحقیق و جستجو میں آپ مستغرق ہوتے۔ اسی نوع کے کلام کو مسلمان الہام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اور اسی کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔

آپ نے حضرت علیؑ کا یہ تاریخی واقعہ سنا ہو گا کہ جب دشمن کا تیر آپ کے پاؤں میں چھد گیا اور جب ہوش کی

حالت میں اس کو ٹھکانا چاہا تو آپ کو سخت و شدید تکلیف ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ حبيب میں ناز کی نیت باندھ لوں تب اس تیر کو نکال لیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوئی۔ اگر اس تاریخی واقعہ کو غلط سمجھا جائے تو اس کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں، لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ تصور و انتہاک کی قوت کوئی معمولی قوت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

لیکن رسول میں یہ قوت بدرجہ اتم موجود تھی، اور جس وقت آپ گردن ڈال کر غرق تصور ہوتے تھے اور آپ کا ضمیر اس قوت لازم وال و سہلے نیاز کی طرف رجوع ہوتا تھا، جس کو عرف عام میں خدا کہتے ہیں، تو آپ کی آنکھیں ہر چیز کو زندگی سے بھرپور اور عمل سے معمور پاتی تھیں اس لئے آپ مسلمانوں کو بلکہ عام انسانوں کو عمل و انسانیت کا سبق دیا کرتے اس دُکھ آواز پر لوگ کھینچے، لبیک کہتے اور آپ کے ملحقہ درس میں شامل ہو جاتے۔ یہی وہ خاموش حکام تھے جو رسول پر نازل ہوتا تھا، اور جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔

رہا جبرئیل فرشتہ کا رسول پر پیغام الہی کا لانا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ قوت جس کے ذریعہ وحی آتی تھی، اس قوت کو ہم جبرئیل کے نام سے پکارتے ہیں اور اسی قوت کا نام قرآن کی زبان میں جبرئیل ہے۔ ورنہ فرشتوں کے وجود کا یہ قلیل جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے، ایک استعارے سے زیادہ کچھ نہیں۔

امام - اکبر آبادی

نوٹ :- اگر الہام علاوہ رسول کے دوسری چیزوں پر بھی ہوتا تھا، جیسا کہ نیاز سنا ہے نے قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور وہ اس سے مسلمانوں کے عقیدے میں گہروری آنا چاہئے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے الہام نے انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، لیکن رسول کے الہام نے امتِ فیض پہنچایا کہ آدمی کو انسانیت و عمل کی دعوت دیکر متاثر کر دیا۔

امام

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچے کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچے کی عدم وصولی کی اطلاع آخر اد تک نہ آئی تو ہم پرچے بیئرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲۰ روپے پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی۔ ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیر شکار

نیازی آزاد خیالی

زندگی عبارت ہے حرکت سے اور شعروادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطہ پروت ایم رہ سکتا محال ہے، شعروادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اصول ارتقاء کے مطابق اردو زبان میں بھی ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اردو ادبیات کو صنعت کے درجے تک پہنچایا مگر انہیں ارباب کمال میں وہ جو ہر تابل بھی رونما ہونا لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے ماحول کا آئینہ کار نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کر کے اپنی راہ الگ بناتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے لئے دلیل راہ بناتے ہیں چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد کی سطح سے بلند ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاصر اور معاشران کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کر دئے جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آجاتا ہے جب ان کے فضل و کمال کی قدر کی جاتی ہے اور ان کی پرستش ہونے لگتی ہے، یہی زمانہ آزادی کا حقیقی عہد ہوتا ہے اور ایسے ہی نفوس کے لئے ڈاکٹر جوٹسن لکھتا ہے:-

”ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ ظلم اٹھا سکتا ہے اور اٹھاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کثرت زبان کو اسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت و حالت میں کہ زبان ان کے سامنے آتی ہے اس کے برعکس ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصد و ارادہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کے دماغ میں غیر معمولی متنوع جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے احساس و خیال میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے، اس کے تصورات عمیق ہوتے ہیں، زندگی و ادب زندگی کے متعلق سبکی رائے تقلیدی نہیں ہوتی، تاریخ کے باب میں اس کا فیصلہ خود اسی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ و زبان میں ایک مخصوص انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کا یہ اظہار خیال چونکہ اس کے ذہنی بطن کا عکس ہوتا ہے اس لئے وہ کثیر الاشکال ہوتا ہے اور اس کے لئے جو زبان وہ اختیار کرتا ہے اس میں غرر، لطافت و حلاوت کا بیک وقت نہایت دلچسپ امتزاج پایا جاتا ہے۔“

کیا جوٹسن کی یہ تعریف غالب دہلوی اور نظیر اکبر آبادی پر صادق نہیں آتی؟ عہد متاخر میں تک اردو ادبیات کی تاریخ میں یہی دو ہستیاں تھیں جنہوں نے تمام مسلک کو ترک کر کے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے ان کے زمانہ میں ان کی قدر ہونا ناممکن تھا اگرچہ موتی بھی تھی تو بالکل غلط بنیاد پر لیکن ان کی عزت کا عہد بھی آگیا چنانچہ آج

ارباب کمال نے ان دونوں بستیوں پر خصوصاً غالب پر اس قدر لکھا کہ کوئی پہلو لکھنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ یہی حالت آج جناب نیاز فچوری کی ہے، جناب نیاز جس بنا پر آج ننگ اسلاط تصور کئے جاتے ہیں وہ موصوف کی آزاد خیالی ہے اور یہی جوہران کے لئے باعث بدنامی ہے، جناب نیاز اگرچہ سماجی قوانین کے شکنجہ میں کسے ہوئے ہیں لیکن اپنے رجحان آزادی کے مقابلہ میں کبھی سماج سے مرعوب نہیں ہوتے اور علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جناب نیاز کا طرز نگارش نہ تفاخرانہ ہے نہ ذریعہ معاش جس کا ثبوت ان کی داخلی و خارجی زندگی ہے یعنی ان کے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

جناب نیاز کے الحاد کے متعلق اظہار خیال سے پہلے محمدی کی حقیقت کو سُن لیجئے۔
نیاز کا الحاد و ارتداد جہاں تک نفس اختلاف و اعتراض کا تعلق ہے سکائے اسلام میں بہت سی ایسی بستیاں گزری ہیں جنہوں نے جمہور علماء سے کھلم کھلا اختلاف کیا ہے۔ ابن راوندی، صالح ابن قدوس، یعقوب ابن یوسف، فاضل ابن سینا، ابن رشد سے لیکر امام رازی، غزالی، طوسی، ابن تیمیہ، ابن قسیم، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم تک سب نے خوف و ہراس کو بالائے طاق رکھ کر بہت سے مسائل میں جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن تیمیہ نے فناء نار کے مسئلہ میں جو عقاید کا بہت زبردست مسئلہ ہے علانیہ اپنی ذاتی رائے کو جمہور کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے جس کے موید جناب مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب علماء کرام کہتے ہیں تو اعتراض نہیں ہوتا اور جب نیاز وہی بات کہتے ہیں جو قدما کہہ گئے ہیں تو بدن طامت بنائے جاتے ہیں۔ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ”الحاد“ کا لفظ بہت ہی محدود معنی میں نیاز صاحب کے مضامین پر مستعمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہ وہ تقلید ترک کر کے خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں اسے پوری میاں کی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب علامہ نیاز بھی وہی لکھتے ہیں جو ہمارے بعض دوسرے علماء کرام فرماتے ہیں تو ان کے قول کو کیوں نظر استعمار دیکھا جاتا ہے۔

مثلاً احمد دہستان کی آزادی و ترقی کے لئے ”میشلم“ پیدا کرنا ضروری ہے اور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جدوجہد مذہب کا آلہ کار ہے چنانچہ بعینہ یہی چیز ہمارے فاضل اجل علامہ عبداللہ سندھی فرماتے ہیں لیکن ہمارے علماء کرام کچھ نہیں کہتے، حالانکہ ان کے نزدیک سیاست سے مذہب کی علیحدگی بیدینی و محمدی ہے۔ نیاز صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کا تعلق چند متعین رسوم و قیود سے نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ خیر مذہب کے عقلاء کے سامنے پیش کیا جاسکے اور اس طرح ہندوستان کے تمام مذاہب کسی ایک مرکز پر پہنچ کر اشتراک عمل پیدا کر سکیں، لیکن عبدالماجد دریا بادی کے قسم کے مذہبی لوگ اسے کفر و الحاد بتاتے ہیں۔ حال ہی میں قرآن کے کلام بانی ہونے کے متعلق جو مقالہ جناب نیاز کا جولائی کے نگار میں شائع ہوا ہے اور

جس کی بنا پر عبدالمجید صاحب نے ان کو ابو جہل کا لقب عطا کیا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، لیکن اگر اس میں واقعی کوئی غلطی ہے، تو انسانوں کی زبان میں بغیر کسی برہمی کے اس پر اظہار خیال کرنا چاہئے۔

”آتش مروت کے واقعہ کو بھی جناب نیاز تاریخی واقعہ نہیں بتاتے بلکہ ”اساطیر الاولیاء“ میں شمار کرتے ہیں

اگر عبدالمجید صاحب یا ان کی طرح دوسرے مجاہدین مذہب کے نزدیک جناب نیاز کے دلائل غلط ہیں تو ان کا جواب دینا چاہئے، نہ یہ کہ گائیوں پر آتشیں، دنیا کا کوئی مذہب دوسروں کو بُرا بھلا کہہ کر بھی ترقی نہیں کر سکتا۔

ہمارے علماء مذہب یا جمہور کی طرف سے ایسی غیر جذباتی و دانشاویہ ذہنیت کا اظہار بجائے اس کے کہ لوگوں کو مذہب کی حق سے مطمئن کرے، اور غیر مطمئن بنادینے والا ہے، کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ علماء مذہب کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ان کا تنہا حربہ ”کافر و ملحد“ کہہ دینا ہے۔

جناب نیاز جب تک محادی وحدانیت اور رسالت رسول کے قائل ہیں (خواہ وہ رسالت کا مفہوم کچھ قرار دیں) دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ملحد و کافر کہہ سکے۔

جس طرح عبدالمجید و غیرہ کو اپنی بنیاد فکری و تاریخی کا حق حاصل ہے، نیاز کو بھی حاصل ہے اور انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے علماء کی نقاب کھریں۔ اگر علماء اپنی جگہ اسلام کی خدمت اس بات میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کو ”انجیو یارو زنگار“ بنا کر پیش کریں تو جناب ”نیاز“ بھی اپنے نقطہ نظر سے اسلام کی خدمت اس کو قرار دیتے ہیں کہ وہ ”قابل فہم عمل“ چیز قرار پاسے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے علماء و کرام اتحاد و بیحدی کی اشاعت پر توجہ دیتے ہیں، لیکن دیکھتے کہ اس کی مجرم حقیقتاً خود انہیں کی ذات ہے، جو اس ”دو علم و عقل“ میں بھی مذہب کو ”مزخرفات“ کا مجموعہ بنائے ہوئے ہے۔ دنیا کا کوئی ادارہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے اور یقیناً مذہب بھی زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔

محمد عبدالشکور رفکر ندوی

”نایخ اسلامی ہند مع توثیق“

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر - قیمت معہ معقول

پتھر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

لوح محفوظ

اور

عذاب و ثواب

(جناب صفی مظہر صاحب۔ محلہ جوڑن شہید۔ غازی پور)

محترم جان سید و مولائی سید میری نگاہ سے گزرتا۔ حسب ذیل سوالات بغرض رفع شک پیش کرتا ہوں امید ہے ان کا جواب نگار ماہ اگست میں شائع فرمائیں گے ممنون ہوں گا۔

۱۔ آپ کو تسلیم ہے کہ انبیاء و مہمبوں نے یا مکار نہیں تھے اور ان کا ہر قول و فعل اشارہ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا (نگار بولائی سید صفی)۔ سطر آخری تو آیت ”بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ“ کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟
۲۔ اگر کوئی حقیقت ہے مگر وہ نہیں جو مسلمان ظاہر کرتے ہیں تو آپ خود ہی اظہار حقیقت فرمائیے۔
۳۔ اگر آیت بالا میں کوئی حقیقت نہیں اور قرآن مجید کا لوح محفوظ سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ یوں کہلے کہ لوح محفوظ کوئی چیز ہی نہیں تو پھر کوئی ایسی صورت بتائیے جس سے جناب رسالت کا سچا ہونا۔ ان کا ہر قول و فعل اشارہ خداوندی کے ماتحت ہونا باور کیا جاسکے۔

۴۔ اگر آیت مذکورہ مسلمانوں کی اختراع ہے تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے اور کیا آپ کوئی ایسا معیار بتا سکتے ہیں جس پر پرکھنے کے بعد ہم کہہ سکیں کہ فلاں آیت قرآن کی ہے اور فلاں نہیں۔

۵۔ آپ قرآن مجید کو لوح محفوظ میں درج ہونا ایک استعارہ عقیدہ جانتے ہیں اور اس کی دلیل میں یہود و نصاریٰ کے اعتقادات متعلق توہیت و انجیل پیش کرتے ہیں تو کیا یہ کلید ہو سکتا ہے کہ اگر دو روایتیں ایک دوسری سے ملتی ہیں اور انہیں سے ایک غلط ہو تو دوسری بھی غلط ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہے تو مثال متعدد جو ذیل میں آپ کیا کہیں گے۔
”دو شخص کسی کے یہاں ملازم ہیں۔ مالک انصاف پسند ہے۔ ایک ملازم چھٹی کی غرض سے بیجا عذر پیش کرتا ہے۔ مالک کے

پاس آکر درد کی شکایت کر کے زمین پر پھپھڑیں کھانے لگتا ہے۔ مالک تسکین درد کے لئے حکیم حاذق کو طلب کرتا ہے حکیم اپنی حذاقت کی بنا پر اس مریض کو واقعی مریض نہیں قرار دیتا چنانچہ مالک اس مریض کو لعنت ملامت کر کے ٹھکرادیتا ہے کچھ دن کے بعد دوسرا ملازم بالکل اسی بیماری کا شکار ہو کر مالک کے پاس آتا ہے اور رخصت کی استدعا پیش کرتا ہے کیا مالک واقعہ سابقہ کی بنا پر اس شخص کے عذرات کو بھی لائق التفات تصور کرے اور تصدیق حال نہ کرے ؟

۶۔ اگر آپ آخرت کے عذاب و ثواب کو بے حقیقت تصور فرماتے ہیں تو آیت ”وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ“ کتا باموجلا۔ ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرة نوتہ منہا وسنجزمی الشاکرین“ کے معنی اس عنوان سے بیان فرمائیں کہ رسول کی صادق الکلامی بھی بجال رہے اور عقیدہ ثواب و عذاب بھی سرزد ہو جائے؟

(نگار) آپ کے استفسار کا مدعا تمام حشو و زوائد کو نکال کر یہ قرار پاتا ہے کہ میں ”لو ب محفوظ“ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آخرت کے عذاب و ثواب پر آپ کی پیش کردہ آیت کو پیش نظر رکھ کر بحث کروں۔ میں نے جون اور جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے کلام خداوندی کے دو نیکے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر جس معنی میں قرآن مجید کو خدا کا کلام سمجھا جاتا ہے وہ میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ خدا نے رسول اللہ پر اس طرح نازل کیا ہے جس طرح کوئی آدمی چیز کسی کو دیکھتی ہے، میرے لئے قابل قبول نہیں اور اس سلسلہ میں مینے وحی سے بحث کی تھی تاکہ وہ لوگ جو قرآن کو محض اس دلیل پر ”منطوق ربانی“ کہتے ہیں کہ اسے ”وحی یوحی“ کہا گیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن مجید کو وحی کا نتیجہ سمجھنا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے ”خدا کا کلام“ سمجھا جائے۔

وحی والہام کا لفظ کلام مجید میں ہر جگہ فطری ذہانت و افتاد یا طبعی صلاحیت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اور اس لئے قرآن کا ”وحی یوحی“ ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے اس غیر معمولی فطری استعداد یا دماغی تفوق کا نتیجہ ہے جو خدا نے ان میں ودیعت کر دیا تھا اور جس کی بنا پر استعارتاً کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ کا قول گویا عین خدا کا ارشاد ہے۔ کلام مجید کو ”کلام ربانی“ کہنے کی سب سے بڑی روایتی دلیل یہی تھی اور اسی کو میں نے پیش کر دیا تھا۔ دوسری دلیلوں سے میں نے اس لئے بحث نہیں کی کہ وہ اس سے زیادہ کمزور ہیں۔ تاہم چونکہ ذکر آگیا ہے اس لئے ان کمزور دلیلوں میں سب سے قوی دلیل کی حقیقت بھی معلوم کر لیجئے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کا جواب کسی انسانی سے ممکن نہیں، اس لئے وہ خدا کا کلام ہے۔ اس سلسلہ میں جو آیات پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:-

سورہ بقرہ:- ”ان کنتم فی ریب منا نزلنا علی عبدنا فاقوا بسورۃ من مثلہ“ (جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تمہیں شک ہے تو اس کے مثل ایک سورہ ہی پیش کر دو)

سورۃ یونس :- ام یقولون افتراہ۔ فاتوا البسورۃ من مثله وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقیین۔

(کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن رسول نے بنایا ہے ؟ اگر وہ سچے ہیں تو ایسی ہی ایک سورت بتلائیں اور خدا کے علاوہ جس کی مدد چاہیں وہ بھی حاصل کر لیں)

سورۃ ہود میں بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں لیکن یہاں بجائے ایک سورۃ کے دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے
ام یقولون افتراہ ؟ قل فاتوا بہ عشر سورہ مثله

سورۃ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا مطالبہ ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تمام دنیا کے انس و جن شریک ہوں تو بھی ایسا ہونا ممکن نہیں :-

قل لئن اجتمعت الانس و الجن علی ان یاتوا بمثلہ ہذا القرآن لایاتون بمثلہ

آپ نے دیکھا کہ ایک جگہ پورے قرآن کے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے، دوسری جگہ دس سورتوں کا اور تیسری جگہ صرف ایک سورت کا۔ اگر آپ ظاہر معنی لیں گے تو ان آیات میں معنوی تعارض پیدا ہو جائے گا اور بحث یہ آن پڑے گی کہ کیا پورے قرآن سے کم، یا دس سورتوں یا ایک سورۃ سے کم کا جواب ممکن ہے۔

ان آیات کو پڑھ کر ایک یا دس یا پورے کی بحث کرنا حماقت ہے۔ مفہوم وہی ایک ہے کہ بحیثیت مجموعی قرآن جس چیز کا نام ہے اس کا جواب پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ انداز بیان جداگانہ ہے۔ لیکن اس دعوے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن کا جواب اس لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ کیونکہ قرآن میں شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو رسول اللہ سے پہلے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو۔ قرآن کے تمام الفاظ اور قرآن کا انداز تحریر پہلے بھی پایا جاتا تھا، لیکن قرآن کوئی نہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو ”خدا کا کلام“ یا ”معجزہ“ کہنا اس بناء پر نہ تھا کہ اس کے الفاظ میں کوئی خاص بات ہے، بلکہ اس حیثیت سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ جو راہ عمل قرآن نے دکھائی ہے یا جو درس اخلاق و ترقی اس نے پیش کیا ہے، اس میں اصولاً کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (ام یقولون افتراہ ؟) لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ قرآن میں کہا ہے وہ ہوائی باتیں نہیں ہیں (ما یطوق عن الہوی) بلکہ وہ نتیجہ ہے وحی یا اس تاثر غیبی کا جو مخصوص ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

اب الفاظ ”لوح محفوظ“ کو لیجئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن پہلے سے کسی تختی میں منقوش تھا

حالانکہ اسے عقل انسانی باور نہیں کر سکتی کہ خدا نے کسی مادی تختی پر کسی کاتب یا نقاش کی طرح قرآن کو پہلے لکھ لیا ہو اور پھر اسے رسول پر نازل کیا ہو، اس عقیدہ کے تحت خدا اور اس کے انتظام کو کیسے ”مادیات“ سے متعلق کرنا پڑیگا اور شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو خدا یا اس کے احکام کا تصور مادی چیزوں کی طرح جائز سمجھتا ہو۔

آپ نے غور نہیں کیا کہ لفظ لوح، بغیر الف لام کے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر واقعی کوئی مخصوص تختی مراد ہوتی تو بجائے لوح کے اللوح (الف لام کے ساتھ) استعمال کیا جاتا۔ اس لئے میری رائے میں قرآن مجید کا لوح محفوظ میں منقوش ہونا بالکل وہی معنی رکھتا ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ فلاں بات ”پتھر کی لکیر“ ہے اور اس سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے۔

اگر آپ ”لوح محفوظ“ کے معنی وہی لیتے ہیں جو عام تختی کے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ”یا اللہ فوق ایڈیم“ میں تیرے معنی ہاتھ کے نہیں لیکن اگر یہاں تیرے معنی قدرت کے لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوح میں محفوظ ہونے کے معنی ”ایک مضبوط و اعلیٰ قانون“ نہ سمجھے جائیں۔ علاوہ اس کے اگر آپ نے لوح کے معنی وہی قرار دئے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو پھر اس عقیدہ کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس میں اتنی ہی پتیاں ہیں جتنے انسان اور ہر پتی پر ایک انسان کی پیدائش و وفات کی تاریخ اور قسمت کی کیفیت درج ہے جب انسان مرتا ہے تو یہ پتہ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں نصاریٰ کی روایتیں لوح منقوش کے متعلق غلط ہوں اور کلام مجید کے متعلق صحیح، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن لوح محفوظ میں منقوش ہے تو پھر یہ دونوں نصاریٰ کا بیان ان کی کتابوں کے متعلق کیوں غلط سمجھا جائے۔ جس طرح قرآن منقوش ہو سکتا ہے اور کتاب میں بھی ہو سکتی ہیں۔

آخرت کے متعلق جو آیت آپ نے پیش کی ہے بیشک اس میں ثواب دنیا اور ثواب آخرت دو چیزیں علیحدہ علیحدہ بیان کی گئی ہیں لیکن بحث تو عذاب و ثواب کی اس مادی صورت سے ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ دنیا و دوزخ و جہنم دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، لیکن دنیا کے علاوہ کسی اور عالم کا پایا جانا اس کو مستلزم نہیں کہ حشر و نشر میزان و صراط، دوزخ و جہنم وغیرہ کے بیان کو بیان تکمیلی نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض اکابر اسلام نے دوزخ و جہنم کے عذاب و ثواب کو بالکل روحانی چیز قرار دیا ہے اور جسمانی حشر و نشر سے انکار کر دیا ہے۔

اصحیح

گزشتہ ماہ کے نگار میں غلطی سے ”بعض حیرتناک سیاسی اکتشافات“ اڈیٹر کے نام سے شائع ہو گیا حالانکہ یہ مضمون جناب محمد عتیق صاحب، صدیقی کا ہے، تاہم یہ تصدیق کر لیں۔ منیر نگار

مطبوعات موصولہ

ادب اور زندگی | پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے سات انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے ایوان اشاعت ریڈیو اسٹیشن سے اور کچھ لکھنؤ سے نشر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر مجنوں کی صحافتی زندگی کے آغاز کو کافی زمانہ ہو چکا ہے لیکن اس دوران میں جو خدمت انھوں نے اردو علم و ادب کی انجام دی ہے، وہ کافی سے زیادہ ہے۔ کمیت کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ وہ ایک بے صین قسم کا دماغ رکھنے والے انسان ہیں اور اسی لئے ان کے افکار و فہمی میں ایک مخصوص نہرت و جہار پائی جاتی ہے۔

ابتداء میں جب انھوں نے فسانے شروع کئے تھے اس وقت بھی یہ حقیقت اہل نظر سے پوشیدہ تھی کہ انکا فطری رجحان ان کو کسی نہ کسی وقت ”انتقادیات“ کی طرف مائل کر دے گا، چنانچہ جب انھوں نے رسالہ ”ایوان“ جاری کیا تو ان کے لئے یہ راہ متعین ہو گئی اور اس کے بعد سے جو کچھ انھوں نے لکھا وہ اردو کے انتقادی لٹریچر میں بالکل نئی چیز تھا۔ مجنوں اپنے مطالعہ کے لحاظ سے فلسفی بھی ہیں اور ادیب بھی اس لئے ان دونوں کے امتزاج نے ان کے رنگ انتقاد میں گہرائی کے ساتھ ساتھ رنگینگی و دلکشی بھی پیدا کر دی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب وہ کسی ایسے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں جس میں انھیں ایک (معمودہ صحت، صحت) اسکول کے آرٹسٹ کی طرح اظہار خیال کا موقع مل جاتا ہے تو ان کے اشارات بہت پر لطف اور گراںمایہ ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جتنے مقالات شائع کئے گئے ہیں، ان سب میں ہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نظیر اور حالی پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں (گو اب حالی موجود نہیں، نظیر اکبر آبادی)

”ادب کا تعلق زندگی سے“ کیا ہے۔ گو تاثرات کے لحاظ سے انسانی تفکر کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو، لیکن بحث و گفتگو کے لئے اسے ایک مستقل موضوع بنادینا، بالکل تازہ چیز ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر مقالات اسی خیال کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں شاید ہی اتنا مفید مواد اس موضوع پر کہیں اور مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ علوم مغربی کے مطالعہ سے مجنوں نے خود جتنا صحیح فائدہ اٹھایا ہے وہ کم کسی کو نصیب ہوتا ہے

اور دوسروں کو جتنا فائدہ پہونچا یا ہے اس کی دوسری مثال تو مجھے نظر ہی نہیں آتی۔

تاریخ ادب اردو پہلا حصہ | یہ کوئی جامع تاریخ نہیں ہے بلکہ طلبہ کے لئے یا ان حضرات کے لئے جو حوالہ کی بڑی بڑی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

ابتداء میں زبان اردو کی مختصر تاریخ درج ہے اور اس کے بعد آغاز ادب سے لیکر اس وقت تک کے مشاہیر کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

گزشتہ دس سال کے اندر ادارہ ادبیات اردو کی یہ ساٹھویں تالیف ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت تک کتنی ادبی خدمت انجام دے چکا ہے۔ اس مرتبہ حیدر آباد بیونچکر میں نے خود اس ادارہ کو دیکھا اور اس کے اہتمام و انصرام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس ادارہ کے روح و رواں ہیں اور حیدر آباد کی جدید نسل میں جو ولولہ زبان کی خدمت کا پایا جاتا ہے اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر زور کی سعی و کوشش کا ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۴۰ روپے ہے۔

محمد حسین آزاد | یہ کتاب بھی ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد نے شائع کی ہے اس میں مولانا آزاد مرحوم کے تمام حالات زندگی کو کیا کر کے ان کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور شاعری پر بھی۔

یہ تالیف جہاں بانوبگیم (نقوی) ام۔ اسے کی ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک خاتون کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ ادارہ کا شعبہ نساواں اس سے قبل اور بھی کئی کتابیں خواتین حیدر آباد کی شائع کر چکا ہے قیمت ۲۰ روپے ہے اور ملنے کا پتہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن۔

آبدوز اور سرنگ۔ پانی کی کہانی | ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد نے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا شروع کیا ہے تاکہ سائنس کے ضروری مسائل عام فہم

اردو میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں۔ ایک میں آبدوز اور سرنگوں کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں پانی کے متعلق تمام ضروری اطلاعات یکجا کر دی گئی ہیں۔ جا بجا نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے ان مسائل کو اور زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور اردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی کوشش ہے۔

قواعد عربی حصہ اول | مولوی محمد مہبتہ اللہ صاحب نے جو گورنمنٹ سنی کالج حیدر آباد میں عربی کے لکچرر ہیں عربی زبان کے قواعد پر یہ پہلا حصہ ابتدائی تعلیم کے لئے شائع کیا ہے جو بہت سہل

و مفید معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان سے مسلمانوں کی بیگانگی بہت افسوسناک بات ہے، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر اسی قسم کی کتابوں کی مدد سے بہت کم مدت میں خاص مہارت اس زبان میں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

امید ہے مولوی صاحب موصوف اس سلسلہ کو جلد مکمل کر دیں گے۔

جلوہ زارِ اظہر | جناب سید دلدار حسین رضوی اظہر آبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب اظہر حیدر آباد کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہیں اور وہاں کے اہل علم میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، تاریخ گوئی میں آپ کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے اور شعرو شاعری سے خاص لگاؤ ہے اس کی قیمت ۳۰ روپے اور طے کا پتہ ۷۶، بازار نورالامراء حیدر آباد دکن۔

تذکرۃ الہند۔ یادگار رضائی | حکیم رضا علی خاں مرحوم کی تالیف ہے جس میں دکن اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص نہایت محنت سے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ انجمن اطباء یونانی حیدر آباد نے اس کتاب کو شائع کر کے واقعی فنی طب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کاش یہ اردو میں ہوتی اور عوام بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔

ان دونوں حصوں کا حجم ۱۰۰ صفحات سے زیادہ ہے اور قیمت دس روپیہ۔

ڈاکٹر عباس علی خاں ملتے کے بعض ادبی نکتوں کا مجموعہ ہے، جو نگار کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مقالات بعض ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اسلئے وہ بزم ادب میں کوئی نواوار شخص نہیں ہیں۔ ان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور زبان شستہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

مقدمہ زندگانی محمد | زندگانی محمد، محمد حسین ہیکل مصری کی مشہور تالیف ہے جس پر خود انھوں نے ایک معرکہ آرا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب اسی مقدمہ کا ترجمہ ہے جس میں قرآن مجید اور رسالت پر جدید اصول انتقاد کو سامنے رکھ کر بحث کی گئی ہے اور ان دونوں کی اہمیت کو روایت و روایت دونوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ طے کا پتہ :- دفتر امت مسلمہ امرتسر ہے اور قیمت ۱۰ روپے۔

رہنمائے تاریخ اردو | فن تاریخ گوئی کی کتاب ہے جسے حاجی محمد عبدالقادر وکیل بنارس نے مرتب کیا ہے اس میں تقریباً ۷۰ شعراء کی تاریخ وفات کے قطعات درج ہیں اور اس سلسلہ میں تاریخی گوئی کے تمام مروجہ طریقوں کو بھی بتا دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ روپے۔

جمعہ نشاط | مجموعہ ہے جناب نظیر ہودھیا نوی کی نظموں کا۔ جناب نظیر بہت کبہ مشق شاعر ہیں اور ان کی نظمیں اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے شعر و فلسفہ سے بہت متاثر ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے نظریہ اقبال ہی کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔

آپ کی نظموں میں استواری ہے اور اداسے بران میں زور و خود داری۔ اس مجموعہ میں ادبی، فطری، مذہبی و معاشرتی سبھی قسم کی نظمیں نظر آتی ہیں اور ان سب میں جناب نظیر کے سچے تاثرات جھلک رہے ہیں۔

طباعت و کتابت وغیرہ بہت خوب ہے اور قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- نیو اسٹریٹ لودھیانہ۔

جناب درویش میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب درویش نوجوان شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، تاثر کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے قبل اپنے اور میرے ایک مشترک دوست کے ذریعہ سے انھوں نے اس مجموعہ پر میری رائے حاصل کی تھی جو ابتداء میں دیدی گئی ہے۔ یہ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے اور جناب درویش محلہ کوٹلہ میرٹھ سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

اردو کا پہلا شاعر اور پہلا مردون | پروفیسر اویس احمد ادیب نے ولی دکنی کو اس عنوان سے پیش کیا ہے اور اس کے تمام اصنافِ نظم سے بحث کی ہے۔ ولی سے پہلے کے شعراء کو وہ برج بھاشا کے کہنے والوں میں جگہ دیتے ہیں اس لئے اردو کے پہلے شاعر ہونے کی خصوصیت ان کے نزدیک صرف ولی کو حاصل ہے۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور افادہ سے خالی نہیں۔

قیمت ۱۲ روپے اور ملنے کا پتہ ”مصنف حلیم مسلم کالج کانپور۔“

خواب بیداری | آخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور کتاب ”خواب و بیداری“ کا ترجمہ ہے جسے سید یوسف حسین صاحب زیدی نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں تمثیلی انداز سے تمام اہم سابقہ و حاضرہ کے اجتماعی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں ادیان پرستی کو کتنا دخل ہو گیا ہے۔ محلا کے روبرو تمام انبیاء کیے بعد دیگرے بلائے جاتے ہیں اور ان کے سامنے ان کی اُمتوں کی بدعتوں کا بیان کر کے محاسبہ کیا جاتا ہے، اخیر میں حضرت خاتم النبیین کو بھی بلایا جاتا ہے اور تمام نزاعات مذہبی کو پیش کر کے پوچھا جاتا ہے کہ کیا جو کتاب نہایت دلچسپ و مفید ہے اور وہ لوگ جو مذاہب کے باب میں زیادہ آزاد رائے رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ترجمہ بہت صاف و سلیس کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ سید یوسف حسین زیدی، کوچہ میرافیس، لکھنؤ۔ قیمت ۸ روپے

طالع عمل | ترجمہ ہے ڈیل کارنگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۲۸ ہزار نسخے ستمبر ۱۹۳۸ء تک فروخت ہو چکے تھے۔ کارنگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ

ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ و سلیس کیا گیا ہے۔ ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے نفسیات کے علمی اصول اردو میں روشناس کرائے۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور پھر میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے۔

خود دار خاتون ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامہ کا جس میں وکٹورین عہد کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔
آسکر وائلڈ کی تصانیف کا ترجمہ آسان نہیں، لیکن جناب محمد مرزا صاحب دہلوی نے بہت کامیابی سے یہ خدمت انجام دی ہے۔

قیمت ۸ روپے اور سٹے کا پتہ دائرہ ادبیہ۔ دریا گنج۔ دہلی۔

نشا ڈراما ہے جناب کشن پرشاد کوئل کا لکھا ہوا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت عورتوں کے باب میں کتنی بیرحم واقع ہوئی ہے اور ہم خدا کی اس مخلوق کے ساتھ کتنی برسلو کی کرتے ہیں۔
اس کے مصنف بہت کہنے مشق انشا پرداز ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خاص قسم کی متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں۔ بلاٹ اور کردار سب میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نظر آتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور سٹے کا پتہ لیڈر پرس الہ آباد۔

پیام کیف مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڑھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا صاحب گو پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، لیکن اپنے فکر و احساس کے لحاظ سے بکے شاعر ہیں۔ جس کا حال لوگوں کو اس وقت معلوم ہو گیا تھا جب کلام اتصغر پر ان کا تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہ اتصغر مروج کی شاعری سے بہت متاثر ہیں لیکن ان کا کلام ان خامیوں سے پاک ہے جو اتصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ فلسفہ و تصوف غزل کا دشمن ہے، لیکن اگر سلیقہ و تاثر کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے تو غزل میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو آجکل مقبول ہے۔

احسان صاحب کی شاعری میں فلسفہ و تصوف دونوں ہیں، لیکن دونوں کا صرف احتیاط سے کیا گیا ہے۔
یہ کتاب جناب مصنف سے اعظم گڑھ کے پتہ پر عدم میں مل سکتی ہے۔

گلستان شرف دیوان ہے سید ابوالفتح محمد شرف الدین متخلص بہ شرف رئیس ڈھاکہ کا جس میں غزلیں، قصائد، سلام اور سہرا وغیرہ سبھی کچھ ہے، لیکن ایک رئیس کا کلام جیسا ہوا کرتا ہے ویسا ہی ہے، کوئی خاص بات کسی چیز میں نظر نہیں آتی۔ البتہ لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

سب سے پہلا مرقی میر نے آوران سے درمیان یہ ہے کہ میں ہر لفظ میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ دشت و درندگی کو۔ وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب ان سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دنیا میں ملحد ہو کر جینا بہتر ہے یا احق رہ کر!

اسلام کیسے شروع ہوا | یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں جناب رسالت کی سیرت کو نہایت سادہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور قیمت پچیس

جوہر عبدالحق نمبر | جامعہ ملیہ کے طلبہ نے رسالہ جوہر کا یہ نمبر مولوی عبدالحق کی سترویں سالگرہ کے موقع پر شائع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے اردو ادب کی جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا اجمالی علم تو ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن ضرورت تھی کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جاتا۔ اس لئے اہل ملک کو ”ارباب جوہر“ کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ علاوہ ان مقالات کے جن کا تعلق مولوی عبدالحق صاحب سے ہے، دوسرے ادبی مقالات بھی اس میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نظر آتے ہیں۔

یہ نمبر مجلد شائع کیا گیا ہے اور قیمت پچیس۔

Our countrymen abroad انگریزی تصنیف ہے جناب دھرم یاش دیو کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہندوستانیوں کی کیا حالت ہے اور وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتاب نہایت محنت و قابلیت سے لکھی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہو سکتی۔

نازی ازم | جناب عبدالرحیم شبلی (بی کام) کی تالیف ہے جس میں نازی تحریک کی تاریخ ابتدا سے اس وقت تک درج کی گئی ہے۔ اس کے مولف دنیا کے صحافت میں اس سے پہلے بھی اپنے معاشی مقالات کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس زمانہ میں جبکہ اس نزع کے لڑنے کی ضرورت ہے، مولف نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب کی نہایت بر محل خدمت انجام دی ہے۔ وہ لوگ جو ہندو اور اس کی نازی تحریک کا مطالعہ ہر پہلو سے کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ قیمت پچیس۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ لاہور۔

طلسم عمل | ترجمہ ہے ڈیل کاریگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۲۸ ہزار نسخے ستمبر ۱۹۳۸ء تک فروخت ہو چکے تھے۔ کاریگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ و سلیس کیا گیا ہے۔ ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے نفسیات کے علمی اصول اردو میں روشناس کرائے۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور پھر میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے۔

دنیا میں صرف ایک ملحد ہے اور ایک مسلمان!

ملحد: نیاز فتحپوری اور مسلمان: عبدالماجد دریا بادی۔ ————— یہ نظریہ یا استقصاء میرا نہیں ہے، بلکہ اسی شخص کی باتوں سے سمجھا ہے جسے میں نے دنیا کا صرف ایک مسلمان کہا ہے۔

یقیناً حیرت کی بات ہے کہ خدا کی اتنی بڑی آبادی میں کفر و اسلام کی نیابت اس قدر محدود و مختصر ہو، لیکن عبدالماجد کی رائے یہی ہے اور کسی شخص کی ذاتی رائے کو یوں بغیر سوچے سمجھے غلط کہہ دینا کم از کم مجھ ایسے ملحد کے نزدیک نہایت نامعقول بات ہے، گو عبدالماجد ایسا مسلمان اسی ضد و رقابت کو اسلام سمجھتا ہو۔

دنیا میں بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ فلسفے انھوں نے پیش کئے ہیں، لیکن ان زمانہ کے ایک ہندی فیلسوف، ایک ماہر علم کلام نے جس کے مسقط انراس ہونے کا فخر دریا بادی کو حاصل ہے، کفر و اسلام کی دیرینہ نزاع کا نہایت ہی سادہ و مختصر نقطہ پیش کیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے اس کے عقل کچھ کم ہو۔

یہ فیلسوف کہتا ہے کہ اسلام نام نہ صرف اُس چیز کا (یعنی چیز کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کا بتایا ہوا اسلام واقعی عجیب ”چیز“ ہے) جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور ہر وہ چیز جو سمجھ میں آجائے کیسے غیر اسلامی ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ مختصر کر کے گویا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو عبدالماجد کہے وہ اسلام ہے اور جو نیاز فتحپوری کہے وہ کفر و الحاد ہے۔ کیا دنیا میں اس سے زیادہ صاف و صریح، اس سے زیادہ آسان تشریح اسلام و کفر کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟ غالباً نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ضرور غور طلب رہ جاتی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور میں کیا کہتا ہوں۔ سب سے پہلا فرق میرے اور اُن کے درمیان یہ ہے کہ میں ہر گفتگو میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ وحشت و درندگی کو۔ وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب اُن سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احمق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دنیا میں ملحد ہو کر صیبا بہتر ہے یا احمق رہ کر!

خیر، یہ تو میرے اُن کے اختلاف کے نہایت سطحی دظاہری حدود ہیں، جن پر آپ کو زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے زیادہ اصرار کی۔ اب آئیے ذرا معنویت کی طرف آئیں۔ میں اس وقت مُسلم و مُلحد کی اصطلاحات پر فقہی حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ میرے اور اُن کے درمیان جو دیرینہ تعلق ”اہرمن و ہیزواں“ کا سا چلا آ رہا ہے اس کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جو کفر و اسلام کے درمیان ابہ التفرع یا (زیادہ صحیح الفاظ میں) ما بہ الاشتراک ہے اور وہ خدا کا تصور ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے اور بالکل صحیح دعویٰ ہے کہ اس نے وحدانیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مادیت کے لگاؤ سے یکسر پاک ہے، یعنی اس تصور میں کوئی بعید ترین شائبہ بھی مادیت کا نہیں پایا جاتا۔ یوں اگر عہد الما جد سے پوچھا جائے تو وہ بھی غالباً اس کا اعتراف کریں گے، لیکن اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ میں بھی یہی کہتا ہوں تو انھیں وحدانیت کے اس عقیدہ میں بھی کفر و الحاد کی جھلک نظر آنے لگے گی۔ آپ اس کو مبالغہ نہ سمجھئے بلکہ جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کے لئے دلائل بھی رکھتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ خدا ”نطق و کلام“ کی اُس صفت سے میرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں ”خدا کا کلام“ کہنا، خدا کی توہین ہے اور تصور وحدانیت کے یکسر منافی۔ وہ یہ سنکر آگ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطہ ”وحیِ یوحٰی“ ہے۔ میں کہتا ہوں بیشک قرآن مجید وحی ہے، الہام ہے لیکن اس معنی میں نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس مفہوم میں جو قرآن سے متبادر ہے اور جب میں ثابت کرتا ہوں کہ ”وحی الہام“ سے مراد صرف فطری ذہانت یا طبعی صلاحیت ہے تو اس کے جواب میں مجھے گالیاں دینے لگتے ہیں۔

کیسی تاشہ کی بات ہے کہ ”یٰ اے اللہ فوق ایسیم“ میں تو وہ ید (ہاتھ) کی تاویل کر کے اس کا مفہوم ”قدرت و قوت“ بتائیں (کیونکہ خدا مادیت سے میرا ہے اور ہاتھ پاؤں کچھ نہیں رکھتا)، لیکن قرآن مجید کے باب میں وہ خدا کا حلق و زبان بھی کچھ مان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وحی کا مفہوم ان کے نزدیک ”خدا کا کلام“ قرار پاتا ہے اور ”لوح محفوظ“ کا مفہوم ایک جواہر کار تختی (واقعی تختی) جس پر یہ کلام ازل سے منقوش چلا آتا ہے اور خدا کا یہ ارشاد کہ ”ما کان لبشر ان یمکملہ اللہ“ (انسان کا یہ منصب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے) ان کو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصد لوگوں میں اعتقاد و بصیرت کی

کیفیت پیدا کرنا ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے:-

فَاتَقْصُصْ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ — لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ

لیکن عہد الما جد کہتے ہیں کہ نہیں کلام مجید تاریخ کی کتاب بھی ہے اور تاریخی نقد و جرح کا ہدف بھی اسے بنایا جاسکتا ہے

میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۃ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے، ورنہ ان کی حیثیت ایک ایسے مصلح کی سی قرار پائے گی جو خود کوئی اختیار رکھتا ہے اور نہ اتنی اہمیت کہ وہ تدبیر و مصلحت سے کام لیکر لوگوں کی رہنمائی کر سکے، لیکن عبدالماجد کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول کی حیثیت صرف ایک پیامبروں کی سی ہے اور قرآن مجید کی رہبری و ہدایت میں خود انکی ذاتی یا طبعی صلاحیت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو معجزہ کہنا اسی وقت اہمیت رکھ سکتا ہے جب ہم اسے رسول اللہ سے یعنی ایک انسان سے منسوب کریں، ورنہ خدا کے کلام یا خدا کی کسی بات کا معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ آفتاب کو بھی آفتاب کہتے ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے۔

عبدالماجد کہتے ہیں کہ ”فاتوا البسورة من مشك“ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک ایک لفظ ”منطوق“ خداوندی ہے اور اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو پہلے سے عربی زبان میں پایا جاتا ہو، اس لئے بجائے قرآن مجید کے عربی زبان ہی کو معجزہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اگر معجزہ کا تعلق ہے آیات کے مفہوم سے اُن تعلیمات سے جو ان آیات میں ظاہر کی گئی ہیں، تو میرا بھی مقصود یہی ہے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کے معجزہ یا کلام ربانی ہونے کی بحث قطعاً اٹھ جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ”نطق یا کلام“ کا مفہوم اس وقت تک تکسین ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہم زبان، حلق، الفاظ وغیرہ کا تصور اس کے ساتھ شامل نہ کریں اور خدا یقیناً ان چیزوں سے پاک ہے۔ مگر عبدالماجد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ وہی ہیں جو خدا نے جبریل کے ذریعہ سے رسول اللہ کے سمیع مبارک میں اس طرح اقلانے جس طرح ایک استاد اپنے شاگرد کو بچے کر کر کے پڑھاتا ہے، خواہ ایسا سمجھنے کے لئے خدا کو حلق و زبان کا محتاج ہی کیوں نہ ماننا پڑے۔

یہ تو صرف کلام مجید کے متعلق میرے اُن کے خیالات کا اختصار تھا، اب اس سے بہت کرا اور باتوں کو لیجئے:-

میں کہتا ہوں خدا بے نیاز مطلق ہے، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا، وہ تافز سے مستغنی ہے۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ وہ ہماری عبادتوں سے خوش ہوتا ہے اور نافرمانیوں سے برہم۔ گویا وہ دنیا کا کوئی انسانی بادشاہ ہو جسکی تعریف کیجئے تو انعام دیتا ہے اور نہ کیجئے تو دربار سے باہر نکال دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے اچھے اخلاق سے خدا کا خوش ہونا اور ہماری برا اعمالیوں سے اس کا ناخوش ہونا صرف اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسان عرصہ سے دنیاوی بادشاہت کے نظام سے متاثر ہے اور اسی کی مثال کو سامنے رکھ کر اسے بہتر درس دیا جاسکتا ہے، ورنہ اس خوشنودی یا ناخوشنودی کا تعلق صرف ہمارے اعمال یا کردار کے اُن نتائج سے ہے جو اسی دنیا کے اندر فلاح یا بربادی کی صورت میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دوزخ و جنت کا مفہوم کیسر روحانی مفہوم ہے اور حور و قصور، کوثر و سلسبیل جہنم و فردوس صرف تمثیلی الفاظ ہیں جن سے معنوی راحت و تکلیف کو ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں، حور سے مراد اسی قسم کی دنیاوی عورت ہے جس سے جنسی لطف اٹھایا جاتا ہے اور عورت و حور میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ عورت کو سیر ہو جانے کے بعد تیس روپیہ کا مہر ادا کر کے طلاق بھی دی جا سکتی ہے اور حور سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، گیسرین کی گرز بازی، حشر و نشر، میزاں، وپل صراط وغیرہ کا وجود مادی حقیقت سے ماننا ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں تمثیلی ہیں اور خدا نے انسان کو اتنا احمق پیدا نہیں کیا کہ وہ عالم مجاز میں آکر اپنی حقیقتوں کو دانشکات کو نا ضروری سمجھے۔ خدا لاکھوں گزے روز بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور اس کا عالم خلق اتنا وسیع ہے کہ زمین ایسا حقیر کرہ اور اس کے حقیر باشندے تو کیا اگر لاکھوں نظام شمسی روز تباہ ہوتے رہیں تو بھی اس کی کارگاہ کی رونق کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہمارا حشر و نشر وغیرہ کا قابل ہونا اپنے آپ کو ناراجب اہمیت دیدینا ہے جس کو خدا کی عظمت کا صحیح تصور برداشت نہیں کر سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ عبادت کا اصل مقصود اخلاق میں بلندی پیدا کرنا ہے، گویا عبادت ذریعہ وسیلہ ہے نہ کہ اصل مقصود۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ صوم و صلوٰۃ خود اپنی جگہ اصل مقصود ہے اور سجاات کے لئے کافی۔

یہ ہیں وہ چند اصولی باتیں جن کے اختلاف پر عبدالماجد کے اسلام اور میرس الحاد کی بنیاد قائم ہے۔ میں تو انھیں غیر مسلم نہیں کہتا کیونکہ میرس نزدیک بعض عقاید کا اختلاف ایک شخص کو سنت اسلامی سے خارج نہیں کر سکتا لیکن میں ان کے نزدیک مرتد ہوں، لمحہ ہوں اور اگر میرس عقاید واقعی ارتداد والحاد ہیں (جس کا فیصلہ میں عبدالماجد سے نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے اہل علم و عقل سے چاہتا ہوں) تو میں نہایت خوشی سے اس کا اعتراف کرنے پر تیار ہوں۔

ہمارے دوست عبدالماجد ایک نہایت ہی خشک و عجوس قسم کے قنوطی انسان ہیں جن کے نزدیک زندگی نام ہے دنیا و اہل دنیا سے بیزار رہنے کا اور اپنے آپ کو سب کے لئے اجیرن بنا دینے کا، ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی گمراہی اس کی علمی و ذہنی حرقیاں ہیں اس لئے دور حاضر ان کے لئے سخت کرب و اضطراب کا باعث ہے۔ یورپ میں کسی علمی ایجاد کی خبر انھوں نے سنی اور دریابا د میں ان کو تکلیف شروع ہو گئی، امریکہ میں کسی نئی دوربین کی ایجاد کا حال معلوم ہوا اور ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اگر اتفاق سے کوئی جہاز طوفان کے صدمہ سے غرق ہو گیا تو فوراً انھوں نے اس کو خدائی انتقام سے تعبیر کیا۔

انھیں یہ جستجو تو ہر وقت رہتی ہے کہ اہل مغرب میں طلاق کا اوسط کیا ہے، شراب پینے والوں کی تعداد کتنی

ہے، موٹروں کے ٹکرانے سے کتنے آدمی روز ہلاک ہوتے ہیں اور ان تمام باتوں کو وہ دہرہ حاضری لعنت قرار دیکر اس سے پناہ مانگتے ہیں، لیکن وہ اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ علوم جدیدہ کتنی زبردست علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور فطرت کے کتنے قوائے کامند کو وہ بروئے کار لا چکے ہیں اسی کے ساتھ کبھی اس پر توبہ نہیں فرماتے کہ جس جماعت کو وہ ”اپنی“ اور ”خالص اسلامی“ چیز کہتے ہیں خود اس کے اعمال و اخلاق کا کیا حال ہے، اور جب تک خود اپنا دامن خشک نہ ہو دوسروں کی تردامنی پر اعتراض کرنے کا انھیں کیا حق حاصل ہے۔

جس وقت میں نے جوآن میں ”آتش فرد“ پر بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ ”قرآن مجید“ اس معنی میں کلام ربانی نہیں ہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو انھوں نے مجھے ابو جہل و ابوسہب بھی کہا، میرے خلاف اخبارات میں مضامین بھی شائع کرائے، میرے اور نگار کے مقاطعہ کے لئے پلے بھی برپائے، لیکن جو دلائل میں نے جوآن اور جولائی کے نگار میں پیش کئے ہیں ان کی تردید کی جرأت وہ نہ کر سکے۔ ان کے نزدیک گویا اسلام کی خدمت نام ہے صرف اس بات کا کہ جو شخص ان کے موعودہ عقاید کے خلاف کوئی بات کہے اسے مرتد و ملحد کہہ دیا جائے کسی کو ”مرتد و ملحد“ کا فروز ندیق“ بنا دینا، تداامت پرست جماعت کا کوئی نیا حربہ نہیں ہے، اور ہر چند کہ اس حربہ سے انھوں نے ”آزاد خیالی“ کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً ”عقل انسانی“ کی طرف سے اظہار حق ہوتا ہی رہا اور برابر ہوتا رہے گا۔

ان لوگوں کا اعتراض سب سے کہ مجھے یا کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ان کے عقاید کے خلاف رائے کا اظہار کر کے انھیں تکلیف پہنچائی جائے۔ لیکن بالکل یہی اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ کسی کو آزادانہ اظہار رائے سے باز رکھ کر کیوں اس جماعت کو تکلیف پہنچائیں جو اسلام کی خدمت اسی میں سمجھتی ہے کہ اسے لایعنی عقاید سے پاک کیا جائے۔

جس طرح عبدالماجد کو ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے اسلام پر اظہار خیال یا اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، اسی طرح میں بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجاز ہوں کہ اسلام کا وہ مفہوم پیش کروں جو میرے نزدیک صحیح و درست ہے۔ اگر عبدالماجد سمجھتے ہیں کہ میں قرآن کو کلام ربانی نہ مان کر اسلام کی توہین اور رسول کی تکذیب کرتا ہوں، تو میں بھی اپنی جگہ یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام کہہ کر اسلام کی تحزیب اور رسول کی تحقیف کرتے ہیں، فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتا ہوں اور وہ صرف مجھے ”ملحد و مرتد“ کہہ دینا ہی کافی دلیل سمجھتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بازاری آدمیوں کی طرح سب و شتم پر اتر آیا جائے۔ خود جناب رسالت کا طرز عمل ہمیشہ یہ رہا کہ وہ مخالف کو پیغمبر سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور

غصہ کبھی نہ فرماتے تھے، لیکن عبدالماجد صاحب کو جو اپنے آپ کو سب سے بڑا محافظ روایات نبوی کا سمجھتے ہیں، سوائے گالیال دینے اور مقاطعہ وغیرہ کی پست و ذلیل کوششیں کرنے کے اور کوئی جواب اپنے پاس نہیں رکھتے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اس نوع کی غیر انسانی حرکات سے اپنے جذبہ انتقام کو ایک حد تک پورا کر سکیں، لیکن دنیا میں تماشائیوں کے ساتھ اہل نظر کی بھی کمی نہیں ہے اور وہ یقیناً اس کو بذہنی پر محمول کریں گے یا اہل مذہب کی بیکیسی و بے مایگی پر، اور شاید یہ دونوں باتیں عبدالماجد کو خوش نہیں آسکتیں۔

مجھ پر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا یہ الزام بھی قائم کیا جاتا ہے کہ میں نے اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کا عہد کیا تھا، لیکن اس عہد سے پھر گیا۔ لیکن یہ معاہدہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب عبدالماجد اینڈ کوئٹہ نے خود بھی اپنے عہد کو توڑ کر حکومت سے میرے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی تھی۔ آج اڈیٹر معارف کی طرف سے بھی مجھ پر یہی الزام قائم کیا جاتا ہے، حالانکہ سینہ ایمان ندوچی خود اس جماعت کے سرگروہ تھے جو میرے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لانے جانے کے لئے لنگ روہ میں معروف تھی!

اگر میری معذرت شایع ہونے کے بعد وہ خاموش رہتے اور کوئی معاندانہ کارروائی نہ کرتے تو بیشک مجھ پر "اخراجات عہد" کا الزام قائم ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ کس منہ سے مجھ پر الزام قائم کر سکتے ہیں۔ خود پاس عہد نہ کرنا اور دوسروں سے ایفاء چاہنا عجیب تماشہ کی بات ہے!

میں نے عبدالماجد صاحب کو خط کے ذریعہ سے بھی اطلاع دیدی ہے اور اب نگار کی وساطت سے بھی میں انھیں اور تمام اُن کے ہم عقائد لوگوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں اسلام کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کرتا ہوں اس کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں، لیکن اگر اُن کے نزدیک وہ غلط ہے تو نگار کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے تردیدی جوابات کو من و عن شایع کر دینے کا وعدہ کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر ان کے جوابات سے مجھے تسکین ہو گئی، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کروں گا۔ ورنہ یوں مجھے ان کے مزید و لمحد کہنے کی پرواہ نہیں ہے، میرا اور میرے عقائد کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیت کیا ہے۔

و کفی بالشد شہیدا

جذبات بھاشا

کا جدید اڈیشن - کاغذ و کتابت نہایت نفیس - قیمت بارہ آنہ - رعایتی قیمت ۹ روپے
مینجر نگار لکھنؤ

دو منظر

پنگھٹ کی صبح :

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں جاڑے کی رُت، بہار کے دن، صبح کا سماں
 لہروں پر تیرتی ہے جہابوں کی کہکشاں موجوں سے کھلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
 آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
 سرسبز پتیوں کے پیالے چھلک گئے
 آئی کرن نگاہ کے پیر تولتی ہوئی، گہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی،
 شبہنم کے تابناک گہر ردلتی ہوئی، پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
 موجوں کی بقیہ راہیں چک گئیں،
 وہ جوش کیفیت ہے کہ ہوا میں بہک گئیں
 اشران کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی کاندھے پہ ایک تلخی دھوتی پڑی ہوئی
 ندی کے پاس جا کے جو انگڑائی اُس نے لی ملاح کے بھی ہاتھ سے پتو اڑ چھٹ گئی
 موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا،
 شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جھکا لیا،

پنگھٹ کی شام :

پیڑوں کی چھاؤں، ریت کے فوسے، شفق کی خنو ساحل کو چومتی ہوئیں موجیں یہ طرز و نو
 خورشید کے چراغ کی بجھتی ہوئی سی لو برہم سا چھیڑتی ہوئی ندی کی تیز رو
 موجوں کے جزر و مد میں عجب اہتمام ہے،
 فردوس کی سحر ہے کہ پنگھٹ کی شام ہے
 پھیلی ہوئیں جھکے ہوئے پیڑوں کی ڈالیاں دریا کی سطح بن گئی سایہ کا آسمان،
 جاتا نہیں ہے ایک بھی نظارہ رائگاں گاؤں سے آرہی ہیں کسانوں کی لڑکیاں
 مٹی کی گاکروں کو سروں پر لئے ہوئے
 مستی کی تیز تیز خرابی پئے ہوئے،

چمڑھتا ہوا شباب، مکمل جوانیاں، موضوعِ حسن و عشق، مجسم کہانیاں
 تہذیبِ عہدِ رفتہ کی زندہ نشانیاں کھیتوں کی شاہزادیاں، گاؤں کی رانیاں
 آتے ہی اُن کے منظرِ ساحل بدل گیا،
 ماحولِ حسن و کیف کے سانچے میں ڈھل گیا

ماہرِ تعادری

رات کی دیوی

مکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے
 پلکیں جھکی جھکی ہوئی نیندوں کے بوجھ سے
 ہونٹوں پہ خامشی سی درختوں کی چھاؤنکی
 سونی جبیں پہ سونی ہوئی بستیوں کا حال
 آنکھیں خمار و خواب کے جادوئے ہوئے
 انگشتِ خواہناک میں ذوقِ گناہ کے
 سانسوں کے دھیمے ساز میں خاموشیوں کی
 بوسوں کے عطرِ بیز ترنم کی گرمیاں،
 دھڑکن میں دل کی راز کی باتوں کی خامشی
 تیندوں کے ابرتار میں کھویا ہوا جمال،
 آہستہ پارواں میں افق پر خیال کے
 سیالوں کے کاروان جلو میں لئے ہوئے
 نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے

طفیل احمد خان سلطانپوری

نازی سپاہی

دیکھ یو نیفارم میں وہ ایک فوجی نوجواں
شارٹ پر ڈالی ہے اس نے کس قدر بالکی شکن
پٹیوں پر کتنی خوبی سے اُلٹ رکھے ہیں ہوز
اس کے بازو ہونہیں سکے کسی صورت سے شل
ہر نظر اس کی گزر جائے گی پتھر توڑ کر
سر کو بے سیدھا کئے، ٹھوڑی کو بے بھنیچے ہوئے
آنڈھیوں میں یہ جگہ سے اپنی بل سکتا نہیں
عزم سے بڑھتا ہے خالی ہاتھ کو دے کر سونگ
راہ دیدیتے ہیں ہٹ کر راستے سے کارواں
حوصلوں سے سرخ چہرہ، عزم سے آنکھوں میں نور
یہ معالج بن کر آیا تھا کبھی تخریب کا
ضامن امن و امان بن جائیگا صیاد بھی

ہم نشیں! آدیکہ میرے ساتھ میں دیکھوں جہاں
دیکھ کتنے سمات و روشن ہیں ٹیونک کے بٹن
دیکھ اس کے بوٹ پر پالش ہے کتنی دل فروز
دیکھ کتنی کس کے یہ تھامے ہوئے ہے رائفل
بے حس و حرکت کھڑا ہے ایڑیوں کو جوڑ کر
کس نئے انداز سے سینے کو بے تانے ہوئے
آہنی قوت سے اس نے داب رکھی ہے زمیں
مارچ کرتے وقت دائیں ہاتھ سے تھامے سینگ
دب دے سے اس کے گھبراتے ہیں سب پر وجواں
گرمیاں سینے میں دل میں ہے شجاعت کا سرور
یہ محاذ بن کر اٹھا تھا کبھی تہذیب کا
کیا خبر تھی ہے فرشتہ پیشہ ورجلا د بھی

ذہن اسے دے کر خدا نے ذہن کی توہین کی
ناچنا ٹھہرا اسے جب دوسروں کے حکم پر
یہ سلامی رائفل پر اس کو دیتا ہے مدام

ریڑھ کی ہڈی پہ کٹ سکتی تھی اس کی زندگی
عقل کی اس کو ضرورت ہی نہیں تھی عمر بھر
یہ جتانے کے لئے ہے اپنے افسر کا غلام،

میت پر دانہ سے یا شمع شب افروز سے
ایک شعلہ اس کے سینے میں کبھی بھڑکا نہیں
آتشیں نعمات سے بھی اس کا دل ہلتا نہیں

اس کو کوئی مس نہیں ہے زندگی کے سوز سے
ایک آنسو آنکھ سے اس کی کبھی اٹا نہیں
اس کو تاروں کی چمک میں کیمت کچھ ملتا نہیں

حسن کیا سمجھے گا جب پیدائشی اندھا ہے یہ
مار کر ٹھوکرا سے سب کچھ کچل دینے سے کام
پھینک دیتا ہے یہ انسانوں کی گردن توڑ کر
اس نے مہیٹ سے کیا معصوم سینوں کو فگار
اس نے فاقہ کش نہتوں پر بھی بم برسائے ہیں
ہڈیوں کے پینے کو اس نے توڑے مقبرے
لطف لیتا ہے یہ ماؤں کو ترپست چھوڑ کر
نوح لیجا تا ہے کہنے بچیوں کے کان سے
دیکھتا ہے کاش ان کی ساڑیوں کی عجوبیاں
کتنی تصویروں کو اس نے کر دیا وحشت میں چاک
پاؤں سے کچلے میں اس نے اپنے کتے شاہکار
اس نے باغوں پر گر امیں بے ضرورت بجلیاں

ہم نشیں اکب تک میں اس کجنت کا شکوہ کروں؟

لا مجھے پستول دے میں اس کے گولی مار دوں!

فضل الدین انصاری

پھول کے رومان رنگ و بو سے بے بہرہ ہے یہ
سانے بلور کی مینا ہو یا پھولوں کا جام
واحد اپنی نوعیت کا ہے یہ حیواں سرسبز
گن مشینوں سے کئے ہیں اس نے مجبوروں پر ہزار
گیس کی صورت میں اس نے غم ہی غم پھیلائے ہیں
بھر گیا انسان سے دل تو تنوع کے لئے
ناز کرتا ہے یہ بچوں کے گھر وندے توڑ کر
بھاگتا ہے جب نظیر ابن کے یہ میدان سے
کاش یہ گنتا مری بہنوں کی ٹوٹی چوڑیاں
کر دئے کتے کتب جانے جلا کر اس نے خاک
کتے شاعر ظلم سے اس کے ہوئے ہیں سوگوار
جانور کی طرح اس نے روند ڈالیں کھیتیاں

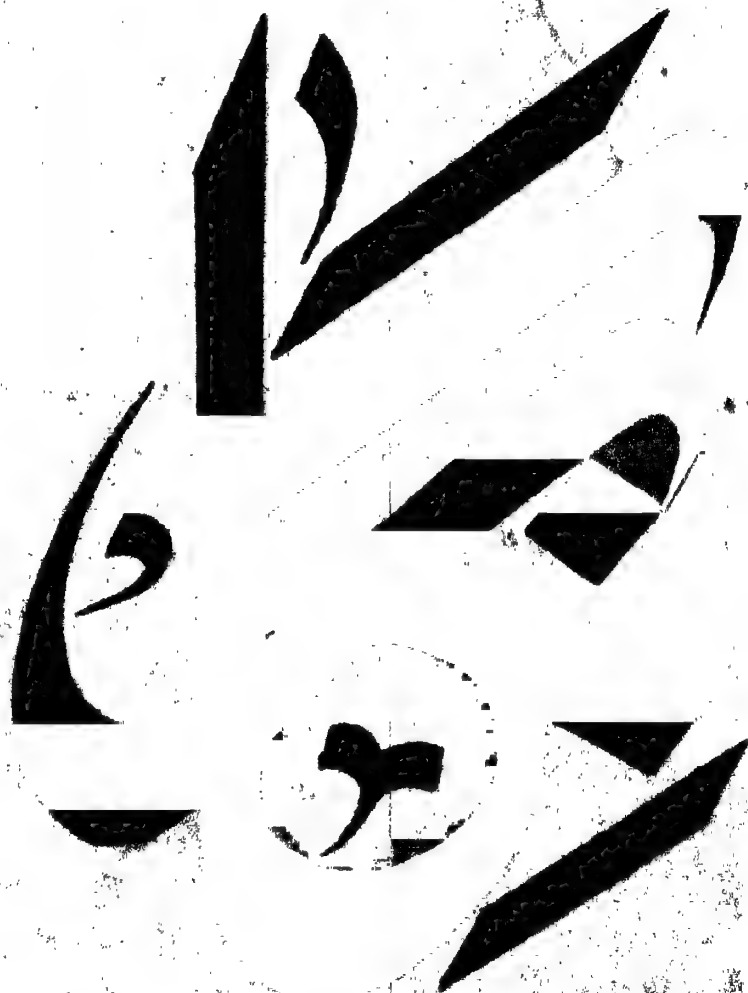
خلیل اللہ قریشی

غزل:

نشاط جاوداں ہے اور میں ہوں
شراب ارغواں ہے اور میں ہوں
وہ کافر شعر خواں ہے اور میں ہوں
بہوں کا آستان ہے اور میں ہوں
محبت کا مراں ہے اور میں ہوں
خیال دستان ہے اور میں ہوں
ستم پرور گمان ہے اور میں ہوں

کسی کا آستان ہے اور میں ہوں
زمین کی گردشوں پر ہے تسلط
خوشا ساعاں رنگین محبت
یقین غفلت کعبہ کے باوصف
وہ وز دیدہ نظر اور پریش حال
طلسم ہے خودی ہے کار فرما
قدم کی چاپ اور ان کے قدم کی

روزنامه خبر ۱۳۹۹



تیت مر

کہ یہ بچہ نہ ہو چنے کی اطلاع اگر اسی موقع پر نہ آتی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک باغ میں اس کے ٹکٹ کی ضرورت نہ ہوتی ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پہلے پرچوں کا حصول پہنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے پاس
 یعنی اس کے ٹکٹ وصول ہوئے۔
 نیچر نگار۔

تصانیف نیاز چھپوری

نگارستان	جمالستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کے بہترین ولی مقالات اور انسانی مکتوبات۔ نگارستان نگار میں جو درجہ قبول میں کیا اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے مقصد سے سید زبانوں میں منتقل کئے۔	ادب نگار کے مقالات اور مجموعہ میں اس سے مکتوبات میں جو درجہ قبول تخلی و پاکیزگی خیال کے بہترین کے علاوہ بہت سے چھاپی و دستی مسائل کا حل بھی آپ کو میں نظر آئے گا۔ اپنی جگہ مجرور ادب کی تثبیت ہے۔ قیمت چار روپیہ (دو روپے) ملاوہ محصول	ادب نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور خلاصت بیان رنگینی اور پیلوین کے مکتوبات میں انشا میں بہت سے چیز ہیں جن کے ساتھ غلطی غالب ہی ہے کہ سارا ہر تہی مکتوبات حضرت نیاز کے مکتوبات کے شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (دو روپے) ملاوہ محصول	حضرت نیاز کا وہ مکتوب انسان جو اردو زبان میں پاکیزہ پہلی مرتبہ سیرت نگاری مکتوبات پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی شخصیت اس کی نزاکت بیان اس کی پسندی مضمون اور اس کے انشاء عالیہ جو محال کے ہے۔ قیمت ایک روپیہ (دو روپے) ملاوہ محصول

اردو شاعری	ہندی شاعری
اردو شاعری میں اردو شاعری کی تاریخ اور اردو شاعری کے شاعرانہ نظموں کا اس کی سیرت میں آپ کو کسی اور اردو شاعری میں اردو شاعری کے قیمت چار روپیہ (دو روپے) ملاوہ محصول	ہندی شاعری میں اردو شاعری کی تاریخ اور ہندی شاعری کے شاعرانہ نظموں کا اس کی سیرت میں آپ کو کسی اور ہندی شاعری میں ہندی شاعری کے قیمت چار روپیہ (دو روپے) ملاوہ محصول

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمار ۶

دسمبر

جلد ۳۸

ملاحظات

رفقہ جنگ

ایک جنگ پر کیا موقوف ہے، دنیا کی ہر چیز اپنی دلچسپی کھو بیٹھتی ہے اگر اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو جس زمانہ میں روس و فلینڈ کی لڑائی ہو رہی تھی اس وقت بھی یہی بے لطفی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ جہینوں تک یہی خبریں آتی رہیں کہ روس کی فوجیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں اور فن لینڈ والے انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتے، ان خبروں سے طبیعت احمقہ اُچاٹ ہو گئی تھی کہ جب آخر میں دفعتاً فن لینڈ کے ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی تو بھی وہی اُداسی باقی رہی۔ اس کے بعد جب جرمنی نے دفعتاً ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کیا تو پھر دلچسپی شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ فرانس پر حملہ ہوا اور اس لطفت کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کچھ زمانہ تک دنیا سوئی سوئی نظر آتی رہی تھی کہ انگلستان پر جرمنی کے ہوائی حملوں نے پھر چہل پہل پیدا کر دی، یہ زمانہ جولائی سے شروع ہوا اور دھارا گت تک یہ دلچسپیاں برابر بڑھتی ہی رہیں کیونکہ ہٹلر نے یہی تاریخ داخلہ لندن کی مقرر کی تھی، لیکن جب یہ تاریخ بھی گزر گئی اور اُدھر سے انگلستان نے بھی جرمنی پر ہوائی حملے شروع کئے تو ان خبروں میں رفتہ رفتہ پھر پھیلا پن پیدا ہو گیا

دہی روز کی دونوں طرف سے بمباری، دہی ہر ایک کا دوسرے کو ”بے پناہ“ نقصان پہنچا دینے کا دعویٰ اور پھر کوئی نتیجہ نہ نکلنا، طبیعت پر سخت مار ہو گیا۔

ہر چند یہ بمباری کا سلسلہ جاڑوں میں بھی جاری ہے (حالانکہ اس کی توقع نہ تھی) لیکن اس سے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اگر ان تمام خبروں پر یقین لے آیا جائے جو دونوں طرف سے سنائی جاتی ہیں تو اس وقت تک لندن اور برلن دونوں کو خاک سیاہ ہو کر زمین کے برابر ہو جانا چاہئے تھا، لیکن ابھی تک یہ دونوں شہر اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور شاید جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ واقعی نقصان ان بمباریوں سے کتنا ہوا اور کس ملک نے کس حد تک اس کو چھپانے میں کامیابی حاصل کی۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ جو قوت نازی فوجوں نے فرانس فتح کیا تو یہ ہٹلر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسی کے بعد اس کا زوال بھی شروع ہو گیا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت تک وہ اپنے ہوائی حملوں سے انگلستان کے ضبط و تحمل کو متزلزل نہیں کر سکا۔

ہٹلر کی تاریخ اقتدار میں غالباً یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ اہل جرمن کو یہ سمجھنے کا موقع ملا کہ ہٹلر اپنے عزم و ارادہ میں کبھی ناکام بھی رہ سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہٹلر نے اپنی اس ناکامی کو نہایت تکلیف کے ساتھ برداشت کیا ہوگا۔ فرانس کی شکست کے بعد ہٹلر کو بالکل یقین تھا کہ وہ بہت جلد برطانیہ کو مجبور کر کے اپنی فاتحانہ شرطیں اس سے تسلیم کرا لیا، تاہم احتیاطاً اس نے اٹلی کو اپنا شریک کر لیا تھا تاکہ بحر روم اور افریقہ کی طرف بھی برطانیہ کو اپنی بحری قوت صرف کرنا پڑے اور انگلستان کی حفاظتی تدابیر کمزور ہو جائیں۔ مگر نازی حکومت کو اس میں ناکامی حاصل ہوئی، یعنی نہ وہ خود ہوائی حملوں سے اب تک برطانیہ کو زیر کر سکا اور نہ اٹلی بحر روم سے برطانوی اقتدار کو چھین سکا۔ پھر یہ ناکامی ایسی نہ تھی جو ہٹلر کو بے چین نہ کر دیتی، چنانچہ اس نے اب ایک تدبیر سوچی اور اٹلی کو یونان پر حملہ کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یونان، اٹلی کے مقابلہ میں زیادہ نہ ٹھہر سکے گا اور اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طنح خوری طاقتوں کا کھویا ہوا اقتدار پھر قائم ہو جائے گا اور دوسری طرف وہ بحر روم کے شمال مشرق میں نئے ہوائی و بحری مرکز قائم کر کے بحر روم میں برطانوی طاقت کو کمزور کر دے گا، لیکن ہٹلر اس میں بھی کامیاب ہونا نظر نہ آتا۔ اس میں شک نہیں کہ یونان کی کامیابیاں اٹلی کے مقابلہ میں حیرتناک ہیں۔ تین ہفتے اس طرف کی بات ہو کہ مسوئینی نے اپنی طیاریاں مکمل کر لینے کے بعد، یونان کی حکومت کو صرف چند گھنٹے کا اٹلی میٹم دیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کی باگ اٹھنے کے ہاتھ میں دیوے لیکن یونان اس پر راضی نہ ہوا۔ اطالوی فوجوں نے البانیہ کی طرف سے یونان پر حملہ کیا اور کورنٹھ کو فوجی مرکز قرار دیکر تین طرف سے فوجیں آگے بڑھائیں، لیکن کسی ایک طرف بھی اٹلی کو کامیابی نہ ہوئی اور کورنٹھ کو خالی کر کے یونان نے اپنی دفاعی پوزیشن کو جارحانہ پوزیشن میں تبدیل کر لیا۔ یقیناً ہم

یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتے کہ لڑائی کا رخ آئندہ بھی یہی رہے گا اور یونان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ کسی فیصلہ کن جنگ کا پیش خیمہ ہیں، لیکن جن اسباب کی بنا پر نتیجہ ظاہر ہوا ہے ان پر غور کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یونان ایک کوستانی علاقہ ہے اور خاص کر البانیا کی طرف کا حصہ جدھر سے آٹلی نے حملہ کیا تھا سو اسے پہاڑوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آٹلی کے پاس ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی کمی نہ تھی، لیکن ان سے کوستانی علاقہ میں وہ کوئی کام نہ لے سکتا تھا، یونانی فوجیں ہر چند آراستگی و سامان کے لحاظ سے اطالوی فوجوں کے برابر نہ تھیں، لیکن وہ اس سرزمین میں مقابلہ کر رہی تھیں جو ان کی جانی بوجھی تھی اور اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

اسی کے ساتھ یونانیوں کو برطانوی ہوائی جہازوں سے بھی کافی مدد ملی جنھوں نے اطالیہ کے ہوائی دھجری مرکزوں پر بمباری کر کے یونانیوں کے حوصلے بڑھادئے اور اطالیہ کو دوسری طرف اپنی بچاؤ کے فکریں متلا کر دیا۔ یونان کی آبادی ۶۰ لاکھ کے قریب ہے اور آٹلی کی تقریباً ساڑھے چار کروڑ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ کیا، علاوہ اس کے آٹلی کی فوجیں جدید آلات حرب سے پوری طرح آراستہ ہیں اور ہوائی جہاز اور ٹینکوں کا کافی تعداد اس کے پاس موجود ہے۔ برخلاف اس کے یونان کی کل فوجی طاقت دو لاکھ سے زیادہ نہیں اور ٹینک وغیرہ بھی اس کے پاس بہت کم ہیں، لیکن اس کی کو برطانیہ کی مدد نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے جو وسطی مشرق کی طرف سے بھی برابر کمک بھیج رہا ہے اور بعض یونانی جزیروں کو ہوائی دھجری مرکز بنا کر مغرب کی طرف سے بھی آٹلی کی ہوائی دھجری قوت کو کمزور کرتا جا رہا ہے۔ تاہم یہ جنگ کا صرف ایک رخ ہے اور ہمیں دوسرے رخ کو بھی نظر انداز نہ چاہئے یعنی اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہٹلر، آٹلی کی اس شکست پر صبر کر کے بیٹھ جائے گا، کیا وہ یونان کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہے گا اور کیا وہ آٹلی کی مدد نہ کرے گا۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے ابھی تک اپنے ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ اپنے اقدام کے لئے زمین تیار کر رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس وقت آٹلی کی فوجوں کو ہٹا کر خود میدان میں آجائے۔

پچھلے جینے ہٹلر نے جتنی سیاسی چالیں چلی ہیں وہ ایک خطرناک مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ خطرہ کی گھنٹی کس وقت بج جائے۔ جاپان، آٹلی اور جرمنی کے اتحاد ملتہ میں رومانیہ، ہنگری، ہسلو، کیوبا، شریک ہو چکے ہیں، بلغاریا ابھی تک شریک نہیں ہوا اور اسپین بھی اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھے ہوئے ہے اور ہو سکتا ہے کہ بلغاریا اور اسپین کا پس و پیش یونان کی کامیابی کا نتیجہ ہو، لیکن ہم کو اس پر زیادہ اعتماد نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اگر ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر اپنی فوجوں کو ان کے ملک کے اندر سے لیجانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر سوال خوشی یا ناخوشی کا باقی نہیں رہے گا بلکہ سینہ سپر ہو کر سامنے آجانے کا ہوگا اور اس کی ہمت

تہانہ بلغاریا میں ہے۔ اسپین میں۔ اس لئے اس وقت تک اگر ہٹلر نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ روس اور ترکی کی طرف سے اُسے پورا اطمینان حاصل نہیں ہوا ہے اور جب تک ان دونوں کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے وہ آگے بڑھنے سے مجبور ہے۔

ترکی کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اظہار کر چکا ہے اور وہ اپنی غیر جانبداری پر قائم رہنے کے لئے ہر قربانی کے لئے آمادہ ہے، دان پاپن جرمن سفیر متعینہ ترکی برلن سے کچھ تازہ ہدایتیں لیکر انقرہ پہنچا ہے اور یقیناً وہ کچھ نئی لاپجے یا کوئی نئی دھکی لیکر آیا ہوگا، لیکن اس وقت تک ترکی اس اسکیم میں شامل نہیں ہے جو یورپ میں جدید نظام قائم کرنے کے لئے ہٹلر نے سوچی ہے بلکہ برخلاف اس کے ترکی حکومت نے اپنی سلطنت کے اس یورپی حصہ کو جو بلغاریا و یونان سے قریب واقع ہے ایک زیر محاصرہ حصہ کی حیثیت دیدی ہے تاکہ اگر بلغاریا یا بلغاریا کی طرف سے جرمن افواج اس طرف آگے بڑھیں تو ان کو سرحد پر روک دیا جائے۔

روس کی پالیسی البتہ بالکل معینہ ہوئی ہے اور اسی پر لڑائی کے مستقبل کا انحصار ہے۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ نہ وہ خیر نہیں ہو سکتا ہے اور نہ بلقان میں لڑائی کی آگ کو پھینٹے ہوئے دیکھنا پسند کر سکتا ہے فن لینڈ میں اس کو جو سبق ملا ہے وہ کم از کم ایک سال تک تو اسے کسی طرح لڑائی پر آمادہ کر ہی نہیں سکتا اور اس کے بعد بھی وہ دیکھے گا کہ اسے جرمنی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہئے یا اس کی قوت سے، کیونکہ اسٹالین کی موجودہ پالیسی چاہے کچھ ہو، لیکن سوویت حکومت کبھی اس بات کو نہیں بھلا سکتی کہ یورپ میں جدید نظام حکومت قائم کرنے والے وہی ہیں جن کے اتحاد کی بنیاد روس کی دشمنی پر قائم ہوئی تھی اور اگر آج کسی غرض کی بنیاد پر جاپان، آٹلی اور جرمنی اس کی دوستی کا دم بھر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ کل غرض پوری ہونے کے بعد وہ پھر اپنے تیور نہ بدل دیں چنانچہ تازہ ترین خبروں سے روس کے اس اندیشہ کی تصدیق ہوتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بحر اسود کے آس پاس وہ کسی طرح جرمن اقتدار کو بڑھتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اس لئے ابھی تک بلغاریا محوری طاقتوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔

چونکہ ہٹلر نے خود اپنے قول و فعل سے یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ کسی حکومت کو کبھی سچ بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ اُس سے کبھی یہ توقع رکھنا چاہئے اس لئے نہ خود اسے بلقان کی ان ریاستوں پر بھر دہ ہے جو اس کے ساتھ شامل ہو رہی ہیں اور نہ ان ریاستوں کو یقین ہے کہ جو ہٹلر کہتا ہے اسے پورا کر دیا بھی یا نہیں، بالکل یہی حال روس اور ترکی کا بھی ہے کہ وہ ہٹلر کے کسی معاہدہ کا اعتبار نہیں کر سکتے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنا کام نکال لے، اور جتنی دیر ہوتی جاتی ہے اس کی کامیابی کے امکانات ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔

ایک طرف اس کی یہ توقع ختم ہو گئی ہے کہ انگلستان کے ذرائع ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے مقصد میں یاب ہو جائے گا، دوسری طرف اٹلی پر جو بھروسہ اس نے کیا تھا وہ بھی غلط ثابت ہوا، ساتھ ہی ساتھ رد و رولٹ کے تیسری بار صدر امریکہ منتخب ہو جانے کی وجہ سے بھی اس کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اسلئے یہ تو ضرور چاہتا ہے کہ مشرق بعید میں جاپان کے ذریعہ سے بے چینی پیدا کر کے برطانوی حکومت کو بھرا ہوا سفک طرف بھی ابھادے اور وسطی مشرق میں بلقان کی ریاستوں کو ملا کر موصل و عراق کی طرف سے بھی انگریزوں کو کمزور کر دے، لیکن بحر روم، سوئٹزرلینڈ اور جبرالٹر پر انگریزوں کا اقتدار بحر ہند میں سنگاپور کا زبردستی بحری مرکز یا سفک میں جزائر امریکہ کا وجود، اسپین، روس اور ترکی کا اپنے غیر جانبدار رہنے پر اصرار اور خود اس کے توجہ ملکوں کی آبادی میں اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے بے چینی پیدا ہونے کا اندیشہ یہ تمام باتیں ایسی ہیں اس کی اسلیم کو پورا ہونے نہیں دیتیں۔

یہاں تو وہ حالات تھے جن سے جرمنی کی مشکلات کا پتہ چلتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ برطانیہ کی راہ میں کیا دشواریاں حایل ہیں۔

سب سے بڑی بات جو برطانیہ کے لئے زیادہ پریشان کن ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے، پچھلی لڑائی میں فرانس، اٹلی، روس، آئرلینڈ سب اس کے ساتھ تھے اور امریکہ بھی کھلم کھلا اخیر میں شریک گیا تھا، لیکن اس مرتبہ فرانس ختم ہو چکا، آئرلینڈ، ترکی اور روس غیر جانبدار ہیں اور اٹلی مخالفت۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ دسواں آئرلینڈ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے دسواں اٹلی سے اور اس طرح بحر اطلانتک اور بحر روم دونوں اس کے لئے مخدوش ہو گئے ہیں، اسی کے ساتھ ناروے، بلجیم، ہالینڈ اور ڈنمارک کی پیداوار سے بھی محروم ہو گیا ہے، دریا ایک جرمنی کو نہ صرف وسطی یورپ کے تمام ممالک بلکہ روس اور ناروے سے بھی ہر قسم کا پیہونچ رہا ہے۔ رہ گیا امریکہ سو وہ بھی فوجی مدد نہیں دے رہا۔ ادھر مشرق میں بھی جاپان مخالفت پر تلا ہوا ہے اور برما کو بری ننگا ہوں سے دیکھ رہا ہے، الغرض جس حد تک دوسرے ملکوں کی اعانت و ہمدردی کا نفع ہے، برطانیہ اس سے بالکل محروم ہے اور سچ پوچھئے تو اس وقت مشرق سے بلکہ مغرب تک سارا حصہ اس کے لئے محاذ جنگ بنا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خود برطانیہ کی سلطنت بہت وسیع ہے اور اس کے مقبوضہ ممالک اس کو ہر طرح کی دیہونچا رہے ہیں، لیکن چودہ کروڑ روپیہ روز کا خرچ کوئی معمولی بات نہیں اور اسی لئے لارڈ لوٹھین کو آخر کار سلیم کرنا پڑا کہ برطانیہ کی مالی حالت کمزور اور محفوظ سونے کی مقدار بہت کم ہو گئی ہے۔ اگر اسی کے ساتھ ان خصانات کو بھی شامل کیجئے جو جرمنی کی بمباری سے انگلستان کی صنعت و تجارت کو پیہونچ رہے ہیں، تو ہم

برطانیہ کی پریشانیوں کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے سب سے بڑی چیز جس نے برطانیہ کے پلہ کو بھاری کر دیا ہے، اس کا عزم و استقلال ہے۔ برطانوی قوم کی یہ خصوصیت کہ وہ مصیبت کا مقابلہ نہایت اطمینان سے کرتی ہے اور آخر وقت تک ہمت نہیں چھوڑتی ایک ایسی زبردست سپر پور جس کے مقابلہ میں دشمن کو ہتھیار ڈال دینا ہی پڑتا ہے۔

انگریز قوم اس میں شک نہیں، بڑی محتاط، نہایت دور اندیش اور حد درجہ متقل مزاج قوم ہے، نہ وہ کسی بات سے گھبراتی ہے اور نہ کبھی غیر دانشمندانہ اضطراب اس میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ لڑائی کو بھی بالکل فلسفیانہ حیثیت سے دیکھتی ہے اور ایک فلسفہ ہی کی طرح اس کا حل بھی چاہتی ہے۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ موجودہ مشکلات کو آسانی سے دور نہ کر سکے، لیکن ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں وہ جرأت و پامردی سے کام نہ لے، ممکن نہیں۔ ایک سال تین چھینے لڑائی کو شروع ہوئے ہو چکے ہیں اور سرچند اس دوران میں یورپ کا نقشہ بالکل بدل چکا ہے، لیکن برطانوی حکومت کے حدود بدستور اپنی جگہ قائم ہیں۔ سب سے زیادہ زور جرمنی نے انگلستان پر صرف کیا، لیکن وہ لندن ایسی گنجان بھری آبادی میں بھی پریشانی کے آثار پیدا نہ کر سکا، جہاں اس نے لاکھوں کم گرائے۔

یقیناً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حفاظت کے انتظامات یہاں بہت مکمل ہیں اور دشمن اپنے حلوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھانے پاتا، لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا سبب اس قوم کی قوت تحمل ہے جو باوجود ہر وقت خطرہ کی زندگی بسر کرنے کے، اضطراب و پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتی اور مردانہ راران مصائب کا مقابلہ کر رہی ہے۔ برخلاف اس کے برطانوی بمباری نے جرمنی کے شہروں میں بے چینی پیدا کر دی ہے اور روہر کا علاقہ تقریباً خالی ہو چکا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس وقت جرمنی و برطانیہ دونوں مشکلات میں مبتلا ہیں، لیکن ایک ان کا مقابلہ یروپاؤنڈ اور سیاسی کمزور فرب سے کر رہا ہے اور دوسرا صرف اپنی ہمت و استقلال سے، لیکن چونکہ فطرت کے قانون میں کوئی کلیہ ہمیں ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ کامیابی ہمیشہ صداقت ہی کو ہوتی ہے یا یہ کہ کذب و باطل کو کبھی شکست نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس جنگ میں برطانیہ کو شکست ہوئی تو دنیا میں پھر اسی فتنہ کا دور شروع ہوگا جو اب سے صدیوں قبل ایشیا کے شمال مغرب سے اٹھا تھا، اور ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہوگا سوائے اس کے کہ اس کا سرچشمہ تاتار تھا اور اس کا جرمنی!

آئندہ پرچہ جنوری ۱۹۷۵ء کا ہوگا

اور اسی میں فردری کا پرچہ بھی شامل ہوگا، کیونکہ اسکی ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات کی ہے۔ اس لئے جن حضرات کا چندہ دسمبر اور جنوری میں ختم ہوتا ہے ان دونوں کا اپنا سالانہ چندہ اخیر دسمبر یا ۲ جنوری تک بھیج دینا چاہئے ورنہ ۳ جنوری سے دی پتی کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ اگر کوئی صاحب دسمبر کے بعد خریدار نہ رہنا چاہیں تو براہ کرم فوراً مطلع کر دیں تاکہ ان کے نام دی پتی نہ بھیجا جائے، ورنہ دی پتی کی دلیسی سے دفتر کو نقصان پہونچے گا۔

جنوری سالانہ کا پرچہ اپنے موضوع کے لحاظ سے جتنا اہم اور بقدر دلچسپ ہوگا، اس کے متعلق اظہار کی ضرورت نہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے کہ موجودہ عہد کے تمام اکابر شعراء کا حال اور انتخاب کلام خود انھیں کا لکھا ہوا تذکرہ نویسوں اور انتقاد نگاروں کے لئے کتنی بڑی چیز ہے۔

اسی کے ساتھ رنگ تغزل پر ایک بسیط مقالہ اڈیٹر نگار کا ہر شاعر کے کلام کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ در ”مئے دو آتشہ“ کے عنوان سے حضرت نیاز کا انتخاب لا انتخاب دوسری خصوصیات اہم ہوں گی۔

ایجنٹ حضرات، ابھی سے اطلاع دیدیں کہ ان کو کتنے پرچے درکار ہوں گے، کیونکہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے یہ نمبر زیادہ تعداد میں شائع نہیں کیا جا رہا ہے اور پھر مشکل ہی سے ہم فراہم کر سکیں گے۔ یہ چھوٹی چیز نہیں ہے کہ اس کی مانگ ختم ہو جائے۔ بلکہ جتنا زیادہ وقت گزرتا جائے گا اتنی ہی زیادہ اس کی مانگ ہوگی۔ قیمت فی پرچہ دو روپیہ۔ کمیشن ۲۵ فی صدی۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

سطحیات سید سلیمان ندوی

نقوش سلیمانی مولانا سید سلیمان ندوی کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو اردو زبان و ادب سے متعلق ان کی زبان قلم سے نکلیں، زیر نظر مجموعے میں ۹ خطبات، ۱۳ مقالات اور ۱۱ مقدمات ہیں جو سب کے سب محارت، ہندوستانی اور دوسری جگہ شائع ہو چکے ہیں۔

خطبوں میں شان خطابت ہونی چاہئے جو موجود ہے، مقالات میں ”اکبر کا طریقہ کلام“ اچھا ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں، ”زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ ایک خط کا جواب ہے وہ مضامین کے مجموعہ کے بجائے مکاتیب میں رہتا تو زیادہ اچھا تھا۔ اردو اشعار کا پڑیا اور ہوم رول سے پہلے ”سطحی“ سے ہیں، لیکن سب سے زیادہ ناامیدی مقدمات کو دیکھ کر ہوتی ہے، گلستانِ امجد، گلستانِ خیابان، وغیرہ پر مقدمے نہایت سرسری طور پر لکھے گئے ہیں، اولاً تو ان کتابوں پر سید صاحب کو لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، اس مجموعہ میں وہ رسوائے عالم مقدمہ ”شعلہ طور“ بھی ہے جو کتاب میں شائع ہو کر پھر نکال دیا گیا

نقوش سلیمانی، مجموعی لحاظ سے بہت ہی ناکامیاب اور مایوس کن مجموعہ ہے اور چونکہ سید صاحب کی اس کتاب سے بہتوں کے گمراہ ہو جانے کا ڈر ہے، اس لئے ہم اس کی بعض غلطیوں پر لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

سید صاحب نے ذیل کے تین شعر شیخ شرف الدین احمد بہاری کے بتائے ہیں:

لودہ پھٹکری مردہ سنگ	ہدی زیر ایک ایک شک
ایون چنا بھر مرچیں چار	ارد بھر موٹھا اس میں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے	نینا پیرا ہل میں ہرے

اولاً تو اس کا کوئی معتبر ثبوت نہیں کہ یہ دو بے مخدوم کے لکھے ہوئے ہیں، دوسری بات یہ کہ یہ تینوں شعر آزاد کی آپہ حیات میں سرور دیں اور وہ انھیں امیر خسرو کا بتاتے ہیں، سید صاحب نے اشعار نقل بھی صحیح نہیں کئے ہیں ظاہر ہے کہ ”سنگ“ کا قافیہ ”شنگ“ ہو گا نہ کہ ”شنگ“ جو تھے مصرع میں ”پھر“ نہیں ”بھر“ ہے، اسی طرح ”موٹھا“ بھی صحیح نہیں یہ اصل میں ”موٹھا“ ہے چھٹا مصرع آب حیات میں یوں ہے: ”توت پیرینوں کی ہرے“

اور ہمارے خیال میں یہی صحیح ہے جیسا کہ ہماری ایک قدیم بیاض سے معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار کو صاحب "سیرت الشرف" نے بھی مخدوم کی طرف منسوب کیا ہے اور اپنے تفحص لمینغ کی داد چاہی ہے، لیکن ثبوت کوئی پیش نہیں کیا۔

سیرت الشرف میں ان اشعار کی صورت کچھ بدلی ہوئی ہے دوسرا اور تیسرا شعر اس طرح ہے :

انہم چنے بھر مرصیں چار کمر اؤ برابر تھو تھا ڈار

پوست کے پانی سے پوٹری کرے مین کا بیدا ترستے ہرے

صاحب کتاب نے مخدوم صاحب کے کچھ اشعار اور بھی درج کئے ہیں :

پات کسوخی کچھ ہرے اور پھول رتو زہی جائے جڑ کسوخی باگہ روئیں ہیچ سے ہیچ نساے

تل، تیرسی، دانا تیکھر، تال، کھانا

گھی شکر میں سانا کھائے زمانہ ہو مردانہ

ہڑ بھیڑا آؤ نلا او چتیا تنگ سوٹھ لادے پتیا

لکھائی سانس بجر جائے آن نہ جانوں کتنا کھائے

فاضل مولف نے ذیل کا شعر بھی مخدوم کی طرف منسوب کر دیا ہے جو شیخ مظفر لمینی کا بتایا جاتا ہے :

جی گن میں ہے کہ آئی ہے سہانی رتیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

ہمارا خیال ہے کہ یہ شعر ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کا نہیں، آخر الذکر شاعر تھے اور برہان تخلص کرتے تھے انکا

کلام نہیں ملتا ہے، دیوان فارسی کا ایک نادر مخطوط مولانا ظفر الدین صاحب قادری استاذ ہیئت و حدیث جامعہ

شمس اہدی پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ہماری نظر سے گزر چکا ہے، ان کے کلام کا انداز اس شعر سے بہت حد تک

مختلف ہے اور پھر یہ زبان بھی ان کے عہد کی نہیں۔

حیرت ہے کہ سید صاحب انشاء اللہ خداں انشا کو لکھنوی سمجھتے ہیں، سید انشا کے متعلق تذکروں میں مذکور ہے

کہ ان کے بزرگ نجف اشرف یا کشمیر سے آئے تھے وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آنا ہوا تھا، دہلی میں آکر سکونت

اختیار کر لی تھی، ہمارے خیال میں یہ بھی صحیح نہیں انشاء دہلی کے تھے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کب تک دہلی میں رہے

شجاع الدولہ کے زمانہ (۱۱۸۵ھ تا ۱۱۸۷ھ) میں مرشد آباد سے فیض آباد گئے تھے اور ان کی وفات کے بعد

وہ وہاں سے رخصت ہو گئے ان کے کلیات سے ان پر مختلف السنہ ہند سے واقف ہونے کا پتہ چلتا ہے اور تعجب نہیں کہ کسی ایک

جگہ جم کر رہنے کے بجائے یہ مختلف اقطاع ہند کی سیر کرتے رہے ہوں۔

سید انشا کی دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۱۸۵ھ نہیں ہے سنہ تکمیل کا ہے کتاب کی ابتدا شاہ عالم کی زندگی

ہی میں ہو چکی تھی جن کا سال وفات ۱۱۸۵ھ ہے اسلئے ظاہر ہو کہ اس سے پہلے ہی دریائے لطافت کا دھارا بہ نکلا تھا،

”دریائے لطافت“ لکھنؤ ہی میں لکھی گئی یہ محل نظر ہے، دیوان مصحفی کا لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہونا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا مصحفی کا تقریباً سارا کلام اب تک غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے، صرف دیوان اردو کی چار جلدیں کچھ عرصہ ہوا نام پورے شائع ہوئی تھیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ نہ شائع ہونا ہی بہتر تھا، وہ دو ادین مصحفی کے تو نہیں ہاں امیر مینائی مرحوم کے کہے جاسکتے ہیں، کیونکہ انھیں کے ذوق کا انتخاب ان میں پایا جاتا ہے۔

سید صاحب دلی کا سال وفات ۱۱۵۵ھ لکھا ہے، یہ آج سے ۵۵ برس پہلے کی تحقیق معلوم ہوتی ہے دلی کے متعلق جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے سید صاحب کو غافل نہیں رہنا چاہئے تھا، صحیح ۱۱۵۵ھ ہے، بعض حضرات ۱۱۵۵ھ کو صحیح سمجھتے ہیں انھیں اس شعر سے دھوکا ہوا ہے:

دل دلی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں،

لیکن اصل یہ ہے کہ دلی کا سال وفات ہے اور نہ یہ شعر دلی کا ہے، دیوان دلی کے جو نسخے اب تک ملے ہیں ان میں سے کسی میں یہ شعر نہیں، یہ شعر دراصل مضمون کا ہے صاحب تذکرہ ”گلشن گشتار“ اور چہستان شعر نے اس شعر کو خفیت تصرف کے ساتھ مضمون کے نام سے منسوب کیا ہے:

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین، جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس کی ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے، مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے: ”دیوان دلی در شاہجہاں آباد“ لوگوں نے غور نہیں کیا اور سمجھ لیا کہ وہ خود دلی آئے تھے حالانکہ اس میں صرف دلی کے دیوان کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ اب رہی ۱۱۵۵ھ کی سند اس کے لئے یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل والی ملک سخن صاحب عرفاں دلی

سال وفاتش خرد از سراپا ہم گفت باد پناہ دلی ساغر کوثر علی

کچھ دن ہوئے لاہور کے ایک پروفیسر صاحب نے اورنٹیل کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ دلی کا سال وفات ۱۱۵۵ھ نہیں۔ ۱۱۵۵ھ ہے اور اس قطعہ سے بھی استخراج ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ قطعہ صفت تمیہ میں لکھا گیا ہے جو تھے مصرعے سے ۱۱۵۵ھ نکلتے ہیں لیکن شاعر نے سراپا ہم ”اہ سے تمیہ ہے اب ۱۱۵۵ھ ہوگے سید صاحب دلی کو دکنی سمجھتے ہیں حالانکہ دلی گجراتی تھے، آزاد نے صاف لکھا ہے ”احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے (آب حیات صفحہ ۷۹) آزاد کے بیان اکثر غلط بھی ہوتے ہیں لیکن بعض مرتبہ بہت اہم بات کہہ جاتے ہیں۔

میر حسن نے بھی یہی لکھا ہے، خواجہ حمید خاں اور نگ آبادی ”گلشن گشتار“ اور قایم ”مخزن نکات“ میں اسے

گجراتی بتاتے ہیں، کتاب خاند مولانا ظفر الدین قادری میں دیوان دلی کا ایک قدیم قلمی نسخہ نظر سے گزارا تو یہ لکھا ہوا تھا ”دیوان دلی محمد گجراتی“ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ وہ گجراتی تھے دوسری بات یہ کہ ان کا صحیح نام

سید صاحب ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تذکرہ مخزن الغرائب کو احمد علی سندیلوی نے ۱۲۱۲ھ میں مرتب کیا، اس لحاظ سے یہ کوئی قدیم کتاب نہیں ہوئی وہ اگر اپنے مطالعہ میں تھوڑی سی وسعت اور دیتے تو ۱۲۱۲ھ سے پہلے کی کتابوں اور تذکروں میں یہ لفظ موجود پاتے۔ شیخ غلام بھدانی مصحفی متوفی ۱۲۱۲ھ اپنے تذکرہ ہندی میں حضور کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

”نقل است کہ روزے در شاہ جہاں آباد بہ خاد لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود، خول طری میر صاحب کردیش بعد قافیہ حرن“ اور ”بمعنی طوطی تقرر داشت و ازیں جہت بعضہ از خصما اور اخلاف اُردو شمر وہ پیردیش ذکر دند“ (تذکرہ ہندی صفحہ ۸۳)

پھر شمار کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

چوں اصلش سمار است لہذا بر بنائے ریختہ ہم بہ خوبی نہادہ اداے زبان اُردو چنانچہ باید از زبان ندرت بیانش بشوید^{۱۵۹} مصحفی کے تذکرہ ہندی کی ابتدا ۱۲۱۲ھ سے بھی پہلے ۱۱۹۹ھ کے قریب ہو چکی تھی۔ مصحفی کے یہاں یہ لفظ اور بھی کئی جگہ ملتا ہے، ہجور کے حال میں ہے:

”سہ کتاب در زبان اُردو ریختہ شکر آیمختہ از خاتم فکرش رونق سواد پریرفتہ“

قبر کے تذکرہ میں قتیل کے متعلق درج ہے:

”اوہم باد صفت فارسی گوئی دعوی اُردو دانی ریختہ داشت“

اگر ہمارا غلط دھوکا نہیں دیتا تو ہم نے یہ لفظ مصحفی کے ابتدائی دواوین میں بھی کہیں دیکھا ہے لیکن اُنکے دواوین اتنے فصیح ہیں کہ اس وقت اس لفظ کو ڈھونڈ کر نکالنا مشکل ہے، اگر یہ لفظ دیوان اول میں ہے تو اس کا سال ترتیب ہمارے خیال کے مطابق ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ ہے۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کی سب سے پہلی دشمنی فالن صاحب نے لکھی، حالانکہ اس سے پہلے بیسوں لغت لکھے جا چکے تھے۔

فرنس نے بہت پہلے اُردو کا ایک لغت لکھا جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں چھپا۔

جنرل ولیم کرک بیاٹرک نے بھی ایک لغت لکھا اسکے تین حصے کے گروہ صرف ایک حصہ لندن سے ۱۷۸۵ء میں شایع ہو چکا۔

یجرڈیوڈ ماس رچرڈسن نے بھی اُردو کا ایک لغت لکھا تھا، مگر یہ شایع نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر ٹیلر نے بھی ایک لغت ۱۸۰۸ء میں طبع کرایا تھا اس کتاب کو پھر ڈاکٹر ہنری نے فورٹ ولیم کالج کے نظر ثانی کے بعد

پھر چھپوایا۔

گلڈون نے بھی دو جلدوں میں ایک لغت لکھا۔

جان شکسپیر نے بھی ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرایا۔
فوربس نے بھی ایک لغت لکھا جو لندن سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔
برٹرنیڈ نامی ایک فرانسیسی نے بھی ایک لغت لکھا جو پیرس میں ۱۸۵۷ء میں طبع ہوا۔
بلیٹ نے بھی ایک لغت لکھا، اور طبع بھی ہوا۔

مولوی اسماعیل دہلوی کا سال وفات ۱۲۴۷ھ نہیں ۱۲۴۸ھ ہے اسی طرح شیخ فرید شکر گنج کا سال وصال ۱۲۵۷ھ صحیح نہیں (نقوش صفحہ ۴۰) خلاصۃ التواریخ میں شنبہ ۱۲۵۷ھ، محرم الحرام ۱۲۵۷ھ، بعض دوسری کتابوں میں ۱۲۵۸ھ درج ہے سید صاحب کا یہ فرمانا کتنا مضحکہ خیز ہے کہ خواجہ کی ولایت مضافات ملتان میں ۱۲۵۷ھ میں ہوئی، یہ بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عالم شیر خوار لگی ہی میں خواجہ کو ولایت مل گئی تھی نصیر الدین حسین نے فارسی علی بابا تہذیبی سے پڑھی یہ محض گپ ہے۔ سید صاحب کو ایسی گپوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مولانا علم الدین حسین کی تصنیف کا نام ”سلم الاخلاق“ نہیں ”سلم الافلاک“ ہے یہ عربی زبان میں ہیئت کی ایک کتاب ہے اور ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ”نقوش سیامی“ کے یہاں وہاں سے ایک سرسری مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے کتاب ادھر ادھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور جو مقامات محل نظر نظر آئے ان کا ذکر کر دیا گیا، اب ہم چاہتے ہیں کہ کسی ایک مضمون کو لیکر اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے اور یہ مضمون ”یادگار عشق“ کا مقدمہ ہے۔ سید صاحب نے پہلے چند صفحات کی تہنید لکھی ہے اور تہنید اچھی ہے اس میں انھوں نے بہار کے قدیم علماء و فضلاء کا ذکر کیا ہے، پھر اصل بحث کی طرف آئے ہیں اور عشق اور کلیات عشق پر بڑی سنجیدگی سے بحث کی ہے، کہیں کہیں صاحب کتاب کی لغزشوں کی تصحیح بھی کر دی ہے لیکن پھر بھی بہت سی غلطیاں کتاب میں رہ گئی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید صاحب ان بیانیوں کو غلط سمجھتے ہوں۔

اب ہم مختصر طور پر ان اغلاط کا ذکر کرتے ہیں جو سید صاحب کے مقدمہ میں نظر آتی ہیں۔

صفحہ ۳۹ پر فرماتے ہیں:

”اس علمی مرکز کے قدیم سخن وروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو دینی تیر و سودا اور میرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے ہم پہلو تھے، ملا محمد علیم تحقیق، عبدالقادر بیدل، اشرف خاں فغاں، سید محمد شاکر تاجی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی بسمل، شیخ غلام یحییٰ حقصور، میر محمد تسلیم اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور یہاں گزرے ہیں جن کی محنتوں اور کادشوں سے اُردو زبان نے ترقی پائی ہے۔“

صفحہ ۴۰ پر ان ناموں میں اور اضافہ فرماتے ہیں:

..... خواجہ امین الدین امین، ملا محمد علیم تحقیق، شیخ محمد روشن جوشش، میرزا قمر حسین، ہدیت علی خاں حسرت، میر غلام حسین شورش، رحمت اللہ شفیق، شاہ رکن الدین عشق، غلام حسین محرم، آغا حسین قلی خاں عشق، نظریہ الملک کوکھٹا

(گلزار ابراہیم صفحہ ۲۱۲)

در عظیم آباد..... اقامت در زیرہ

(ج) تحقیق بھی انھیں دہلوی لکھتے ہیں:

”فخاں دہلوی..... پس از چندہ در اوائل عشرہ سابعہ بدایتہ دالغ رخت جانب عظیم آباد کشید اعیان دارکان آن مقام قدم اور اگر اسی داشتند بالفعل در مزاج راجا مذکور شتاب رائے ناظم صوبہ عظیم آباد دخل تمام دارد“ (گل رعنہ صفحہ ۲۷)

(د) فخاں کے دہلوی ہونے کے ثبوت میں اور دلائل سے قطع نظر کر کے ہم صرف ایک عظیم آبادی تذکرہ نگار آغا حسین علی خاں عاشقی کے ”نشر عشق“ سے فخاں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جو سترہ اٹھارہ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، چونکہ یہ تذکرہ بہت کم یاب ہے اس لئے ہم فخاں کا پورا ترجمہ من عین نقل کر دیتے ہیں، اس سے فخاں کی وطنیت کے علاوہ ان کے حالات، پرہیزگاری، اچھی طرح روشنی پڑتی ہے، جو حضرات کتب خانے آئے اور قلمی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت اٹھائے بغیر تحقیقی مضامین لکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان کے لئے یہ اقتباس بہت مفید ہوگا،

”فخاں اشرف علی شاہ جہاں آبادی مشہور بلوچوں مادر آں مرحوم احمد شاہ بن فردوس آرام گاہ حضرت

محمد شاہ را شیردادہ بود ہذا بایں لقب شہرت داشت، در اوائل عبد احمد شاہ مرحوم از دہلی متوجہ دارا مشرق شد و اول

صوبہ اودھ رسیدہ بہ نواب شجاع الدولہ بہادر پیوست، چندہ در آں جا بسراخت و من بعد آں در سنہ یک ہزار و یک صد و

ہفتاد و شہر عظیم آباد رفتہ بہ راجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار توسل جست۔ و راجہ قدر دان بہ خوب ترین وجہ باو پیش

آمدہ بہ رفاقت خود کشید و متکفل معاش او گردید و بہ وساطت و سہ عطاب ظریف الملک از حضور شاہ عالم بادشاہ مغفور

کہ در آں ہنگام در بدہ الار آباد ہر دن بیرون یافت۔ و دوسہ دیہہ بہ طریق آں تمنا حصول ساختہ بہ فارغ البالی و خوشحالی

اوقات بسر می نمود سوائے آں دیگر اماراداران آں شہر سلوک و مراعات باومی کردند و عزت و خلعتش می نمودند چنانچہ

اولاد آں مرحوم تا تحریر مجموعہ ہذا در شہر عظیم آباد موجود اند و انہما معاش مذکورہ زندگانی می نمایند گویند فخاں مذکور کمال

تشگفتہ مزاج بود و از بس ظرافت و مزاح بہ خاطر داشت، فوجتہ مکان پختہ برائے سکونت خود بنانہاد و بعد تیاری آں احباب

را ضیافت کرد و در آں مجلس عندالافکار بر زبان آورد، کہ می خواہم کہ ام نشانے بہ مکان درست سازم تا انراں دریافت شود کہ

کہ مکان فلاسفے است خدمت گارے خاں مرحوم ایستادہ بود دوست بستہ عرض کرد کہ نشان مکان بہ خاطر ندوی خوب

رسیدہ است، چون خاں استفسار کرد گفت کہ بالائے دروازہ دو پستان بسازند تا مردمان دریافت کنند کہ ایں مکان

اشرف علی خاں کو کہ است خان و حاضرین بخندہ در آمدند دوسہ را انعام نمودند۔ اکثر تلاش نظم بہ زبان ریختہ می کرد و

گاہ گاہے فکر فارسی ہم می نمود۔“

مختصر یہ کہ فخاں دہلوی تھے آخر عمر میں عظیم آباد آئے اور یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہیں.....

ان کی قبر کا بھی پتہ چل گیا ہے جس پر یہ کتبہ درج ہے :

کو کہ خاں آل بہار باغ سخن سوئے خلد بریں ز دنیا رفت
کرد مفتوں چو فکر تاریخش گفت با لطف سرور دلہا رفت

سال وفات ۱۰۸۷ متخرج ہوتا ہے، یہی عشق نے لکھا ہے، اور یہی صحیح ہے، ذاتی کا لکھنا کہ سال وفات ۱۰۹۶ء ہے صحت سے دور ہے، راقم نے اس سلسلہ میں ان کے دیوان اردو کے بھی کئی قلمی نسخے دیکھے لیکن ان میں بھی ان کے عظیم آبادی ہونے کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

شاہ رکن الدین عشق پر سید صاحب نے کئی صفحے سیاہ کئے ہیں حالانکہ وہ عظیم آبادی کسی طرح نہ تھے، وہ بلاشبہ دہلوی تھے، ان کی شاعری کی ابتدا وہیں ہوئی، وہیں پروان چڑھی، بہار کی شاعری کا ان پر مطلق اثر نہیں ہے اور نہ وہ اس عمر میں یہاں آئے تھے کہ ان کی شاعری کسی رنگ سے متاثر ہو سکتی، میرزا علی لطف نے انھیں شاہ جہاں آبادی میر حسن نے ”اصلش از شاہ جہاں آباد“ اور نواب ابراہیم خلیل نے ”از عمدہ مشائخ شاہ جہاں آباد“ لکھا ہے۔

محمد علی خدوی کو بھی عظیم آبادی کہنا صحیح نہیں، تذکرہ میر حسن میں ہے ”اصلش از شاہ جہاں آباد“ صفحہ ۱۲۸۔

سرت افزا میں ہے ”وطن اصلی دے دہلی است“ (—)۔ علی لطف اور نواب ابراہیم خلیل بھی اسے دہلوی ہی لکھتے ہیں۔ خود عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش لکھتا ہے ”از صاحب طبعان شاہ جہاں آباد است“۔ عظیم آباد میں ان کا قیام مسلم لیکن اس سے وہ عظیم آبادی تو نہیں ہو گئے، یہاں وہ کچھ دن رہے تھے ضرور لیکن جیسا میر حسن نے لکھا ہے وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھے کبھی عظیم آباد رہے کبھی مرشد آباد اور کبھی فیض آباد۔

مزاج ایک جا قرار نہی کند گاہے در عظیم آباد گاہے مرشد آباد گاہے فیض آبادی ماندہ الحال شنیدہ ام کہ

در بنگالہ۔۔۔۔۔ برہمنی برد۔ صفحہ ۱۲۸۔

میراقر حزیں کا شمار بھی عظیم آبادی شعرا میں کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ میر حسن اور قائم نے ”از سادات اکبر آباد“ لکھا ہے، گردیزی بھی انھیں اکبر آبادی لکھتا ہے ایک زمانہ تک بنگالہ میں قیام بھی ثابت ہوتا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۸۰۔ نواب ابراہیم خلیل کے دوست ہیں اگر وہ عظیم آبادی ہوتے تو وہ گلزار ابراہیم میں ضرور لکھتے۔

حیرت ہے کہ سید صاحب، سید شاکر ناجی کو بہاری یا عظیم آبادی سمجھتے ہیں، میر حسن شفیق اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے صاف لکھا ہے ”متوطن شاہ جہاں آباد بود“۔ قائم کا بیان بھی بہت واضح ہے: ”زادگاہ او دارالخلافہ شاہ جہاں آباد است“ خلیل نے بھی یہی لکھا ہے۔

اسی طرح جبار علی بٹل اور راجہ پیارے لال الفتی کو بھی بہاری نہیں کہہ سکتے، بٹل کا قیام کچھ دنوں کے لئے عظیم آباد میں ضرور تھا لیکن اس سے وہ عظیم آبادی تو ہونے سے رہے، الفتی بھی دہلوی تھے، آخر میں عظیم آباد میں کونین تو

سید صاحب نے شتاب رائے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود بھی شاعر تھا اور شعر کا مربی و سرپرست تھا۔ ہمیں اپنی بے بصری پر افسوس ہے کہ کسی تذکرے یا تاریخ میں شتاب رائے کے شاعر یا ادب نواز ہونے کا ذکر نہ دیکھ سکے، وہ شعر کا مربی و سرپرست تھا اس کا بھی ہمیں علم نہیں ایک اشرف علی خاں فغان ان کے یہاں ملازم ضرور تھے اور وہ بھی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شاید مصاحب و نظریٹ کی حیثیت سے ورنہ شتاب رائے انھیں ظریف الملک و مصاحب اللہ کے خطاب نہ دیتے۔

شتاب رائے کے بعد سید صاحب نے راجہ بہادر راجہ کا نام لکھا ہے ہمیں یاد آتا ہے کہ سید صاحب اپنے پہلے کسی مضمون میں اسے شتاب رائے کا بیٹا قرار دیا ہے یہ غلط فہمی انھیں غالباً لالہ سری رام کے خاندان کا دید سے ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ شتاب رائے کے تین بیٹے تھے اور تینوں شاعر تھے ایک کا تخلص عاشق دوسرے کا مجبور تیسرے کا گریاں، راجہ کسی کا تخلص نہ تھا بعض ذمہ دار حضرات مہاراجہ کلیان سنگھ کا تخلص راجہ بتاتے ہیں اور سند میں مجموعہ نغمہ پیش کرتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ قاسم نے غلطی سے ایسا لکھا ہے، عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش عشقی عبرتی، ان میں سے کسی نے اس کا تخلص راجہ نہیں بلکہ عاشق لکھا ہے، ہم نے اس کی اجس تصانیف کا غور سے مطالعہ کیا لیکن اس سے بھی راجہ کے تخلص ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، یہ غلطی سب سے پہلے قاسم سے ہوئی لالہ سری رام نے

سلہ مہاراجہ کلیان سنگھ کی مندرجہ ذیل تصانیف کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے :

(۱) ثنوی اردو یہ ایک صان اور شستر ہے جو سحر البیان کے طرز پر لکھی گئی ہے، اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار ہے، لیکن اس کا جو نغمہ جمالی نغمہ سے گزرا ہے وہ بہت بوسیدہ و کرم خوردہ اور ناقص ہے اور اس میں چھ سو سے زائد اشعار نہ ہوں گے، عاشق نے ثنوی بالکل آخر زمانے میں لکھی جب کہ بصارت بھی جواب دے چکی تھی، پوری ثنوی انھوں نے دوسرے سے لکھوائی ہے اس کا یہ کمال ماننا پڑتا ہے۔ کلیان سنگھ نے زبان کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ: یہ شعرا نے دہلی کی گفتار ہے۔ کرسن اس کو طوطی شکر بار ہے، ثنوی اس نے ۷۰ برس کی عمر میں لکھی تھی اس کی تکمیل ۱۱۵۱ھ شعبان ۱۲۱۴ء بروز شنبہ کو چیت پور کلکتہ میں ہوئی۔

(۲) ثنوی زیبا، یہ فارسی ثنوی انھوں نے ۶۶ سال کی عمر میں اپنے لڑکے کنور حشمت علی کے لئے لکھی تھی، زیر نظر نوہ کلکتہ میں ۱۳۱۵ء لکھا گیا اردو ان تصانیف دو جلدوں میں ہے کتاب ۱۴ نومبر ۱۹۶۷ء کی ہے یہ تصانیف تمام کے تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ اور دواؤہ انام کی شان میں لکھے گئے ہیں، تصانیف کی زبان بہت اچھی ہے اللہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلیان سنگھ فارسی کا اچھا جاننے والا تھا، زیر نظر نغمہ بہت قدیم ہیں اور ہمارے علم میں یہ واحد نغمہ ہیں، بعض اوراق خراب ہو گئے ہیں کتاب داخل ایشیائی موزیم کی معلوم ہوتی ہے۔ (۳) خلاصۃ التواریخ، یہ کلیان سنگھ کی بہترین تصنیف ہے مغلوں کی آخری عہد کی اور بنگال کے گورنروں کی بہترین تاریخ ہے پوری کتاب ۱۳۲۲ء میں لکھوائی گئی ہے۔ اس کا دوسرا نام فاروق قاسمی ہے اس پر سید حسن سکری صاحب ام ہاے پرنسپل شریعہ تاریخ پٹنہ کالج ایک بسیط مضمون انگریزی زبان میں لکھا ہے جس پر کوشش کریں گے کہ عاشق کی اپنی و علمی زندگی پر بہت جلد ایک مضمون لکھیں۔

دہیں سے نقل کیا ہے۔

سید صاحب نے جس جگہ عظیم آبادی یا بہاری شعرا کے نام گناے میں وہ عبارت تو چار سطریں نہیں، لیکن غلطیوں کا ایک دفتر اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

فخاں کا نام اشرفِ فَاں نہیں، اشرفِ علی فَاں ہے۔ اسی طرح حسرت کا نام ہدیت علی فَاں نہیں، ہدیتِ علی فَاں ہے۔ عشقِ صاحب تذکرہ کا نام رحمت اللہ بتایا ہے۔ یہ صحیح نہیں، غلطی سب سے پہلے دآسی سے ہوئی، اس کا نام وجیہ الدین ہے، تذکرے اس کے شاہ میں عظیم آبادی تذکرہ نگار آغا حسین قلی فَاں کی ”نشر عشق“ میں بھی اسی طرح درج ہے، عشقی سے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے بہت زیادہ ردِ رابط تھے وہ عشقی کے شاگرد بھی تھے، عشقی سے انھوں نے کتب درسیات بھی پڑھی تھیں اس لئے ان کا بیان بہت زیادہ قابلِ قدر ہو گا عشقی کا تذکرہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے، اسکی بعض دوسری تصانیف کا بھی ہمیں علم ہے تعجب نہیں کہ ان سے بھی ہمارے قول کی تائید ہو، اس وقت ان کی طرف رجوع مشکل ہے۔

غلام حسین محرم، یہ کوئی مشہور شاعر نہیں اور اگر سید صاحب کی مراد عشقی کے باپ سے ہے تو ان کا تخلص غلط لکھا ہے، ان کا تخلص مجرم ہے۔
نشر عشق، کے مصنف کا تخلص عشق نہیں عاشقی ہے، خود لکھتے ہیں: ”مناشتی تخلص کہ امداد کردہ شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی است“۔

سید صاحب ان ناموں کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ... اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور یہاں گزرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی ہے۔ حالانکہ اس میں ایسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ترقی دینا کیا اردو زبان میں ایک شعر بھی نہیں کہا۔

اشرف علی فَاں فَاں فارسی اشعار بھی کہتے تھے، مصحفی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کے فارسی اشعار کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن یہ بھی بھلا یا نہیں جاسکتا کہ وہ اردو زبان کے بھی شاعر تھے ان کا دیوان اردو گو کم یا ب ہے، لیکن نایاب نہیں، دیوان فَاں کے چار نسخوں کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ نسخے اور بھی ملیں۔ عشقی کی اردو شاعری کے متعلق بہتر ہے کہ اسی کے زبان سے سنئے:

..... مقیم کوئے بے استعدادی، عشقی عظیم آبادی مولف تذکرہ بڑا از موطنان شہر رقوم است

..... اگرچہ فقیرا و دفن شعرو شاعری شعور سے دوست گاہے نیست، اما بحسب موزونی طبع بیشتر اوقات تصنیف

و تالیف نظم و نثر فارسی می پردازد، و پوشیدہ طرزِ بخت و اصلاحیہ و رغبت ندارد۔

نظمی زبان کہ قلم را قوام اوراق را با شعر ہندی بیچ علاقہ نمود ہذا۔۔۔۔۔ فارسی۔۔۔۔۔ براہے تفریح خاطر دوستان قلمی می گردد۔

یہ تو مدعی سست گواہ چست والا معاطہ ہے، خود عشقی تو کہتا ہے ”بہ شیوہ طرز ریختہ اصلا میلے و رغبت نہ دارد“ اور ”راقم را با شعر ہندی بیچے علاوہ نبود“ شکل سے اپنے صرف چھ اشعار درج کرتا ہے اور وہ بھی یہ لکھ کر ”چند اشعار چستہ جہتہ کہ بہ حسب اتفاق قلم زبان و زبان قلم سرزدہ...“ عشقی خود اپنے ان اشعار سے مطمئن نہیں، اس کا رجحان فارسی کی طرف تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اردو کے چھ اشعار لکھ کر اپنے فارسی اشعار نقل کرتا ہے۔ اور ہمارے سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اردو زبان کو ترقی دی فیالجب !

ہمارے پاس یہ ماننے کے لئے کافی ثبوت ہے کہ وہ فارسی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ تھا، اردو کے اشعار جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے کبھی کبھی اتفاقاً لکھ لیتا تھا اور بہت ممکن ہے کہ ان کی تعداد چھ سے بہت زیادہ زائد نہ ہو۔ ورنہ وہ تذکرہ لکھ رہا ہے اور قلم اس کے ہاتھ میں ہے، اپنے سیکڑوں اردو اشعار نقل کر سکتا تھا جیسا کہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے اکثر تذکرہ نگاروں کی عادت ہے، ورنہ اسی اپنے ایک خطبہ میں اسی کو روتا ہے:

”تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ اپنے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ اردو پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ دوسرے شعرا کے حالات بھی اسی طرح لکھتے اور اپنے اشعار نقل کرنے میں کبھی نہیں چوکتے۔“ غلام حسین مجرم فارسی گو تھے، وہ شاہ محمد وفا کے شاگرد تھے اور وہ بلاشبہ ایک فارسی گو شاعر تھے نثر عشقی کے مصنف کا بیان سنئے:

مجرم مرد صاحب طبیعت است و فکر ہموار دارد، اصلاح سخن و استفادہ صحبت از خدمت شاہ محمود و سا کہ
”وقائع مہابت جنگی“ از تالیفات اوست برداشتہ، راقم حروف — آن سخن سخن را در عظیم آباد دیدہ است —
ہنگام تحریر محمود ہذا از کلام ادبیں یک بیت بہ خاطر بود۔

بنواز بہ زخم تیغ ظالم از آب مکن درینغ ظالم
تذکرے میں نہ اردو کا کوئی شعر ہے نہ اردو شاعری کا کوئی تذکرہ۔ خود تذکرہ عشقی میں بھی اردو کی حیثیت سے غالباً اس کا ذکر نہیں، اگر وہ اردو کے شاعر ہوتے تو عشقی اپنے باپ کے اشعار ضرور درج کرتے۔ یہی حال عاشقی کا ہے اپنا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے لیکن نہ تو اپنی اردو شاعری کا کچھ حال لکھا ہے اور نہ ایک اردو شعر ہی درج کیا ہے۔ یہاں تو بے یلگی کا یہ حال ہے اور ہمارے سید صاحب چیخ چیخ کر فرما رہے ہیں کہ ان کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی، سید صاحب نے اپنی فہرست میں سب سے نمایاں جگہ علامہ علیہ تحقیق کو دی ہے، حالانکہ وہ غریب سرے سے ریختہ گو ہی نہیں، وہ ایک فارسی گو شاعر تھا، یہ بات ابھی حال میں ہم نے دریافت کی ہے کہ وہ صاحب دیوان بھی تھا، تذکرہ خوشگو اور نثر عشقی میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن ریختہ گو نہیں بلکہ فارسی گو شاعر کی حیثیت سے، یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ

کسی عظیم آبادی تذکرہ نگار نے بھی ان کا ذکر ریختہ گو کی حیثیت سے نہیں کیا۔

سید صاحب، تحقیق کو زمانی حیثیت سے بیدل سے بھی مقدم قرار دیتے ہیں، حالانکہ تحقیق کا سال ولادت ۱۰۵۰ء لگ بھگ ہے اور سال وفات ۱۱۲۷ء اور بیدل کا سال ولادت ۱۰۵۷ء اور سال وفات ۱۱۳۷ء ہے، اس حساب سے بیدل کی ولادت کے تقریباً بیس برس بعد تحقیق پیدا ہوئے اور ان کی وفات کے کم و بیش ۳۰ برس بعد مرے ہیں۔

سید صاحب کے پاس تحقیق کے ریختہ گو ہونے کی کیا سند ہے اس کا ہمیں علم نہیں، ہم یہ جانتا چاہتے ہیں کہ انھوں نے یہ رائے تحقیق کے اُردو اشعار دیکھ کر قائم کی ہے یا کسی تذکرے کے مطالعہ کے بعد، دونوں صورتوں میں انھیں حوالہ دینا چاہئے۔ ہمارا خیال ہے کہ سید صاحب کو دو شعروں سے دھوکا ہوا ہے جو تحقیق کی طرف منسوب ہیں:

جگہ را باندہ دل موم سماجا سلو نو سانورے ایدھر کوں آجا

سرجن ترے کھڑے میں سورج کی کرن دیا ہے دیکھوں ہوں جو تجھ کھ کوں نیناں مری چندرا ہے

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ اشعار تحقیق کے نہیں ہو سکتے، تحقیق کے زمانہ میں ریختہ گوئی کا عام طور پر رواج ہو چکا تھا، ۱۱۰۰ء پھر یہ زبان بھی بارہویں صدی کی نہیں معلوم ہوتی۔

اس جگہ بیدل کے متعلق بھی دو لفظ کہ دینا غیر مناسب نہ ہوگا، بیدل کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں:

مست پوچھ دل کی باتیں اب دل کہاں ہو ہم میں اس تخم بے نشان کا حاصل کہاں ہو ہم میں

جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا پردے سے بار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

شہرہ سن سے از میں کہ وہ محبوب ہوا اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

سرا در پر کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس پٹنہ نگر کی چھاڑ دیں اب بیدل چلے کیس

ظاہر ہے کہ پہلے تین اشعار جس شاعر کے ہیں چوتھا اس کا نہیں ہو سکتا، پھر شاعر مرحوم کے علاوہ کسی نے اس شعر کا

ذکر نہیں کیا، شاعر مرحوم ایک شاعر آدمی تھے اور آخر عمر میں ان کا حافظ بھی خراب ہو گیا تھا اس لحاظ سے ان کی سب سے معتبر

نہیں۔ تیسرے شعر کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بیدل کا نہیں بلکہ سوز کا ہے۔ اب رہے اوپر کے دو شعر

جنھیں تیر اور قائم نے اپنے تذکروں میں درج کئے ہیں، تو پہلی بات یہ کہ ہمیں ان کے ماخذ کا علم نہیں، دوسرے یہ کہ یہ

دونوں ان کے معاصر بھی نہیں، تیسری بات بڑی پُر لطف ہے وہ یہ کہ یہ دونوں اشعار بیدل کے اور پہلے دو اشعار تحقیق

کے مان لینے کی صورت میں تو یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہم بیدل زمانہ سے زیادہ قریب ہیں اور تحقیق کے عہد کی زبان سے بہت دور

حالانکہ بیدل کا زمانہ پہلے ہے اور تحقیق کا بعد کو۔ بیدل کا سال وفات ۱۱۳۷ء ہے اور تحقیق کا ۱۱۲۷ء۔

سید صاحب یہ بھی صحیح نہیں کہتے کہ تحقیق دلی کے قریب مصر تھے۔ دلی کا سال وفات ۱۱۱۷ء ہے۔ اب رہا

تحقیق کا سال وفات، ایک بہاری شاعر کے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سال وفات ۱۱۱۷ء ہے۔

مشرق کی کتب خانہ ہائی پور میں فارسی کا ایک مختصر سا رسالہ ہے، اول و آخر غائب ہے، یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالمجید صاحب فہرست نگار نے اسے نامعلوم لاسم لکھ دیا ہے، خان بہادر عبدالقادر صاحب نے اپنی انگریزی فہرست میں بھی تصنیف و مصنف کے متعلق کچھ نہیں بتلایا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لالہ اُجاگر چند اُلفت کے خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے احباب اعرہ اور بزرگوں کو لکھتے ہیں۔ اُلفت حسب روایت عبرتی قوم کا ہیتم سے تھے اور عظیم آباد کے روسا میں ان کا شمار ہوتا تھا پہلے تخلص غربت کرتے تھے بعد کو اُلفت رکھا، یہ تحقیق کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک رقعہ اس کتاب میں موجود ہے جو تحقیق کے صاحبزادے میر محمد حسین کو لکھا گیا ہے، اس مکتوب سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں اس لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ زیر نظر نسخہ آب رسیدہ، بوسیدہ اور نہایت بدخط ہے، بعض جگہ قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے:

بخدمت میر محمد حسین صاحب خلف الصدق قبلہ اباب ترقی میر محمد علیم صاحب (تحقیق)

میر صاحب قدردان سلامت

اشعار انتخاب دیوان میر صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ خدمت گزار سرکار ساند انشاء اللہ تعالیٰ لالہ خوشگو صاحب سلمہ المنان دافن تذکرۃ الشعراء می نمایند و احوال ہم حسب الارقام حال بہ شرح و بسط قلمی می فرمائید، قطعہ تاریخ وصال میر صاحب مغفورہ کو طرح گفتہ احترام بود ارسال بعالی خدمت نمود۔۔۔۔۔ بہ نظر خواہر گزشت:

آل مسیح علیم رمز معنی جاگرد	د خلوت عرش فوق چرخ ارزق
افتاد ستون کاخ فطرت افسوس	شد گلشن تحقیق خرد بے رونق
در ماتم او کرد سخن خامہ سیاہ	چوں گرہ نمود خامہ ازدید و شوق
در خون جگر دل سپوش زغم	ز غوطہ چو داغ لالہ در رنگ شفق
تاریخ وصال ادب اُلفت بافت	فرمود کہ تحقیق شدہ واصل حق

یہاں تک لکھ لینے کے بعد تذکرہ خوشگو کے ایک نسخہ تک رسائی ہوئی تحقیق کا بیان دیکھا اس میں سال و وفات ۱۱۶۲ھ دیا ہے اور ”تحقیق شدہ واصل حق“۔۔۔۔۔ نادرہ تاریخ کا پورا اطلعہ نقل نہیں کیا ہے صرف مادہ تاریخ لکھ دیا ہے۔ ولی اور تحقیق میں چالیس برس سے زائد کا فصل ہے وہ دونوں قریب العصر نہیں۔

میر صاحب نے صفحہ ۹۰م کے فٹ نوٹ میں ”یادگار عشق“ کے ایک غلطی کی تصحیح کی ہے کہ ۱۱۹۵ھ تاریخ وفات عشق مجنونا غلط ہے جیسا کہ علی لطف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ان کی تصحیح صحیح ہے، لیکن انھوں نے خود نہیں بتایا کہ عشق کا سال وفات کیا ہے، بہ ظاہر جو کچھ صاحب یادگار عشق نے لکھا ہے اسے وہ صحیح سمجھتے ہیں، کتاب میں سال وفات ۱۱۵۳ھ درج ہے ہم اس معاملہ میں مشکوک ہیں، میرزا محمد علی فدوی جو عشق کے مخصوص شاگردوں میں تھے ان کا ایک قطعہ تاریخ ہمیں ایک قدیم بیاض سے ملا ہے جو درج کیا جاتا ہے:

شور و اویلا فتاد اندر جہاں چوں اجل آمد سر بالین عشق
گفت فردی سال تاریخ وفات ہادی یاشاہ رکن الدین عشق

اس مصرع سے سلسلہ غلط ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ فردی کا بیان دوسروں کے بہ اعتبار زیادہ مستند سمجھا جائے گا، فردی کا احمد شاہ بادشاہ دہلی کا قایم نویں ہونا بھی متحقق نہیں، اسی کا نام غلام حسین نہیں محمد علی ہے عرف بچہ نہیں، بھجویا بھجہ ہے۔

سید صاحب کا سال ولادت عشق سلسلہ بتانا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

سید صاحب نے لکھا ہے کہ بہار میں تین قابل قدر تذکرے لکھے گئے تذکرہ شورش، تذکرہ جوشش اور گلزار ابراہیم ہمارا خیال ہے کہ جوشش نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔

تذکرہ عشقی کے متعلق یہ لکھنا بھی عجیب ہے کہ یہ شعراء اردو کا سب سے قدیم تذکرہ ہے جواب نایاب ہے، اس تذکرہ کا سال تصنیف ہمارے خیال کے مطابق سلسلہ کے لگ بھگ ہے اس سے پہلے سیدوں تذکرے لکھے گئے یہ بھی صحیح نہیں کہ نایاب ہے اور کہیں نہیں ہے، تذکرہ عشقی خود ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

سید صاحب نے میر جعفر عظیم آبادی کا نام شعرا کی فہرست میں لکھا ہے، اس نام کا کوئی مشہور شاعر عظیم آباد میں نہیں گزرا، اگر مولف کی مراد میر جعفر استاذ میر تقی میر سے ہے تو انھیں جاننا چاہئے تھا کہ میر نے مرثیہ ان سے فارسی کی کتابیں پڑھی تھیں شعرو سخن میں ان کے استاد نہ تھے۔

میر حمزہ کو لکھا ہے کہ عظیم آباد کی خاک سے اُسٹھ اگر ایسا ہوتا تو نواب علی ابراہیم خاں حال انھیں دہلوی نہ لکھتے گلزار ابراہیم کے بیان کے بموجب وہ سلسلہ کے قریب عظیم آباد آئے ہیں۔

سید صاحب نے بیان بھی صحیح نہیں کہ فناں رکن الدین عشق، محمد علی فردی اور میر باقر حزیں نے عظیم آباد کی آغوش تربیت میں نشوونما پائی۔ قدرت اللہ قدرت صاحب تذکرہ کا سال وفات ۱۲۰۵ھ نہیں اگر یہ صحیح ہوتا تو مصنفی ۱۲۰۹ھ میں "بالفعل در رام پور استقامت دارد" کہی نہ لکھتے۔ (تذکرہ ہندی صفحہ ۱۷۵)

یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ فردی عشق کے ساتھ سلسلہ میں مرشد آباد سے عظیم آباد آئے، پہلے تو عشق ہی کا سلسلہ میں آیا متحقق نہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ عشق نواب قاسم علی خاں کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر عظیم آباد آئے۔

نواب قاسم کا عہد نظامت سلسلہ سے بارہ برس بعد سلسلہ سے شروع ہوتا ہے، سلسلہ تو علی وردی خاں کا زمانہ تھا اس وقت میر قاسم کا کیا ذکر ان کے پیش رو میر جعفر اور سراج الدولہ بھی میدان میں نہیں آئے تھے، یہی حال فردی

کا ہے سلسلہ میں فردی عظیم آباد تو درکنار دہلی سے مرشد آباد بھی نہیں آئے تھے، یہ صحیح نہیں کہ فردی کا دیوان نایاب ہے، یہ موجود ہے اور ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

سید صاحب، اس مقدمہ میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

”میر کی نکات الشعرا اور تذکرہ حیرت کے بعد سخن گویان اردو کے ابتدائی تذکرے پہلے ہیں مرون ہوئے، شورش نے سنہ ۱۱۹۲ھ اور عشقی نے سنہ ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ میں شعراے اردو کے تذکرے لکھے۔ یہ عظیم آبادی میں لکھے گئے ان کے علاوہ گلزار خلیل اور اس کا ترجمہ گلشن ہند بھی اسی چین زار کے پروردہ ہیں“ (نقوش صفحہ ۵۰)

دیکھنے میں تو یہ سرت و سطر میں ہیں لیکن اغلاط سے پر۔

ہماری طرح ناظرین بھی حیرت میں ہوں گے یہ ”تذکرہ حیرت“ کیا ملا ہے، ہمارے علم میں اس نام کا کوئی مشہور تذکرہ نہیں سید صاحب کا یہ فرمایا بھی حیرت انگیز ہے کہ اردو کے ابتدائی تذکرے پہلے ہیں مرون ہوئے تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی سے پہلے بہت سے تذکرے بہار سے باہر لکھے گئے۔ ہم ذیل میں ان کی ایک مختصر فہرست درج کرتے ہیں، ترتیب فہرست میں کسی قسم کی تفصیل و تلاش کو دخل نہیں بلکہ جو راقم کے پیش نظر تھے یا فوری طور پر خیال میں آئے درج کئے گئے۔

نام	مصنف	سال تصنیف تکمیل	نام	مصنف	سال تصنیف تکمیل
مخزن نکات	قائم	۶۹ھ ہجری	چنستان	شفیق	۱۱۶۵ھ
تذکرہ شعرا	فاکسار	۱۱۱۵ھ	طبقات الشعرا	شوق	۱۱۸۸ھ
تذکرہ ریختہ گویان	گردیزی	۱۱۶۶ھ	گلشن ہند	لطف	۱۲۱۵ھ
تختہ الشعرا	افضل بیگ اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ	مجمع الانتخاب	کمال	۱۲۱۹ھ
گلشن گفتار	خواجہ جلیل احمد خاں اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ	مجموعہ نغز	حکیم قاسم	۱۲۲۱ھ
تذکرہ شعرا	معین الدین خاں رچی والا شاہی (محمد شاہ ۱۲۳۱ھ تا ۱۲۴۱ھ)		مخزن الغرائب	احمد علی سندیلوی	۱۲۱۸ھ
تذکرہ شعرا	سودا	(قبل از ۱۱۶۵ھ)	تذکرہ عمدۃ المنتخبہ	سرور	
تذکرہ ہندی	مصطفیٰ	۱۲۰۹ھ	تذکرہ عشق	عشق میرٹھی	
گلزار ابوابیم	خلیل	۱۱۹۸ھ	عیار الشعرا	خوب چند ڈکا	
تذکرہ میر حسن	میر حسن	قبل از ۱۱۹۲ھ	تذکرہ بے بلگر	خیراتی لال بے بلگر	

لے نام کے بجائے جہاں پر ”تذکرہ شعرا“ لکھ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل نام کا علم نہیں فاکسار کے تذکرے کا نام میر نے ”معشوق چہل سال خود“ لکھا ہے لیکن یہ کسی کتاب کا نام نہیں ہو سکتا عمدۃ المنتخبہ ”تذکرہ سرور کے نام سے بھی مشہور ہے جہاں جہاں سال تصنیف پر () یہ نشان لگا دئے گئے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ سال تالیف کا صحیح علم نہیں تذکرہ گردیزی کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ نہیں بلکہ عام طور پر مشہور ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ ہو)

(۳) تذکرہ شورش کا سال تصنیف ۱۱۹۲ھ بتانا صحیح نہیں۔

(۴) تذکرہ عشقی کے سال تصنیف میں اکثر لوگوں نے دھوکا لکھا یا ہے، زندہ کے مایہ ناز فرزند مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے ۱۱۵۱ھ لکھا ہے (شعرا ہند)۔ سید صاحب نے اس کی تصحیح کی ہے (نقوش صفحہ ۴۰۵) اور لکھا ہے کہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ لکھا گیا، ہمارا خیال ہے سید صاحب قبلہ کو بھی دھوکا رہا، تذکرہ عشقی میں ۱۲۱۵ھ کے بعد کے بھی حوالے ملتے ہیں۔ سال تصنیف ۱۲۲۵ھ کے لگ بھگ ہے، ۱۲۱۵ھ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ہے جو صحیح نہیں اور دہاسی کا بیان ظاہر ہے کہ انھیں سے منقول ہے۔

(۵) تذکرہ عشقی عظیم آبادی میں لکھا گیا۔ انکی سید صاحب کے پاس کیا سند ہے؟ ہمارا تو علم ہے کہ عشقی دس برس تک ضلع آناؤ میں تحصیلداری کے عہدہ پر مامور رہے، پھر کچھ دنوں تک اپنے والد خجڑ کے پاس ڈھاکا رہے، پھر عظیم آباد آئے لیکن ۱۲۱۵ھ میں پھر ڈھاکا گئے اور عمر بھر وہیں رہے اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۶) نواب ابراہیم خاں حال کے تذکرے کا ۱۲۴۸ھ "گلزار ابراہیم" ہے گلزار خلیل نہیں جیسا کہ مرتب نے لکھا ہے۔
(۷) "گلشن ہند" کو "گلزار ابراہیم" کا محض ترجمہ سمجھنا بھی عجیب ہے علی لطف نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا گلزار ابراہیم میں پتا تک نہیں۔ لطف نے جو اضافے کئے ہیں ان کے لئے آفتاب، آشنہ، انشا، افسوس، بقا، بیدل، فقیر، قائم، تیر، مجدد، مصطفیٰ، منت وغیرہ کے تراجم دیکھے۔

(۸) سید صاحب علی لطف کو عظیم آبادی کہتے ہیں یہ بڑے لطف کی بات ہے، لطف ہندوستان کے بھی نہیں امر آباد کے رہنے والے تھے، نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے کچھ دنوں تک نواب اعظم الدین ارسلو جاہ کے ساتھ دکن میں رہے کچھ دن لکھنؤ میں رہے، ہاں کچھ دن تک قیام عظیم آباد میں بھی رہا۔

م-۱

بقیہ فیٹ نوٹ صفحہ ۲۴ - خود گردیزی خاتم میں لکھا ہے: "حتم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنقذہ فی ہمار تذکرہ تین و

ماہ لبر الالف من الهجرة المبارک النبویہ ۱۲۷۰ھ - میر حسن کے تذکرے کا سال مولوی حبیب الرحمن صاحب خروانی نے ۱۱۹۹ھ و ۱۱۹۲ھ کے مابین بتایا ہے عام طور پر بھی مشہور ہے، لیکن یہ صحیح نہیں اس لئے کہ شجاع الدولہ موتی ۱۱۹۹ھ کو بقیہ حیات لکھا ہے اور قصیح کے قریب میں ہے، "در سال یک ہزار و یک صد و نو و ہجرت حق پیوست" معلوم ہوا کہ وہ ۱۱۹۹ھ سے شروع تذکرہ لکھنا شروع کر چکے تھے اور ۱۱۹۲ھ کے بعد تک لکھتے رہے۔ طبقات الشعرا کا سال تالیف ۱۱۹۹ھ ہے مگر شوق اس کے بعد بھی اس میں اضافے کرتے رہے تھے، عذرا المنقذہ کا سال تالیف پر دینے خروانی نے ۱۲۰۰ھ بتایا ہے مولانا عبدالحی اسے صحیح نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں اس میں ۱۲۰۰ھ تک حوالے ملتے ہیں اس لئے کہ قائم کا ذکر ۱۲۰۰ھ میں کیا ہوا، اصل یہ کہ تذکرہ کی ابتدا ۱۱۹۲ھ میں ہو چکی تھی لیکن وہ ۱۲۰۰ھ تک ہی نہیں بلکہ دس بارہ برس تک اسے مرتب کرتے رہے اور نظر ثانی اس کے بھی بہت بعد تک کرتے رہے اس لئے کہ اس میں غالب کا حال بھی درج ہے، غالب کا سال ولادت ۱۱۹۲ھ ہے تذکرہ بے جگر دہاسی کے بیان کے مطابق ۱۱۹۲ھ بھی لکھا گیا ہو۔ چھٹے تذکرے کے متعلق مولانا ام الدین خاں بتایا جاتا ہے ہمارے خیال میں میری ہر اذعان الدین سے ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ تذکرہ عہد محمد شاہ میں لکھا گیا، لیکن اگر سید صاحب اسکا عہد محمد شاہ میں تالیف ہونا ناممکن جب بھی ہمارا بیان اپنی جگہ پر رہتا ہے اس لئے کہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے لکھا گیا ہے۔ سودا اور بکوش کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تذکرے لکھے آخر الذکر کے متعلق ہم دھونی سے کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا تذکرہ سودا کے متعلق مولانا عبدالحی اور دوسرے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس معاملہ میں بھی شکوک ہیں، ہم یہ مطالب کسی دوسری جگہ بیان کریں گے ۱۱۹۲ھ تذکرہ ہندی کا سال تکمیل ہے اس کی ابتدا وہ ۱۱۹۹ھ کے قریب کر چکے تھے۔

نشری ڈرامہ اور اداکاری

بی. بی. سی کے ڈرامہ ڈائریکٹر مسٹر ویل گل گڈ (Mr. Val Gilgind) کا قول ہے کہ صنف ڈرامہ میں نشری ڈرامہ بہت بقدری کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم نشری ڈرامہ کا مقابلہ اسٹیجی ڈرامہ سے کریں جس کی ابتدا (Introduction) بلکہ اس سے بھی پہلے ہوتی ہے یا سینما سے اس کا تقابل کیا جائے جس کو عالم وجود میں آئے چالیس پینتالیس سال ہوتے ہیں، تو اس کی کم ایسی پر تعجب ہوتا ہے، مگر اس کم مدت میں جو مقبولیت اس نے حاصل کر لی ہے اور ترقی کے جو امکانات اس میں پائے جاتے ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گل گڈ ابھی اس کے قایل نہیں کہ نشری ڈرامہ کی تاریخ لکھنے کا وقت آگیا ہے یا یہ کہ نشری ڈرامہ لکھنے اور اس کے پیش کرنے کے جو اصول مقرر ہیں ان کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا فلم کی طرح ہلیر مقبولیت حاصل کرنا مشتبہ ہے، کیونکہ عوام اپنے کانوں کو استعمال کرنے سے زیادہ آنکھوں کو استعمال کرتا جاتے ہیں اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہی ذریعہ زیادہ کامیاب ہوگا جو بیک وقت دونوں قوتوں (بصارت اور سماعت) کو متاثر کرے تاہم اسکا کافی ثبوت موجود ہے کہ نشری ڈرامہ سننے والوں اور لکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اس سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ سامعین اس کی ٹیکنک سے بھی واقف ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح ذوق تنقید کا معیار بھی بلند ہو رہا ہے۔

انسان نے اب تک دنیا میں جو کچھ معلوم کیا ہے، وہ بہت کچھ اس کی بصارت کا نتیجہ ہے۔ لیکن نشری ڈرامہ نگاروں کے پاس ذریعہ اظہار صرف آواز ہے اس لئے اس کو دوسری قسم کے ڈرامہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ دقتیں ہوسکتی ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم ان سہولتوں کا مقابلہ کریں گے جو نشری ڈرامہ نگار، اسٹیجی ڈرامہ نگار اور فلم نگار کو اپنے اپنے میدانوں میں حاصل ہیں، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ نشری ڈرامہ نے ابھی تک کیوں ترقی نہیں کی۔

اسٹیج فلم اور نشری ڈرامہ نگار کو مکالمہ صوتی (Sound Effects) اثرات اور موسیقی میں جلا نئی طبع دکھانے کا برابر موقع حاصل ہے، لیکن جسمانی خصوصیات، سوانگ (Make up) اور ساز و سامان وغیرہ جو آلات کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتے ہیں ان سے نشری ڈرامہ لکھنے والا استفادہ نہیں کر سکتا۔ وہ ان سے

محروم ہے کیونکہ ان کا تعلق صرف بصارت سے ہے۔

ایسیج اور فلم بہت سے اداکاروں کو شریک کر سکتا ہے اور ان کی مدد سے مختلف قسم کے اثرات پیدا کر سکتا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

فصل : صفیہ تم خاموش کیوں ہو گئیں مجھے معاف کر دو۔

(صفیہ نہایت مغموم انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میز کے قریب پہنچتی ہے کتاب اٹھاتی ہے۔ دو چار صفحات اٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ میز پر دونوں کھنیاں ٹیک کر سر کا پورا وزن ہاتھوں پر ڈال دیتی ہے۔ فضل اپنی جگہ سے اٹھ کر صفیہ کے قریب آتا ہے اور اُس کی چوڑیوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے ہوئے میز پر بیٹھ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ)

یہ جزو صرٹ ایسیج پر یا سینما میں دکھایا جاسکتا ہے کیونکہ سوائے ابتدائی جملہ کے باقی تمام حصہ کا تعلق بصارت سے ہے اور ریڈیو سننے والے اس سے ہمیشہ کے لئے محروم ہیں۔

قدرتی مناظر تاریخی مقامات یا فوٹو گرافی کے کرشمے صرٹ فلم میں دیکھے جاسکتے ہیں اور اس لئے جہاں تک سہولتوں کا تعلق ہے، فلم نگار کو اولیت حاصل ہے اور نثری ڈرامہ نگار کو کم سے کم حصہ ملتا ہے۔ اس کے سلسلے میں ایک اور وقت ہے اور وہ وقت کی تنگی ہے۔ اس کو فلم نگار اور ایسیجی ڈرامہ نگار کی طرح وقت نہیں ملتا۔ اس کو تو کم سے کم وقت میں دلچسپ سے دلچسپ ڈرامہ پیش کرنا ہے۔ سینما اور تھیٹر میں تو یہ ہوتا ہے کہ ناظرین اسے پیسے خرچ کر کے دیکھتے ہیں اس لئے عام طور پر آخر وقت تک بیٹھتے رہنے ہیں۔ برخلاف اس کے ریڈیو سننے والے کا یہ حال ہے کہ اگر اس کو ڈرامہ ذرا بھی نا پسند ہو تو فوراً سوئی دوسری نشر گاہ کی طرف گھما دیتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک بات ضرور تسکین بخش ہے اور وہ یہ لوگوں کو ڈرامہ پسند آئے یا نہ آئے، نثری ڈرامہ نگار اُن کی تعریف نہیں کرتا۔

چند بنیادی اصول ڈرامہ خواہ کسی قسم کا ہو اس میں ہم کو چند بنیادی اصول مشترک ملیں گے۔ نام موضوع پلاٹ، تخیل، کردار، ابتدا، وسط اور ختم یہ ہیں ایک ڈرامہ کے اجزاء، جن پر پہاں سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

نام یا سرخی ڈرامہ کی سرخی یا نام جاذب توجہ ہونے کے علاوہ پلاٹ کی طرف رہبری کرنے والا بھی ہونا چاہئے یعنی یا تو وہ ایسا ہو کہ اس سے فوراً ڈرامہ کے موضوع کا اشارہ ملے جیسے ٹیکسیر کا ڈرامہ "جولیس سیزر" (Julius Caesar) یا پھر ایسا کہ سرخی سے موضوع کا پتہ ہی نہ چلے اور جیسے جیسے پلاٹ پھیلتا جائے ڈرامہ کے نام، موضوع اور پلاٹ کا باہمی تعلق واضح ہوتا جائے جیسا کہ ٹیکسیر کا ڈرامہ "مرچنٹ آف ونس" (Merchant of Venice) جولیس سیزر کا نام سنتے ہی ہمارا دھیان اُن ہستیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے

رکھنے والوں کی تعداد کم ہو۔ ڈرامہ کا موضوع دراصل اس کی روح ہے۔ روح کی کثافت اور لطافت کا اثر جسم یعنی پڑیگا "عام دلچسپی" (Mass Appeal) بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ ایسی فلم اور ریڈیو کے متعلق بار بار اعداد و شمار حاصل کئے گئے، لیکن "عام دلچسپی" کے سلسلہ میں کوئی نتیجہ خیز بات معلوم نہ ہو سکی۔ بہر حال اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عوام تفریح چاہتے ہیں، نہ کہ تعلیم و تربیت اس لئے ان سے جو کچھ کہا جائے اس میں معلمانہ شان نہ ہو، اور اپنے دماغ پر بار ڈال کر اور سوچ کر ان کو نتیجہ نکالنا نہ پڑے، صاف صاف باتیں کہئے ان کو لطف آئے گا، وہ حزن سے زیادہ طریقہ اور دل خوش کن انجام چاہتے ہیں کسی گہرے مزاح سے محفوظ نہیں ہو سکتے۔ عمر، طبقہ، صنف، مذہب، اور تمدن کو بھی انتخاب موضوع کے وقت ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔ ایسا موضوع منتخب کیجئے جو سوسائٹی کے ہر طبقہ کو پسند آئے۔ پروگرام کا ہر وہ جز و نشر گاہ کے لئے سم قائل ثابت ہوگا جس میں سوسائٹی کے کسی طبقہ کی تضحیک کی گئی ہو یا اس کے احساسات کو ٹھکرایا جائے۔ گو اکثریت کو اہمیت حاصل ہے مگر اقلیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مناسب موضوع منتخب ہونے کے بعد پلاٹ کی تیاری نہایت اہم کام ہے۔ ڈرامہ کا موضوع خود چنیدہ واقعات پیش کرتا ہے اور ان امکانات کو ظاہر کرتا ہے جن پر پلاٹ کی بنیاد رکھی جاتی ہے مگر تقیہ اجزاء کی تیاری کچھ آسان کام نہیں۔ ایک انسان یا قصہ لکھتے وقت اگر ہم اپنے موضوع سے کچھ ہٹ جائیں اور کوئی خاص احوال پیدا کرنے یا کسی منظر کو رنگین بنانے کے لئے دو ایک صفحوں کا اضافہ کر دیں تو اس کا اثر بُرا نہ ہوگا، لیکن ایسی فلم اور ریڈیو میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ڈرامہ سنتے وقت سامعین کے تخیلات و تاثرات کا ایک دھارا ہوتا ہے اس لئے اگر غیر ضروری باتوں سے دھیان پلٹ گیا تو پھر جی لگنا مشکل ہے۔ تمام قصوں کے پلاٹ ایسے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مرکزی کردار کو اپنا مقصد حاصل کرنے میں مدد ملے یا تعویق پیدا ہو جائے۔ ڈرامہ کا ہر جز و منطقی طور پر اپنے کل سے وابستہ ہے، اس لئے علت و معلول کے ضابطہ کے تحت اس کی تشریح پوری طرح ہونی چاہئے۔ آپ فلم ایک سے دو مرتبہ دیکھ سکتے ہیں، ناول کو بار بار پڑھ سکتے ہیں مگر نشری ڈرامہ ایک ہی مرتبہ نشر ہوتا ہے اگر پلاٹ سمجھ میں نہ آیا تو وہ ہمیشہ کے لئے ناقابل فہم رہ جائے گا۔ تھیٹر اور سینما ہال میں مکمل خاموشی رہتی ہے اس کے خلاف گہر میں بچوں کا ہنگامہ، عورتوں کا شور و غوغا، نوکروں کی آمد و رفت غرض طرح طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں، اس لئے پلاٹ جتنا زیادہ واضح و صریح ہو اچھا ہے۔ یہ کیوں تصور کیا جائے کہ سامعین اپنے تفریح کے اوقات میں بھی فلسفیوں کی طرح غور و فکر پر وقت صرف کریں گے۔

تخالف و تصادم ہر ڈرامہ میں تخالف و تصادم لازمی ہے اس کے بغیر وہ ڈرامہ بنتا ہی نہیں۔ مرکزی کردار کو چمکانے کے لئے رقابت اور رقیب کی شکست دکھانا ضروری ہے۔ تصادم ڈرامہ کی جان ہے جو ذہنی بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی بھی۔ مرکزی کردار کو ان طاقتوں سے لڑنا لازمی ہے جن پر وہ قابو حاصل

لڑنا چاہتا ہے۔ اگر مرکزی کردار قوی تر ثابت ہو تو انجام طریقہ ہوگا ورنہ حزن یہ جیسا کہ ”رومیو اینڈ جولیٹ“ (Romeo And Juliet) اور دوسرے حزن یہ ڈراموں سے ظاہر ہے۔

ڈرامہ نگار کے لئے کرداروں کا انتخاب بھی کوئی سہل کام نہیں کیونکہ موضوع کو پھیلانے والے کردار ہی ہوتے ہیں۔ نثری ڈرامہ میں بہت زیادہ کردار شریک نہ کرنا چاہئے، باوجود آوازوں کے اختلاف کے سامعین کو مختلف کرداروں میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسٹیج پر اور فلم میں تو ہم کرداروں کو دیکھ بھی سکتے ہیں، ان کی حرکات و سکنات اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ لباس کی وجہ سے بھی تمیز کرتے ہیں آسانی ہوتی ہے مگر ریڈیو میں یہ ممکن نہیں اس لئے ۲۴ کرداروں اور کم سے کم دو ہاتھیوں کا سوال ہمیشہ غور طلب رہے گا۔

کسی پلاٹ کی ”ابتداء“ اس سے ہوتی ہے کہ مرکزی کردار اور اس کے معاونین اپنے مقصد کو خود پیش کریں یا دوسروں کے ذریعہ سے پیش کرائیں۔ اس مقصد کا تعارف سب سے پہلے موعود پر کر دینا زیادہ مناسب ہے تاکہ سامعین فوراً متوجہ ہو جائیں نثری ڈرامہ نگار کو ناول نویس یا افسانہ نگار وغیرہ کے مقابلہ میں زیادہ غفلت کے ساتھ مرکزی کردار کا تعارف کر دینا چاہئے۔

مرکزی کردار جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی وجہ سے مناقشات پھیلتے ہیں اور تصادم ہوتا ہے۔ **وسط** ان مناقشات کو مختلف صورتوں میں تسلسل کے ساتھ ڈرامہ کے وسط میں جاگ دینا چاہئے اور وسط ہی میں بتانا چاہئے کہ مرکزی کردار اپنے مقصد کے حصول کی خاطر مشکلات کو دور کرنے میں مصروف ہے۔ وہی مشکلات اور مقصد جن کا تعارف ڈرامہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔ اس کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے طرح طرح کی شکلیں پیدا کی جاسکتی ہیں مگر ہر شکل ایسی ہو کہ نازک صورت حال دکھائی دے یا یہ کہ اس کی وجہ سے مرکزی کردار کی شکست کا خدشہ پیدا ہو اور حالات ایک نئی کوڈٹ لینے والے ہوں۔ تنگی وقت کی وجہ سے نثری ڈرامہ میں اس قسم کی مشکلات کو زیادہ نہیں پھیلا یا جاسکتا۔

ڈرامہ کا اختتام ان صورتوں اور پیچیدگیوں کا منجھاؤ ہے جو حصول مقصد کے سلسلہ میں شروع سے پیدا ہوتی چلی آتی ہیں، ڈرامہ کے اختتام پر سامعین کی تسفی ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ دل خوش کن انجام پر کسی تبصرہ کی چنداں ضرورت نہیں لیکن المناک انجام کے متعلق بیشک یہ کہنا ہے کہ سامعین یہ محسوس کریں کہ پلاٹ کا اس سے بہتر انجام نہیں ہو سکتا تھا یا پھر ”رومیو اینڈ جولیٹ“ کی طرح اثر پیدا کیا جائے کہ دو معزز ماہان دو مرکزی کرداروں کی درناک موت کی وجہ سے آپس میں مل گئے۔

نثری ڈرامہ نگار کے پاس تین ہی ذرائع ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا پیام سامعین تک پہنچا سکتا ہے۔ کالمہ صوتی اثرات اور موسیقی، ان کو ہم مجموعی طور پر آواز کہہ سکتے ہیں۔

مکالمہ ڈرامہ کے مکالمہ کے متعلق صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ اس میں عام دلچسپی کی آسان باتیں وضاحت سے پیش کرنا چاہئے۔ اسٹیج پر اگر کوئی کردار ایک سگریٹ پھینک دے اور اسی سے فرش جلنے لگے تو دوسرا کردار صرف یہ کہنے پر اکتفا کر سکتا ہے ”دیکھو وہ جل رہا ہے“ نثر میں جلتے ہوئے سگریٹ کے پھینکنے اور فرش کے جل اٹھنے کا حوالہ دینا ضروری ہے ورنہ سامعین کچھ نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں نے صوتی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا حوالہ اگر مکالمہ میں دیدیا جائے تو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے، مکالمہ کے دوران میں مناسب مقامات پر کردار ایک دوسرے کے نام وقفہ وقفہ سے لیتے رہیں تو سامعین کو نام جلد یاد ہو جائیں گے اور سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ غالباً نیویارک ٹائمز کے ریڈیو ایڈیٹر مسٹر اوسای ڈنلاپ جونیئر (O.E. Dunlop Jr.) *Radio Editor, New York Times* کسی جگہ کہا ہے کہ ریڈیو میں الفاظ ”یہ“ اور ”وہ“ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہمیشہ واضح کر دینا چاہئے کہ یہ کون ہے اور وہ کون۔ اگر کسی ڈرامہ میں باپ اپنی بیٹی کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہے ”اُن سے یعنی اپنی ماں سے“ پوچھو تو وہ اتنا موثر نہ ہوگا جتنا کہ اپنی ماں کے کہنے سے۔ فرض کیجئے تین آدمیوں کی محفل میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے اگر ان میں سے ایک کہے ”واہ، یہ تو ان کا اعتراض ہے“ تو لفظ ”ان“ کا اشارہ ظاہر ہے تیسرے شخص کی طرف ہوگا لیکن اگر تعداد تین سے زیادہ ہوئی تو پھر ان یا اُن سے کام نہ چلے گا؟ انفرس کردار کو ذہن نشین کرانے کے لئے نام لینا بے حد ضروری ہے اور ”یہ“ ”وہ“ ”اُن“ ”ان“ وغیرہ سے پرہیز لازم ہے۔

جس طرح اسٹیجی ڈرامہ میں مناظر کی تبدیلی سے قصہ کے مختلف اجزاء کو ملایا جاتا ہے اسی طرح **مناظر کی ترتیب** نثری ڈرامہ میں موسیقی، صوتی اثرات اور اناؤنسر (Announcer) کے تبصرہ۔۔۔ سے مختلف مناظر کو ملایا اور ترتیب دیا جاتا ہے۔ مثلاً دو افراد اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے آئینہ سفر کا ذکر کر رہے ہیں اس کے بعد کا منظر اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے۔ گھر کی گفتگو اور پلیٹ فارم کے منظر کے درمیان اگر موٹر گاڑیاں دونوں کا اس میں بیٹھنا موٹر گاڑیوں کا چلنا پر شور شرک پر سے گزرنا اسٹیشن کے پاس موٹر کار کنا وغیرہ بتایا جائے تو یہ ترتیب ضرور جاذب توجہ ہوگی۔ ترتیب کے متعلق بھی کوئی خاص اصول نہیں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سلسلے کوئی ڈرامہ ہو اور ہم اس کی گنجائش کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ مناظر کو کس طرح کی ترتیب دیکھائے۔

جس طرح اسٹیجی ڈرامہ میں اداکاروں کی رہبری کے لئے ہدایات لکھی جاتی ہیں اسی طرح نثری ڈرامہ میں **ہدایات** بھی ہدایات کا وضاحت کے ساتھ لکھا جانا ضروری ہے مگر ان میں اور اسٹیجی ڈرامہ کی ہدایات میں بہت فرق ہے۔ مثلاً اسٹیج کے لئے لکھا جاتا ہے ”عام داخل ہوتا ہے“ نثری ضرورت کے پیش نظر ”حامد کے داخل ہونے کی آواز“ لکھا جائے کیونکہ اسٹیج پر تو حامد خود داخل ہوتا ہے مگر اسٹوڈیو میں یہ ہو سکتا ہے کہ حامد پہلے ہی سے مانی کوڈ فون

کے قریب بیٹھا ہو اور اس کے داخلہ کے وقت کسی اور کو چلا کر اس کے داخلہ کا اثر پیدا کیا جائے۔ ایسٹج کی بعض باتیں مانی کرو فون (Memorandum) کے لئے بالکل مضحکہ خیز ہوں گی مثلاً ”افسری گھر میں باہیں ڈال کر باتیں کرتی ہے۔“ ممتاز چٹلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹپکتا ہے۔“ ”سراج سرکار کا اشارہ کرتا ہے۔“

”جھیل کی طنز یہ مسکراہٹ دیکھ لی جاتی ہے“ وغیرہ۔ نثری ڈرامہ میں اگر ایک کردار کوئی کام کرے اور اس کی وجہ سے کوئی آواز ہو یا اس کا حوالہ مکالمہ میں دیا جائے تو ہمیشہ اس آواز کے پیدا ہونے کی ہدایت درج کرنا چاہئے۔

موسیقی نثری ڈرامہ میں موسیقی کو شریک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی قطعی بات اس لئے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ ہر موسیقی ڈرامہ کی انفرادی ضروریات اور گنجائش پر منحصر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ موسیقی کو نقل مکان یا مرد ایام کے اظہار کے لئے خوبی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ دیگر یوں سمجھے کہ جس طرح ایسٹج کا پردہ چھوڑ کر منظر بدلا جاتا ہے اسی طرح موسیقی سے کام لیا جاسکتا ہے مگر اس کا دوران تیس سکند سے زیادہ نہ ہو۔ موسیقی کا انتخاب جس طرح ہر وہ ڈرامہ نگار جو موسیقی سے واقف نہ ہو نہیں کر سکتا اسی طرح ہر اچھا مطرب بھی انتخاب نہیں کر سکتا کیونکہ ہر مطرب کا ڈرامہ کی تکنیک سے واقف ہونا ضروری نہیں۔ اگرچہ ایسے اشخاص جن کو ڈرامہ اور موسیقی دونوں پر قدرت حاصل ہے، باہم مشورہ سے موسیقی کا انتخاب کریں تو بہتر ہے۔ پس منظر میں بھی موسیقی یا اس کے اثرات دئے جاسکتے ہیں۔

آواز نشریات میں آواز کی اہمیت ظاہر ہے۔ اگر مطرب، مقرر اور ادکار کی آواز میں دلکشی نہ ہو، تو یہ مشکل ہے کہ سامعین کوئی دلچسپی لیں۔ بلکہ ان کو کامل آزادی رہتی ہے کہ وہ فوراً دوسری نشر گاہ کا پردہ گرام سننے لگیں یہی وجہ ہے کہ کسی فن کار کی فنی صلاحیتوں کا امتحان لینے سے پہلے اس کی آواز کا امتحان لیا جاتا ہے۔ نشر گاہ ایک پبلک ادارہ ہے۔ حکام کا بے جا دباؤ امر کی دولت اور ادب باب نشر کی جانبداری وغیرہ سامعین کی پسند اور ان کے ذوق کے مقابلہ میں بے اثر ہے۔ سننے والوں کی پسند طرح طرح کی ہوتی ہے۔ کسی کو باریک آواز پسند ہے کسی کو موٹی آواز بھلی لگتی ہے کوئی اوسط قسم کی آواز پسند کرتا ہے۔ بعض ایسے ہیں جو مردوں کی آواز میں قد سے لوچ اور نزاکت کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض عورتوں کی آواز میں مردوں کی آواز کا رعب اچھا سمجھتے ہیں۔ پسند کی توخیر کوئی حد ہی نہیں مگر ”نا پسند“ کی حدیں مقرر ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا جو خیر خواہٹ والی آواز اچھی کہے۔ کون ہوگا جو ایک تو تے سے سقراط کی کہانی سنے جو ہر بار سقراط کو ”ٹھک لات“ کہتا ہے؟ کون ایسا ہے جو برٹش میوزیم پر تقریر سننے کے لئے ریڈیو کے قریب بیٹھے اور برٹش کو ”بہ بہ بہ برٹش“ اور میوزیم کو ”مہ مہ مہ میوزیم“ سننا پسند کرے؟ بعض اصحاب کی زبان موٹی ہوتی ہے اور وہ الفاظ صاف طور پر دانا نہیں کر سکتے۔ پکے نہ ہونے کے باوجود بھی ڈانی کے ساتھ بولنے یا پڑھنے سے قاصر ہیں۔ ایسے اصحاب کے لئے نشر گاہ کا دروازہ بند ہے اور مانی کرو فون مردہ اس میں ارباب نشر کا تصور نہیں بلکہ قدرت ذمہ دار ہے بعض محرضین کا کہنا ہے کہ ”پھر یہ لوگ کیا کریں؟“ لیکن

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ٹکراؤٹ بال نہیں کھیل سکتا، بہرہ گاہا نہیں سن سکتا اور اندھا ایم سی سی (M.C.C.) کا میچ نہیں دیکھ سکتا تو اس میں محض اسپورٹنگ کلب، (Mohammedan Sporting Club)، گوئیے اور ایم سی سی کا کیا تصور ہے؟

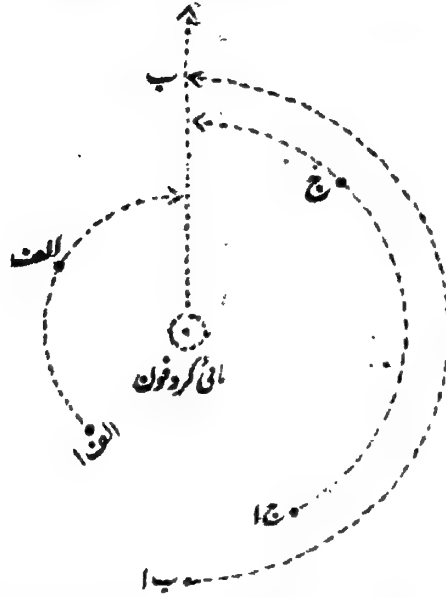
ہم فاصلہ کے ذریعہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ آواز کس طرف سے آرہی ہے اگر ایک سے زیادہ آوازیں ہوں۔
فاصلہ تو ان کے باہمی فاصلہ کو بھی ایک حد تک بتایا جاسکتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سمت اور فاصلہ میں قریبی تعلق ہے ان میں سب سے زیادہ اہمیت مبداء آواز اور مائی کرو فون کے باہمی فاصلہ کو حاصل ہے کیونکہ فاصلہ کا علم ہو جانے سے سامعین اصلی منظر یا یہ الفاظ دیگر تصور کردہ منظر کا حقیقی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ہم نہایت آسانی کے ساتھ یہ پہچان سکتے ہیں کہ آواز دائیں جانب سے آرہی ہے یا بائیں جانب سے۔
 دائیں جانب سے آنے والی آواز ہمارے دائیں کان میں بمقابلہ بائیں کان کے جلد داخل ہوگی اور اس طرح ہم جان لیں گے کہ آواز ہماری دائیں جانب سے آئی ہے۔ برخلاف اس کے آگے پیچھے اور اوپر نیچے کا فرق اتنا واضح نہیں ہوتا۔ ذیل کے نقشہ کو ملاحظہ کیجئے:



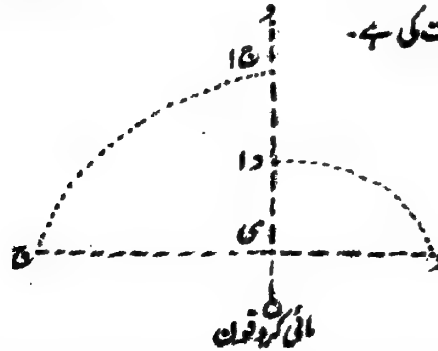
فرض کیجئے کہ آواز مقام الف سے آرہی ہے تو ہم آسانی سے کہہ سکیں گے کہ مبداء آواز کا بائیں جانب ہے یا اگر ت سے آئے تو سمجھ لیا جائے گا کہ سامنے سے آرہی ہے۔ اگر آواز مقام ج سے نکلے تو مبداء آواز دائیں رخ پر ہوگا۔ اسی طرح اگر الف ت اور ج سے آوازیں آئیں تو ان کا رخ ترتیب وار بائیں پچھلا اور دایاں ہوگا۔ برخلاف اسکے ہم الف الف الف ب ب ب آ اور ج ج ج میں فرق نہیں کر سکیں گے کیونکہ یہ نقاط دونوں کانوں سے متوازی فاصلہ پر واقع ہیں۔ جانور بالعموم اپنے کان کھڑے کر کے اصلی رخ آواز کا دریافت کرتے ہیں، ہم اپنے دونوں کانوں کی مدد سے بائیں اور

دائیں کا فرق بتا سکتے ہیں مگر انکر و فون ایک کان ہے۔ اگر ہم دو انکر و فون استعمال کریں اور دونوں کی نشریات دو مختلف ٹرانسمیٹروں (Transmitter) اور لاؤڈ اسپیکروں (Loud speaker) پر سنی جائیں تب بھی دائیں اور بائیں کا فرق نہیں بتا سکتے۔ اور ایک نقشہ ملاحظہ کیجئے:



الف الف اب ب ا اور ج ج ا سے آنے والی آوازوں کا حجم ایک ہو تو ان آوازوں کے مقامات کا تعین نہیں کیا جاسکے گا۔ یعنی الف سے آنے والی آواز بالکل ویسی ہی ہوگی جیسی کہ الف ا سے آنے والی آواز۔ اصل اہمیت فاصلہ کی ہو اور فاصلہ ہی سے مبداء آواز کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کوٹھے سے گفتگو کر رہا ہے اور اس کا جواب دوسرا شخص نیچے مرٹک پر سے دے رہا ہے تو اس کیفیت کو بغیر کوٹھے اور مرٹک کے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص مائی کرو فون کے قریب ہواؤ دوسرا دور تو بالکل وہی اثرات ہونے بشرطیکہ بات چیت میں کوٹھے کا حوالہ دیدیا جائے اور لب و لہجہ سے دوری کا اظہار ہوتا ہو۔

اب تک ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ آواز اور فاصلہ کی کیا اہمیت ہے اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ سامعین اداکاری کی حرکات حرکت "سن" سکتے ہیں سمت کی تبدیلی، فاصلہ کی تبدیلی یا سمت اور فاصلہ دونوں کی تبدیلی سے یہ پہچان لیا جاسکتا ہے کہ مبداء آواز نہٹ گیا ہے یا آواز پیدا کرنے والے جسم نے حرکت کی ہے۔



اس نقشے کے مطابق فرض کیجئے کہ مبداء آواز مقام ج سے حرکت کرتا ہوا سیدھی سمت میں مانگر دفون کے سامنے سے گزرتا ہوا مقام د تک پہنچتا ہے۔ اس حرکت کی وجہ سے سامعین پر یہ بھی اثر ہو سکتا ہے کہ مبداء آواز مقام ج سے حرکت کرتا ہوا مقام سی تک آیا اور پھر مقام د پر واپس ہو گیا، کیونکہ ج سی اور ج آئی کا باہمی فاصلہ ایک ہے۔ جب مبداء آواز مقام سی تک پہنچنے کی کوشش میں د آئی کا فاصلہ طے کر چکا تو اس مقام سے نکلنے والی آواز کا۔ سی د اور سی د آ کا فاصلہ برابر ہے اس لئے ہمارے پچھلے ادعا کے مطابق کوئی فرق نہ ہوگا۔

صرف آواز پیدا کرنے والے اجسام کی حرکتوں بلکہ بے آواز اجسام کے وجود کو بھی محسوس کر لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان کے وجود سے آواز کے حجم میں فرق پڑے۔ فرض کیجئے کہ مانی کرو دفون کے قریب دو آدمی بیٹھ باتیں کر رہے ہیں اگر ان کی بات چیت کے دوران میں بڑے جسم والی کوئی چیز ان کے اور مانی کرو دفون کے درمیان حائل ہو جائے تو اس کا وجود محسوس ہو سکے گا۔ اگر کسی اسٹوڈیو (Studio) کے باہر مکمل خاموشی ہو اور اس خاموشی کے عالم میں اسٹوڈیو کا دروازہ یا کھڑکی کھولی جائے تو اس کی وجہ سے اسٹوڈیو کی فضا اور ہوائیں حرکت ہوگی اور یہ حرکت محسوس کی جاسکتی ہے۔

صرف آواز پیدا کرنے والے اجسام کو حرکت دیکر اور ان کے فاصلہ میں کمی بیشی کر کے آواز اور فاصلہ کا فرق ظاہر کیا جاسکتا ہے بلکہ خود مانی کرو دفون کو ہٹا کر بھی اثر پیدا جاسکتا ہے۔ سامعین یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ مانی کرو دفون ہٹایا جا رہا ہے یا خود مبداء آواز بہت گیا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں صرف فاصلہ کا فرق پڑتا ہے مثلاً یہ کہ اگر مبداء آواز مانی کرو دفون سے دس فیٹ دور ہو جائے یا مانی کرو دفون کو مبداء آواز سے دس فیٹ دور کر دیا جائے تو نتیجہ ایک ہی ہوگا۔ البتہ بعض صورتوں میں سامعین خاص حالات کے تحت بتا سکیں گے کہ کس کو ہٹایا گیا ہے مثلاً یہ کہ کسی ڈرامہ میں دیوار کی گھڑی کی آواز کا حجم بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہو جائے تو سامعین پر یہ اثر ہو سکے گا کہ مانی کرو دفون گھڑی کے قریب کر دیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر گھڑیاں دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ برعکس اس کے پیروں کی آواز بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہو جائے تو وہ یہ سمجھنے میں بالکل حق بہ جانب ہوں گے کہ کوئی شخص چلتا ہوا مانی کرو دفون کے قریب آیا ہے۔ اگر ہر دو مثالوں کو عملاً بالکل الٹ دیا جائے یعنی یہ کہ گھڑی کو مانی کرو دفون کے قریب کیا جائے اور کوئی شخص ایک جگہ کھڑا کھڑا چلنے کی آواز پیدا کرے اور مانی کرو دفون آہستہ آہستہ اس کے قریب لیجا کر چلنے والے کے قریب آنے کا اثر پیدا کیا جائے تو سامعین پہچان نہیں سکتے۔ کیونکہ اب بھی وہی سمت و فاصلہ کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں اور ایک چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص تقریر کرتے ہوئے اپنا سر ہٹائے یا سر نیچے کی طرف کر لے تو یہ حرکت ”سنائی دیتی“ ہے۔ آواز کا سمتی اثر محسوس ہوتا ہے۔ والٹن اور ہیا نو جیسے گونجنے والے باجوں کو بجاتے وقت یہ اثر کم محسوس ہوتا ہے، لیکن غزنی (Ghani)

باجوں اور ان باجوں کو بجاتے وقت جو منہ سے بجاتے جاتے ہیں یہ زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ سمت بل دی گئی ہے۔

حجم جب معمولی بات چیت میں آواز کے حجم کو اہمیت حاصل ہے، تو نشریات میں یقیناً اور زیادہ ہوگی۔ کیونکہ بات چیت میں بہت سی باتیں آنکھ اور ہاتھ پیر کے اشاروں اور ہونٹوں کی حرکات سے بھی سمجھ میں آجاتی ہیں نشر میں صرف سامعین کے کان اور تخیل کا کام ہے۔ اگر حجم میں کمی زیادتی ہو تو نشر پر برا اثر پڑے گا۔ یہ واقعہ ہے کنٹرول پنل (Control Panel) مشین کا وہ حصہ جہاں آواز کو ضرورت کے مطابق بڑھایا یا کم کیا جاتا ہے) کے ذریعہ آواز کو گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے مگر جس طرح آپ پچیس کینڈل پاور (Candle Power) کے قلم سے صرف پچیس کینڈل پاور کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں، موثر اتنی ہی تیز دوڑا سکتے ہیں جتنی کہ اس میں طاقت ہے اسی طرح کنٹرول پنل سے آواز کو اتنا ہی گھٹایا بڑھا سکتے ہیں جتنی کہ اس میں گنجائش موجود ہے۔ اداکار کی آواز اور کنٹرول پنل میں جتنی صلاحیت اور طاقت ہوگی اتنا ہی کام لیا جاسکے گا۔ بعض گونے، مقرر اور اداکار مائی کرو فون سے دور بٹھائے جائیں تو وہ آہستہ آہستہ کھسک کر خود ہی قریب آجاتے ہیں۔ ان کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ بعد کی وجہ سے ان کی آواز دور تک نہیں جا رہی ہے بعض دوسروں کو بلند آواز سے بولتے ہوئے سن کر خود بھی بلند آواز میں بولنے لگتے ہیں۔ واضح رہے کہ اداکار اور مائی کرو فون کا درمیانی فاصلہ اس کی آواز کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ غلط خیال ہے کہ بلند آواز سے بولے تو آواز دور تک جائے گی۔

عام طور پر حجم (Volume) اور رفتار (Velocity) کو غلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ حجم تو آواز رفتار کی بلندی یا پستی کا نام ہے لیکن رفتار یہ ہے کہ فی منٹ آپ کی زبان سے کتنے الفاظ ادا ہو رہے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص فی منٹ سو لفظ ادا کر رہا ہے اور اس سے کہا جائے کہ وہ رفتار تیز کر دے تو وہ فی منٹ ڈیڑھ سو لفظ ادا کر کے کہنے کے لئے کہا جائے تو کھلے الفاظ بولنے لگا۔ ڈرامہ کے کس حصہ کو کس حجم اور رفتار سے ادا کیا جائے اس کا تعین بھی مکالمے کی مناسبت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ سرگوشیاں کم حجم کی ہوں گی۔ لڑائی کا مکالمہ تیز رفتار کے ساتھ ادا ہوگا اور ڈرائنگ روم کی گفتگو ٹھہر لیا انداز کی ہوگی۔ میں پھر اس نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ کامیابی نشر کے لئے اداکار کے مکالمے کے ساتھ ساتھ اس کے آواز کے حجم اور رفتار کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

نشریات میں صوتی اثرات کو وہی اہمیت حاصل ہے جو تھیٹر یا سینما میں سین سینری، صوتی اثرات لباس، فرش، فرنیچر اور روشنی کو حاصل ہے لیکن صوتی اثرات کے سلسلہ میں

اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھئے کہ وہ اس وقت تک استعمال نہ کئے جائیں جب تک خاص تاخیر پیدا کرنے کے لئے انکی ضرورت نہ ہو۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ بہت سی مانوس آوازیں لاؤڈ اسپیکر پر صبح اور حقیقی شکل میں سنائی نہیں دیتیں۔ تجربہ کے طور پر آپ سینما میں تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے کوئی ناطق فلم دیکھئے۔ آپ کو بہت سے صوتی اثرات ایسے سنائی دیں گے جو بالکل بے معنی ہیں اور ان کو بغیر فلم دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ان صوتی اثرات سے واقفیت حاصل کر لیجئے، مثلاً بچے کے رونے کی آواز، سیٹی، متعدد گھریلو اور جنگلی جانوروں کی آواز، ٹیلیگرافی آلہ کی آواز وغیرہ۔ اس کے مقابلہ میں آبشار اور بارش، گائے اور بکری کا دودھ دھنا، فٹ بال کی آواز مختلف اجسام کے زمین پر گرنے کی آواز وغیرہ ہے۔ ان آوازوں سے ہم مانوس ہوں گے مگر وہ ایک دوسرے سے اتنی ملتی جلتی ہیں کہ بغیر مکالمہ اور حوالہ کے تمیز کرنا مشکل ہے۔

ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

اناؤنسمر: سرور نے خانصاحب کے مکان سے فوراً نکل جانے کا ہتھیہ کر لیا ہے۔ ارشاد بھی اس تخلیق کا موافق ہو دونوں انتہائی عجلت میں اپنا سامان اٹھاتے اور بڑے دروازے کھولتے ہوئے خانصاحب کے جہنم نامکان سے نکل جاتے ہیں۔

(بارش کا اثر)

سرور: (مائی کرو فون سے ذرا دور ہو کر) ارشاد خدا کے لئے دروازہ بند کرنے کے لئے نہ رکو۔ چلو جلدی چلو

ارشاد: (مائی کرو فون کے قریب سے) اچھا مگر میرے لئے ٹھیر تو دیکھو گر پڑو گی۔ کیس چوٹ نہ آجائے۔

سرور: (مائی کرو فون کے قریب سے) مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں میں یہاں سے جلد نکل جانا چاہتی ہوں۔ افوہ یہ ایک لعنت ہے۔ کیوں ہے تا۔

ارشاد: ”ہاں یقیناً ہے۔ اگر ہم کو ریل نہ ملے تو رات ایشین میں ہی بسر کریں گے“

اس مکالمے میں بارش کا اثر شریک کیا گیا ہے مگر کہیں حوالہ نہیں دیا گیا۔ بارش کا اثر فضا کی خلل سمجھا جاسکتا ہے

جب تک کہ مکالمہ میں اور اناؤنسمر کے تعارف میں تعارف میں بارش کا ذکر نہ ہو مکالمہ سہم رہیگا۔ تھوڑی سی تبدیلی سے دیکھئے کتنا فرق ہو جاتا ہے اور مطلوبہ ذہنی تصویر کتنی مکمل ہو جاتی ہے۔

اناؤنسمر: سرور نے خانصاحب کے مکان سے فوراً نکل جانے کا ہتھیہ کر لیا ہے۔ ارشاد بھی اس تخلیق کا موافق ہے۔

دونوں انتہائی عجلت میں اپنا سامان اٹھاتے اور بڑے دروازہ کو کھولتے ہوئے موسلا دھار بارش کی پردائے بغیر خانصاحب کے جہنم نامکان سے نکل جاتے ہیں۔

(بارش کا اثر)

سرور: (مائی کو دفون سے ذرا دور ہو کر) ارشاد خدا کے لئے دروازہ بند کرنے کے لئے نہ رکو۔ چلو جلدی چلو۔
 ارشاد: (مائی کو دفون کے قریب سے) اچھا مگر میرے لئے ٹھیکر تو دیکھو کچھ ٹپ ہے مگر پڑو گی کہیں چرٹ نہ آجائے۔
 سرور: (مائی کو دفون کے قریب سے) مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں، میں جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ افوہ۔
 بارش ایک لعنت ہے۔ کیوں ہے نا۔

ارشاد: ہاں یقین ہے اگر تم کو ریل نہ لے تو رات اٹیشن ہی میں بسر کریں گے۔
 آپ نے دیکھا کہ خط کشیدہ الفاظ سے مکالمہ کا سارا ابہام جاتا رہا اگر مکالمہ میں اور اناؤنسر کے تبصرہ میں بارش کا حوالہ نہ دیا جائے تو سرور جس لعنت کا ذکر کر رہی ہے اس سے بارش کا مفہوم نہیں نکلتا بلکہ خانصاحب کا مکان متصور ہوتا ہے۔

صوتی اثرات تین چار طریقوں سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو انسان خود اپنے ہاتھوں سے کام لیکر مختلف اثرات پیش کر سکتا ہے مثلاً دیا سلائی سلگاتا ہے۔ طباخچہ مارتا ہے۔ گھڑی میں کھنچی دیتا ہے۔ کوئی ساز بجاتا ہو وغیرہ وغیرہ دوسرا ذریعہ میکا کی ہے۔ گو اس میں بھی انسان کی ضرورت ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔ انسانی ہاتھوں کی تھوڑی بہت مرد سے کام چل جاتا ہے۔ میکا کی ذریعہ کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی ٹب میں تھوڑا سا پانی بھر کر اس کا فوارہ کھول دیا۔ فوارہ کا پانی جب ٹب کے پانی پر مسلسل گرتا ہے تو بارش کا اثر پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ گھڑی یا مگر دفون کے قریب رکھ دی اور مطلوبہ گھنٹے بجانے لگی۔ بجلی کے ذریعہ سے بھی صوتی اثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے اثرات کے ریکارڈ تیار کر لئے گئے ہیں جن کو مکالمہ کی مناسبت سے بچایا جاتا ہے۔ مختلف صوتی اثرات کو چاہئے وہ میکا کی ذریعہ سے پیش کئے جائیں یا ان کے ریکارڈ بچائے جائیں، آپس میں ملانا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے حقیقی اثر پیدا کرنا نہایت مشکل اور عہارت کا کام ہے۔ اس کی ٹیکنیک وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسٹوڈیو، مائی کو دفون، گرموفون ٹرن ٹیبل اور ڈریٹیک کنٹرول پنل سے واقف ہیں اور ان سب کی فنی خصوصیات جانتے ہیں۔ مگر میں ان کا ذکر عمدہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ فرایض ڈرامہ اور ٹیٹر کے پیش کرنے والوں کے ہیں اور ڈرامہ نگاروں سے ان کو بہت کم تعلق ہے۔ صوتی اثرات کے سلسلہ میں ڈرامہ نگاروں کو یہ ہمیشہ ذہن نشین رکھنا ہے کہ ”ایک آؤٹس اشارہ ایک ٹن نقالی کے برابر ہے“

صوتی اثرات کے ضمن میں گرموفون ٹرن ٹیبل بڑا مفید آلہ ہے۔ ہم بہ یک وقت چھ اور اس سے زیادہ ریکارڈ لے (Gramophone Turn Table) ایسا گرموفون پر جس پر بیک وقت دس دس اور بارہ ریکارڈ مختلف یا ایک ہی حجم اور رفتار کے ساتھ بچائے جاتے ہیں۔ (Dramatic Control Panel) مشین کا وہ حصہ جس سے ڈرامہ کی مناسبت سے شین کنندہ یا کوئی اور متعلقہ شخص اداکاروں کی آواز پر صوتی اثرات ریکارڈ اور موسیقی وغیرہ کو ملاتا یا ان کے حجم میں مناسب کمی بیشی کرتا رہتا ہے۔

جاسکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کو ایک ایسا منظر پیش کرنا ہے جس میں بچہ کے رونے کی آواز، کسی گونے کا گانا، موٹر مارن، ریل، مجمع کا شور وغل اور ہوائی جہاز کے اثرات پیدا کرنا ہیں تو ہم بہ یک وقت یہ تمام اثرات ریکارڈ کے ذریعہ سے پیدا کر سکتے ہیں اور حسب ضرورت ان کے حجم کو کم زیادہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً کبھی گانے کا حجم بڑھا کر دوسرے اثرات پر غلبہ پیش کر دئے کبھی مجمع کا شور وغل زیادہ کر دیا۔ کبھی ہوائی جہاز کی آواز تیز کر دی۔ اسٹیجی ڈرامہ میں تو سینیئر اور فرش، فرنیچر بدلنا پڑتا ہے مگر ریڈیو میں مختصر صدیقی اثر اور مکالمے کے حوالہ سے ایک مقام دوسرے مقام میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

اسٹوڈیو میں آپ کو بے شمار چیزیں ایسی ملیں گی جن کو دیکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ان کا مصرف کیا ہے۔ ایک لمبی میز چھ مختلف سطحوں کی ملے گی۔ ایک سطح گٹری، ایک دھات کی ایک مندرے کی۔ ایک مصنوعی چھرا اور دو مختلف قسم کے ربر کی۔ ان سطحوں پر سلاخوں وغیرہ سے ضرب لگانے اور رگڑنے سے کئی قسم کی آوازیں نکلتی ہیں۔ حتیٰ کہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اور ہندو کی آواز تک اٹھیں سے نکالی جاسکتی ہے۔ ایک تاروں والا بڑا پیچرہ ہے جس کے اندر موٹر سے چلنے والا پنکھا لگا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ سے معمولی ہوا سے لیکر طوفان خیز ہوا تک کا اثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔

نثری اداکاری اولین خصوصیت اپنی آواز پر مبنی ہے واضح رہے کہ خطیبانہ انداز آج کل کام نہیں دیتا۔ وہ زمانہ گزر چکا جب اس انداز سے دل ہل جایا کرتے تھے آج کل اس انداز کا بچہ بھی مذاق اڑاتے ہیں، اس میں قطعاً صداقت و تاثر نہیں ہوتا۔ چونکہ نشر اور آواز لازم و ملزوم ہیں اس لئے یہ احساس ضروری ہے کہ اصلی آرٹ آواز میں پوشیدہ ہے اور یہ اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اداکار آواز پر قدرت حاصل کر لے اور کوشش سے یہ مشکل نہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض گانے والے اول اول گھڑے میں منہ ڈال کر لاپا کرتے تھے۔ یہ دراصل آواز میں شن پیدا کرنے کا ایک ہندوستانی طریقہ تھا۔ آواز میں شن پیدا کرنا ناؤنسر اور اداکار کا فرض ہے۔ اس کو اسقدر حسین بنائیے کہ وہ سرے پہن اور دلکشی کا کمال حاصل کر لے۔ اس میں پک پیدا کی جاسکتی ہے۔ آواز کو اتنا حساس بنایا جاسکتا ہے کہ وہ ہر جذبہ، ہر گانے خیال اور ہر تاثر کو پیش کر سکے۔ اس میں اتنی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے کہ وہ زیر دہم اور خفیف سے خفیف آواز چڑھاؤ کو ظاہر کر سکے۔ نثری ڈراموں میں صرف آپ کی آواز ہی ”شخصیت“ کو پیش کر سکتی ہے۔

اداکار کو دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ایک تو یہ کہ وہ نہایت توجہ کے ساتھ اپنا پارٹ دیکھتا رہے اس کا دھیان ایک ایک حرف پر رہے۔ دوسرے وہ آواز کے آثار چڑھاؤ اور حجم کا بھی خیال رکھے۔ اداکار کو گفتگو کرتے وقت اپنے اعضا، اعصاب میں کوئی حرکت کرنا چاہئے یا نہیں، یہ بھی اپنی جگہ اہم مسئلہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مکالمہ کی مناسبت سے اس قسم کی حرکات کی جائیں تو جذبات پیدا کرنے میں مدد

ملتی ہے۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حرکات و سکنات سے بہت کم کام لیا جائے کیونکہ اس طرح اداکار جلد تھک جاتا ہے۔ ڈراموں کی نشر کے وقت غیر متعلق لوگوں کو ناظرین کی حیثیت سے اسٹوڈیو میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اسٹوڈیو کے ناظرین اگر آنکھوں آنکھوں میں یا مسکراہٹ یا کسی اور ذریعہ سے اداکاری کی داد دیں یا کسی اچھے جملہ پر اپنے طور پر ملاحظہ ہوں اور اداکار کو اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دھیان پٹ جاتا ہے اور وہ اس کے بعد کے موقعوں پر ان کی طرف تحسین و داد کی خاطر غیر شعوری طور پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسے لائق پرفیسر کو جانتا ہوں جو اپنے مضمون کے بہت اچھے اُستاد اور عمدہ ناشر ہیں مگر ان میں ایک کمزوری یہ ہے کہ اگر نشر کے وقت ان کے اسٹوڈیو میں کوئی شخص رہتا ہے تو اس سے وزن کم از کم اناؤنسر ہی سے اپنے خیالات اور مزاحیہ نکات کی داد لینے کے لئے گردن موڑ کر دیکھتے ضرور ہیں۔

نثری اداکار کو اپنا پارٹ یاد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یاد کرنے میں ایک تو وقت ضائع ہوتا ہے دوسرے ذہن سے ذہین اداکار بھی اپنا پارٹ بھول سکتا ہے۔ نشر کے وقت اسٹیج کی طرح کوئی ”لقمہ دینے والا“ تو ہوتا نہیں اس لئے حفظ کرنا بلا ضرورت ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کو یہ چاہئے کہ وہ اپنے پارٹ کو اتنی مرتبہ پڑھ لے کہ الفاظ بالکل بے اختیارانہ طور سے اس کی زبان سے ادا ہوں، اور سننے والے یہ محسوس نہ کریں کہ سارا مضمون پہلے ہی سے اس کے ذہن نشین ہو گیا ہے اور وہ پڑھ رہا ہے۔

اوراق اُلٹنے میں انتہائی احتیاط کرنی چاہئے۔ مانی کرو فون بے حد حساس ہوتا ہے معمولی سانس تک کی آواز نشر ہو سکتی ہے۔ اگر ورق اُلٹنے کی آواز سامعین سن لیں گے تو ان کو احساس ہوگا کہ پارٹ پڑھا جا رہا ہے اور سارا اثر زایل ہو جائے گا۔ اگر کسی اداکار کا کام ختم ہو گیا ہے یا اس کا پارٹ شروع ہونے میں کچھ دیر ہے تو اس کو بالکل خاموش رہنا چاہئے۔ دوسرے اداکاروں سے کاٹنا پھوسی کرنا اشارہ کرنے سے قطعی احتراز کرنا چاہئے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ پہلا ڈرامہ جو نثری ضروریات کو خاص طور پر پیش نظر رکھ کر لکھا گیا، ۱۹۲۲ء کی کرسمس کی شام کو لندن کی نشر گاہ سے بچوں کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔ اس کا نام ”دی ٹرتھ اباوٹ فادر کرسمس“ (The Truth About Father Christmas) تھا، اس کے بعد ریچنلڈ برک لی (Reginald Berkley) کا ڈرامہ ”واہیٹ شیو“ (White Chalk) ۱۹۲۵ء میں نشر کیا گیا۔ اُس وقت سے لیکر اب تک اربابِ بے بی، بی، تھی نثری ڈرامہ اور اداکاری کے سلسلہ میں ان تھک کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی قطعی تکنیک دریافت نہیں ہوئی ہے اور نہ اداکاری کے مسئلہ تفصیلی اصول بیان کئے گئے ہیں تاہم اربابِ نشر کی اس وقت تک کی کوششوں کی داد دیتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اب تک جو جستجو کی گئی ہے اور جو اصول و قواعد اس وقت تک مرتب ہو چکے ہیں انہیں مقامی ضروریات کے منظرِ تبدیلی کر کے ان سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرزا ظفر احسن بی۔ اے (عثمانیہ)

خان آرزو کی مثنوی "شور عشق"

خان آرزو کا پایہ شاعری میں کتنا بلند تھا اور قدرت کی طرف سے وہ کیسا ذہن رسا لیکر آئے تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ صرف چودہ سال کے سن میں درسیات سے فارغ ہو کر شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے اور اصناف شاعری میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ میر حسن کی روایت کے مطابق انھوں نے سات دیوان لکھے "وہر کے پہلو بہ نظیری و فغانی میزند" افسوس کہ میر حسن نے اُن سات دیوانوں کی تفصیل نہیں لکھی، تاہم ہمیں اپنی تحقیق سے چار دیوانوں کا نام اور بعض کا پتہ معلوم ہوا ہے۔ ایک دیوان انھوں نے شفیعا کے اثر کے رنگ میں کہا دوسرا بابا فغانی کے دیوان کے جواب میں تیسرا محمد قلی سلیم کے جواب میں اور چوتھا کمال خجندیہ کے دیوان کے جواب میں۔ اسی طرح اکثر و بیشتر اساتذہ کی مثنویوں کے جواب میں مثنویاں لکھیں مثلاً ملا ظہوری کے ساقی نامہ کے جواب میں ساقی نامہ کہا اور نام اس کا عالم آب رکھا۔ ایک مثنوی بحر غیر متعارف میں بھی جس کے دو شعر یہ ہیں:

آدم گل باغ است جهان شیطان باشد نا فرمان

راست براست رقم کردم شاخ سرو تسلیم کردم

مثنوی کی مثنوی سوز و گداز کے رنگ میں جوش و خروش بھی۔ حکیم سنائی کے حدیقہ کی بحر میں ایک دوسری مثنوی بھی اور ملا زلالی کی مثنوی محمود و لیا ز کے جواب میں انھوں نے شور عشق بھی۔ مثنویوں کے علاوہ خمسات و ترکیب بند و ترجیع بند و مقطعات و توارخ وغیرہ بھی ہیں۔ جن کا ذکر سفینوں و تذکروں میں موجود ہے۔

تعب ہے کہ خان آرزو کا فارسی کلام تو اس قدر لمبا ہے لیکن میر و سودا کا استاد اُردو کا ایک دیوان بھی نہ چھوڑا اس کا سبب مولوی محمد حسین صاحب آرزو سے سنئے:

"خان آرزو کو زبان اُردو پر بھی دعویٰ پہنچتا ہے جو اسطرح کو فلسفہ منطق پر ہے۔ جب تک کل منطقی اسطرح کے

۱۔ سفینہ عشرت باکی پور لاہوری۔ ۲۔ صفحہ ابراہیم۔ ۳۔ مجمع الفخائل جلد اول پتہ لاہوری۔ ۴۔ مجموعہ نغز۔ ۵۔ خلاصۃ الکلام۔

۶۔ سفینہ خوشگو قلمی۔ ۷۔ مقدمہ عطیہ کبریٰ قلمی کتب خانہ جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ ۸۔ سفینہ خوشگو۔ ۹۔ اسپرنگر اوردہ کئیلاک صفحہ ۳۳۔ ۱۰۔ آب حیات ذکر خان آرزو

خیال کہلاتے رہیں گے تب تک اہل آرزو خان آرزو کے خیال کہلاتے رہیں گے۔ فارسی تصنیفات کی مہوں نے انہیں کوئی دیوان آرزو میں نہ لکھنے دیا اس لئے ان کے باب میں اس قدر گھٹنا کافی ہے کہ خان آرزو وہی ہیں جن کے دامن ہریت سے ایسے شایستہ فرزند پرورش پا کر اٹھے جو زبان آرزو کی اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جلت اور ذومعنی الفاظ پر تھی۔ اُسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور اداسے مطالب پر لے آئے یعنی مرزا جان منظر۔ مرزا رفیع۔ میر تقی میر۔ خواجہ میر درد وغیرہ۔

خان آرزو کے شاعر نہ تھے نہ اُسے اُس زمانہ میں کچھ کمال سمجھتے تھے البتہ چند متفرق اشعار برائے لفظ طبع کہے تھے۔ تیسرے نکات میں ان کے پانچ شعر دئے ہیں۔ قائم لکھنے بھی پانچ شعر دئے ہیں جن میں تین وہی ہیں جو تیسرے لکھے ہیں۔ گوردیسی نے آٹھ شعر دئے ہیں۔ علی لطف نے البتہ دو پوری غزلیں لکھی ہیں۔ اشعار کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ خان آرزو کو زبان آرزو پر بھی کافی عبور تھا دو شعر ملاحظہ ہوں

ہر صبح آؤ تا ہے تیری برابری کو کیا دن لگے ہیں دیکھو غور شید خاوری کو

رکھے سبارہ گل کھول آگے عند لیبوں کے چمن میں آج گویا پھول ہیں ترے شہیدوں کے

خان آرزو محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ تنقید میں بھی یدِ طولی رکھتے تھے اور اسی لئے غلام علی آزاد ان کو سراج الشعراء و طراز انصفا کہتے ہیں۔ صاحب نتائج الانکار ان کے متعلق لکھتے ہیں ”گرم ساز ہنگامہ سخن و بانار نقادی“ اخلاص لکھتے ہیں کہ ”ازجاہر زواہر اشعار لعل آبدار بخشاں را بنماک دخن نشانہ و زمین گلشن سخن را از شا دانی اندیشہ رسا سر سبز نمود“ حسین قلی خان عظیم آبادی ان کو ”سراج و باج محفل سخن دانی کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور خوشگو کہتا ہے:

”جو ہر اغراض آدمیت و حکیم امراض قابلیت۔ گوہر علم را بسی گرد آدیش آبروئے محیط اعظم حاصل، و ذہ شعرا بہ

یمن سایہ پرورش رہہ آفتاب عالمگیر و ظل“

ایک دوسرے مقام پر وہ خان آرزو کو دوسرے صائب کے لقب سے یاد کرتا ہے:

ہند از ذات او شدہ ایران بخدا ہست صائبائے دگر

حقیقت یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی نے ایسا جامع انسان دوسرا نہیں پیدا کیا۔ تاریخ، لغت، نجوم، فقہ، منطق، فلسفہ، تذکرہ نویسی، انشا پر دازی، شرح نگاری، انتقاد سخن، صرف و نحو اور شاعری ان سب میں استاد کی درجہ حاصل تھا۔ اس جگہ میر حسن کا یہ کہنا کہ امیر خسرو کے بعد ایسا صاحب کمال سننے میں نہیں آیا بہت کچھ حقیقت کہتا ہے۔ خان آرزو نے ملاوشتی یزدی کی ایک غزل کو تصحیف کیا تھا اور اپنے ہی ہاتھ سے سفید خوشگو میں لکھا تھا تاکہ یادگار رہے۔

لے ذکرہ قائم۔ لے ذکرہ گوردیسی۔ لے گلشن ہند لے خزانہ مامور۔ لے نتائج الانکار و طبع۔ لے ہمیشہ ہارسے شہر عشق۔ لے سفید خوشگو لے تذکرہ میر حسن۔

مخمس ہے جو: نو برکنم کہ از تو پیامے مرا بس است از باغ وصل جلوہ غامے مرا بس است
و رہشوم ز درد کلامے مرا بس است از تو نہیں تواضع عامے مرا بس است

در ہفتہ جواب سلا سے مرا بس است

عمرے اگرچہ داشتہ ام حب جاہ قرب می نیم از عداوت دوری پناہ قرب
اکنوں چو یا فتم کہ بود صعب راہ قرب نے صدر وصل خواہم دے پیشگاہ قرب

ہمرا ہی تو یکدوسہ گامے مرا بس است

ہر چند العطش زدہ ام بہر آب وصل گردیدہ ام باتش حسرت کباب وصل
قانع بہ جلوہ شدہ ام از حجاب وصل مخمنا نہ بنی طلبم از مشرب وصل

یک قطرہ بازماندہ جامے مرا بس است

چوں نقش یافتادہ گئے در رہ تو ام حیراں برنگ ہلہ دے برہ تو ام
دیدار جو گدائے در خسرو کہ تو ام بیہودہ گرد و عصہ جو لانگہ تو ام

گاہے کرشمہ گاہے خرامے مرا بس است

اے ز گس تو از مزہ گردید کجلاہ من بندہ ات بدعوی من آرزو گواہ
گذار کار من ز تغافل شود تباہ وحشی بگو بگو سگ کو بلکہ خاک راہ

یعنی ز تو نوازش نامے مرا بس است

ایک قطعہ بھی ملاحظہ فرمائیے جس سے اُن کی شہنشاہی ظاہر ہوتی ہے:

زاہد از مسجد سوئے میخانہ شب آمد مگر دین فروشہاں را آنجا خریدار سے بنود
من ہم از میخانہ رفتم جانب مسجد مرا گرچہ غیر از لغزش ستارہ رفتار سے بنود
مجھے دیدم کہ ہر یک را بجز بد گوئییم بعد تجدید وضو اشغال و اذکار سے بنود
یادم آمد مجلس متاں کہ از بس بیخودی بابد و نیک کسے این قوم را کد سے بنود
باز گشتم زان مکان لا حول گویاں سوئے دیر درد دین شان چو دیدم غیر آزار سے بنود

خان آرزو کی شہنشاہی شوق مجھے ہمدی دستیاب نہیں ہو سکی۔ عام تذکروں نے تو اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے

انتخاب دینا در کنار بعضوں نے اگر نام بھی دیا ہے تو غلط۔ اس ضمن میں سفینہ عشرت در گاداس، خلاصۃ الکلام و صفۃ ابراہیم علی ابراہیم، سفینہ خوشگوار مجمع النفایس خان آرزو بیت اہمیت رکھتے ہیں۔ در گاداس نے تقریباً پوری شہنشاہی اپنے سفینہ میں نقل کی ہے لیکن نام اس کا نہیں لکھا۔ علی ابراہیم نے اس شہنشاہی کا نام جوش و خروش

رکھا ہے اور یوں شروع کرتے ہیں:

خداوند اچھے گویم شرمسارم عرق پروردہ چوں ابر بہارم
انہوں نے چار توحیدوں۔ لغت، تعریف براق، معراج، تعریف سخن۔ تعریف ہندوستان حضرت دہلی
تعریف قبیل، تعریف شراب اور بہت سے عنوانات کو جو درگا داس نے اپنے سفینہ میں قبل آغاز مثنوی لکھے ہیں
ترک کر دیا اور مثنوی کو فوراً یوں شروع کر دیا ہے: خداوند اچھے گویم شرمسارم
اور آخر میں ایک خاتمہ پر مثنوی ختم کر دیتے ہیں جو یوں شروع ہوتا ہے:

ایا نالان دل لبریز دلدار

درگا داس کے یہاں بھی خاتمہ یوں ہی ہے لیکن سرخی بدلی ہوئی ہے یعنی بجائے 'خاتمہ' کے 'خطاب بعشق'
نمبر اول و نمبر دوم اور نمبر دو پر کتاب یوں ختم ہو جاتی ہے:

ایا نالان دل لبریز دلدار

علی ابراہیم کو اس مثنوی کے نام میں مخالطہ ہوا اور غالباً اس کا یہ سبب ہو کہ اس کا آخری شعر یہ ہے:

چو زین غننامہ در و دل بجوش است خطابش از خرد جوش و خروش است

خان آرزو نے ایک مثنوی جوش و خروش نامی بھی لکھی ہے لیکن وہ ملا نوحی کے 'سوز و گداز' کے جواب میں جو
ملا زلالی کی مثنوی محمود و آیار کے جواب میں انہوں نے شور عشق ہی کہی ہے جیسا کہ گردیزی نے بھی لکھا ہے سفینہ ختلو
میں اس مثنوی کا نام حسن عشق ہے لیکن یہ بھی کتابت کی غلطی ہے اس لئے کہ خان آرزو نے خود مجمع النفاث جلد
اول فولیو ۷۷ پر اپنی مثنوی شور عشق میں سے انتخاب دیا ہے جس میں قصہ کا کوئی انتخاب نہیں ہے ہاں شروع
کے وہ کل عنوانات موجود ہیں جو سفینہ عشرت میں درج ہیں۔ اسی کتاب میں فولیو ۱۲ پر بھی یونسی بیگ انسی کے
کے ذکر میں اپنی اس مثنوی کا جو محمود و آیار زلالی کے جواب میں کہی گئی ہے پھر ذکر کیا ہے اور نام اس کا شور عشق ہی
بتایا ہے۔

شعری کا قصہ دکن میں ایک نہایت اچھا شہر تھا۔ وہاں ایک عادل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اُس کے ایک
نہایت حسین و جمیل لڑکا تھا جس کا وقت سیر و شکار میں گزرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب شہزادہ شکار
کھیلنے گیا تو دن پرندوں و چرنندوں کا شکار کھیلتا رہا شام کو مع اپنے ساتھیوں کے محل کی طرف رخ کیا جب لوگوں
نے شہزادے کی واپسی کی خبر سنی تو شہر میں اژدحام عام ہو گیا۔ اسی مجمع میں ایک نوجوان بھی تھا جو شہزادہ کا عاشق

تھا وہ بھی معشوق کی دیدار کا منتظر تھا۔ شہزادہ کی سواری آئی، عاشق سے نظریں دوچار ہوئیں۔ شہزادہ نے پہچان لیا لیکن چشم پوشی کی۔ محل میں پہنچ کر کپڑے اتارے اور ہاتھ منہ دھویا۔ یہاں عاشق کا اضطراب و جنون بڑھتا جاتا ہے اور وہ معشوق کی گلیوں میں جا کر نہایت دلخراش مین کرتا اور روتا ہے اور شہزادہ کا نام لیکر اظہار عشق کرتا ہے۔ شہزادہ کی بڑی رسوائی ہوتی ہے اور عاشق راز کو طشت از بام کر دیتا ہے۔ جب معاملہ بہت بڑھ گیا تو لوگوں نے عاشق کے ہلاک کرنیکی تدبیر سوچی اور یہ رائے ہوئی کہ اس دفعہ جب وہ دکھائی دے تو اسے دربار میں لایا جائے اور خود شہزادہ اس سے کہے کہ:

بہائے وصل اینجا نقد جانست	برہ جان گرترا سودائے آنت
دریں سودا زیا نہا سودا باشد	ہلاک عاشقاں بہبود باشد

چنانچہ تمام لوگوں نے اس رائے کی تائید کی کہ اگر وہ بواہوس ہوگا تو چلا جائے گا اور اگر سچا عاشق ہوگا تو اپنے کو ہلاک کر لے گا، یوں شہزادہ رسوائی سے بچ جائے گا۔ دوسرے دن عاشق لایا گیا لوگوں نے اسے تاؤ دیا اور کہا:

مبادا چوں تو کس در عاشقی خوار	ز پہلوئے تو دل گر دید دشوار
بہائے وصل یار از نقد جانست	حیات خضر عن عاشقان است

عاشق نے جب یہ شرط سنی خوش ہو گیا فوراً خنجر نکالا اور اپنے سینہ کو زخمی کیا اور شہزادہ کے سامنے آیا:

بزنخمے سینہ خود ساخت گلشن	در آمد باغ حسرت در شاغفن
دل مانند گل خوین جگر را	بقل پر وید ز خیم نیشتر را
چو آمد رو بروئے قاتل خویش	لب شکرش کشاد از سینہ ریش
زبان موج خوں گرم دعا کرد	بکف لعل بودش رو نما کرد

غرض کہ عاشق خوں میں نہایا ہوا پہنچا۔ معشوق کے سامنے نماز بخودی ادا کی اور رکوع میں جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ شہزادہ نے جب یہ نظر دیکھا تو ہر دشت نہ کر سکا، بیتاب ہو گیا اس کی موت پر نوہ کیا اور خود بھی اسی کے ہمراہ عالم بقا کی طرف سدھارا:

پری دیوانہ ماچوں ایں جنیں دید	ز بیتابی بان زلف لرزید
بجائے زلف خود بر خاک افتاد	کو دیدہ جانشین سایہ شمشاد
الف بر سینہ از حسرت کشیدے	چو کبک نیم بسمل می طہیدے
تنش نیلی ز آسیب فتادن	پرافشاں گشت طاؤس گلشن
بشیون آچنناں پرداخت آں گل	کہ از ہر موفناں برداشت لبلسل

چناں آں کوہ تمکیں تار سر کرد
درستی اینقدر مقدور کس نیست
ہر سودا روح مجنوں ساختی شاد
بیک دیدن خراب ناز گشتن
ہمیں از چشم خونبار سے تو آید
کنوں ننگ است مارا زندگانی
چنین گفت و زجا برجست چوں آہ
قیامت ہر طرف سرزد ز ششیون
چراغ از نسیم عشق، افسرد
کہ اے خونِ دلت گلگونہ درد
قیامت کردہ عشق و ہوس نیست
بمزدن زندہ کردی نام فر باد
بمگزے مرگ را دمساز گشتن
زدست عشق پر کار سے تو آید
بود مردن حیات جاودانی
آہے جان پاکش رفت ہمراہ
کہ چاک جیب رفت آنسوئے دامن
ز جان افشانی پر داند مرد

خان آرزو نے اپنی اس شہنوی میں جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، سراپا دار داعی عشق کو نہایت وضاحت سے ادا کیا ہے اور ہر موقع پر حسن ترتیب، اور جزئیات کا استقصاء ملحوظ رکھا ہے جہاں کسی چیز کی صفت یا منظر کشی کرتے ہیں وہاں اُن کے قلم کی سحر آفرینیاں قابل دید ہیں۔ ایک موقع پر جس شہر کا یہ قصہ ہے اس کی منظر کشی کرتے ہیں:

شنیدم در دکن شہریت معمور
چہ شہر آئینہ آبادی دل
گل خود روش حسن لالہ رویاں
ہوا چوں نقشہ نے عشرت انگیز
بہر سودا برے سرمایہ شرم
نگہ ہر جا متاع دل خریدار
ز تاشیر جنوں پر در ہوایش
صراحی گردن ان در تیز دستی
سوادش شام عید طرہ حور
سرایش بہر معموریت منزل
تمامی سنبلیش زلف نکویاں
فضائے خانہ چوں آئینہ گلخیز
چو خورشیدش دکان دہری گرم
تماشا ہر طرف بازار بازار
سراسر اشک و آہ آب دہوایش
بہم چوں موج سے گلاب رستی

ایسے جنوں خیز خطہ میں ایک بادشاہ عادل کی حکومت کے پس منظر کو بہت کچھ مستحکم کر دیتی ہو ملاحظہ ہو:
در آنجا بود شاہ عدل گستر
رگ ابر کرم چین جنبیش
پرستش چوں کماں محکوم افلاک
بسان رحمت حق خلق پرور
جہاں چوں ہر در زیر جنبیش
رواں چوں آب کلکش بر سر خاک

جہاں را از نگاہش روح در تن
خانے پائے تمشت خون دشمن
ایک منظر اور ملاحظہ ہو۔ شہزادہ شکار کھیلنے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مقام جنگل ہی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ
ان کو شہزادہ کا سر پا ایسا دکھانا ہے کہ اس کو دیکھ کر لوگ سہل ہو جائیں۔ اس وجہ سے جنگل بھی اس کے درود
سے بہار آگیا ہے، شہزادہ شکار کھیلتا ہے اور تمام دن شکار کھیلنے کے بعد واپس آتا ہے۔ واپسی کے
وقت بھی اس کے حسن و جمال اور دبیر کو شاعر نے محفوظ رکھا ہے لیکن چونکہ اُسے معشوق کی صورت میں پیش کرنا
ہے اس لئے یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی گئی ہے۔ جزئیات کا احاطہ ملاحظہ ہو:

صبح باطلوعِ نشاءِ حمد و ش	شفق گلبادِ شونہی نترن پوش
دش فیض گلستانِ تبسم	بہار شش گل بدامانِ تبسم
ہوا با معتدل چوں چشمِ انساں	مزاج خرمی را آبِ حیاں
دل شہزادہ شد گرمِ طہیدن	کہ باید صید را درخوں کشیدن
زفرانش مہیا شد سواری	لا سیلاب در ہر کوپہ جاری
بروں آمد ر شہر آں شوخ چوں ماہ	نہار شش اختر تا بندہ ہمراہ
چو شد شام خطا و دامِ افسوں	سیاہی کرد بر مرغانِ شغوں
زخون طائراں چوں دستِ خود شست	بقفل آہواں شد شونیش بست
تفنگ اندازی آں ترک بدخو	سیاہی می ربود از چشمِ آہو
نشاہ گشتہ ہر داغِ پٹنگش	قرہ در پیش دستی از تفنگش

نام دن شکار کھیلنے کے بعد ظاہر ہے کہ شہزادہ خستہ ہو گیا ہو گا پیاس کا ضرور غلبہ ہوا ہو گا اس بات کو
بھی شاعر نے فراموش نہیں کیا ہے۔

بجو ش گرمی اندر آسماں یافت	بسوی سایہ خورشیدش عناں یافت
پریرد دلربایاں در رکابش	بلاگردان انداز خطابش
تھے چوں جاں سبکدچی سرشتہ	پرستش مروجہ بال فرشتہ
وگر چوں خضد گرم آبپاری	رداں اندرجلو ابر بہاری
بفکر آنکہ سازد آب را سرد	ز شور خویش محشر شورہ آورد

ہزارہ کا سر پا ملاحظہ ہو۔

پری دیوارِ شوخ تازہ پرور
رُخِ ادِ صفحہ دیوانِ محشر،

نمک در زخم از حسنش ملاحظت
دل و دین و دماغ و خانما سوز
برنگ غنچہ مینائے تبسم
زبان عذر مرثاں بر کشادے
تبسم آفرین صد بہانہ
کہ صد یا قوت پیش خط کشیدہ
خط او مصحف خط فرنگے
کہ ہر خارے شگفتہ زر گستاں

بہر آشکارش زندگانی،
پیمبر زادہ شاہد پرستی،
کہ مغز استخوانش بود نالہ
محبت کردے از خاک رہش گرد
خراکش تیشہ اورا موہو بود
کہ بایوسف بجاں میگرد سودا
ایا ز حسرت او عشق محمود،
بجز عریانی خویشش کفن نہ

چو فوں سودا در آمد در رگ و پے
تغیر بردش از جا، ہجو عالم
کنار از اشک شد آئینہ بازار
ز خود رفتے با استقبال صدا
اگر بر خاستے بنشستے از پا
بزور دل طمیدن بال ز درنگ
خطابش کردہ نالیدے بعد رنگ

سفید از عشق او چشم صباحت
قدش یک نیزہ غرید جہاں سوز
سراپاست صہبائے تبسم
چو چشمش حکم قتل عام دادے
لبش گر ریختے خون زمانہ
ہر پشت لعل لب خط دمیدہ
رخ او نو بہار لالہ رنگے
لگا ہش شد بہر باغ خراماں
عاشق کے سراپا کے ساتھ اس کا کیر کڑ بھی ملاحظہ ہوا
چوزلف اورا سیہ روزے جوانی
دماغ بخودی و جان مستی
برنگ نے ہمہ حسرت مقالہ
ز مجنوں داشت افزوں حسرت و درد
بہ گہسار دکن فدا داد بود
کینز ہمتش شوق زلیخا
ہلک بے نوائی بادشہ بود
لسان مردہ اورا پیرہن نہ
اب اسی عاشق کی بتیابی کو بیان کرتے ہیں:

بر آمد نالہ از ہر بند چوں نے
دگر گون گشت احوالش بہر دم
گر بیاں خندہ ز دبر و سئے گلزار
تخیل کردے آمد آدیار
بہر آواز پائے بجتے از جا
بصبر از بے خودی چوں کار شد تنگ
گہے با طالع برگشتہ در جنگ

”بلوٹاں خیز وریاںم فلسفہ دی
گے معشوق خود بودش مخاطب
”بت نوشین و عمر من از آں تلخ
تو اے سیل بلا باغ بہ بندی“
بہ ہڈیاں آدمے از گرمی تب
غدارت ماہ از دے غمہ ام سلخ“

اسی حالت میں وہ راز پشت از ہام کر دیتا ہے اور انتہائے عشق میں شہزادہ کا نام لے لیتا ہے:
شہے بر خاک را ہش زار دیدند ہمہ ز دنام شہزادہ شنیدند

جب اُس نے شہزادہ کا نام لیا تو لوگوں کو بہت غصہ آیا اور اُس سے کہا کہ تو نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اگر وہ حکم دے
تو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس سے عاشق کی شورش اور بھی بڑھ گئی اور اس نے جنون میں یوں بکنا شروع کیا۔

کہ اے سودا فروشان دماغم
اگر تیغسم بسر می آزمائید
من اینک حاضر و سر پیش دارم
نہ خود افتادہ ام در حلقہ دام
عزیزاں داد می خواہم خدا را
چہ می باشد گناہ صید دل ریش
ز مژگان ہر بن موزخم دارم
دریں صورت ملامت بے حساب است
نک سایان چشم تازہ دماغم
بپائے دوست بسم اللہ بیانید
سر فرمان یار خویش دارم
بہر سید از سر زلف سیف نام
نمی باید گزشت از حق شمس را
کہ صیادش نماید خستہ خویش
جراحت با نیاید در شمس دارم
خطا بر من گرفتن ناصواب است

اب چند اشعار شکایت عشق و خطاب معشوق کے سنئے:

خندہ یاراں از میں عشق جگر باز
کہ سازد جو او پا مال یکساں،
بر دطوفاں جہاں را اگر سراپا
جفا جو یا جہاں سوزا بلا یا،
چہ سوزی جان خواہی جفا کیش
غدار سے را کہ رشک آفتاب است
از میں حسرت نوائے داد فریاد
نیار و ناز را ہنگامہ پروانہ
سر بیگانگان و آشنایاں
نگردد موج چین زابروش پیدا
خدا شناس کا فرما خرا یا،
کئی آتش کہاں گرمی خویش
جگر از گرمیت چوں شبنم آب است
زمین شعر شد بیتابی آباد

اقبال انصاری



۹

فلسفی۔ یا۔ پاگل۔؟۔ مگر اے فلسفی کہہ سکتے تھے نہ پاگل۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے اس سلسلہ کی درمیانی کڑی تصور کر لیجئے۔ کچھ خطی وہ ضرور تھا ورنہ اس زمانہ میں چار سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری چھوڑ کر ہرگز گھر پر نہ بیٹھ رہتا۔ وہ کچھ فلسفی بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسکی علمیت بے انتہا خشک تھی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھا بلکہ درمیانی نقطہ بھی نہ تھا اس لئے کہ بعض اوقات نہ وہ پاگل ہی معلوم ہوتا نہ فلسفی یوں سمجھئے کہ لفظ 'عجیب' کا اگر صحیح اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو یہی شخص تھا۔ زندگی کا ایک طنز یا زندگی پر ایک طنز جو بہتر سمجھئے کہہ لیجئے۔

اتنے بڑے شہر میں تنہا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز! ایسی ہولناک زندگی گزارنا اسی کے بس کی بات تھی۔ لوگ اسے علاوہ خطی، پاگل اور مٹری کے مفروضہ بھی کہتے تھے اور حق بجانب بھی تھے کیونکہ بہت کم لوگوں سے حضرت سید سے منہ بات کرتے۔۔۔ میرا مکان اس کے پاس ہی تھا میں البتہ کبھی کبھی وہاں چلا جاتا کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا "کیوں جناب دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایک مرتبہ یوں ہی پوچھ لیا تھا کہ "کیا آپ اخبار بھی نہیں پڑھتے؟" چنانچہ اس کا جواب وہ یوں اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دیا کرتا تھا جب سے پروفیسری چھوڑی اس شخص نے نہ کوئی اخبار منگایا نہ لوگوں سے حالات سننے کی کوشش کی۔ کتابوں سے اسے نفرت تھی۔ کہا کرتا تھا "انسان اپنی ذہنی تنہائیوں کی اذیت سے بچنے کے لئے کتابیں لکھتا ہے" کتابیں اس کے یہاں بہت تھیں جن میں زیادہ تر ادبیات سے تعلق رکھتی تھیں لیکن سب کی سب الماری اور گرہ کا 'جزو لائیف' بن کر رہ گئی تھیں۔

مجھے ادبیات۔ خصوصاً شعریات سے فطری دلچسپی تھی اسی لئے پروفیسر صاحب سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کی زندگی پر کبھی کبھی ایک تلخ شعر کا گمان ہو جاتا تھا۔ جب کبھی میں ان سے کسی شاعر کا تذکرہ کرتا وہ نہایت خشک لہجہ میں فرما دیا کرتے "بھئی شاعروں کی بات چھوڑو شاعر۔ اخبار اور کتابیں یہی تین چیزیں تو ہیں جو دنیا کو خراب کرتی ہیں" میں اگر زیادہ اصرار کرتا تو وہ صاف کہہ دیتے "جناب جانیے کوئی کام کیجئے اور دوسروں کو کام کرنے دیجئے" گویا انھیں بڑا کام ہی رہتا ہے۔۔۔ دن بھر بیٹھے رہنا۔ سگریٹ پینا اور شام کو کسی دیرانی میں

نکل جانا۔ یہ تھا ان کا کام !

ان کی کوئی ایسی زیادہ عمر بھی نہ تھی کہ کہا جاسکتا کہ شاعری سے اب انھیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے صرف چالیس برس کے تھے اور سچ بوجھ تو چالیس برس میں لوگ مکمل شاعر بنتے ہیں۔ بہر حال میں بھی موقع کا منتظر رہتا۔ باوجود ان کی گھڑکیوں اور طنزیہ جملوں کے ایک آدھ شعر ضرور سنا دیتا اور وہ چپ نہ ہوں نہ ہاں، منہ بنائے بیٹھے رہتے۔

انھیں دنوں مجھے ایک نوجوان شاعر جمال کے کلام سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ جمال کا رنگ یکسر عاشقانہ تھا۔ اس کی شکستگی اور درد و معہ خود دارانہ پہلوؤں کے مجھے بہت پسند تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے اشعار پر فیض صاحب کے جمود اور بے حسی کو توڑ دیں گے مگر وہ شخص کبھی دلچسپا۔ کبھی کبھی سن لیتے یہی غنیمت تھا۔ جب زیادہ تنگ جاتے تو ٹپٹنے لگتے اسی درمیان میں میں نے جمال سے بھی دوستی پیدا کر لی تھی۔ ہم عمر اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی 'شعریت' کا جامہ پہنتی جا رہی تھی۔ ایک دن جمال کو لیکر پروفسر صاحب کے یہاں پہونچا۔ نو بجے رات کا وقت تھا پروفسر صاحب کے اتنے بڑے مکان میں تمام اندھیرا تھا صرف دو کمروں میں روشنی تھی ایک تو وہ جہاں خود تشریف فرما تھے۔ دوسرے جہاں کھانا پک رہا تھا۔ پروفسر صاحب آرام گاہی پر پاؤں پھیلائے نظرس چھت پر جمائے سگریٹ پی رہے تھے۔ سامنے گول میز پر لمپ ہلکا ہلکا جل رہا تھا۔ کمرہ میں خاموشی طاری تھی اور کچھ وحشت سی برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آدمی رہتے ہی نہیں۔ ہم لوگ بیٹھ گئے مگر وہ چپ چاپ جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ جمال کو سخت مایوسی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ میرا ہاتھ دبا یا کہ چل نکلو۔ اسے اس بے توجہی سے صدمہ پہونچا تھا مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ "ذرا ٹھیرو، دو تین منٹ کے بعد پروفسر صاحب اپنے آپ میں آئے۔"

"کہنے دُنیا میں کیا ہوا ہے"

میں نے کہا: "ہر شخص خوش و خرم ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مسرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے" کہنے لگے: "کیوں جناب یہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟"

"یہ تو فطری خواہش ہے۔"

"اور یہی فطری خواہش۔ یہی بے قراری کبھی مسرت حاصل کرنے دیگی انسانی زندگی سے یہ ناکمل کا احساس کبھی نہ بٹے گا۔"

"خیر ہوگا۔۔۔ آپ کو جمال سے ملاؤں"

"ہی آپ کے شاعر صاحب؟"

"ہاں"

”تو بیوقوف ہے!“ یہ کلمہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئے۔ میں بھی گھر چلا آیا، میں نے اپنے ضمیر کو بہت برا بھلا کہا۔ بہتیرا احساس خود داری دلایا مگر پروفیسر صاحب کی شخصیت کے سامنے ایک نہ پیش گئی۔ میں روز بروز لگے یہاں ”جمالیات“ لیکر زیادہ جانے لگا۔ کسی نہ کسی طرح کچھ اشعار سنا ہی دیتا۔ بعض اوقات وہ بے حس بیٹھے رہتے بعض دفعہ کھرا کر چلے جاتے مگر میں باز نہ آتا۔ جمال کی زندگی اور اس کے اشعار یہی دو باتیں میں انھیں سنایا کرتا۔ آخر وہ دن بھی آ ہی پہونچا جب انھوں نے نہایت نرم مگر مستحکم لہجہ میں کہہ دیا کہ ”آج سے میں نے عزم کر لیا ہے کہ کسی سے نہ ملوں گا۔“

پروفیسر صاحب کے عزم کے معنی میں جانتا تھا ”موت اور میرا عزم“ وہ کہا کرتے تھے ”یہ دو چیزیں کبھی نہیں مل سکتیں“ اب تک وہ میری جسارت کو برداشت کئے گئے تھے تو یہی خوشی تھی کہ وہ میری جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو یہ معلوم کیا کر بیٹھتے۔ بہر حال مجھے رنج ضرور ہوا اور میں نے دوبارہ انادہ کر لیا کہ اب کبھی نہ جاؤں گا۔ ادھر خوش قسمتی سے میرا تبادلہ بھی دوسری جگہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پروفیسر صاحب ذہن سے اترتے چلے گئے۔ ہاں جمال سے البتہ تعلقاً گہرے ہوتے گئے۔ وہ میرے یہاں کبھی کبھی آ بھی جاتا تھا۔ جمال میں ادھر ایک مین تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اب فسادہ رہا کرتا۔ اس کی گفتگو اور لہجہ سے شگفتگی ذلیل ہو چکی تھی مگر اشعار میں درد اور بڑھ گیا تھا۔ میں اس تغیر کی وجہ پوچھتی جانتا تھا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے تھے۔

تین سال کے بعد مجھے ایک کام سے پھر وہیں جانا پڑا۔ ریل میں سوار ہوتے ہی مجھے پہلی بار پروفیسر صاحب کی یاد آئی۔ گاڑی جتنی قریب ہوتی گئی، جمال سے زیادہ پروفیسر صاحب میرے دل و دماغ پر چھاتے گئے۔ میں نے عجیب بھینپی اور کشش سی محسوس کی۔ گاڑی سے اترنے کے ساتھ ہی میں سیدھے ان کے بنگلہ پر پہونچا مگر وہاں وہ نہ ملے۔ بنگلہ خالی تھا، میرا دل دھک سے ہو گیا۔ دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے مگر پروفیسر صاحب جنبش کرنے والے نہیں تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں، تلاش کرنے پر ان کا مکان ملا مکان دیکھتے ہی ایک نامعلوم خون جس میں کچھ غم بھی شامل تھا میرے تمام بدن میں سرایت کر گیا۔ مکان نہایت چھوٹا اور تاریک تھا جس سے مفلسی کی بو آتی تھی۔ میں اندر گیا۔ تین کمرے تھے۔ جس میں سے صرف ایک میں روشنی تھی۔ اور باوجودی کہاں گیا؟ میں نے دل میں سوچا اور پھر نہ معلوم کیوں اپنے خیال پر خود ہی پریشان سا ہو گیا میں کمرے کے سامنے پہونچا۔ پروفیسر صاحب کرسی پر پاؤں پھیلائے حسب دستور لیٹے ہوئے تھے اور سگریٹ کا دھواں کمرے میں چکر کھا رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑے۔ شاید رت سے وہ انسانی قدموں کی چاپ سے نا آشنا تھے۔ مجھے دیکھا۔ میں ان کی آنکھوں کا سامنا نہ کر سکا۔ ایک عجیب مسکراہٹ، جس میں پہلی بار بیچاریگی کا عکس تھا ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ بولے ”کہنے آپ کی دنیا کا کیا حال ہے؟“

میں ان کے قریب ہی کرسی گھینچ کر بیٹھ گیا، لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ اچھی طرح دکھائی پڑ رہا تھا۔ شدت، تاثر اور ہجوم خیالات سے میں ان کے سوال کا جواب دینا یا کچھ اور کہنا بھول گیا۔ ان کے خشک چہرہ پر چھریاں زیادہ بڑی تھیں سر کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ آنکھوں میں چمک ضرور تھی مگر بجھتے ہوئے چراغ کی سی۔ کمرہ بالکل خالی تھا معلوم ہوتا تھا کہ اسباب اور فرنیچر بہت کم ہو گیا ہے۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے دہلی زبان میں پوچھا۔

”کہنے کیسے ہیں؟“

میرے اس سوال سے غالباً انھیں اذیت ہوئی کہنے لگے ”اس سوال کو آپ میرے سوا دنیا میں سب سے پوچھ سکتے ہیں اور میرے سوا غالباً ہر شخص اس کا جواب دے سکتا ہے۔“
میں پھر چپ ہو گیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔
”جمال کے کچھ شعر سناؤں“

میں نے سنا سنا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب اسی محویت کے عالم میں بیٹھے رہے جس طرح پہلے بیٹھا کرتے تھے۔
”پسند آئے؟“

”وہ زندہ ہے ابھی تک؟“ یہ سوال انھوں نے کسی دوسرے کے بارے میں اب تک شاید نہ پوچھا تھا!

میں نے کہا: ”اس کی زندگی ہی کیا اسے محبت نے تباہ کر ڈالا۔“

”محبت؟“ انھوں نے طنزیہ لہجہ میں دہرایا اور پھر غلاف معمول خوب ہنسے۔ خوب ہنسے۔ اتنا ہنسے

کہ ان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

محبتی حسین

نوٹ کر لیجئے

کہ پڑانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچہ کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ ہرنگ سمجھیں پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۰.۲ روپے پرچہ وصول کرنا پڑے گا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہوسکے گی ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔
منیر نثار

خدا کا ماضی، حال اور مستقبل

’مذہبی ایجادات و فریب‘ (Religious Inventions & Frauds) کے نام سے مسٹر لوئس کالنج (Louis Coulange) نے ایک ضخیم کتاب فرانسیسی زبان زبان میں لکھی ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ ذیل کا مضمون اس کتاب کے اُن اجواب سے ماخوذ ہے، جن میں مصنف نے خدا کے عیسوی تخیل سے گفتگو کی ہے۔

عرصہ تک مذہبی زندگی بسر کرنے کے بعد مصنف نے یہ ایک محسوس کیا کہ اس وقت تک وہ شدید فریب میں مبتلا رہا ہے اُسی وقت سے اس نے اعتقاد کا جامہ اتار کر تحقیق و تفتیش شروع کی، جس کو وہ خود ”کوش حق“ سے تعبیر کرتا ہے۔ متذکرہ بالا کتاب موصوف کی اسی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔

آج یورپ میں مسٹر لوئس کالنج کو مذہب عیسوی کے باب میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ (عقیق)

اولین عیسائی قدیم یہودی تھے۔ قبول عیسائیت سے قبل قدما اُن کے معتقدات کا ماخذ عبرانی انجیل تھی لیکن تبدیل مذہب کے بعد بھی انھوں نے اس کتاب کا دامن نہ چھوڑا۔ اُن کے اعتقاد کے مطابق اُن کے خدا نے اس دُنیا کو ایک خلا سے پیدا کیا اور اُس کی تکمیل چھ یوم کے اندہ ہوئی۔ اسی خدا نے ابراہیم سے ایک معاہدہ کیا کہ اُنکی آنے والی نسلوں کا ارض کنعان پر (جس کو آج فلسطین کہتے ہیں) تسلط ہوگا۔

عبرانی انجیل کی طرح اولین عیسائیوں کا خدا بھی بالکل انسانوں کی طرح با تہ پادوں رکھتا تھا، اگرچہ اُس کا جسم

نے ڈاکٹر جان لائٹنٹ، جو کیمبرج یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اپنے وقت کے ماہر عمرانیات تھے اُن کا بیان ہے کہ ”زمین و آسمان، مرکز و محیط، ارض سے لبریز باطن اور انسان کی تخلیق ۳۳ ہزار ۴۰۰۰ قبل مسیح کو فوجی معجے کے وقت تخلیق نے کی۔“

”A History of Warfare of Science with Theology in Christendom“

By Andrew D. White. جلد اول صفحہ ۹

گوشت و خون سے مرکب نہ تھا۔ جتن، جس نے خدا کو مرتے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اُس کا بیان تھا کہ خدا کے داہنی جانب جناب مسیح شکن تھے اور خدا یثرب و عقیق کا ہر رنگ تھا۔

تقریباً سلسلہ میں ایک شخص ماریٹون (Marett) نامی نے جس کا باپ ایک پادری تھا، یونانی فلسفہ کا عمود اور افلاطون کا خصوصاً مطالعہ کیا۔ طویل غور و فکر کے بعد اُس نے اپنے خیالات عوام کے سامنے پیش کئے۔ یہ تصور خدا کے اُس تصور سے بالکل مختلف تھا جو خدا کو متشکل کرتا تھا۔ کلیسائی گروہ نے اس کی جی کھول کر مخالفت کی مگر اُن کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ بالآخر خدا کے تخیل نے ایک نیا چولا بدلا اور انجیل نے دنیا کے سامنے خدا کا جو تخیل پیش کیا تھا وہ دلوں سے کیسے محو ہو گیا۔ اب خدا کی ذات غیر مادی اور اورائے تخیل قرار پائی۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جس کو انسان اپنے ذہن میں محدود کر ہی نہیں سکتا تھا یعنی اب خدا نے عبرانی جامہ اتار پھینکا اور اُس کی جگہ پر فلسفہ کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔

اس دور میں خدا کا ایک تخیل قائم ضرور ہو گیا مگر عہد و معبود کے تعلقات متعین نہ ہو سکے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک اُس خدا کی پرستش ہوتی رہی جس نے انسان کو اس دنیا کا بادشاہ بنایا تھا اور جس نے دوسری دنیا میں انسان کے لئے فردوس میں عالیشان محلات تعمیر کئے تھے (اُس زمانہ میں ارض فلسطین کی حکومت کا وہ لوگوں کے ذہن سے فراموش ہو گیا تھا) ان دنوں لوگوں کے اعتقاد کے مطابق انسان مختار کل تھا اور اُس کو اپنی تقدیر پر پورا اختیار تھا، خواہ وہ اُسے سیاہ کرے یا سپید۔ عہد و معبود کے تعلقات کا یہ تخیل سینٹ اگسٹائن کے خیال کے مطابق خدا کے ناقابل انتقال حقوق پر شدید قسم کی ڈاکڑنی تھی۔ انسان کو اس کی تقدیر کا مالک قرار دینے کے معنی سینٹ اگسٹائن کے نزدیک صرف یہی نہیں تھے کہ انسان کو خدا کی سلطنت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دینا ہے کہ ہم کو ”عدم“ سے ”وجود“ میں لایا گیا ہے۔

سینٹ اگسٹائن کو اس پر پورا اعتقاد تھا کہ ہر وہ چیز جو ہم میں موجود ہے (اور اس میں تقدیر بھی شامل ہے) خدا کے احکام کے تابع ہے۔ نجات و بخشائش صرف اُن لوگوں کی ہوگی جن کو خدا بخشنا چاہے گا، اور باقی سب دوزخ کے کندے بنیں گے، کیونکہ خدا اُن کی نجات و بخشائش نہ چاہے گا اور اُس کی یہی مرضی ہوگی۔ شاید یہ انھیں خیالات کا نتیجہ تھا کہ سینٹ اگسٹائن کو صدیوں تک لاطینی کلیسا کا مرکز سمجھا جاتا رہا۔

سولھویں صدی نے خدا کے اس تصور کو ایک پٹا دیا جس کو سینٹ اگسٹائن نے پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی جگہ قدم خیال نے لی۔ غرض صدیوں تک خدا کا تصور ذہن انسانی سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں خدا کے تصور کے متعلق لوگوں کا جو بھی خیال رہا ہو لیکن اُس کے وجود کا لوگوں کو یقین ضرور تھا۔

خدا کا علم اُن کو کیونکر ہوا ؟ : دو باتوں نے اس سلسلہ میں اُن کی رہنمائی کی۔ ایک روح، دوسرے خدا کے

متعلق متصوفاً خیال، مگر خدا کو پہچانتے کا یہ بلند زین صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لئے مخصوص رہا۔ دوسرا طریقہ عوام الناس کا تھا۔ انھوں نے خدا کو بالعموم قدرت کی عام عینک سے دیکھا۔

آج خدا کا تصور۔ آسمان پکار پکار کر اُن تبدیلیوں کا اعلان کر رہا ہے، جس کا سولھویں صدی سے وہ آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ چھٹا آسمان زمین کے گرد چکر لگاتا تھا اور زمین ایک پروقار مکہ کی طرح کائنات کے وسط میں تخت شاہی پر ممکن نظر آتی تھی۔ زمانہ کے انقلاب نے اُس کی یہ حیثیت ہل دی ہے۔ آج اُس کی حیثیت ایک تخت سے اتاری ہوئی شہزادی کی ہے، بلکہ مہر و ملتان کی ایک ادنیٰ کنیز سمجھی جاتی ہے اور اس کا کام آفتاب کے گرد طوائف کرنا ہے۔

موجودہ دور میں یہ دعویٰ کرنا کہ آسمان کی تخلیق زمین کے لئے ہوئی تھی یا یہ کہنا کہ آسمان پر انسان کے لئے محلات تعمیر کئے گئے ہیں ایک مہمل سی بات ہے۔ اب ان باتوں کا زمانہ گزر گیا اور آج نظام شمسی میں زمین ایک بے وقعت سی چیز ہے۔

زمین پر انسان کی حیثیت کیا ہے؟۔ کل انسان کو زمین پر کئی اقتدار حاصل ہو گا اور لا تعداد قوتیں لوگوں کی طرح اُس کی فرائض بردار ہوں گی۔ اس عظیم الشان سلطنت کا خاکہ تو آج ہی تیار ہو گیا ہے۔ حیوانات و نباتات کا جہاں تک تعلق ہے ہم نے اُن پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ حیوانات و نباتات کی شکل میں ہمارے جو لا تعداد دشمن چھپے ہوئے تھے اُن پر ہم نے اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان ممالک میں بیضہ، طاعون اور کوڑھ وغیرہ کا سرے کوئی وجود ہی نہیں اور جب جنون و خناق جیسے امراض کا کسی پر حملہ نہ توہم فوراً اُس کا تدارک کر لیتے ہیں۔ صرف بڑے بڑے جاندار ہی نہیں بلکہ قدرت کی طاقتیں بھی ہماری مطیع ہو چکی ہیں۔ اگر انہuman حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ آسانی پتہ چل سکتا ہے کہ انسان آہستہ آہستہ زمین پر حکمران کا درجہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ قوت انسان کو کہاں سے نصیب ہوئی؟۔ عیسائی کہتے ہیں ”اس طاقت کو خدا نے عطا کیا ہے“ مگر خیال

کس قدر مبالغہ آمیز ہے۔ ہماری حکومت جو آج زمین پر قائم ہے وہ ہر چند بہت محدود ہے لیکن اگر تم یہ تسلیم کر لیں کہ مکہ اور بے حقیقت حکومت بھی خدا ہی کا عطیہ ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی کریم انفسی ظاہر کرنے میں اتنی کوتاہی سے کیوں کام لیا اور پہلے ہی انسانوں کو ان مصائب سے کیوں نہ چھٹکا را دیا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ صرف ستر سال جوئے کسی متمدن ملک پر ہیضہ کا حملہ نہیں ہوا اور خناق پر قابو حاصل کئے ہوئے تو ابھی شاید پورے تیس سال بھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے ہر نصیب انسانیت ان ناویدہ دشمنوں کے حملوں کے مقابلہ میں کیوں بیدست و ہار کھا گیا۔ اب ہم کو زیادہ عرصہ تک خوابوں کی دنیا میں رہنا نہیں ہے۔ یہ سوچنا کہ خدا جاری نگہبانی نگرانی اور نہماں کرتا ہے خوابوں کی دنیا کی باتیں نہیں تو بھیر کیا ہیں۔ اس خیال میں اور قدیم دنیا کے اُس خیال میں کہ

بین کائنات کے مرکز میں ایک اہم اور مخصوص جگہ کی مالک ہے، کیا فرق ہے۔ ہزاروں سال تک قدرت کی ہیبت طاقتوں و خوفناک دندلوں کے سامنے لرزہ براندام رہنے کے بعد انسان نے موجودہ جگہ حاصل کی ہے اور نتیجہ ہے اُس لگاتار نخت کا جس کا سلسلہ اُس نے صدیوں سے جاری رکھا ہے۔ اس میں خدا کی مہربانی و عنایت کو کیا دخل ہے؟ عیسائی کہتے تھے کہ اُن کا خدا پوشیدہ ہے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے تعین کو اور بھی چھپا رکھا ہے۔ لیکن خدا کی عدم موجودگی میں بھی ہر چیز اپنی جگہ پر دستور جاری و ساری ہے۔ خدا کے وجود کے وہ روش و تابناک نشانات جو کبھی بہت نمایاں نظر آیا کرتے تھے اب اُن کا کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ گویا سائنس نے خدا کے وجود کو ختم کر دیا ہے۔ کل خدا کا تصور کیا ہوگا — دنیا آج اس سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے کہ گویا خدا کا کوئی وجود ہے تو اس نے کائنات کے کسی نامعلوم گوشہ میں اپنا منہ چھپا لیا ہے اور اس دنیا اور اُس کے کاروبار سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کی موجودہ دنیاوی زندگی جو صدیوں تک سنگدل دشمنوں کا مقابلہ کرنے اور بیشمار موانع کو ہٹانے کے بعد شکل ہوئی ہے، خدا نے اُس سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔

کیا خدا کا کوئی وجود ہے؟ — بہت سے تمدن داغ آج بھی اس کا جواب اثبات میں دیں گے لیکن کل جب سائنس کی ایجادیں ذہن انسانی کا گوشہ گوشہ اپنی روشنی سے منور کر دیں گی کیا اُس وقت بھی کوئی داغ اسکا جواب اثبات میں دے گا؟

دوسری دنیا کا ذکر تو خدا کے اُن حقیقی پرستاروں کے لئے چھوڑ دو جن کے لئے وہاں محلات کھڑے کئے گئے ہیں آؤ ہم اُن حقایق پر غور کریں جو ہماری عقل کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ہماری آنکھیں مصائب کے ایک ہمتناہی سلسلہ کو دیکھتی ہیں۔ جس نے انسان کو بچپن و بے قرار کر رکھا ہے۔ ہمارے کان انسانیت کی چیخ و پکار سے پٹھے جارہے ہیں۔ انسان پریشان ہیں، جانور پریشان ہیں، غرض جو ہے وہ پریشان ہے۔ آخرش یہ کیا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے جانوروں کو کھانا پڑتا ہے، اسی طرح جانور اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے اپنے ہم جنسوں کو کھاتا ہے۔ پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ سب ہوتا ہے خدا کی مرضی سے، اور صرف عیسائیوں ہی کے خدا کی مرضی سے نہیں بلکہ تمام اقوام کے خداؤں کی مرضی سے بھی۔ غیر جانبدار مبلغین مذاہب نے بھی خدا کے تصور کی اس خامی کو تسلیم کیا ہے۔ شاید خدا انسان کے معیار انصاف و کرم ایک دوسرے سے بحد مختلف ہے۔ ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو وہ بحد ظالم ہے۔ کتاب تخلیق ہم کو بتلاتی ہے کہ انسان کو خدا نے اپنے نمونہ پر بنایا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو خود انسان کے جذبہ خوف نے پیدا کیا۔ اُس کے بعد فلسفی آئے جنہوں نے وجود خدا کی اس تعبیر کو منطقی و عقل کی خراہ پر چڑھا کر اور زیادہ نمایاں کیا، لیکن یہ پہلے سے زیادہ کمرہ ثابت ہوا۔

محمد عتیق صدیقی

دنیا کا ایک بڑا مفکر — ندریک ایک بڑا باغی

اسپینوزا

سرخ و سپید رنگ، اوسط قد، متناسب الاعضاء، گھنی سیاہ پلکوں کے اندر مقناطیسی کشش رکھنے والی روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، لمبی ستواں ناک، باریک شانوں تک بکھرے ہوئے سیاہ گھنے بال، اُٹھے ہوئے جڑے سیرت کی مضبوطی اور عزم و استقلال کے آئینہ دار، چہرے چہرے کے ہر ہر انداز سے تفلسف اور علمیت آشکار نام و نمود کے خیال سے بے پروا، مال و دولت کے خیال سے بے نیاز، فقر و فاقہ کے خیال سے بیہراس مصائب کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے والا ندریک کا باغی، کورانہ تقلید کا دشمن عقل کا پرستار آزاد خیالی کا علمبردار سترھویں صدی کا یہودی النسل ذہین، طباع، نڈر، بیباک، بے لوث مفکر، علوم مذہبیہ کا عالم ریاضیات و طبیعیات کا ماہر، یورپ کی متعدد زبانیں بولنے اور سمجھنے والا فلسفی — یہ تھا ڈی اسپینوزا جس کا حال پیش کیا جا رہا ہے۔

نشاة ثانیہ اور تحریک اصلاح نے یورپ میں جس ذہنی بغاوت کی آگ لگائی تھی، سترھویں صدی میں اُس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، ڈیکارٹے (Descartes) کی ذات میں ہم کو اُس دور کے دونوں پہلو، یعنی کمزور اور قوی دونوں کا اچھا نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ پہلا فلسفی تھا جس نے یورپ میں پہلی بار تشکیک کی آواز بلند کی۔ اُس کے علمی کارنامے اس عہد کے روشن اور قابل احترام شاہکار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ڈیکارٹے کی اُن کمزوریوں کے نقوش بھی کم گہرے نہیں ہیں، جن کے مظاہرے اُس نے کلیسا اور سماج کی دار و گیر سے پناہ حاصل کرنے کیلئے کئے۔ عہد حاضر کے ایک فاضل فلسفی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ مصیبت کے وقت خدا کی ذات سے شاید ہی کسی نے اتنا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہو جتنا ڈیکارٹے نے گردہ آواز جو اُس نے ایک بار بلند کی تھی اُس کی صدا نے بازگشت برابر فضا میں گونجتی رہی۔ اُس کی کمزوری کے باوجود اُس کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اور کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے کورانہ تقلید کی جگہ سوجھ بوجھ اور عقل سے کا لینا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کو ”فلسفہ جدید“ کا امام سمجھا گیا تھا

سترھویں صدی کا سب سے زیادہ جری مفکر اسپینوزا تھا۔ انساٹکلو پیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ ”اسپینوزا دراصل ڈیکارٹے کا قبیح تھا“ لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ڈیکارٹے کے خیالات سے متاثر ضرور تھا اور اُس کے خیالات کی پختگی میں ڈیکارٹے کے خیالات کو کافی دخل تھا لیکن اسی کے ساتھ اسپینوزا کے اکثر نظریے ڈیکارٹے کے خیالات سے متصادم نظر آتے ہیں۔

اسپینوزا کی سیرت اور اُس کے فلسفے سے متعلق یورپ کی تمام زبانوں میں بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ جہاں تک اُس کی سیرت کا تعلق ہے، ان تمام کتابوں کا اخذ (Maximilien Luce) کی مرتب کردہ سیرت ہے جس کو مستند ہونے کے ساتھ ساتھ اولیت کا بھی فخر حاصل ہے۔ اسپینوزا کی ایک اور سوانح حیات سنہ ۱۸۷۷ء میں کولیرس (Coleridge) نے مرتب کر کے شائع کی۔ اس کو دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مصنف جرمن تھا اور اس کو ذاتی طور پر اسپینوزا سے کوئی واقفیت نہ تھی مگر اس کی معلومات کا ذریعہ بھی بہت اہم تھا۔

کولیرس (Coleridge) چونکہ ایک متعصب عیسائی تھا، اس لئے یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اُسکو اسپینوزا کے تمام فلسفیانہ معتقدات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً اسپینوزا کے اُن خیالات کے ساتھ جو اس نے انجیل کے باب میں ظاہر کئے تھے، اس لئے ان کی کتاب کا مقصد دراصل اُس کے خیالات کی تردید تھی۔ اس کتاب میں اکثر واقعات غلط بیان کئے گئے ہیں اور بعض واقعات کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ لیکن یہ ایک ناگزیر چیز تھی کیونکہ اول تو یہ کتاب اسپینوزا کے انتقال کے کافی عرصہ کے بعد مرتب کی گئی اور پھر لکھنے والا خود اُس کے حالات سے ناواقف تھا۔

اسپینوزا، یورپ کے حسین و جمیل شہر امسٹرڈم (Amsterdam) میں ۲۴ نومبر سنہ ۱۶۳۲ء کو پیدا ہوا۔ جس مکان میں اُس کو زندگی کی پہلی شعاع نظر آئی تھی آج وہ ”رائے واطر لوبلین“ کے نام سے مشہور ہے اُس کے خاندان کا شمار معزز یہودی گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اُس کے باپ اور دادا ہجرت کر کے امسٹرڈم میں آئے تھے۔ اُس کی ماں کا سنہ ۱۶۳۸ء میں سین (Sonne) کے مقام پر انتقال ہوا اور اُس کے باپ کا انتقال سنہ ۱۶۷۵ء میں ہوا اُس وقت اسپینوزا کی عمر بائیس سال کی تھی۔ اُس کے باپ نے تین شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، دوسری سے خود اسپینوزا اور تیسری سے بھی ایک لڑکی۔ اُسکا باپ ایک معزز یہودی تاجر تھا اور یہودیوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسپینوزا کی تعلیم، مقامی یہودی مدرسہ میں شروع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس اسکول میں اُس کو صرف مذہبی تعلیم دی گئی تھی۔ اسپینی زبان اُس کی مادری زبان تھی، اور پرتگالی زبان اس نے اپنے باپ سے

سیکھی تھی۔ لاطینی زبان اُس نے (Jeremiah Felbinger) سے حاصل کی اور شاید جرمن زبان بھی اُسی سے سیکھی ہو۔ ان زبانوں کے علاوہ آگے چل کر یونانی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں اور فرانسیسی اور اطالوی زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کی۔

علم الحساب اور طبیعیات کا شوق اسپنوزا کو کیونکر پیدا ہوا اور یہ زبانیں اُس نے کس سے حاصل کیں، اُس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان علوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ کسی کا بھی رہنمائی نہیں تھا۔ ان علوم کا اچھا ذخیرہ مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اسپنوزا نے یقیناً اس کتب خانہ سے پورا فائدہ اُٹھایا ہوگا اور شاید اسی چیز نے گرد و پیش کے مذہبی ماحول کے باوجود اُس کو ایک آزاد خیال مفکر بنا دیا۔

وہ بلا کا ذہین تھا۔ پندرہ سال کا سن ہی کیا ہوتا ہے لیکن اس سن و سال میں بھی اُس نے اپنی ذہانت کا سکہ اساتذہ پر بٹھا دیا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں جو طوفان چھپا ہوا تھا اُس کی وجہیں اس سن میں بھی آہستہ آہستہ بلند ہونے لگتیں اور اکثر وہ ایسے شکوک کا اظہار کرتا جن کو رفع کرنے سے اُس عہد کے بڑے بڑے علماء بھی قاصر رہتے۔

اسپنوزا سے پہلے بھی ایک دو آزاد خیال یہودی پیدا ہوئے اور احتساب مذہبی کی عدالت نے ان کو پوری سزا بھی دی۔ مثلاً جبریل ڈی کوسٹا (Gabriel de Costa) (۱۵۸۵ء-۱۶۴۰ء) کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ وہ خود کشی کے لئے مجبور ہو گیا۔ اسی طرح سے دوسری مثال ڈاکٹر ڈینیئل ڈی پریٹور (Dr.

Daniel de Predo) کی ہے۔ اُس نے اپنی آزاد خیالی صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھی بلکہ نوجوانوں میں بھی اُس کی تبلیغ شروع کی اُس کے خلاف عدالت احتساب میں مقدمہ چلایا گیا مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ نہیں کی۔ علماء یہود نے اُس کو رشوت بھی دینے کی کوشش کی تاکہ وہ ہجرت کر جائے مگر اُس نے اس مشکیش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ بالآخر عدالت احتساب نے اُس کو دائرۃ یہودیت سے خارج کر کے اُس کا سماجی مقاطعہ کیا۔ اُس کے ایک ہم عصر یہودی شاعر نے ایک طویل جوج بھی لکھی جو یہودی مذہبی حلقوں میں زبان زدِ خاص و عام ہوئی۔ یہ تو تھا یہودیوں کا حال لیکن عیسائیوں کی حالت بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ چنانچہ اسپنوزا سے نصف سے نصف صدی قبل کی بات تھی جب کیتھولک چرچ (Catholic Church) نے ایک شخص مسمیٰ برنو (Bruno) کو اُس کے لحدانہ خیالات کے جرم میں زندہ جلا دیا تھا۔

اسپنوزا نے اول اول تو اپنے شکوک علماء یہود سے رفع کرنا چاہے لیکن اس کو جلد ہی معلوم ہو گیا

کہ یہ کوشش بے سود ہے کیونکہ علماءِ رومانیات کی کورانہ تقلید سے آگے ایک قدم آگے نہیں جانا چاہئے اسپینوزا کو اس کا بھی جلد ہی احساس ہو گیا کہ اگر یہ روش اُس کے دُرک کی تو شکوک کا رافع ہونا ایک طرف، خود اُس کی جان کے لئے پڑ جائیں گے۔ اب وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہاں تک "حقیقت" کا تعلق ہے، علماء اُس سے قطعاً نا آشنا ہیں اور ان کا مذہب سوائے حماقت پرستی کے اور کچھ نہیں۔

اسپینوزا نے اپنی نظریں علماء کی طرف سے ہٹا کر خود اپنی عقل کو غفرانہ بنایا اور یہی ہے مذہب کی بارگاہیں وہ سب سے بڑا جرم جس کی سخت سے سخت سزا دینے کے بعد بھی جذبہ انتقام آسودہ نہیں ہوتا۔ گویا مذہب اور عقل دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور مذہب کی سرحدیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں عقل کے حدود ختم ہوتے ہیں اسپینوزا نے اس ارادے کے ساتھ ہی انجیل اور تالمود (*Talmud*) کا از سر نو عمیق مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلہ میں اُس کو ایک یہودی عالم مورٹیرا (*Morteira*) سے جو نسبتاً مذہبی معاملات میں کم غلو رکھتا تھا کافی مدد ملی۔ اُس نے اسپینوزا کو اپنا شاگرد بنایا لیکن کسے خبر تھی کہ ایک دن شفیق استاد ہی شاگرد کا بدترین دشمن ہو جائے گا۔

دو اور نوجوان تھے جو ہر جوش انداز میں اسپینوزا کی ہمنوائی پر آمادہ تھے۔ شاید اسپینوزا سے ان لوگوں کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ لیکن انھیں لوگوں نے آگے چل کر اسپینوزا کی مجبوری کی اور اُس کے متعلق طرح طرح کی غلط افواہیں پھیلانیں۔ اسپینوزا اور علماءِ یہود کے درمیان مابہ النزاع خیالات، وہی تھے جن کا آزاد خیال مفکرین اس سے پہلے بھی اظہار کر چکے تھے۔

یہودی صحابیات کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ ان کی موجودہ ترتیب سکندر اعظم کے زمانہ کے بعد ہوئی ہے اور یہ ایسی بات نہ تھی جسے یہودی علماء برداشت کر سکتے۔ چنانچہ عدالت احتساب میں اُس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ اسپینوزا کا آزاد خیال استاد مورٹیرا (*Morteira*) اس عدالت کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے اسپینوزا کو مخاطب کر کے کہا:

"میں نے جس دسوزی اور دل ہی سے تم کو تعلیم دی تھی، کیا تم اُس کا بدلیوں دینا چاہتے ہو؟ کیا تم کو اپنے جرم کی

اہمیت اور سزا کا کچھ اندازہ ہے؟ تمہارا جرم یقیناً بہت بڑا ہے مگر ابھی ٹوٹنے کی راہیں بند نہیں ہوئی ہیں۔ تم پھر ایک بار

غور کرو۔"

مورٹیرا (*Morteira*) کی تقریر کے بعد چوں نے اسپینوزا سے کہا کہ وہ یا تو معافی مانگے اور اپنے گمراہ خیالات سے باز آئے ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جائے۔ اُس نے جواب دیا:

"سزا کی اہمیت کا مجھ کو کوئی اندازہ ہے جس کی مجھ کو جملگی دی گئی ہے۔۔۔۔۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا کے متعلق

نے اُس کو جو سزا دی ہے وہ قطعاً حق بجانب ہے، اس لئے اُس کو فوراً جلاوطن کر دینا چاہئے۔ شہر کا حاکم صوبہ عالی سے ناداشت نہ تھا۔ لیکن وہ ایک طرف ایک معزز یہودی عالم کو صفات جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا اور دوسری طرف وہ غلط قدم بھی اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُس نے یہ درخواست علماء کلیسا کی طرف بڑھا دی، جنہوں نے اپنے ”ہم پیشوں“ کے خلاف فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسپینوزا کو چند ماہ کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن پھر وہ امسٹرڈم بھی واپس نہ آیا۔

اس سزا سے یہودیوں کو یقیناً سکون ہوا مگر اسپینوزا کو بجائے تکلیف کے اطمینان نصیب ہو گیا۔ وہ خود کچھ دنوں سے کسی گاؤں میں جا کر رہنے کا ارادہ کر رہا تھا کیونکہ علوم انسانیہ کے متعلق ایک فلسفی کو جتنا علم ہونا چاہئے، اسپینوزا اُس قدر علم حاصل کر چکا تھا۔ اب کسی گوشہ میں بیٹھ کر وہ حقیقت کی جستجو کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیز ایک اعتبار سے اور بھی ضروری تھی اور وہ یہ کہ خود اُس کے مذاق کے صرف ایک آدمی فلسفی تھے جن کی تصانیف سے وہ استفادہ کر سکتا تھا اُس نے یہاں بھی اپنی عقل ہی کو اپنا مہربن بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لئے جس قدر اطمینان کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے۔

اسپینوزا امسٹرڈم سے نکل کر ایک گاؤں رائن برگ میں پہنچا اور یہاں اُس کا قیام دو سال تک رہا۔ ابتداء میں تو لوگوں کو اُس کی جائے قیام کا علم نہ ہو سکا مگر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُس کے شناسا اور شیدائیان علم رائن برگ پہنچنے لگے۔ شروع میں آنے والوں کی تعداد محدود رہی مگر رفتہ رفتہ اُس میں اضافہ ہونے لگا۔ اب لوگوں نے اسپینوزا کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ کسی ایسی جگہ قیام اختیار کرے جہاں لوگ بہ آسانی آجاسکیں۔ کچھ دنوں تک وہ ٹالتا رہا مگر پھر مجبوراً اُس کو رائن برگ کا قیام ترک کر کے ہاگ (Hague) کے شہر میں منتقل ہونا پڑا۔

ہاگ میں اسپینوزا کے یہاں آنے والوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہاگ ایک نیا مقام تھا اور یہاں لوگ درودراز حصوں سے تبدیل آب و ہوا اور قابل دید چیزیں دیکھنے کے لئے آتے تھے اور انھیں نوا در میں اب اسپینوزا کی بھی ذات کا شمار ہونے لگا۔

ہاگ میں اُس کی مصروفیتوں میں ایک اضافہ اور ہوا یعنی خطوط کا جواب دینا کیونکہ اب یورپ کے مفکرین نے اسپینوزا سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ یہ خطوط کتابی صورت میں یکجا شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو لکھنے میں اُس کا کافی وقت صرف ہوتا رہا ہوگا، کیونکہ یہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ پیر پر مغز اور دقت ہوتے تھے۔ جب مطالعہ اور دیگر مصروفیتوں سے معافی ملتی تو وہ خود دینوں اور دور بینوں کے شیشے گھستا اور اُن کو تیار کرتا۔

اُس کی صحت خراب تھی اور ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اُس کے لئے کل سکون و آرام کی ضرورت ہے لیکن اسنے

ڈاکٹروں کے اس مشورہ کو کبھی قابل التفات نہ سمجھا۔ اُس نے اپنی مشغولیتوں کے مرتبہ خاک میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دی اس چیز نے اُس کی صحت کو خراب تر کر دیا مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

اسپینوزا سے پہلے کسی شخص نے یہ جہت نہ کی تھی کہ صحافت آسمانی پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے کی جگہ ناقذانہ انداز میں غور و فکر سے کام لے۔ وہ پہلا مفکر تھا جس نے اپنی کتاب (*Treatise on Theology + Politics*) میں اس مسئلہ پر مدلل تنقید کی۔ دنیا میں افتراء پر دازی سے زیادہ انسان کے قلب و دماغ کو مجروح کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا حربہ ہو۔ اسپینوزا کی متذکرہ بالا تصنیف کے سلسلہ میں علماء مذہب نے جو اوجھے اور کینے کر رہے استعمال کئے ہیں ان میں ایک افتراء پر دازی کا بھی حربہ تھا اور اس حربہ کو جس بیدردی کے ساتھ اس موقع پر استعمال کیا گیا اُس کی دوسری مثال مشکل ہی سے تاریخ میں ملے گی۔ انھوں نے اس کتاب کی عجیب عجیب بے سرو پا تخریصیں کیں ایک شخص ڈاکٹر ڈی وٹ (*De Witt*) نامی تھا، وہ اسپینوزا کو دو سو فرانک بطور پنشن دیا کرتا تھا۔ جب اُس کا انتقال ہوا تو یہودی علماء نے اُس کے جانشین کو اس قدر مجبور کیا کہ وہ پنشن بند کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اسپینوزا نے خاموشی کے ساتھ اپنی اس تصنیف کے مسودات ڈاکٹر وٹ کے جانشین کو دکھائے۔ اس نے غور کے ساتھ ان مسودات کو پڑھا اور اُس کے تمام شکوک رفع ہو گئے اور پنشن بند کرنے کا خیال اُس نے دل سے نکال ڈالا۔

علماء مذہب کے ان کینہہ حربوں نے اسپینوزا کو بدنام و رسوا کرنے کی جگہ اُس کی شہرت اور چارہ پاند لگا دئے شہزادہ کوئٹز (*Count Cocceius*) جو خود صاحب علم و ذوق تھا اور جس کو فلسفیوں اور آزاد خیالوں تبادلاً خیال کرنے اور ان کی بحیثیت سننے کا بے حد شوق تھا اُس نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اسپینوزا کو بلایا لیکن اسپینوزا نہ جا کا متعدد دور سگا ہوں نے بھی اُسے اپنے یہاں جگہ دینا چاہی مگر اُس نے انکار کر دیا۔

بعض معاملات میں وہ دوسرے فلسفیوں سے بالکل مختلف مزاج واقع تھا۔ مثلاً وہ طبعا بے حد نفاست پسند واقع ہوا تھا۔ خصوصاً جب کبھی وہ باہر نکلتا تو لباس کی درستگی اور اُن کی صفائی کا پورا پورا خیال رکھتا۔ اُس کا خیال تھا کہ لباس کی گندگی اور جسمانی کثافت کا خیالات پر برا اثر پڑتا ہے۔

اُس کے انداز گفتگو میں عجیب دلکشی تھی جس سے وہ ایک مرتبہ گفتگو کرتا ہمیشہ کے لئے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا اُس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، تراش و خراش کے اعتبار سے زیادہ اچھے نہ ہوتے مگر اُس کی گفتگو بے حد مدلل ہوتی دوران گفتگو میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہوتی جس سے سننے والا بہت لطف اٹھاتا۔

دوستی کے باب میں اسپینوزا بے حد بد نصیب واقع ہوا تھا۔ اُس کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ ”جو لوگ اُس سے ملنے آتے ان میں سے ہر شخص اُس کی دوستی کا دم بھرتا۔ مگر انسان کے دل سے زیادہ مخدوش اور ناقابل

اعتبار کوئی دوسری چیز نہیں۔ یہ دوستیاں بھی، ایک نہیں بلکہ تقریباً سب کی سب مصنوعی تھیں۔ وہ لوگ جن پر اسپنوزا کے سب سے زیادہ احسانات تھے، انھیں لوگوں نے اُس کے ساتھ سب سے زیادہ برے سلوک روا رکھے۔ اسپنوزا ازدواجی زندگی کو انسان کے لئے کوئی لعنت یا مصیبت نہ سمجھتا تھا مگر اُس کے باوجود اُس نے شادی نہیں کی۔ شاید اس ڈر سے کہ ازدواجی شغولیتیں اُس کے مطالعہ و تفکر کی اُن مشغولیتوں میں حاج نہ ہوں جو اُس کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔

اسپنوزا مطالعہ کی وجہ سے دیر خواہی کا عادی ہو گیا تھا۔ اکثر تو اس کو رات رات بھر سونا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات اُس کے لئے بہت مفر ثابت ہوئی اور اُس کو حشرات رہنے لگی۔ کچھ دنوں بعد اسی چیز نے شدت اختیار کی اور بالآخر فروری ۱۹۷۷ء میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

م۔ ص

آپ کے فایہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہیں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار جواب پرہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نہ روپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان گل
دھائی روپیہ	دھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑ روپیہ	شائیں روپیہ آٹھ آنہ

لیکن

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپے میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

باب الاستفسار

ترک مذہب کا مطالبہ

(سید تقی الدین - حیدر آباد دکن)

آپ کی طرف سے مسلمانوں یا کم سے کم علماء اسلام کو سب سے زیادہ شکایت ہے کہ جب آپ مسلمہ عقاید اسلام کے قائل نہیں تو آپ اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہیں۔ کیوں نہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کے بعد غالباً پھر کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔ سید سلیمان ندوی اور عبد الماجد دریا بادی وغیرہ کی برہمی کا زیادہ تر سبب یہی ہے۔ کیا آپ نگار کے ذریعہ سے جواب دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

(نگار) اس مشورہ کا شکریہ، لیکن جن بزرگوں کا نام آپ نے لیا ہے ان کو بھی یہ مشورہ دیکھ کر وہ بھی اپنے انسان ہونے سے انکار کر دیں، کیونکہ اگر اسلام کے مسلمہ عقاید سے انکار کرنے کے بعد مجھے اپنے آپ کو مسلمان نہ سمجھنا چاہئے تو ان لوگوں کو بھی اپنے آپ کو انسان نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ مذہب کی حمایت میں یہ بھی انسانیت کے مسلمہ اصول کے پابند نہیں رہتے۔ آپ باور کیجئے، میں نے تنہائی میں بار بار غور کیا کہ یہ لوگ اپنے عقاید کے خلاف کوئی بات سُکر کیوں برہم ہوتے ہیں لیکن میری سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ یا تو خود وہ بہت تنگ ظرف ہیں یا یہ کہ ان کا مذہب تنگ مایہ ہے۔ مذہب کو میں ایسا نہیں سمجھ سکتا اس لئے لامحالہ انھیں حضرات کو تنگ نظر نہ بنا دیتا ہے اور اس طرح سوال صرف ذاتیات کا پیدا ہو جاتا ہے، یعنی یہ لوگ نایندہ مذہب کی حیثیت سے مجھ کو برا نہیں کہتے، بلکہ اپنے آپ کو ایک خاص ادارہ کا عقل کل جان کر مجھ سے صرف اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ میں کیوں اُنکے اداروں کا احترام نہیں کرتا۔

میں اس وقت ان تمام واقعات کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا، جنکی بناء پر ان حضرات کے ذاتی بغض و عناد کو پوری طرح ثابت کیا جاسکتا ہے، کیونکہ باوجود نہایت معمولی، جاہل، اور کم ظرف انسان ہونے کے میں اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہیں کہتا چاہتا جو میرے مخالفین کے ذاتی اخلاق سے تعلق رکھتی ہو، اور اس طرح میں بھی اخلاق کی اس نیچی سطح پر آ جاؤں جو ان کا بر قوم و مذہب کے لئے باعث فخر ہو تو ہو، لیکن میرے لئے کبھی وجہ ناز نہیں ہو سکتی۔

سید سلیمان اور اُن کے شرکار نے پہلے میرے خلاف ابھارنے کے لئے جس قدر کذب و فریب سے کام لیا ہے اس کا اعلازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مجھ سے وہ باتیں منسوب کیں جو کبھی میری زبان سے نہ نکلی تھیں اور میرے خیالات کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ رسول اللہ کو میں بہت بڑا انسان سمجھتا ہوں، اُن کے اخلاق کی بلندی کا قائل ہوں، لیکن سید سلیمان فرماتے ہیں کہ یہ میرے دل کی بات نہیں

ہے، اور کوئی شخص پوچھنے والا نہیں کہ وہ کس کشف کی بنا پر میرے ضمیر پر یہ حکم لگاتے ہیں۔ میں نے کہیں نہیں لکھا کہ سول اللہ نے کلام اللہ میں سنی سنائی باتیں خود اپنی طرف سے گھر گھر پیش کر دیں، لیکن سید سلیمان علانیہ یہ جھوٹ لیتے ہیں اور کوئی ان سے اس لغو بیانی کا مطالبہ نہیں کرتا۔

یقیناً میں نے جون کے نگار میں لکھا تھا کہ میں کلام اللہ کو الہام یا وحی نہیں سمجھتا، لیکن اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ عام طور پر جس معنی میں اسے وحی والہام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اس کا قائل نہیں ہوں، چنانچہ میں نے بعد کو اسکی مراحث بھی کر دی تھی، لیکن میرے مقصود و مفہوم کو قصداً چھپایا جاتا ہے اور میرے الفاظ کی ایسی غلط تعبیر لی جاتی ہے جو میرے معبود ذہنی کے بالکل خلاف ہے۔

میں نے صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ وحی والہام کا تعلق خود ذات نبوی یا رسول اللہ کی اس فطرت بلند سے ہے جو قدرت کی طرف سے عطا کی گئی تھی اس لئے کلام مجید کو خدا کا کلام کہنا اس لحاظ سے بالکل صحیح ہے کہ وہ نتیجہ جو ان فطری اشارہ کا، ایک قدرتی ملکہ و ہدایت کا اور ایک رسول ایسے کلام کو جو اس جذبہ کے زیر اثر بے اختیار زبان سے ادا ہو جائے الہام خداوندی اور وحی ربانی کہہ سکتا ہے لیکن جس حد تک صرف الفاظ کا تعلق ہے انھیں خدا کے الفاظ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ خدا کا صحیح تصور اس اذی نسبت کے منافی ہے، وہ یقیناً انسانی الفاظ ہیں اور اسی زبان کے الفاظ ہیں جو عام طور پر سرزمین عرب میں رائج تھی لیکن میرے اس بیان کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بالکل غلط اتہامات مجھ پر قائم کئے جاتے ہیں۔ جو کچھ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے، جس قدر کاوش انھوں نے منقولات کے پیش کرنے میں صرف کی ہے اور جن لایعنی منقولات سے انھوں نے جواب دینے میں کام لیا ہے ان کی حقیقت پر آئندہ کسی وقت تفصیل سے گفتگو کروں گا، لیکن فی الحال میں اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اصل مسئلہ یا اصل اعتراض کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ سب سے پہلے انھیں کلام کی حقیقت پر بحث کرنا چاہئے اور پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ کلام مجید میں جو الفاظ عربی زبان کے پائے جاتے ہیں کیا وہ کلام انسانی سے علیحدہ کوئی صورت رکھتے ہیں اور اسی پر بحث کا اختتام ہو اگر وہ یہ مانتے ہیں اور انھیں ماننا پڑے گا کہ کلام مجید کا ہر لفظ انسانی زبان سے تعلق رکھتا ہے تو پھر مجھے ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور اگر وہ یہ تسلیم نہیں کرتے ہیں تو اس کٹھی ہوئی حقیقت سے انکار کرنے کے دلائل پیش کرنا ان کا فرض ہے میرا نہیں۔ پھر ان حالات میں جبکہ میں خدا اور رسول کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا وہ ان کو کسی کو لیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسلمان نہ سمجھے اور میں کیوں ترک اسلام کا اعلان کروں جبکہ میں عقاید اسلامی کو اپنے نزدیک ان سے بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب بالکل انفرادی چیز ہے اور اس کا تعلق انسان کے ضمیر سے ہے۔ سید سلیمان اگر مجھے گمراہ سمجھتے ہیں تو میں بھی ان کو ایسا ہی سمجھ سکتا ہوں، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ مجھے گمراہ سمجھ کر گالیاں دیتا اور ذاتیات پر حملہ کرنا بھی ثواب خیال کرتے ہیں، اور میں اس فعل کا صواب کا مرکب ہونا نہیں کرتا۔

سید سلیمان ندوی اور عبدالمجید دریا بادی سے!

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے تو پھر یہ دشمنی عقل و ہوش کیا معنی
یہ شور کا فروزِ ندیق و متحد و بے دین برائے گوشِ نصیحتِ یروش کیا معنی
سوال ”وحی“ پہ آخر یہ برہمی کیسی مثال ”نخل“ پہ جوش و خروش کیا معنی
اگر ”سکوتِ روایات“ ہے ”جوابِ خرد“ تو پھر یہ شورِشِ محشر و شوش کیا معنی

”صدیقِ دین“ کو عقل و خرد سے کیا نسبت؟ یہ ادعا بربانِ خروش کیا معنی
”بغیرِ نطق جو ممکن ہے گفتگو و پیام“ تو پھر و سلطنتِ پرکِ سر و شوش کیا معنی
جو بابِ مسکدہ غور و فکر باز نہیں تو دعوتِ ہوس نائے و نوش کیا معنی
کلام و فلسفہ ما خرد کے دھوکے ہیں مگر یہ ”علمِ حقیقتِ فروش“ کیا معنی

فریبِ فہم میں آکر - فریبِ فہم نہ دے

یقین کے نام سے ہم کو پیامِ دہم نہ دے

”نگاہِ فکر“ کو ایمان طلب نہیں کہتے تلاشِ حق کو، ”غمِ بے سبب“ نہیں کہتے
”تجلیاتِ جنوں“ پر دہ ”دلیل“ نہیں جمالِ حق کو حجابِ ادب نہیں کہتے
”یقینِ غیب“ پر تسکین کا مدار سہی ہر ایک شکل تو ہم کو رب نہیں کہتے

محمد عربی کو جو مانتا ہو نبی،

عزیز دوست! اُسے بواہب نہیں کہتے

فضائے چرخ کو تو بندشِ نظر نہ سمجھ اُسے نہایت پر دازِ بال و پر نہ سمجھ
طلوعِ صبحِ قیامت ہے انتہا اس کی فسادِ غمِ تحقیق مختصر نہ سمجھ
جمالِ قدسِ چس کی نگاہ رہتی ہو اُسے جہانِ تماشائیں بے بصر نہ سمجھ
رسول کو جو امامِ زمن سمجھتا ہو اُسے مقامِ رسالت سے بے خبر نہ سمجھ

گو ہر حسنِ گوہر

نیازِ عظمت و شانِ پیمبری داند

اگرچہ سر نہ تراشد خلعتِ درمی داند

نغمہ فریاد!

اُن کے سامنے!

نظروں کے سامنے ہے اک شوخ ماہ پارا
وہ اُس کا میری جانب یکبارگی اشارا
اُس جان گلستاں نے انگڑائی ناز سے لی
رنگیں لبوں پہ رقصاں ہلکی سی مسکراہٹ
یہ بے پناہ شوخی، یہ مدھ بھری جوانی
انداز کم ٹکاہی، جلووں کی بے پناہی
یہ چال یہ قیامت، یہ ناز یہ شرارت
میں بسمل سراپا، در زعم باطل خود
یہ کس نے مسکرا کر نیچی نظر سے دیکھا،
اس مختصر نظر پر، سب جان و دل بچھا دو

میں لڑکھڑا رہا ہوں دُنیا کوئی سہارا
رنج جس طرح بدل دے دریا کا تیز دھارا
یا طاق میکدہ سے شیشہ کوئی اُتارا
جیسے شفق کی ضو میں اک کا پتلا ستارا
اک بے قرار دریا جس کا نہیں کسٹارا
بے تاب ہے تنہا، سکتے میں ہے نظارا
حل ہو گیا ہے جیسے شوخی میں گرم پارا
وہ تال مجسم ”بالا تفاق آرا“
جنش میں آگیا ہے دل کا نظام سارا
اک کامیاب سودا جس میں نہیں خسارا

اتہریبی گھڑی ہے معراج زندگی کی
اتنے حسین مناظر ملتے نہیں دوبارا

مشاہدہ!

میرے حال دل کی کس صورت سے ہوائی ہوئی
رنگ و بوبو کے جھرمٹ میں!

یہ ہلکتا ہے پھول سی گلابی
یہ آنکھ یہ عارضِ شہابی
اے رحمت حق! معاف کرنا
بننا ہی پڑا مجھے شرابی

ایک حزنِ نیا!

چمن میں سوگ ہے اُس بے نصیب غنچہ کا
جوانیک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا
اُس نے ایک دن ماتہر مسکرا کے دیکھا تھا
تاثیر:-

ماہر القادری

وہ گھڑی محبت کی روزِ یاد آتی ہے

مذہب عالم کی تنک ظرفی

کہا ہے ایک نظر ورنے کس سلیقے سے
کہ اس صدی کے بتوں میں وطن بھی اک بت ہے
وطن سے صرف محبت ہی ہم نہیں کرتے
مگر یہ نکتہ حکمت ہے وہ بجھا سا چراغ
یہ فلسفہ بھی تقاضائے بت پرستی ہے
ہے غزنوی کی جبین میں بھی اک صحنہ
وطن کے بت کو نہیں پوجتے جو اہل نظر
وطن کے بت کی پرستش ہے دل کی خاصیت
چمن میں نکبت پراں کی جان رہتی ہے
تڑپ ہے موج کی، دریا کا ایک ذکر جمیل
ذرا فلک سے ستاروں کو توڑ کر دیکھو
اٹھا کے نشے کو مے سے ذرا دکھاؤ تو
اتار کر ذرا قوس قزح کو رفعت سے
وطن ہے مذہب دل، دل ہے ایک پروانہ
وطن کا عشق اگر تنگی تصور ہے،
مضر نہیں ہے جو انسان کو بت پرستی سے
حرم میں پڑھتے ہیں جو لوگ صبح و شام ناز

زبانِ راز میں ایک سرحدی طریقے سے!!
فطن میں نخوت بونے فطن بھی اک بت ہے
کچھ اس صنم کی پرستش بھی کم نہیں کرتے
کہ جس سے روشنی کرتا ہے اخذ دل نہ دماغ
کراسے تہ میں بھی اک برہمن کی مستی ہے
عجیب چیز ہے ساقی! بتوں کا افسانہ،
ہے پائے نخوتِ مذہب پہ اُن کے شوق کا سر
بھری ہوئی ہے اس آتش سے زیت کی فطرت
گرنے کے دل میں نوا کی زبان رہتی ہے
جنوں ہے ذرے کا اک جزو داستانِ طویل
بکرن کا ربط زمینوں سے جوڑ کر دیکھو
بغیر شمع کے پروانے کو جلاؤ تو
طلسم رنگ کو رکھو تو قید حکمت سے
ہے ناگزیر محبت کا رقصِ مستانہ
تو مذہب ایک تنک ظرفی تفکر ہے
تو ربط چاہئے ہر جاں نواز سستی سے
ہے اُن کا فرض کہ دیں دیر کو بھی نذر و نیاز

ہو در عشق بہم مذہب و وطن کے لئے

نگاہ چاہئے رشتہ چمن چمن کے لئے

عدم

قہر اکبر آبادی

غزل :

کوئی نشان نہ کوئی پتہ پار ہا ہوں میں
یوں مل رہی ہے اب مجھے ذوقِ طلب کی داد
وارفتہ راہِ عشق میں ہوں گامزن مگر
وارفتگی و بے خودی شوقِ اسلام
دنیا تمام پیچ ہے دنیا کا ذکر کیا
ایسا نہ ہو کہ حسن بھلا دے پیامِ عشق
شاید مرا مذاقِ خلش خام ہے ابھی
وہ دل جو ہو چکا ہے زمانہ سے بے نیاز

اے قہر سر د ہو گئی کیا نبض کا ثبات
نغموں سے کیوں یہ آگ سی برسا رہا نہیں

غزل : پروفسر شورو

اس احتیاط سے نزدیک آ رہا ہے کوئی
نگاہِ شوق سے پردے اٹھا رہا ہے کوئی
کچھ اس طرح سے تصور میں آ رہا ہے کوئی
رکا رکھا یہ تنفس جھکی جھکی یہ نظر !
سکوتِ شب میں یہ دلکی دھڑک اسے تو یہ !
یہ مد و جزرِ تجلی ، یہ چاند کا عیال !

چلا ہوں شور کچھ اس طرح رگنزاروں سے
کہ جیسے دور سے جھلک رہا ہے کوئی

مطبوعات موصولہ

کلیم عجم حضرت سیما ب اکبر آبادی کی ۱۷ غزلوں کا مجموعہ ہے جو تین ادوار میں تقسیم کر کے درج کی گئی ہیں، پہلا دور ”صہبائے کہن“ ہے جس میں ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۲۵ء تک کی غزلیں پائی جاتی ہیں، دوسرا دور ”بادۂ خوشیں“ کے نام سے موسوم ہے اور اس میں ۱۹۲۵ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کی غزلیں نظر آتی ہیں، تیسرا دور ”نشدنو“ کا ہے جس میں ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک کی غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں۔

اس ترتیب سے ایک شخص کو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ شاعر کی غزلگوئی میں رفتہ رفتہ کیا تغیر پیدا ہوا اور امتداد زمانہ کا اس کی شاعری پر کتنا اثر ہوا۔

جناب سیما ب دورِ حاضر میں ایک اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن کی غزلوں کو دیکھ کر ہمیں اعتراض کرنا پڑتا ہے کہ یہ اُستادانہ حیثیت انھوں نے ایک مستحق کی حیثیت سے حاصل کی ہے۔

”صہبائے کہن“ ان کی نوجوانی کا کلام ہے جب انھیں غالباً شہرت حاصل نہ تھی، لیکن اُس وقت بھی ان کا رنگِ تغزل اس قسم کے اشعار سے خالی نہ تھا،

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی،
ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے نہ تھا حجاب، تو آنکھوں میں اشک بھر آئے
ایک وہ شمع نہ ہوگی جو بھی جل جل کر شام بھی ہوگی زمانہ میں سحر بھی ہوگی
ان کا یہی رنگ ”بادۂ خوشیں“ میں اور زیادہ بخت ہو کر یوں نظر آتا ہے:

ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پر حسن تھا دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب کی
ورقِ گل ہو کر آئینہ زارِ شبنم انھیں ہر رنگ سے آتا ہے نمایاں ہوتا
آیا مری سمجھ میں نالِ کلیم و طور جب سر چڑھا لیا تو نظر سے گرا دیا
کوئی چمن نہیں ایسا جہاں بہار نہیں مگر بہار مرے دل کو سازگار نہیں

”نشدنو“ بڑا حصہ ہے اور ۱۷ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سیما ب صاحب کی شاعری کا ارتقاء

پوری طرح نمایاں ہے۔ چند اشعارلاحظہ ہوں:

اندر سے شام غم مرے دل کی شگستگی،
اس غم عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے
تا چند اعتبار پہ یوں سجدہ نیاز
ہم اور تیری بزم میں آتے، محال تھا
روایات محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک
سیاب صاحب ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے شاعری کو فادی حیثیت دینے میں بڑا حصہ لیا ہے اور

بہت سے وہ بدنام داغ جن کی وجہ سے ہماری شاعری بدنام تھی، دور کر دئے۔

سیاب صاحب کے کلام کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر اس نے پہلے پوری طرح غور کر لیا ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ اسے پیش کرنا چاہتا ہے، اسی لئے اُن کے یہاں خیال کی سخافت و دانست یا انداز بیان کی رکاوٹ کہیں نہیں پائی جاتی، گو اس لمہمانہ آمد کی بھی کمی ہے جو فن سے زیادہ صحت جذبات کی بدولت کو دکھی ہے۔

اس مجموعہ میں سیاب صاحب کے وہ چودہ خطبات بھی شامل ہیں جو انہوں نے شعر و شاعری پر مختلف محبتوں میں پڑھے تھے۔ یہ خطبات بجائے خود ایک نقاد شعر و ادب کے لئے بڑے کام کی چیز ہیں۔

سیاب صاحب نے اپنے حالات بھی اس مجموعے میں شامل کر دئے ہیں اور ایک فہرست متروک و مختار الفاظ کی بھی دیدی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ ہے اور مجموعہ قصر الادب آگرہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

دستور الاصلاح تصنیف بھی مولانا سیاب اکبر آبادی کی ہے۔ اس میں پہلے بتایا گیا ہے کہ بحالات موجود اصلاح شعری سے قبل شاگرد و استاد دونوں کو خود اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور پھر اصلاح کے طریقوں سے بحث کر کے اساتذہ متقدمین و متاخرین اور شعرا و محال کے نمونے پیش کئے ہیں اور پھر اصلاح کی مثالیں درج کی ہیں، اس میں شک نہیں کہ کام کی ہے اور اس کے مطالعہ سے فن شعریں کافی درجہ پیدا ہو سکتا ہے اس کی قیمت ہم سے - قصر الادب آگرہ سے خط و کتابت کی جائے۔

آر دو شاعری پراک نظر سٹر کلیم الدین احمد بی۔ اے (کمیرج) پروفیسر انگریزی پٹنہ کالج کی تصنیف جو اور جدید اصول انتقاد کے لحاظ سے غالباً بالکل پہلی تصنیف ہے جو اس قدر شرح و بسط کے ساتھ آر دو شاعری پر لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں شعراء متقدمین و عہد وسطی کے کلام کو پرکھا گیا ہے اور دوسرے لیکر انیس و دہریہ تک سب کا ذکر اس سلسلہ میں آگیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو البتہ علیحدہ ضمیمہ کی صورت میں لیا گیا ہے غالباً مصنف سے پہلے سہو ہو گیا تھا اس لئے بعد کو بڑھانا پڑا۔

دوسرے حصہ میں آزاد و حافی سے لیکر اس وقت تک کے شعراء سے بحث کی گئی ہے جن میں ترقی پسند شعراء بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ۵۰ صفحات سے زیادہ ضخامت رکھتی ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہم بیکار کہہ سکیں۔ کام کی باتیں کام کی زبان میں بتائی گئی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے کافی غور و مطالعہ کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہمیں یا کسی اور کو ان کی رائے سے کہیں کہیں اختلاف ہو، لیکن اس رائے میں، مجھے اُن سے بالکل اتفاق ہے کہ ”موجودہ زمانہ کے قومی، ملی و سیاسی مضامین نے اردو شاعری کو وہی نقصان پہنچایا ہے جو کبھی عشقیہ مضامین کی وجہ سے پہنچا تھا۔ اور اگر اس جنس کی یہی ارزانی رہی کہ ہر وہ شخص جو شعروں کو لے کر سکتا ہے، قومی و ملی شاعری کو بیٹھے تو ”اردو شاعری کا مستقبل امیدوار نظر نہیں آتا“

انداز بیان وہی ہے جو فن انتقاد کی انگریزی کتابوں کا ہوتا ہے، لیکن زبان کی لغزش ضرور کہیں کہیں پائی جاتی ہے، جو چنداں قابل لحاظ نہیں۔ بہر نوع کتاب نہایت مفید ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اردو شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔ قیمت پچاس روپے کا پتہ کتابستان، لاہور۔

اردو کہاوتیں مسٹر عبدالرافع فریدی ام۔ اس کی تالیف ہے جس میں اردو کی تمام اونچے اور نیچے درجے کی وہ کہاوتیں جمع کر دی گئی ہیں جو ہماری زبان کا جزو بن گئی ہے۔ ہر کہاوت کے ساتھ اس کا مفہوم بھی بتا دیا گیا ہے، لیکن کتابت کی اتنی غلطیاں پائی جاتی ہیں کہ اس کو دوبارہ طبع کرانے بغیر ان کا ازالہ ممکن نہیں۔ شروع میں کہاوتوں کی تاریخ پر ایک مختصر لیکن نہایت دلچسپ مقالہ بھی نظر آتا ہے۔ کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ مولف سے محلہ زبور خانہ لکھنؤ کے پتہ پر خط و کتابت کی جائے۔

کارل مارکس کامرنڈ باری کی تالیف ہے جس میں موجودہ اشتراکیت کے ابوالآباء کارل مارکس کے حالات اور اس کے معاشی و سیاسی نظریوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس عہد کے اشتراکی انقلاب کا پس منظر کارل مارکس کی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اس لئے ہر وہ شخص جو علمی اور عملی حیثیت سے اشتراکیت کا مطالعہ کر چاہتا ہے، اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ پہلے کارل مارکس کا مطالعہ کرے۔ ہائی صاحب نے اس مختصر سے رسالے میں اس بات کو پیش کر دیا ہے جو کارل مارکس کے بنیادی اصول کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

ان اگر اور زیادہ آسان ہوتی تو بہتر ہوتا۔

یہ کتاب مکتبہ اُردو لاہور سے چھ آنے میں مل سکتی ہے۔

سٹالین | ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے محمد اشرف خاں عطاء نے اُردو میں منتقل کیا اور مکتبہ اُردو لاہور نے شائع کیا ہے۔

اس رسالہ میں سوویت حکومت کے نظام اور اس کی ترقیوں سے بحث کر کے اسٹالین کے حالات اور دلائل موجودہ سیاست خارجہ سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ موجودہ جنگ میں اسٹالین کی حیثیت اس بادشاہ کی سی ہے جس کے رعب سے ہوا کا رخ پچھانا جاتا ہے اس لئے اسٹالین کے حالات اور اس کی پالیسی کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے فردی ہے جو موجودہ جنگ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ قیمت ۶ روپے۔

انقلاب فرانس | مکتبہ اُردو لاہور پہلا ایڈیشن اس سے قبل شائع کر چکا تھا، اب یہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے اس کے مولف بھی کامریڈ باری ہیں۔ انقلاب فرانس کا مطالعہ اب کلاسیکی مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے سیاسیات کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے واقف ہو۔ اس کی قیمت بھی ۶ روپے۔

فتح الاندلس | ترجمہ ہے ابن القوطیہ کے عربی رسالہ کا جسے مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ام۔ اے، پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے پیش کیا ہے۔ فاضل مترجم نے ایک بیحد مقدمہ بھی شامل کر دیا ہے اور مفید حاشی بھی دیدے ہیں، جن سے ترجمہ کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

فتح اندلس، تاریخ اسلام کا خاص واقعہ ہے اور اس پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے جو کافی سلیس و آسان ہے، ادارہ کتابستان الہ آباد سے یہ کتاب بر میں مل سکتی ہے۔

دکتر انصیر | مجموعہ کلام ہے مولوی محمد نصیر الدین علوی مرحوم کا جسے اُن کے بھائی سید ظہیر الدین احمد علوی نے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں متعدد حضرات کے تعزیت نامے درج کئے گئے ہیں اور پھر ان کا فارسی و اردو ام پیش کیا گیا ہے۔ تعزیت ناموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر مرحوم نہایت اچھے انسان تھے اور کلام کے لکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر بھی بڑے نہ تھے۔

اس مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ شروانی بک ڈپو علی گڑھ۔

پاکستان | ضیاء سرحدی کا مختصر سا ڈرامہ ہے جو انھوں نے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں لکھا ہے اور غالباً یہ پہلی علامت ہے اس بات کی کہ یہ تحریک شاید ڈراموں اور انسانوں کی حیثیت سے

آگے بڑھ سکے۔ خلوتیاں راز تو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تحریک کا مقصود سوائے ڈرانے دھمکانے کے کچھ نہیں لیکن ضیا صاحب اسے زیادہ غائر نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اعظم بک ہاؤس۔ ماہم۔ ممبئی سے یہ ڈرامہ مل سکتا ہو جناب ابو محمد صالح کی تالیف ہے جس میں کلام اقبال سے وہ اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو تعلیمات قرآن سے متعلق ہیں۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد سے شائع کیا ہے اور قیمت دو روپیہ ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ قطب شاہیوں میں محمد قلی قطب شاہ کو دہلی حیثیت حاصل ہے جو کسی گورنر میں چوٹی کے پھول کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ بڑا بادشاہ، بڑا شاعر اور بڑا شخص تھا اور جس طرح دکن کی کوئی تاریخ اس کا ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اسی طرح دکن کی کسی ادبی تاریخ میں اس کی شاعری کا ذکر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور پروفیسر زور کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ اس میں قطب شاہ کے مفصل حالات بھی درج ہیں اور ان کے اردو فارسی کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف، فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اصول کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور حوالہ جات، تصاویر و نقوش، طباعت و کتابت غرض ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ پروفیسر زور نے اس کی ترتیب و تالیف میں جس محنت و سلیقہ سے کام لیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

قیمت پانچ روپیہ اور سٹلٹے کا پتہ سب رس کتاب گھر فیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

فن تقریر خطابت کا سلیقہ بالکل فطری چیز ہے، لیکن چونکہ اب ہر فطری ودیعت کو علمی جامہ پہنایا جا رہا ہے اس لئے خطابت کو بھی فنی حیثیت دے دی گئی ہے اور یورپ میں اس موضوع پر بہ کثرت لکھی گئی ہیں۔ اردو میں غالباً سب سے پہلی کوشش ادارہ ادبیات اردو کی ہے جس نے اس رسالہ کے ذریعہ سے مجملہ لیکن جامع حیثیت سے اس فن کی خصوصیات کو پیش کیا ہے۔

قیمت ۱۲ روپے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد دکن

مقدمہ تاریخ دکن جناب عبد المجید صدیقی اُستاد تاریخ جامعہ عثمانیہ کی تالیف ہے جس میں انھوں نے دکن کے تمام شاہی خاندانوں کے شجرے مختصر تمہید کے ساتھ دیدئے ہیں اس کے مطالعہ سے بیک نگاہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم سے لیکر اس وقت تک کتنے خاندانوں نے کسے کسے تک حکومت کی اور حکمران افراد کون کون تھے۔ مولف لکھتے ہیں کہ ”اس کو تاریخ دکن کا نقش اول سمجھنا چاہئے جو اس کے بعد تفصیل سے لکھی جائے گی۔“ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی تفصیلی تاریخ لکھی جائے تو بھی یہ مقدمہ ایک حد تک اس فرض کو پورا کر سکتا ہے۔ اس وقت عام اشاعت تعلیم کے لئے بڑی بڑی کتابوں کی اتنی زیادہ ضرورت

نہیں ہے، جتنی مختصر کتابوں کی، اس لئے یہ مقدمہ بجائے خود کام کی چیز ہے اور تاریخ دکن کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ازہر مفید۔ قیمت ایک روپیہ اور پٹے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن۔

نمود زندگی جناب سید علی منظور حیدر آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں جو اردو کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ جناب منظور حیدر آبادی کے کہنے مشق شاعر ہیں اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کی ان نظمیں ہیں اور محبت سے لیکر ترک محبت تک جتنی منزلیں اخلاقی یا معاشی حیثیت سے سامنے آ سکتی ہیں ان سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ان کی شاعری کو یہ خصوصیت کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں نہایت مادی اور آسانی سے کہ جاتے ہیں ان کی غزلوں میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور لطف دہکاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ پر کھلیں گے اور ابھی راز ہائے عشق	دل کو لے گی لذت بیچارگی کچھ اور،
ضبط گریہ کی تلقین ختم کر بس اسے ہدم	بات بات پر رونا بے سبب نہیں آتا
لطف بخش بیجا آج دونوں پاتے ہیں	مسکرا رہے ہیں وہ دل ہے شاد ماں اپنا
میں نے جب کبھی دیکھا سر جھکا لیا تو نے	تو نے جب کبھی دیکھا دل تڑپ گیا میرا
ان کی مشکوک نظر میں وہ مزا تھا منظور	کہ یقین اپنی محبت کا دلایا نہ گیا،
ساتھ ان کے لے رہا ہوں میں گلگشت کے مزے	یہ خواب ہی سہی مراجی تو بہل گیا،

ست چہر ہے اور پٹے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن

اغذ کی ناؤ مجموعہ ہے صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے ان چھ ڈراموں کا جو حیدر آباد لاسلیک اسٹیشن سے نشر کئے گئے۔ صاحبزادہ میکش، حیدر آباد کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جو اس وقت زبان کی ہمت میں شانہ روز مصروف نظر آتے ہیں۔

اس مجموعہ میں اکثر ڈرامے خزنہ ہیں اور جناب میکش کی غزلت اسی نوع کے ڈرامہ لکھنے کے لئے زیادہ موزوں بن ہوئی ہے وہ ایک خاموش انداز کے سوچنے والے نوجوان ہیں اور اس لئے وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں اس میں خاموش حیرت کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے۔ تمام ڈرامے ہماری معاشرت سے متعلق ہیں اور کافی اثر افروز رکھتے ہیں۔

یہ کتاب بھی ہم میں سب رس کتاب گھر حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

لب کوہریں ایک منظوم ڈراما آہیرا ہے جسے محمد جلال الدین رشک نے تصنیف کیا ہے مصنف نے

ابتداء میں اس کی مراحت بھی کر دی ہے کہ اس آپت سے ان کا مقصود کیا ہے۔ انھوں نے اس میں اپنے نقطہ بحث کو پیش کیا ہے جو ضیاء سے ہٹ کر صرف کائناتی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۴ روپے اور طے کا پتہ سب رس کتاب گھر حیدر آباد دکن۔

ارسالہ ہے محمد مجاہد مرزا ام۔ اسے پرنسپل عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدر آباد کا جس میں انھوں نے اردو رسم خط علمی، تاریخی اور میکانیکی حیثیت سے ثابت کیا ہے کہ اردو رسم خط کے لئے جو ٹائپ کامیاب ہو سکتا ہے وہ استغلیق نہیں بلکہ تسلی سے بننا چاہئے۔ انھوں نے پہلے عربی اور فارسی رسم خط کی تاریخ پیش کی ہے اور پھر اردو رسم خط کے مختلف ادوار سے بحث کی ہے اور آخر میں خود وہ نمونہ پیش کیا ہے جو ٹائپ کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کی ترتیب میں نہایت سلیقہ و محنت سے کام لیا ہے اور ضرورت ہے کہ اسے اب فن اسپر غور کریں۔ قیمت ۸ روپے اور طے کا پتہ مکتبہ ابراہیم حیدر آباد دکن۔

”نگار“ کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۷۷ء (غالب نمبر)۔ غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۷ء (اردو شاعری نمبر)۔ اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۲۶۔ بعض صاحب قلم کی تصاویر کے ساتھ جس میں ایڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۷ء (ہندی شاعری نمبر)۔ ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحات ۲۸ قیمت ۲ روپے ڈرامہ اصحاب کہف۔ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۱ روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۷ء تاریخ اسلامی ہند۔ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اعزاز آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ صفحات ۱۵۲ قیمت ۱ روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۷ء (مصطفیٰ نمبر)۔ اسکے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصطفیٰ۔ اردو غزل گوئی میں مصطفیٰ کا مرتبہ۔ مصطفیٰ کی غیر مطبوعہ شتویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۴۔ قیمت ۱ روپیہ علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۷ء (نظیر نمبر)۔ بعض عنوانات: نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۲۸ قیمت ۱ روپیہ علاوہ محصول۔

نمبر نگار کھنڈ

دی مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کے جہازوں کی روانگی

حکومت ہند کے مشورے سے حاجیوں کی روانگی کے لئے جہازوں کا انتظام ہو گیا ہے جس کے لئے مغل لائن بہترین رہائش کا انتظام اور سہولتیں بہم پہنچائے گی۔ جنگ کی وجہ سے جہازوں کی روانگی کی تاریخ اور جہازوں کی روانگی کی تاریخ اور جہازوں کے نام نہیں شائع کئے جاسکتے لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کے حکام کی اطلاع مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۴۷ء کے مطابق عازمان حج ۱۶ دسمبر تک بمبئی اور ۱۹ دسمبر تک کراچی پہنچ جانا چاہئے۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہوگی

فرسٹ کلاس کا واپسی کا ٹکٹ مع خوراک: بمبئی سے جدہ — کراچی سے جدہ

۷۲۵ روپیہ — ۷۰۰ روپیہ

تختہ جہاز کا ٹکٹ واپسی مع خوراک کے: ۱۹۵ روپیہ — ۱۸۹ روپیہ

مزید تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ سے خط و کتابت کیجئے:

ٹرنر مارین کمپنی لمیٹڈ

اسٹریٹ بمبئی

